بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصباح المجالس

جلد اوّل

مصنفہ

جناب شمس الواعظین ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ

مطبوعہ

شمیم بک ڈپو ناظم آباد کراچی ظفر منزل بلاک نمبر ۲

قیمت - پانچ روپے

مختصر حالاتِ مُصنّف کتاب ہٰذا حضرت ادیب اعظم مدظلہ العالی

حضرت ادیب اعظم مولانا و مقتدانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ نقوی ابن سید دلشاد علی صاحب مرحوم و مغفور کا اصلی وطن امروہہ ضلع مراد آباد یوپی (بھارت) ہے ابتدائی تعلیم سید المدارس و امام المدارس امروہہ میں ہوئی پھر مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں تقریباً دو سال تعلیم حاصل کی۔ امروہہ کے مشہور و معروف زبان فارسی و عربی کے ادیب فاضلِ جلیل جناب مولانا و مقتدانا سید جواد حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ و جناب سرکار نجم العلماء اعلی اللہ مقامہ اور جناب جنت مکان فقیہ لاثانی مولانا و مقتدانا مولوی سید اولاد حسن صاحب قبلہ سکیم امروہوی امام جمعہ و جماعت جامع مسجد امروہہ سے حضرت ادیب اعظم کو شرف تلمذ حاصل ہے۔ لکھنؤ میں جناب سرکار نجم العلماء نور اللہ مرقدہ و جناب ملک الناطقین خطیب آل محمد جناب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ وغیرہ جیسی مقدس اور باکمال ہستیوں کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ لکھنؤ سے واپس آکر آپ نے الہ آباد یونیورسٹی کے ملا فاضل کی سند حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل کی۔ مذہب کی محبت میں زبان انگریزی بھی حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس ایل سی کا امتحان پاس کیا اس زبان کی مدد سے آپ نے مغربی علماء کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اسٹرانومی (علم نجوم)، جیولوجی (علم طبقات الارض) کی طرف چونکہ کئی سال آپ کی توجہ بہت زیادہ رہی اس لئے ان علوم کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد آپ کو روحانیت پر اہل یورپ نے جو کتابیں لکھی تھیں ان کے دیکھنے کا شوق ہوا اور کئی سال متواتر ان کے مطالعہ میں مشغول رہے۔

آپ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ اب آپ کی عمر تقریباً ۷۵ سال کی ہے مگر بحمد اللہ قوائے جسمانی ایسے اچھے ہیں کہ سات آٹھ گھنٹے روزانہ دماغی کام کرتے ہیں۔ اولاد کے اعتبار سے آپ بڑے خوش نصیب انسان ہیں۔ آپ کے بحمد اللہ سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں (۱) سید تہذیب الحسن صاحب جو اردو فارسی اور انگریزی کے متعدد امتحانات پاس ہیں (۲) سید شمیم الحسن صاحب ایم اے ایل ایل بی جو حبیب بینک کی ایک برانچ کے انچارج ایجنٹ ہیں (۳) سید نسیم الحسن صاحب نقوی بی ایس سی انجینیر (انگلینڈ ریٹرنڈ) قائم مقام انگزیکیٹو انجینیر کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (۴) سید توصیف الحسن صاحب ایم ایس سی لیکچرار انجینیرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جو پی ایچ ڈی بھی کر رہے ہیں (۵) سید ندیم الحسن صاحب ایم ایس سی (پریویس) جو ایم بی بی ایس میں تعلیم پا رہے ہیں (۶) سید تسنیم الحسن صاحب بی ایس سی جو انجینیرنگ کالج میں زیر تعلیم ہیں (۷) سید شبیہ الحسن صاحب جو بی اے میں تعلیم پا رہے ہیں اور ایم اے کر کے عراق جائیں گے اور انشاء اللہ اجتہاد کی سند حاصل کریں گے۔

جناب قبلہ مع اپنے متعلقین کے ۱۹۵۰ء میں کراچی تشریف لائے اور اس وقت سے مستقل قیام یہیں ہے۔ ناظم آباد بلاک ۲ میں آپ نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کرا لیا ہے۔ حضرت قبلہ نے اپنی مبارک زندگی کا بیشتر حصہ علمی خدمات میں بسر کیا اور ملک و قوم و مذہب کی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔ آپ کی تصنیفات کی طولانی فہرست دیکھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ آپ کی طبیعت کس قدر جدت پسند واقع

ہوئی ہے۔ دنیا کے کم لوگوں نے اپنی تصنیف و تالیف کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ کیا ہوگا۔ جتنا حضرت قبلہ نے کیا ہے۔ باوجودیکہ مصروفیت وعظ و ذکر اہلبیت کے سلسلہ میں آپ کا بہت سا وقت باہر جانے میں صرف ہوتا ہے پھر بھی کئی گھنٹے روزانہ آپ کا قلم چلتا ہے۔ علاوہ ان کتابوں کے جن کے نام آئندہ صفحات میں درج ہیں آپ کی سرپرستی میں ۱۶ سال سے ماہواری رسالہ نور نامے نکل رہا ہے جس میں زیادہ تر مضامین عالیہ آپ ہی کے ہوتے ہیں پہلے یہ رسالہ مراد آباد سے نکلتا تھا لیکن پاکستان آنے کے بعد جولائی سنہ ۴۸ء سے اس کا اجرا کراچی سے ہوا جو بحمد اللہ اب تک جاری ہے اور بہترین تبلیغی خدمات انجام دے رہا ہے۔

سنہ ۵۳ء سے آپ نے کراچی میں ایک نہایت مفید قومی ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ پاکستان میں مدرسۃ الواعظین کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کمی کو آپ نے پورا کرنا چاہا۔ اس مدرسہ کے لئے ناظم آباد بلاک ۲ میں ایک قطعہ زمین کو الاٹ کرایا گیا اور جناب قبلہ نے انتہائی جانفشانی سے کام لے کر اس مدرسہ کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا پہلے اس کا ۹۶۲ لمبا احاطہ بنوایا پھر ایک نہایت شاندار مسجد بنوائی پھر مدرسہ کے لئے آٹھ کمرے اور ایک ہال بنوایا۔ ۱۰ دکانیں تعمیر کرائیں۔ امید ہے کہ سنہ ۱۹۵۷ء سے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہو جائے گا۔ شاید کسی ادارہ نے اس سرعت سے ترقی نہیں کی جتنی اس ادارہ نے جس کا نام جامعہ امامیہ ہے دو سال کے اندر کی ہے یہ سب جناب قبلہ کی انتھک کوشش کا نتیجہ ہے

جب آپ کا قیام ہندوستان میں تھا تو آپ نے امروہہ میں شیعہ آرٹس اسکول بھی بنوایا تھا جس میں کپڑا بننا سکھایا جاتا تھا مگر افسوس کہ روپیہ ختم ہونے سے پہلے اسکول ختم ہو گیا کیونکہ سادات کرام نے اس خیال سے اپنے بچوں کو داخل کرنا پسند نہ کیا کہ وہ کپڑا بننا سیکھ کر جلاہے کہلانے لگیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوم کو اس قابل قدر وجود پر جس قدر فخر ہو کم ہے۔ ایسی ٹھوس کام کرنے والی ہستیاں دنیا میں کم پائی جاتی ہیں اور پھر بھی یہ کہ انتہائی دیانت اور ہمدردی سے۔ آپ کو بہ نسبت کہنے کے کرنے کا زیادہ شوق ہے جس کام کو آپ ہاتھ میں لیتے ہیں اس کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھتے۔ آپ تقریباً ۴۵ سال سے متواتر علمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ دماغ اختراع اور طبیعت اتنی رواں ہے کہ جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں دریا بہا دیتے ہیں جس موضوع پر تقریر فرماتے ہیں اس کے کسی پہلو کو تشنۂ تکمیل نہیں رکھتے رسالہ نور میں بعض بعض مضامین آپ کے پچاس پچاس قسطوں میں نکلے ہیں۔ جیسے حقیقت انسانیہ۔ اسلام فطری دین ہے۔ روحوں کی حاضرات علامہ برزخی کا مکالمہ۔ نور ہی پر موقوف نہیں تمام جرائد و اخبار میں آپ کے مضامین برابر چھپتے رہتے ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کی قدردانی محکمہ تعلیم نے بھی کی اور ایک عرصہ تک آپ کی مؤلفہ کتابیں بطور ٹیکسٹ بک کے انگریزی اور ورنیکولر مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ کئی بار آپ کو مضامین نویسی پر سرکار انگلشیہ اور پبلک سوسائٹیوں سے انعامات بھی ملے۔ مثلاً ارک شینک پرائز۔ نیشنل ویک پرائز آف تھیوسوفیکل سوسائٹی سلور جوبلی پرائز آف جارج پنجم۔ بعرصہ ۱۹۲۳ء سے یکایک آپ کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور اس شغلہ کو چھوڑ کر اپنی تمام تر توجہ دینی خدمت کی طرف مائل کی

آپ کی تصنیفات تین قسم کی ہیں (۱) وہ کتابیں جو آپ نے محکمہ تعلیم کی ضرورت کے لحاظ سے لکھیں (۲) جو اپنے ذاتی شوق سے بطور ادبی خدمات کے لکھیں (۳) مذہبی اور دینی خدمت۔ چونکہ یہ سلسلہ تقریباً ۴۵ سال سے جاری ہے۔ لہٰذا بہت سی کتابیں تو پہلے ہی سے نایاب تھیں اور اس ملکی انقلاب نے تو سب ہی کا خاتمہ کر دیا۔ ہم ذیل میں پہلے ادبی کتابوں کی فہرست دیتے ہیں۔ آپ کو نثر و نظم میں کمال حاصل ہے۔ لیکن

بہ نسبت نظم کے نثر کی طرف آپ کا رجحان زیادہ ہے ذیل کی سب کتابیں طبع شدہ ہیں۔

(۱) تعلیمی خدمات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ تصنیف
۱	مختصر القواعد	۳۲	سنہ ۱۹۱۴ء
۲	گلدستہ مضامین	۳۰۴	سنہ ۱۹۲۰ء
۳	ادیب فارس	۸۰	سنہ ۱۹۲۱ء
۴	تہذیب القواعد	۳۰۴	سنہ ۱۹۲۳ء
۵	ورنیکولر فائنل مضامین	۹۶	سنہ ۱۹۲۴ء
۶	معلم خطوط نویسی	۸۰	″
۷	تکمیل اردو	۳۰۴	″
۸	تہذیب اللغات	۸۰۰	سنہ ۱۹۲۵ء
۹	چمن اردو	۱۰۰	″
۱۰	گنجینۂ مضامین	۴۰۰	سنہ ۱۹۲۶ء
۱۱	لغات فارسی	۱۳۰	سنہ ۱۹۲۷ء
۱۲	قواعد اردو حصہ اول	۳۲	سنہ ۱۹۲۹ء
۱۳	″ ″ ″ دوم	۴۰	″
۱۴	بہارستان اردو حصہ اول	۱۶۰	″
۱۵	″ ″ ″ دوم	۱۶۰	″
۱۶	دبستان اردو	۱۴۸	″
۱۷	ترجمانِ فارسی حصہ اول	۶۴	سنہ ۱۹۲۹ء
۱۸	″ ″ ″ دوم	۸۰	″
۱۹	بچوں کی کہانیاں حصہ ۱	۶۴	سنہ ۱۹۳۰ء
۲۰	″ ″ ″ حصہ ۲	۶۴	″
۲۱	″ ″ ″ حصہ ۳	۶۴	″
۲۲	بچوں کی کہانیاں حصہ ۴	۶۴	سنہ ۱۹۳۰ء
۲۳	گلزار فارسی حصہ ۱	۱۰۰	″
۲۴	″ ″ حصہ ۲	″	″
۲۵	لڑکوں کی کہانیاں حصہ ۱	۶۴	″
۲۶	″ ″ حصہ ۲	″	″
۲۷	″ ″ حصہ ۳	″	″
۲۸	″ ″ حصہ ۴	″	″
۲۹	گلدستہ قواعد حصہ ۱	۴۸	سنہ ۱۹۳۱ء
۳۰	″ ″ حصہ ۱	″	″
۳۱	سلک اردو حصہ ۱	[illegible]	سنہ ۱۹۳۲ء
۳۲	″ ″ حصہ ۲	″	″
۳۳	″ ″ حصہ ۳	۲۸۰	″
۳۴	″ ″ حصہ ۴	۳۰۴	″
۳۵	″ ″ حصہ ۵	۳۲۰	″
۳۶	″ ″ حصہ ۶	۴۳۸	″
۳۷	کمال اردو حصہ ۱	۹۶	سنہ ۱۹۳۳ء
۳۸	″ ″ حصہ ۲	۱۱۲	″
۳۹	″ ″ حصہ ۳	۱۳۴	″
۴۰	″ ″ حصہ ۴	۱۵۰	″
۴۱	″ ″ حصہ ۵	۱۸۰	″
۴۲	تسہیل القواعد	۳۲	سنہ ۱۹۳۴ء

۴۳	تحصیل القواعد	۴۰	سنہ ۱۹۳۴ء
۴۴	تکمیل القواعد	۴۸	〃
۴۵	شمیم القواعد	۹۶	سنہ ۱۹۳۵ء
۴۶	نسیم القواعد	۸۰	〃
۴۷	ندیم القواعد	۶۴	〃
۴۸	قسیم القواعد	〃	〃
۴۹	ترصیف القواعد	۱۶۰	〃
۵۰	رسالہ قواعد اردو	۱۶	〃
۵۱	ادبی خطوط	۲۰۴	〃
۵۲	شباب اردو	۳۰۴	〃
۵۳	کلید امتحان	۱۶۰	〃

(۲) ادبی خدمات

۵۴	سیر کواکب	۸۰	سنہ ۱۵ء
۵۵	صحبت کا اثر	۴۸	〃
۵۶	گل صد برگ	۹۶	سنہ ۱۹۱۶ء
۵۷	اخلاق حسنہ	۱۰۸	سنہ ۱۷ء
۵۸	فریادِ عاصی	۳۲	〃
۵۹	ارمغانِ عاصی	۱۶	سنہ ۱۸ء
۶۰	ایام غدر	۲۵۰	سنہ ۱۹ء
۶۱	رہنمائے مسرت	۶۴	سنہ ۲۱ء
۶۲	کارخانۂ عالم	۲۵۰	〃
۶۳	تہذیب الاطفال	۱۶۰	سنہ ۲۲ء
۶۴	اسرار قدرت	۳۰۴	سنہ ۲۳ء
۶۵	لطائف الشعرا	۲۰۰	سنہ ۲۵ء
۶۶	دنیا کے چار دروازے	۱۵۶	سنہ ۲۶ء
۶۷	مرثیہ استاد	۱۶	〃
۶۸	اردو گلستان	۲۰۰	〃
۶۹	شہید یونان	۱۶۰	سنہ ۳۳ء
۷۰	ثمرۂ تجارت	۱۲۰	〃
۷۱	یورپ کے سیارے	۱۵۴	〃
۷۲	زندگی کے دو رُخ	۱۲۸	〃
۷۳	مشاہیر عالم	۲۰۴	〃

(۳) مذہبی خدمات

۷۴	اصحاب رسول حصہ ۱	۸۰	سنہ ۱۹۱۶ء
۷۵	〃 〃 حصہ ۲	〃	〃
۷۶	〃 〃 حصہ ۳	〃	〃
۷۷	قضایائے امیر المومنین	۱۰۴	سنہ ۱۹۱۸ء
۷۸	آئینۂ اسلام	۳۰۴	〃
۷۹	شیعہ دینیات کورس	۱۱۲	سنہ ۲۲ء
۸۰	الشہید	۶۴	سنہ ۲۴ء
۸۱	جنت البقیع	۹۶	سنہ ۲۵ء
۸۲	مناظرہ تقدیر و تدبیر	۱۰۴	سنہ ۳۹ء
۸۳	حقیقت روح	〃	〃
۸۴	جواز عزا	۹۶	سنہ ۲۶ء
۸۵	تحقیق اصحاب رسول	۳۰۴	سنہ ۲۷ء
۸۶	سوانح عمری حضرت رسولخدا	۱۵۰	سنہ ۳۷ء
۸۷	〃 〃 علیؑ	۱۶۰	〃
۸۸	〃 〃 فاطمہؑ	۱۰۴	〃

۸۹	سوانحعمری حضرت امام حسنؑ	۶۴	سنہ ۳۷ء
۹۰	〃 〃 امام حسینؑ	۲۴۰	〃
۹۱	〃 〃 امام چہارم	۱۱۲	〃
۹۲	〃 〃 امام پنجم	۶۴	〃
۹۳	〃 〃 امام ششم	۱۳۶	〃
۹۴	〃 〃 امام ہفتم	۸۸	〃
۹۵	〃 〃 امام ہشتم	۱۲۰	〃
۹۶	〃 〃 امام نہم	۴۸	〃
۹۷	〃 〃 امام دہم	۷۶	〃
۹۸	〃 〃 امام یازدہم	۴۸	〃
۹۹	〃 〃 امام دوازدہم	۱۰۰	〃
۱۰۰	دینی کہانیاں حصہ ۱	۳۰۴	سنہ ۳۸ء
۱۰۱	〃 〃 حصہ ۲	〃	〃
۱۰۲	〃 〃 حصہ ۳	〃	〃
۱۰۳	〃 〃 حصہ ۴	〃	〃
۱۰۴	〃 〃 حصہ ۵	۴۰۰	سنہ ۳۸ء
۱۰۵	〃 〃 حصہ ۶	۲۸۸	〃
۱۰۶	تحفۃ الابرار	۴۴۸	سنہ ۳۹ء
۱۰۷	مذہبی مکالمہ	۴۶۴	〃
۱۰۸	ید اللہی تپانچہ	۹۶	〃
۱۰۹	سر فروشانِ ملت	۳۰۴	〃
۱۱۰	خواتین اسلام	۱۶۰	〃
۱۱۱	بچوں کی دینیات حصہ ۱	۶۴	سنہ ۴۰ء
۱۱۲	بچوں کی دینیات حصہ ۲	۶۴	سنہ ۴۰ء
۱۱۳	مصباح المجالس حصہ ۱	۳۱۲	سنہ ۴۱ء
۱۱۴	〃 〃 حصہ ۲	۱۱۲	〃
۱۱۵	تحفۃ المومنین	۳۰۴	سنہ ۴۲ء
۱۱۶	مجمع الآیات[۱] جلد ۱	۸۰۰	سنہ ۴۴ء
۱۱۷	〃 〃 جلد ۲	۱۰۰۰	〃
۱۱۸	〃 〃 جلد ۳	۱۰۰۰	سنہ ۴۵ء
۱۱۹	〃 〃 جلد ۴	۱۰۵۰	سنہ ۴۶ء
۱۲۰	قرآن کا ترجمہ مع حاشیہ	غیر مطبوعہ	
۱۲۱	مجالس خواتین	۳۰۰	سنہ ۱۹۵۲ء
۱۲۲	محافل و مجالس چہاردہ معصومین	۳۴۴	〃
۱۲۳	حقائق اسلام	۱۰۰	〃
۱۲۴	مختصر مختار نامہ	۴۰	〃
۱۲۵	سوانحعمری حضرت حجت	〃	〃
۱۲۶	فضائل امیر المومنین	۴۴	〃
۱۲۷	دعائے نور مترجم	۲۶	〃
۱۲۸	حدیث کساء مترجم	۲۶	〃
۱۲۹	دعائے مشلول مترجم	۲۴	〃
۱۳۰	حیات بعد الموت	۴۸	سنہ ۵۳ء
۱۳۱	حکومت الٰہیہ و سیاست علویہ	۱۴۴	〃
۱۳۲	عقاید الشیعہ	۸۸	〃
۱۳۳	تحقیق حدیث قرطاس	۲۴	سنہ ۵۴ء
۱۳۴	تحقیق مسئلہ فدک	۲۴	〃

[۱] افسوس ہے کہ مجمع الآیات کی تمام جلدیں جو حضرت قبلہ کی تین سال متواتر کی محنت تھی مع بہت سی قیمتی اور کمیاب کتابوں کے گزشتہ ملکی انقلاب میں ایک خاص حادثہ کے ماتحت ضائع ہو گئیں۔ اب دوبارہ پھر آپ نے اس اہم خدمت کو انجام دینا شروع کیا ہے۔

۱۳۵	تحقیق مسئلہ متعہ	۲۴	سنہ ۱۹۵۴ء
۱۳۶	تحقیق مسئلہ تقیہ	"	"
۱۳۷	تحقیق مسئلہ خمس وحق ذوی القربیٰ	"	"
۱۳۸	جواز مراسم عزا	۴۸	"
۱۳۹	قاتلانِ حسین کا مذہب	۲۴	"
۱۴۰	یزید بن معاویہ	"	"
۱۴۱	تحقیق مسائل فقہیہ	"	"
۱۴۲	تحقیق مسئلہ تحریف قرآن	"	"
۱۴۳	تحقیق عقد ام کلثوم	"	"
۱۴۴	تحقیق ایمان ابوطالب	"	"
۱۴۵	تحقیق مسئلہ خلافت	۳۲	سنہ ۱۹۵۴ء
۱۴۶	تحقیق مسئلہ بیعت یزید	۲۴	"
۱۴۷	تحقیق لفظ آل و اہلبیت	"	"
۱۴۸	اہلبیت و منازل روحانیت	۸۰	سنہ ۵۵ء
۱۴۹	سکینہ بنت الحسین	۲۴	"
۱۵۰	واقعات کربلا کا پس منظر	۳۲	"
۱۵۱	تحقیق مسئلہ بداء	۲۴	"
۱۵۲	اہلبیت کا احسان اسلام پر	۸۰	سنہ ۵۴ء
۱۵۳	اہلبیت اور اسلام	۸۰	"

فہرست مجالس مصباح المجالس

نمبر شمار	مضامین مجالس	صفحہ
۱	صدقہ دینے اور برادر مومن کی حاجت براری کا ثواب ماہ محرم کا ذکر حاکم مدینہ کی امام حسین سے ملاقات	۹
۲	تفسیر آیۂ الذین اُخرجوا من دیارھم۔ الخ اور امام حسین کا روانگی مکہ کا قصد	۱۵
۳	تفسیر آیۂ کل من علیہا فان ذکر موت اور امام علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی	۲۰
۴	تفسیر آیۂ یوفون بالنذر، امام حسین کا مکہ پہنچنا اہلِ کوفہ کے خطوط اور حضرت مسلم کی شہادت	۲۷
۵	تفسیر آیۂ ان اول بیت۔ الخ اور امام حسینؑ کی مکہ سے عراق کو روانگی	۳۶
۶	مہمان نوازی کے فضائل امام علیہ السلام کی حُر سے ملاقات اور کربلا میں ورود	۴۳
۷	تفسیر آیۂ اما الیتیم فلا تقہر الخ اور شہادت فرزندانِ جناب مسلم	
۸	تفسیر آیۂ مودت اور حالِ شب عاشور	۵۹
۹	تفسیر آیۂ ان اللہ اشتریٰ الخ اور حالِ شب عاشور	۷۰
۱۰	تفسیر آیۂ ولنبلونکم الخ حالِ شب عاشور و شہادت حضرت حُر	۷۵
۱۱	تفسیر آیۂ مباہلہ فضائل امیر المومنین و شہادت جناب وہب	۸۵
۱۲	تفسیر آیۂ من یرتد منکم الخ فضائل امیر المومنین اور شہادت حبیب ابن مظاہر	۹۴

١٣	تفسیر آیۂ انما ولیکم اللہ فضائل حضرت علیؑ اور شہادت اصحاب امام علیہ السلام	١٠٥
١٤	تفسیر آیۂ من یشاقق الرسول الخ و شہادت جناب قاسم بن الحسنؑ	١١٢
١٥	تفسیر آیۂ کونوا مع الصادقین و شہادت حضرت عون و محمد	١٢٠
١٦	تفسیر آیۂ ھو الذی ارسل رسولہ اور شہادت حضرت ابوالفضل العباس	١٣٠
١٧	تفسیر آیۂ اللہ الذی رفع السموات اور شہادت حضرت علی اکبر	١٤١
١٨	تفسیر آیۂ افمن کان علی بینۃ اور شہادت حضرت علی اصغر	١٥٣
١٩	تفسیر آیۂ یسئلونک عن الاھلۃ اور حال رخصت امامؑ از اہل حرم	١٦١
٢٠	تفسیر آیۂ ثم اورثنا الکتاب اور حال شہادت امامؑ	١٧٠
٢١	تفسیر آیۂ ما کان محمد ابا احد الخ و حال پامالی لاشہائے شہدا و تاراجی خیام	١٧٩
٢٢	تفسیر آیۂ یا ایھا النبی انا ارسلناک اور ذکر شام غریباں	١٨٥
٢٣	تفسیر آیۂ ھو الذی ارسل من السماء ماء احوال روانگی اہل حرم از کربلا	١٩٣
٢٤	تفسیر آیۂ قل کفی باللہ شہیداً احوال ورود اہل حرم در کوفہ	١٩٩
٢٥	تفسیر آیۂ واللہ انزل من السماء ماء اور شہادت عبداللہ بن عفیفؓ	٢٠٦
٢٦	تفسیر آیۂ واذ یرفع ابراھیم القواعد الخ حال داخلہ اہل حرم دربار یزید میں	٢١٢
٢٧	تفسیر آیۂ انا ارسلنا الیکم رسولاً اور حال اہل حرم دمشق میں	٢٢١
٢٨	تفسیر آیۂ وانذر عشیرتک الاقربین اور حال زندان شام	٢٢٦
٢٩	تفسیر آیۂ قد جاءکم من اللہ نور اور حال رہائی اہل حرم از زندان شام	٢٣٤
٣٠	تفسیر آیۂ اطیعوا اللہ الخ اور حال روانگی اہل حرم بمدینہ	٢٣٩

پہلا ایڈیشن - ایک ہزار سنہ ١٩٤٥ء   دوسرا ایڈیشن - ایک ہزار سنہ ١٩٥١ء

تیسرا ایڈیشن - ایک ہزار سنہ ١٩٤٧ء   چوتھا ایڈیشن - ایک ہزار سنہ ١٩٥٦ء

ڈیڈیکیشن

میں اپنی اس کتاب کے چوتھے ایڈیشن کا ڈیڈیکیشن قوم کی اس مقتدر ہستی کے نام سے کر رہا ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دین و دنیا دونوں قسم کی دولتوں سے مالا مال کیا ہے۔ وہ ہیں میرے کرم فرمائے خاص فخرِ قوم عالی جناب نواب حاجی امیر علی خاں صاحب لاہوری۔ او۔ بی۔ ای۔ جے۔ پی۔ لاڑکانہ سندھ۔ آپ ۲۰ ماہ محرم ۱۳۰۸ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور والدین کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے آپ عشق اہلبیت علیہم السلام میں سرشار تھے۔ مجالس شہدائے کربلا میں بڑے شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ کتب دینی اور تحقیق مذہب کا ابتدا ہی سے آپ کو شوق تھا۔ اسلامی تواریخ کے مطالعہ میں آپ بڑا وقت صرف کرتے تھے اور آیات و احادیث میں کافی غور و خوض سے کام لیتے تھے۔ خلق اللہ کی خدمت کا جذبہ ہمیشہ آپ کے قلب میں موجزن رہا۔ غربا و مساکین کی امداد دل کھول کر کرتے رہے جس کی وجہ سے لاڑکانہ اور بیرون لاڑکانہ کی پبلک کی نظر میں آپ کا وقار روز بروز بڑھتا رہا۔ اور لوگ آپ کو مسلمانوں کا بہترین ہمدرد سمجھتے رہے۔ چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ آپ میونسپل بورڈ لاڑکانہ میں بلامقابلہ تقریباً ۱۴ سال تک پریزیڈنٹ منتخب ہوتے رہے اور نہایت گرم جوشی، صداقت اور ہمدردی سے پبلک کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مزید براں ۱۳ سال متواتر آپ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے اور اپنی حسن خدمات اور گورنمنٹ سے وفاداری کے صلہ میں انگریزی حکومت سے نواب۔ خان بہادر۔ او۔ بی۔ ای۔ جے۔ پی وغیرہ کے خطابات حاصل کئے۔ خدا کے فضل و کرم سے آپ کی مالی حالت صوبہ سندھ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعزازی دور میں جبکہ آپ کا آفتاب اقبال عروج پر تھا جب کبھی مجلس میں تشریف لیجاتے باوجودیکہ آپ کی نشست کے لئے ایک ممتاز جگہ مقرر کی جاتی تھی مگر آپ ہمیشہ مولائے کونین حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی مجلس سننے والوں کی جوتیوں کے قریب بیٹھ کر مجلس سننا باعث صد افتخار تصور فرماتے تھے۔ اس انکسار اور تواضع پسندی نے پبلک کی نظر میں آپ کا مرتبہ ایک سے ہزار کر دیا تھا۔ آپ اب تک دو مرتبہ فریضہ حج ادا فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دو مرتبہ مشہد مقدس اور چار مرتبہ عراق کی زیارتوں سے مشرف ہو چکے ہیں۔ تیسری بار آپ پھر عازم زیارات مشاہد مقدسہ ہیں۔ آپ کی مقدس زندگی کا روزانہ پروگرام یہ رہتا ہے کہ بعد نماز صبح اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر ٹھیک نو بجے دیوان خانے میں تشریف لے آتے ہیں اور بارہ بجے دن تک نشست رہتی ہے۔ شہر کے معززین، امراء، آفیسر صاحبان اور متوسط طبقہ کے لوگ بھی شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے برابر آتے رہتے ہیں۔ آپ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں چونکہ اہلبیت علیہم السلام سے آپ کو بے پناہ محبت ہے اور امیر المومنین علیہ السلام سے خصوصاً ایسی پُرخلوص عقیدت ہے جو عشق کے درجہ سے مخصوص ہے لہٰذا ہر روز آپ اپنے دوستوں کی دلبستگی کے لئے فضائل علی اور اولاد علی علیہم السلام بیان فرماتے رہتے ہیں

امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں جو بہترین قصائد شعرائے کرام نے اردو و فارسی میں لکھے ہیں وہ اپنے ہم نشینوں کو سناتے رہتے ہیں۔ آپ فطرتاً حد درجہ مخیر و فیاض ہیں۔ جب تک آپ دیوان خانہ میں تشریف فرما رہتے ہیں، اہل حاجت کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہر سائل کو نذر اللہ اور نیاز حسین کہکر اس کی امید سے کہیں زیادہ دے دیتے ہیں اور یہ سلوک کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ قومی اداروں کی دل کھول کر امداد فرماتے ہیں۔ ماہ مئی ۱۹۵۶ء میں آپ نے جامعہ امامیہ کراچی کے لئے تین ہزار پچیس روپیہ عطا فرمایا۔ چنانچہ آپ کے نام سے بطور یادگار ایک کمرہ تعمیر ہوا۔ آپ جو مذہبی یا قومی خدمت کرتے ہیں وہ چونکہ قربۃً الی اللہ ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ اس کو مخفی رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور نام و نمود سے بہت گھبراتے ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مسٹر احمد حسین لندن میں بیرسٹری کی تعلیم پا رہے ہیں خداوند عالم اپنے حبیب پاک اور اہلبیت کے صدقہ میں بانیل مرام وہاں سے واپس لائے اور اپنے بزرگوار کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق کرامت فرمائے۔ آمین۔

میں بے حد مسرور ہوں کہ مجھے اپنی اس کتاب کو معنون کرنے کے لئے جو فضائل و مصائب اہلبیت کرام کا مجموعہ ہے ایک ایسی بے بدل اور مقدس ہستی مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میری درخواست کو نواب صاحب نے شرف قبولیت بخشا لہٰذا بے حد شکرگزار ہوں اور بارگاہ الٰہی میں دست بدعا کہ وہ ان کا سایہ عاطفت ہماری قوم پر مدت دراز تک باقی رکھے۔ اور ان کے اعمال حسنہ کا اجر جزیل دین و دنیا میں عطا فرمائے۔ آمین میں نے اپنی یہ محنت ان کی نذر کی ہے۔ خدا کرے وہ خوش ہوں۔

دعاگو

سید ظفر حسن مصنف کتاب ہذا



جناب قبلہ و کعبہ حضرت ادیب اعظم
مولانا سید ظفرحسن صاحب مدظلہ ۔ سرپرست
رسالہ نور ۔ صدر پراونشیل شیعہ کانفرنس ۔
صدر جامعہ امامیہ کمیٹی ۔ مصنف کتاب ھذا ۔



عالیجناب خان بہادر نواب حاجی امیر علی
خانصاحب دام اقبالہ لاہوری ۔ او ۔ بی ۔ ای ۔
کے ۔ بی ۔ جے ۔ پی ۔ ایف آف لاڑکانہ سندھ ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہ الطیبین الطاہرین المعصومین

پہلی مجلس

صدقہ دینے اور برادر مومن کی حاجت برلانے کا ثواب۔ ماہِ محرم کا ذکر حاکم مدینہ کی امام حسین علیہ السلام سے ملاقات

خداوندِ عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون ۔ یعنی جب تک تم اپنی محبوب چیز راہِ خدا میں صرف نہ کرو گے، ہرگز ہرگز نیکی کو نہ پاؤ گے۔

مومنین! بارگاہِ خدا میں مال و دولت کا خرچ کرنا بڑا ثواب رکھتا ہے۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو حلال طریقے سے روزی کما کر پھر نیک کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ مال و دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ ترویج دین اور حفاظتِ مذہب میں صرف کیا جائے۔ اس کے بعد اپنے ہم مذہب فقرا و مساکین یتیموں اور بیوں کی مدد کی جائے۔ جو کوئی اپنی ضرورت پر کسی بندۂ مومن کی ضرورت کو مقدم رکھتا ہے تو درگاہِ الٰہی میں اس کا مرتبہ بہت زیادہ بلند ہوتا ہے۔

اس مواسات و ہمدردی میں ہم کو اہلبیت علیہم السلام کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ سبحان اللہ! وہ کیسی مسکین پرور اور غلام نواز ہستیاں تھیں کہ اپنا تمام سرمایہ فقرا و مساکین کی حاجت برآری کیلئے وقف کر دیا تھا۔ وہ خود بھوکے سو رہتے تھے لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے ہمسایہ میں کوئی بھوکا سو رہے وہ اپنے لباس میں خود پیوند لگا لیتے تھے لیکن کسی محتاج کو برہنہ تن نہ دیکھ سکتے تھے۔ ایک بار کسی نے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ اکثر ہم آپ کے شکم مبارک پر پتھر بندھا ہوا پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے شخص میں کیونکر سیر ہو کر کھاؤں در آنحالیکہ میرے گرد بہت سے بھوکے شدتِ گرسنگی سے تلملا رہے ہوں۔ اکثر ہوتا تھا کہ تین تین دن متواتر ان حضرات کو فاقہ سے گزر جاتے تھے۔ اور اس عرصہ میں جو غذا ہاتھ آتی تھی وہ غریبوں اور محتاجوں کو تقسیم کر دیتے تھے اس ہمدردی میں اس گھر کے بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت سب کا ایک ہی حال تھا۔ مومنین ہم نے ان کی غلامی سے کچھ بھی سبق حاصل نہ کیا ہم میں ہمدردی کا جذبہ بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہم اپنے نادار بھائیوں کو دیکھ کر بجائے غم کرنے کے خوش ہوتے ہیں اور بجائے ان کی مدد کرنے کے طعن و تشنیع سے ان کے دکھتے ہوئے دل کو اور دکھاتے ہیں۔ ان کو اپنی نگاہ میں ذلیل و خوار سمجھتے ہیں۔ ہم اچھی سے اچھی غذائیں کھاتے ہیں اور ان بیکسوں اور ناداروں کے حال پر ہم کو ذرا رحم نہیں آتا جو فاقے سے تڑپ تڑپ کر اپنے رات دن بسر کرتے ہیں۔ ہم کہنے کو ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ لیکن حقیقتاً غیروں سے بدتر ہیں۔ کیا ہمارے ائمہ ہمارے اس عمل سے خوش ہو سکتے ہیں! ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

کتاب رسائل میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا ایک بار قوم بنی اسرائیل ایسے سخت قحط میں مبتلا ہوئی

جس کا سلسلہ کئی برس تک رہا بے شمار آدمی بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ لوگ روٹی کے ایک ٹکڑے کو ترستے تھے اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نے بمشکل تمام روٹی کے چند ٹکڑے حاصل کئے چاہتی تھی کہ ان کو کھا کر اپنی جان بچائے کہ ایک یتیم بچہ روتا بلبلاتا اس کے پاس آیا اور کہنے لگا اے مادر مہربان! میں بھوک سے جاں بلب ہوں خدا کے لئے مجھے کچھ دے کہ میری جان بچے میں یتیم ہوں کس سے اپنا حال کہوں۔ وہ عورت اہل دل تھی بے چین ہو گئی اور سب ٹکڑے اٹھا کر اس کو دے دیئے۔ اب خدا کی شان رحمت دیکھو۔ اس عورت کا ایک چھوٹا سا بچہ گھر میں پڑا سو رہا تھا جب وہ اس کو اٹھانے کے لئے گئی تو دیکھا کہ ایک کالا ناگ اس کے بستر کے نیچے پڑا ہوا ہے۔ عورت اسے دیکھ کر کانپ گئی اور بچہ کو اٹھا کر بھاگی۔ خدا نے جناب موسیٰ پر وحی کی کہ ہم نے فلاں عورت کے بچہ کو اس نیکی کے عوض بچا لیا جو اس نے ایک یتیم بچے کے ساتھ کی تھی۔ مومنین دیکھا آپ نے کسی حاجت مند کی حاجت بر لانا کس طرح آدمی کو بلا سے بچا لیتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے میرے نزدیک کسی بندۂ مومن کی حاجت برآری سے زیادہ محبوب کوئی کام نہیں۔ مروی ہے کہ جب کوئی بندۂ خدا اپنے برادر ایمانی کے واسطے دعائے مغفرت کرتا ہے تو خدا اس کی دعا کو رد کرنے سے شرم کرتا ہے۔ خاص کر ایسے بندوں کے متعلق جو اپنے برادر ایمانی کی حاجت برآری بھی کرتا رہا ہو۔

مومنین خوشحال ان لوگوں کا جو اپنا مال ہر سال تعزیہ داری میں صرف کرتے ہیں اور اس رسم خیر کو ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں یاد رکھنا چاہیئے جو کوئی محبت اہلبیت اور تعزیہ داری وغیرہ میں اپنا مال صرف کرتا ہے تو خدا اس کے مال میں برکت عطا فرماتا ہے۔ حضرات تعزیہ داری سے ہمارے مذہب حقہ کی بہت بڑی ترویج ہے۔ ہر سال اس کی بدولت بے شمار لوگ ہمارے مذہب میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پس ہر بندۂ مومن کا فرض ہے کہ جتنا ممکن ہو اس امر خیر میں صرف کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مظلوم امام نے دین اسلام پر جو عظیم الشان احسان کیا ہے۔ وہ اسی کا مقتضی ہے کہ ہم ہر سال اس کی یاد بہترین صورت میں تازہ کرتے رہیں۔

مومنین محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی ہمارے زخم دل آبلے ہو جاتے ہیں۔ ہر شیعہ کے گھر میں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ ہماری عورتیں حسین مظلوم کے غم میں چالیس دن کے لئے سوگ نشین ہو جاتی ہیں۔ گھر گھر سے نوحہ و ماتم کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ تعزیہ خانے کھل جاتے ہیں علم نصب ہوتے ہیں۔ جا بجا مجلسیں ہونے لگتی ہیں۔ ہر دل محزون و مغموم نظر آتا ہے۔ واقعہ کربلا کی ایک دردناک تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چالیس دن کے لئے ہر قسم کی خوشی ہم سے رخصت ہو جاتی ہے۔ عزاداری کے سوا اور کسی کام پر ہمارا دل نہیں لگتا۔

لکھا ہے جب محرم کا چاند نمودار ہوتا تھا تو امام رضا علیہ السلام اسے دیکھ کر زار زار روتے تھے اور فرماتے تھے یہ محرم کا مہینہ وہ مہینہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اس میں قتال کو حرام جانتے تھے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ اس مہینہ میں ہمارے خون بہائے گئے۔ ہماری ہتک حرمت کی گئی۔ ہماری عورتوں کو قید کیا گیا۔ اور حضرت رسولخدا کی رشتہ داری کا ذرا سا لحاظ بھی ہمارے بارے میں نہ کیا گیا۔ اے سرزمین کربلا تو نے ہمیشہ کے لئے ہمیں درد و کرب میں مبتلا کر دیا۔

حقیقتاً مومنین محرم کا مہینہ ایک عجیب مصیبت کا زمانہ ہے۔ آہ! آہ! اس مہینہ میں ہمارے رسول کا سارا خاندان برباد ہو گیا۔ اس مہینہ میں ہمارے نبی کی آل پر وہ مصیبتیں نازل ہوئیں کہ اگر پہاڑوں پر پڑتیں تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ اگر دنوں پر پڑتیں تو غم سے کالی راتوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتے

مومنین! یہ دن ہمارے لئے رونے پیٹنے اور سوز سینہ کوٹنے کے ہیں۔ ہمارا مظلوم امام آج سے ہمارا مہمان ہے۔ آہ! یہ مہمان کیسا بیکس و مظلوم ہے کہ اس پر رونے والے جی بھر کر رو بھی نہ سکے جب ہی تو ہمارے مظلوم امام نے فرمایا ہے۔ انا قتیل العبرۃ یعنی وہ مقتول ہوں جس پر لوگ ہمیشہ رویا کریں گے۔ مومنین امام حسین علیہ السلام کی مصیبت کے تصور نے کس کس کو نہ رلایا حضرت رسولخدا روئے۔ حضرت علی مرتضیٰ روئے۔ حضرت فاطمہ زہرا روئیں۔ حضرت امام حسن روئے اور امام زین العابدین علیہ السلام تو چالیس برس تک دن رات اس غم میں روتے ہی رہے۔ ان کے علاوہ ہمارے تمام امام اس دردناک واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ روتے رہے۔ انہی کی تاسی میں ہم ہر سال اپنے مظلوم امام کی مجلس غم برپا کرتے ہیں اور اپنی گریہ و بکا سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔

ہم کیونکر اس غم میں ضبط کر سکتے ہیں جبکہ خدا نے ہم کو پیدا ہی اس کام کے لئے کیا ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام شکم مادر میں تھے تو ایک دن جبرئیل امین حضرت رسولخدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا اے خدا کے رسول تمہاری بیٹی کے یہاں عنقریب ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ وہ آپ کی امت کے ہاتھوں انتہائی ظلم و ستم سے شہید کر ڈالا جائے گا۔ اس کے بعد تمام واقعہ کربلا آنحضرت سے بیان کیا۔ حضرت آبدیدہ ہوئے اور اپنی پارہ جگر جناب سیدہ کے پاس تشریف لائے اور کل حال ان سے بیان کیا۔ حضرات! ماں کو اولاد سے جو محبت ہوتی ہے اس کو کون نہیں جانتا۔ جناب سیدہ اس واقعہ کو سنتے ہی بے چین ہو گئیں اور رو رو کر کہنے لگیں بابا! میں اپنے اس مظلوم فرزند پر جو راہ خدا میں شہید ہوگا خوب دل کھول کر ماتم کروں گی۔ حضرت نے فرمایا اے نور دیدہ! یہ وہ زمانہ ہوگا جب دنیا میں نہ میں زندہ رہوں گا نہ تم نہ علی۔ یہ سنکر حضرت سیدہ کا غم سے عجیب حال ہوا عرض کرنے لگیں بابا! پھر میرے اس مظلوم فرزند پر کون روئے گا۔ فرمایا اے بیٹی اس کا غم نہ کرو۔ خدا ایک ایسی قوم کو پیدا کرے گا جو شب و روز تیرے فرزند کا ماتم کرے گی ان کے مرد ہمارے مردوں پر نوحہ کریں گے اور ان کی عورتیں ہماری عورتوں کو یاد کر کے سینہ زنی کریں گی۔ اور ان کے بچے ہمارے بچوں پر ماتم کریں گے جناب سیدہ کو یہ سنکر تسلی ہوئی اور فرمایا اگر وہ قوم میرے فرزند سے اتنی محبت رکھتی ہوگی تو میں بھی اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوں گی جب تک اس قوم کے ہر چھوٹے بڑے کے گناہ خدا سے بخشوا کر داخل جنت نہ کرا دوں گی۔

مومنین! جناب سیدہ کو امام حسین پر رونے کے متعلق اس قدر اہتمام کیوں مد نظر ہوا۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ عرب میں دستور تھا کہ جس مردہ پر نوحہ نہ ہوتا تھا اس کو نحوس سمجھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب جنگ احد کے بعد انصار کی عورتیں اپنے اپنے شہیدوں پر روئیں اور ان کی آواز گریہ حضرت کے کان میں آئی تو آپ نے حسرت سے فرمایا اما عمی حمزۃ فلا بواکی لہ یعنی افسوس میرے چچا حمزہ پر کوئی رونے والا نہیں۔ چنانچہ یہ سنتے ہی انصار نے اپنی عورتوں سے جا کر کہا کہ پہلے حضرت کے یہاں جا کر حضرت حمزہ پر نوحہ کرو پھر اپنے مردوں کو آ کر رونا۔ پس انصار کی عورتیں آئیں اور گریہ کیا۔ جب ان کی آوازیں بلند ہوئیں تو حضرت نے فرمایا خدا ان آوازوں پر اپنی رحمت نازل کرے۔

دوسرے حضرت سیدہ کا مقصود یہ ہوگا کہ اگر نوحہ ہوتا رہا تو ہر زمانہ کے لوگوں کو میرے فرزند کے مظلوم ہونے کا پتہ چلتا رہے گا۔ اور ظالموں سے نفرت رہے گی۔ تیسرے رونے والوں سے فطرتاً لوگوں کو ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے حالات کے چرچے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے پوشیدہ واقعات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

پس جس قوم کی طرف حضرت رسولخدا نے اشارہ فرمایا وہ ہم ہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ غم حسین میں آنسو بہائیں کہ روح جناب سیدہ شاد ہو جائے

مومنو! آج ماہِ محرم کی پہلی تاریخ ہے۔ جناب سیدہ کی روح ہمارے عزاخانوں میں آچکی ہے ہم کو چاہیئے کہ اپنی بی بی زہرا کے ساتھ نوحہ و ماتم میں شریک ہوں۔ ہم کو چاہیئے کہ اس مظلوم پر جی کھول کر روئیں جس پر رونے والا بعد شہادت کوئی نہ تھا۔ حضرات! میں نے یہ کیا کہا کہ رونے والا کوئی نہ تھا رونے والے تو بہت سے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان بیکسوں اور آوارہ وطنوں کو رونے نہ دیتا تھا اگر کسی بی بی کی آنکھ سے آنسو نکلتا تھا تو اشقیا تازیانوں سے بیداد شروع کر دیتے تھے۔

آیئے آج اپنے مظلوم امام کے حالات سنا کر ذاکر خود بھی روئے اور آپ کو بھی رلائے۔ آہ! میری چھاتی اس غم سے بھری آتی ہے۔ کلیجہ خنجرِ الم سے کٹا جاتا ہے۔ آج کا دن معمولی دن نہیں۔ آج سے اس مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کا دسواں دن عاشورا کہلاتا ہے۔ عاشورا کا نام زبان پر آتے ہی میرا دل ہل گیا کربلا کے روح فرسا واقعات نظر کے سامنے آگئے۔

منقول ہے کہ ایک بار جناب موسیٰ نے مناجات کی بارالہا! تو نے امتِ محمد مصطفےٰ کو تمام امتوں پر کس وجہ سے فضیلت دی ہے؟ جواب ملا دس خصلتوں کی وجہ سے۔ جناب موسیٰ نے عرض کی وہ کیا ہیں مجھے بھی آگاہ کر تاکہ میں بھی بنی اسرائیل کو ان کے بجا لانے کا حکم دوں۔ فرمایا وہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ جہاد۔ جمعہ و جماعت۔ قرآن۔ علم اور عاشورہ ہے۔ جناب موسیٰ نے عرض کی پروردگارا! یہ عاشورہ کیا چیز ہے۔ فرمایا وہ مصیبت حسین بن علی پر رونا رلانا اور عزاداری و ماتم کرنا ہے اے موسیٰ جو بندہ ایسا کرے گا میں ضرور اسے جنت دوں گا۔ اے موسیٰ جو کوئی محبتِ فرزندِ رسول میں کسی کو کھانا کھلائے گا۔ یا اپنے مال میں سے کچھ دے گا تو میں اس کے مال میں برکت دوں گا۔ اور اس کے گناہ معاف کر دوں گا۔ جس مومن کی آنکھ سے ایک قطرہ آنسو کا جاری ہوگا میں اس کو شہید کا ثواب عطا کروں گا۔

حضرت موسیٰ نے عرض کی خداوندا اس رسول کا فرزند کیسا بیکس و مظلوم ہوگا کہ اس کا ذکر سن کر میرا دل ہل گیا۔ وہ کون بدبخت ہوں گے جو ایسے برگزیدۂ خدا کو قتل کریں گے۔ فرمایا وہ اس رسول کی امت ہوگی۔ یہ سن کر جناب موسیٰ نے قاتلانِ حسین پر لعنت کی۔

اللہ اکبر! مومنین جس حسین کا یہ مرتبہ تھا بنی امیہ نے اسی کو آوارہ وطن کر کے طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کیا۔ اور تین دن کا بھوکا پیاسا میدانِ کربلا میں گوسفند قربانی کی طرح اس کو اور اس کے تمام رفقا کو شہید کر ڈالا۔

کتاب بحار الانوار میں ہے کہ جب معاویہ کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹے یزید سے کہا کہ میں نے بڑے بڑے سرکشوں کو زیر کر کے تیری فرماں برداری پر آمادہ کر دیا ہے۔ لیکن اب بھی مجھے تین شخصوں کی طرف سے مخالفت کا کھٹکا ہے۔ ایک عبداللہ بن عمر۔ دوسرے عبداللہ بن زبیر اور تیسرے حسین بن علی۔ ان میں سے عبداللہ بن عمر کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہنا اور اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا کہ اس کے موافق ہونے کی امید ہے۔ رہا عبداللہ بن زبیر اگر موقع پانا تو اس کو قتل کر ڈالنا یہ شیر کی طرح تیری گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ البتہ حسین بن علی کا معاملہ بہت نازک ہے وہ ہرگز تیری بیعت نہ کریں گے کیونکہ وہ بہت بڑے غیور ہیں حتی المقدور ان کی مخالفت پر آمادہ نہ ہونا لیکن جب کسی طرح کام ہی نہ چلے تو پھر آخری علاج تلوار ہے۔

جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کتاب ارشاد میں تحریر فرماتے ہیں کہ ۶۰ھ میں جب معاویہ مر گیا تو یزید نے ولید حاکم مدینہ کو خط لکھا کہ جس طرح ہو حسینؑ سے میری بیعت لے لے۔ اگر انکار کریں تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے۔ جب یہ خط ولید کے پاس پہنچا تو اس نے وقتِ شب حضرت امام حسینؑ کو بلا بھیجا۔ حضرت اس کا مطلب سمجھ گئے۔ آپ نے اپنے عزیزوں کو حکم دیا کہ ہتیار باندھ لو مجھے اس وقت ولید نے بلایا ہے۔ میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں

تم سب میرے ساتھ رہنا جب میں اندر داخل ہوں تو تم سب دروازے پر ٹھہرے رہنا لیکن جس وقت میری آواز بلند ہو تو بے تامل اندر چلے آنا تاکہ وہ اپنا ارادہ میرے ساتھ پورا نہ کر سکے۔ حضرت کا یہ حکم سنتے ہی تمام جوانانِ بنی ہاشم ہتھیاروں سے آراستہ ہو گئے اور حضرت کے ساتھ روانہ ہوئے

جب حضرت ولید کے پاس پہنچے تو اس نے پہلے تو معاویہ کے مرنے کا حال بیان کیا۔ پھر یزید کا خط سنا کر اس کی بیعت کے لئے کہا۔ حضرت نے فرمایا یہ وقتِ شب ہے صبح کو دیکھا جائے گا۔ ولید نے کہا کیا مضائقہ ہے اب آپ تشریف لے جائیں۔ اور صبح آکر سب کے سامنے بیعت یزید کا اعلان کر دیں اس وقت دربار میں مروان بے ایمان بھی موجود تھا۔ ولید سے کہنے لگا کیا غضب کرتا ہے حسین کو بغیر بیعت کئے نہ جانے دے اگر یہ اس وقت چلے گئے تو پھر تیرے ہاتھ نہ آئیں گے یا تو اسی وقت ان سے بیعت کا اقرار لے ورنہ ان کا سر کاٹ کر یزید کے پاس بھیجدے۔

اس کی بے ادبانہ تقریر سنکر امام علیہ السلام کو غصّہ آگیا! او کافر تیری کیا مجال جو ایسا کہے اسنے تلوار میان سے نکال لی اور ولید سے کہنے لگا کیا سوچ رہا ہے۔ جلاد کو حکم دے کہ ابھی ان کا سر تن سے جدا کر دے۔ ان کا خون میری گردن پر ہے۔ حضرات! جب اس شور و غل کی آواز بلند ہوئی تو انیس جوانانِ بنی ہاشم برہنہ تلواریں لئے ولید کے محل میں گھس آئے سب سے آگے حضرت عباس اور حضرت علی اکبر تھے۔ دونوں نے بڑھکر چاہا کہ مروان کو اس گستاخی کا مزہ چکھائیں کہ حضرت امام حسین نے فرمایا ٹھہر جاؤ۔ ہم اہلبیت کا شیوہ نہیں کہ کسی جنگ کی ابتدا اپنی جانب سے کریں۔ یہ فرما کر آپ تمام بنی ہاشم کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے

راوی کہتا ہے جب سے حضرت ولید کے پاس گئے تھے۔ جناب زینب و اُمّ کلثوم اور دیگر زنانِ بنی ہاشم گھبرائی پھر رہی تھیں کبھی ڈیوڑھی پر جاتی تھیں اور کبھی صحنِ خانہ میں آتی تھیں اور رو رو کر کہتی تھیں ارے کوئی جاکر خبر لاؤ کہ فرزندِ رسول کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں کچھ دیر بعد جب حضرت ولید کے یہاں سے تشریف لائے تو تمام بی بیوں کو پریشان پسِ در کھڑا پایا حضرت کو دیکھتے ہی جناب زینب گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگیں اور پوچھنے لگیں بھیا! جلدی بتائیے کہ آپ کے اور ولید کے کیا گفتگو ہوئی۔ حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا اے بہن اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ مدینہ حسین سے چھوٹ جائے روضۂ رسول اور قبرِ بتول سے جدائی ہو۔ آہ بنی امیہ درپے آزار ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم چین سے مدینۂ رسول میں زندگی بسر کریں یزید نے ولید کے پاس حکم بھیجا ہے کہ جس طرح بنے حسین سے بیعت لے اور اگر انکار کریں تو ان کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجدے۔ بخدا مجھے قتل ہونا گوارا ہے۔ لیکن یزید جیسے بدکار کی بیعت منظور نہیں۔

مومنین! حضرت کی یہ تقریر سنتے ہی اہلِ حرم میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ ہر ایک بی بی زار زار رو رہی تھی چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کو روتا دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگے۔ آہ آہ مجھے اس وقت ایک اور خیال آ گیا۔ اس وقت غم سے اہلِ حرم کا کیا حال ہوا ہوگا جب امام مظلوم روزِ عاشور زخموں سے چور چور ہو کر رخصتِ آخر کے لئے در خیمہ پر تشریف لائے ہوں گے۔ اور فرمایا ہوگا۔ سلام ہو میرا تم پر اے زینب و اے اُمّ کلثوم و اے سکینہ و اے رباب یہاں تک کہ آپ نے فرمایا سلام آخری ہو میرا تم پر اے فضہ اے میری ماں فاطمہ زہرا کی کنیز خاص۔ میں اب تم سب سے رخصت ہوتا ہوں اور تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

آہ آہ ابھی حضرت کو اہلِ حرم پوری طرح رخصت بھی نہ کرپائے تھے کہ دشمنوں کی طرف سے خیموں پر تیر آنے لگے یہاں تک کہ کئی تیر قناتوں سے پار ہو گئے پھر وہ ملاعین با آوازِ بلند کہنے لگے اے حسین! جلد خیمہ سے نکل کر میدان میں آؤ۔ یا تو یزید کی بیعت کرو ورنہ اپنے قتل پر تیار ہو جاؤ۔ یہ طعن آمیز باتیں سنکر حضرت کا غم سے عجب حال ہوا۔ مجبوراً سب کو تعلیم صبر فرما کر خیمہ سے باہر تشریف لائے اور گھوڑے پر سوار ہو کر مقتل کی طرف روانہ ہوئے۔

لکھا ہے حضرت بنگاہِ یاس کبھی داہنی طرف دیکھتے تھے۔ اور کبھی بائیں طرف۔ لیکن کوئی یار و مددگار آپ کو نظر نہ آتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے عزیزوں اور دوستوں کے لاشے خاک و خون میں بھرے پڑے تھے۔ حضرت نے اپنے زخمی دل سے ایک آہ کھینچی اور تلوار نیام سے نکال کر جنگ کا ارادہ کیا۔

آہ! حضرت کی یہ جنگ اس حالت میں تھی کہ جسمِ مبارک سے جابجا خون بہہ رہا تھا اور شدتِ تشنگی میں ہوا کر زبانِ مبارک ہونٹوں پر پھیرتے تھے اور اس گروہِ ستم شعار سے بطور اتمامِ حجت فرماتے تھے۔ اے قوم! میں تمہارے نبی کا نواسہ ہوں کیا تم میں کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ تھوڑے سے پانی سے میری پیاس بجھا دے۔ یہ نہرِ فرات سامنے موجیں مار رہی ہے۔ اگر اس میں سے دو چلو پانی مجھے پلا دو گے تو اس میں کمی نہ آجائے گی تم کیسے بے رحم اور سنگدل ہو کہ اس نہر سے سگ و خوک تک سیراب ہو رہے ہیں۔ آدمی اور جانور سب اپنی اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ لیکن افسوس اولادِ رسول ایک ایک قطرہ پانی کو ترس رہی ہے۔ اے ظالمو! روزِ قیامت میرے نانا حضرت رسولِ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ بعض کتابوں میں ہے کہ عمر سعد کے لشکر کا ایک سپاہی حضرت کی یہ تقریر سنکر بے چین ہو گیا۔ اس نے پانی کا ایک مشکیزہ بھرا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا اے فرزندِ رسول میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں یہ پانی حاضر ہے۔ حضرت اس پانی کو دیکھ کر شدت سے روئے اور فرمایا اے شخص میں کیونکر پانی پیوں۔ درآنحالیکہ میرے تمام عزیز و انصار پیاسے قتل ہو گئے یہاں تک کہ میرا چھ مہینہ کا شیرخوار تک اس پانی کو تڑپتا بلکتا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اے شخص میں کیونکر یہ پانی پی سکتا ہوں درآنحالیکہ خیموں میں بہت سی عورتیں اور بچے یہاں تک کہ میرا بیمار فرزند تک پیاسا ہے۔ پھر آپ نے اس شخص سے فرمایا ہم پانی کے محتاج نہیں جہاں ٹھوکر ماردیں وہیں پانی نکل آئے۔ اس وقت میرا پانی مانگنا ان ظالموں پر حجت تمام کرنا تھا۔ اے شیخ! اب تو لشکرِ پسرِ سعد سے جلد نکل جا تاکہ میری آوازِ استغاثہ نہ سن سکے کیونکہ اس کو سنکر جو کوئی میری مدد نہ کرے گا۔ خداوندِ عالم اس کو اوندھے منہ جہنم میں دھکیل دے گا۔ اسکے بعد حضرت نے نہایت ہی دردناک لہجہ میں استغاثہ فرمایا جس کو سنکر فرشتے بے چین ہو گئے۔ لاشہائے شہدا کانپ گئے۔ آہ! آہ! کیسے سنگدل وہ لوگ تھے کہ بجائے مظلوم پر رحم کھانے کے چاروں طرف سے تیروں کا مینہ برسانے لگے۔ یہاں تک کہ جسمِ مبارک چھلنی ہو گیا اور آپ تیورا کر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے اور زمینِ کربلا میں زلزلہ آگیا۔

اَلَا لعنۃُ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذینَ ظلموا ایَّ منقلب ینقلبون ۝

دوسری مجلس

تفسیر آیۂ الذین اُخرجوا من دیارھم۔ اور امام حسینؑ کا مدینہ سے مکہ معظمہ کی طرف روانگی کا قصد

قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی کتابہ المجید و فرقانہ الحمید الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ۔

خداوند عالم قرآن مجید و فرقان حمید میں ارشاد فرماتا ہے وہ لوگ بے قصور اپنے گھروں سے نکالے گئے اس کے سوا ان کا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر خدا بعض قوموں کے ذریعہ سے بعض کو دفع نہ کرتا تو عیسائیوں کے گرجا یہودیوں اور مجوسیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں مسمار ہو کر رہ جاتیں جن میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔

مومنین۔ آیت کربلا والوں پر پوری طرح صادق آتی ہے کیونکہ بنی امیہ نے انہی کو بے تصور آوارہ وطن کیا تھا اور یہی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے کہ اگر اللہ ان کے ذریعہ سے یزید کی قوت کو نہ توڑتا تو پھر اس کی سلطنت میں کوئی عبادت خانہ باقی نہ رہتا کیونکہ وہ بدکار خدا پرستی کے سخت خلاف تھا وہ بظاہر اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ لیکن حقیقتاً اسلام سے اس کا دور کا بھی لگاؤ نہ تھا اگر وہ مسلمان ہوتا تو اولادِ رسول کو اس بیدردی سے قتل نہ کراتا۔ مسجدِ رسول میں گھوڑے نہ بندھواتا۔ خانہ کعبہ کی بے حرمتی نہ کرتا۔

آہ آہ مومنین بنی امیہ نے ہمارے مظلوم امام کو سخت گرمی کے موسم میں آوارہ وطن کیا جبکہ پرندے بھی اپنے اپنے آشیانوں سے باہر نکلنا پسند نہ کرتے تھے۔ آہ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو بنی امیہ نے ہمارے مظلوم امام کے لئے اٹھا رکھا ہو۔ جب ہم ان مصیبتوں کا تصور کرتے ہیں تو دل سینوں میں الٹ جاتے ہیں۔ حضرات ہمارا کیا ذکر ہمارے تمام ائمہ امام مظلوم کے مصائب کو یاد کر کے ہمیشہ روتے رہے۔ ابو عمارہ سے منقول ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے جناب امام حسین علیہ السلام کا ذکر ہوا ہو اور تمام دن اور تمام رات کسی نے آپ کو ہنستے دیکھا ہو۔ حضرت فرمایا کرتے تھے۔ میرے جد مظلوم امام حسین کا نام جب بندۂ مومن کے سامنے لیا جائے گا۔ وہ ضرور ان کے مصائب پر آبدیدہ ہو گا۔

جارود بن منذر سے منقول ہے کہ ایک روز میں خدمتِ امام جعفر صادق علیہ السلام میں حاضر ہوا محرم کا مہینہ تھا۔ حضرت کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور نہایت ہی محزون و مغموم بیٹھے تھے۔ میں نے عرض کی یا ابن رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیا ایسا خاص صدمہ قلب مبارک کو پہنچا ہے کہ آپ اس حد درجہ رنجیدہ خاطر ہیں۔ کہ اس سے پہلے میں نے آپ کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا۔ حضرت نے ایک آہ سرد کھینچکر فرمایا اے جارود! کیا تم کو معلوم نہیں کہ آج محرم کی پہلی تاریخ ہے یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہمارا پھلا پھولا باغ ظالموں کی تلواروں سے کاٹا گیا تھا۔ اے جارود! اس غم نے ہمارے کلیجے کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ہماری نیندوں کو اڑا دیا ہے۔ ہماری خوشیوں کو برطرف کر دیا ہے۔ جب محرم کا چاند نمودار ہوتا ہے تو ہمارے گھروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ یہ ایسا غم نہیں کہ ہم اسے بھول جائیں۔

جارود کہتے ہیں میں نے عرض کی یا ابن رسول اللہ میں آپ سے یہ سوال کر کے سخت نادم ہوا بے شک یہ زمانہ ہر شیعہ کے لئے رونے رلانے کا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے مجھ سے واقعاتِ کربلا بیان کرنے شروع کئے حضرت بھی زار زار رو رہے تھے اور میری آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں امام علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا اے جارود جب تک مختار نے ابنِ زیاد اور دیگر قاتلانِ حسین کے سر نہیں بھیجے ہمارے خاندان کی عورتوں نے اس وقت تک اپنے سروں میں کنگھی نہیں کی۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی اور آنکھوں میں سرمہ نہیں لگایا پانچ برس تک ہمارے گھر سے کسی نے دھواں اٹھتا نہیں دیکھا بلکہ ہماری بعض عورتوں نے تو سایہ میں بیٹھنا تک چھوڑ دیا تھا بجائے پکے ہوئے کھانے کے بھنا ہوا اناج عموماً ہمارے خاندان کی برسوں غذا رہا۔ جب ٹھنڈا پانی سامنے آتا تھا تو دھاڑیں مار مار کر روتے تھے آہ کیونکر میسر آ سکتا تھا ان لوگوں کو جن کی آنکھوں کے سامنے اٹھارہ جنازے ایک گھر سے نکلے۔ کیونکر عیش دنیا کی طرف مائل ہو سکتے تھے وہ لوگ جن کے بھرے گھر کی صفائی چند گھنٹوں میں ہو گئی۔

مورخین نے جناب رباب مادر جناب سکینہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب تک زندہ رہیں واقعاتِ کربلا کو یاد کر کے شب و روز روتی تھیں انہوں نے سایہ میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا دن کی تمام دھوپ ان کے سر پر گزرتی تھی۔ جب محلے کی کوئی عورت سایہ میں جانے کو کہتی تو رو رو کر فرماتیں۔ کیونکر سایہ میں بیٹھے وہ دکھیا جس کے شوہر کی لاش کئی دن تک بے غسل و کفن دھوپ میں پڑی رہی ہو۔ منقول ہے کہ متواتر دھوپ میں رہنے سے جناب رباب کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا تھا اور اعضاء میں اس درجہ کمزوری آ گئی تھی کہ جہاں بیٹھ جاتی تھیں وہاں سے اٹھنا دشوار ہو جاتا تھا بدن میں خشکی اتنی بڑھ گئی تھی کہ آنسو تک نکلنے بند ہو گئے تھے۔ جناب زینب اور دیگر زنانِ بنی ہاشم کا یہ حال تھا کہ جب ٹھنڈا پانی سامنے آتا یا کربلا کا نام کسی کی زبان سے نکل جاتا تو دل بے قرار ہو جاتا۔

مومنین بے شک امام حسین علیہ السلام کے مصائب ایسے ہی ہیں کہ ان کو یاد کر کے جتنا کوئی روئے کم ہے۔ ہم غلاموں کا یہ فرض ہے کہ جب مصائب امام حسین کو سنیں تو بغیر روئے مجلس سے نہ اٹھیں۔ غم حسین میں رونے والوں کا مرتبہ کیا بیان کروں۔ کیا یہ کچھ کم بات ہے کہ جب کوئی مومن مجلس عزا میں روتا ہے تو جناب سیدہ کی روح اس سے شاد ہوتی ہے اور وہ بکمال شفقت فرماتی ہیں۔ خوشا حال تیرا اے ہمارے دوست کہ تو اس مظلوم پر روتا ہے جس پر رونے والا دنیا میں نہ ماں ہے نہ باپ۔ حدیث میں ہے کہ کوئی غم حسین میں روئے، رلائے یا رونے والوں کی صورت بنائے خدا بہشت کو اس پر واجب کر دیتا ہے۔

مومنین! یہ زمانہ خاص طور سے ہمارے رونے اور سر پیٹنے کا ہے۔ آہ! اس امت جفاکار نے اولادِ رسول کے مرتبہ کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہ کیا لوگ اپنے دشمن کی اولاد سے بھی وہ سلوک نہیں کرتے جو ان بدبخت مسلمانوں نے اپنے نبی کی عترت سے کیا۔ خداوند عالم فرماتا ہے ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ لیکن افسوس ہمارے رسول کی امت نے آنحضرتؐ کے احسان کی ذرا قدر نہ کی اور آنحضرت کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کے اہلبیت کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اگر مسلمان احسان شناس ہوتے تو اولادِ رسول کے پیروں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناتے۔

جو احسان شناس قومیں ہیں وہ اپنے محسن کے احسان کی اتنی قدر کرتی ہیں کہ پشتہا پشت تک اس کی اولاد کے ساتھ برابر نیک سلوک کرتی رہتی ہیں۔ ہندوؤں کو دیکھو کیسی احسان شناس قوم ہے۔ جب راجہ رامچندر نے لنکا پر چڑھائی کی تو ہنومان نے جو ایک بندر تھا ان کی اس طرح مدد کی کہ اپنی دم میں ایک مشعل باندھ کر ساری لنکا میں آگ لگا دی۔ ہندو اس احسان کو آج تک نہیں بھولے اور بندروں کو جو اس کی اولاد سے

ہیں دیوتا سمجھ کر پوجے چلے جاتے ہیں۔ ان کو کھانا دینا پانی پلانا اپنا مذہبی فریضہ جانتے ہیں۔ اگر کوئی بندر کو مارنا چاہتا ہے تو اس سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں ذرا ان مسلمانوں کی حالت کا تصور کرو جو ہمارے نبی کی امت کہلاتے ہیں۔ رسولِ خدا کی آنکھ بند ہوتے ہی انہوں نے اولادِ رسول کی طرف سے کیسی آنکھ موڑی کہ دشمن سے بھی کوئی ایسی بے رحمی نہیں کرتا۔

حضرت علی سے خلافت چھینی جو ان کا جائز حق تھا حضرت فاطمہ سے فدک چھینا جو ان کی میراث تھا۔ امام حسن سے بہ مکر و فریب سلطنت غصب کی اور زہر دے کر ان کو شہید کیا اُن کے جنازے پر تیر برسائے۔ اس کے بعد پنجتن پاک میں صرف ایک دم حسین کا رہ گیا تھا ظالموں نے ان کو بھی چین سے نہ رہنے دیا۔

معاویہ کے مرتے ہی بیعت یزید کا زور امام حسین پر ڈالا جانے لگا اور انکار کی صورت میں قتل کی دھمکی دی جانے لگی۔ چنانچہ جب حضرت کو ان کے ارادہ کا پتہ چلا تو آپ ترکِ وطن پر آمادہ ہوئے۔ پہلے حضرت رسولِ خدا کے روضہ پر حاضر ہوئے اور رو رو کر فرمانے لگے السلام علیک یا جدی آہ نانا آج آپ کا پیارا حسین سلامِ آخری کے لئے حاضر ہوا ہے۔ نانا آپ کی امت نہیں چاہتی کہ میں یہاں رہ کر قبر مبارک کی زیارت کا شرف حاصل کرتا رہوں۔ آپ کے روضۂ انور اور والدہ گرامی کی قبر اطہر کا چھوڑنا اور اس سخت گرمی میں آوارہ وطن ہونا میرے اوپر نہایت شاق ہے۔ لیکن کیا کروں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ نانا میں وہی آپ کا حسین ہوں جس کو آپ نے زبان چوس چوس کر پالا تھا جس کے لئے روزِ عید آپ مرکب بنے تھے۔ جس کی ناز برداری کے لئے آپ جنت سے میوے منگا کر دیتے تھے۔ آہ! آج وہی آپ کا حسین ظالم بنی امیہ کے ہاتھوں طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ پہاڑوں کا سفر گرمی کا موسم چھوٹے چھوٹے بچوں اور پردہ نشین عورتوں کا ساتھ۔ ظالموں کی ایذا رسانی کا خوف وطن کے چھوٹنے کا غم۔ نانا! اب میرا دل زندگانی دنیا سے سیر ہو گیا ہے۔ کاش آپ مجھے اپنی قبر کی آغوش میں لے لیتے اور میں ان مصیبتوں سے بچ جاتا۔ یہ کہہ کر آپ فرطِ شوق میں قبر مبارک سے لپٹ گئے اور دیر تک روتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ پر نیند کا غلبہ ہوا خواب میں دیکھا کہ حضرت رسولِ خدا آپ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے فرما رہے ہیں بیٹا حسین! غم نہ کر۔ اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ تو جنت میں میرے پاس ہو۔ آہ ظالم بنی امیہ مجھے قبر میں بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بہت جلد مع عزیز و انصار سرزمین کربلا پر تین روز کا بھوکا پیاسا شہید کر دیا جائے گا۔ اے حسین صبر کر اور جو وعدہ تو نے کیا ہے اسے پورا کر تو شہید راہ خدا ہے تو میری امت کے ڈوبتے بیڑے کا ناخدا ہے۔ بیٹا حسین اب قبر میں مجھے چین کہاں۔ جہاں تو جائے گا میں بھی تیرے ساتھ ساتھ رہوں گا۔

یہ خواب دیکھکر جب حضرت بیدار ہوئے تو قبرِ رسول کو انتہائی رنج و ملال کے ساتھ رخصت کیا پھر وہاں سے اپنی ماں کی قبر پر تشریف لائے اور رو رو کر عرض کی اماں جان! آپ کا پیارا حسین رخصتِ آخر کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اماں جان آپ کی قبر کی جدائی حسین غریب پر بہت شاق ہے۔ لیکن کیا کروں دشمنانِ دین درپے آزار ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں وطن میں رہ کر آپ کی قبر مبارک کی زیارت کا شرف حاصل کرتا رہوں بڑی دیر تک قبر مبارک سے لپٹ کر روتے رہے۔ پھر وہاں سے قبر امام حسن پر تشریف لائے اور بصد رنج و ملال رو رو کر رخصت کیا۔

منقول ہے کہ جب حضرت کے اس ارادہ کی خبر کنبہ میں مشہور ہوئی تو ایک ایک کا فرطِ غم سے عجب حال ہوا۔ سب لوگ جناب محمد حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہم نے سنا ہے کہ فرزند رسول مدینہ چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں جا کر جس طرح

ہو اس ارادے سے باز رکھئے چنانچہ حضرت محمد حنفیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے بھائی جان! آپ جانتے ہیں کہ آپ سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی عزیز نہیں آپ ہمارے خاندان کے چشم و چراغ اور ہم اہلبیت کے بزرگ و سرپرست ہیں۔ آپ کی اطاعت خدا نے ہم سب پر واجب کی ہے۔ بحیثیت چھوٹا بھائی ہونیکے مجھے زیبا نہیں کہ بطور نصیحت آپ کی خدمت میں کچھ عرض کروں۔ لیکن کیا کروں فرط محبت سے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ خدا کے واسطے ترک وطن کا ارادہ ملتوی کیجئے۔ آپ کے دم سے ہم لوگوں کو بڑی ڈھارس ہے۔ آپ حضرت رسولخدا اور جناب علی مرتضیٰ کی یادگار ہیں۔ اگر آپ تشریف لے گئے تو ہم سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور زندگی وبال جان ہو جائے گی۔

حضرت نے فرمایا اے بھائی تم جو کچھ فرط محبت سے کہہ رہے ہو میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن جس بات کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے میرا اب یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بنی امیہ میرے درپے آزار ہیں اگر میں یہاں رہوں گا تو ضرور قتل کر دیا جاؤں گا میں نہیں چاہتا کہ مدینۂ رسول میں میرا خون بہا دیا جائے اور اس مقدس شہر کی عظمت خاک میں مل جائے۔ جناب محمد حنفیہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے اچھا اگر آپ سفر کرنا ضروری ہی سمجھتے ہیں۔ تو پھر میری عرض یہ ہے کہ آپ یمن تشریف لے جائیں۔ ہمارے بہت سے دوست وہاں موجود ہیں وہ ضرور آپ کو پناہ دیں گے اور اگر خدانخواستہ وہاں بھی امان کی صورت نظر نہ آئے تو جنگلوں، گھاٹیوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جایئے اور جب تک یہ فتنہ فرو نہ ہو برابر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کرتے رہئے تا اینکہ حکم خدا ہمارے اور اس قوم ستم شعار کے درمیان جاری ہو۔

حضرت نے فرمایا اے بھائی اگر میں سوراخ مور و مار میں بھی پناہ لوں گا تب بھی ظالم بنی امیہ مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔ میں اپنے نانا سے سن چکا ہوں کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا خون انتہائی بے دردی سے سرزمین کربلا پر بہایا جائے گا۔ یہ سنکر جناب محمد حنفیہ زار زار رونے لگے اور عرض کی اے بھائی! اگر یہ صورت ہے تو پھر عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جایئے۔ یہ گرمی کا موسم ہے راہ میں دور دور تک پانی کا نشان نہیں دشمن گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا ساتھ لے جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت نے فرمایا اے بھائی میں تمہاری اس فرمائش کو بھی قبول کرنے سے معذور ہوں کیونکہ مرضی الٰہی یہی ہے کہ ان سب کو اپنی راہ میں اسیر و مقید دیکھے۔

مومنین جس وقت جناب زینب کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت محمد حنفیہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ امام علیہ السلام اپنے ساتھ اہل حرم کو نہ لے جائیں تو بے چین ہو کر محمد حنفیہ کے پاس آئیں اور فرمانے لگیں۔ اے بھائی محمد خدا کے لئے ہم کو چھوڑنے کی رائے نہ دو۔ زینب اپنے ماں جائے سے جدا ہو کر ایک دن دنیا میں رہنا نہیں چاہتی۔ پنجتن پاک میں بس ایک دم حسین کا رہ گیا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ میں ان کو چھوڑ دوں۔ نانا کی یادگار ماں باپ کی نشانی بھائی کی نشانی جو کچھ کہو بس ایک حسین کا دم ہے۔ وہی ہم سب کی زندگی کا سہارا ہیں۔ ہم کسی طرح ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ زینب ہر مصیبت اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ لیکن اپنے پیارے بھائی کی جدائی پر راضی نہیں۔ یہ سنکر حضرت محمد حنفیہ خاموش ہو گئے اور دیر تک کنبہ کی جدائی کے تصور سے روتے رہے۔

منقول ہے کہ جب مدینہ کی عورتوں کو یہ پتہ چلا کہ امام حسین علیہ السلام مع اپنے تمام خاندان کے عنقریب مدینہ سے کوچ کرنے والے ہیں تو ہر گھر میں انتہائی بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور گروہ گروہ عورتیں جناب زینب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں اے دختر زہرا جس طرح ممکن ہو فرزند رسول کو اس ارادہ سے روک لیجئے۔ ہمارے کلیجے آپ لوگوں کی جدائی کے تصور سے شق ہوئے جاتے ہیں۔ ہم نے اس

غم میں کسی وقت سے کھانا نہیں کھایا۔ ہمارے ہوش و حواس گم ہیں۔ ہماری طرف سے فرزندِ رسول کی خدمت میں یہ عرض کیجئے کہ للہ ہمارے حال پر رحم کھا کر اپنے اس ارادہ سے باز رہیں۔ ہمارے سرِ دربار حضرت کی خدمت میں حاضر ہیں اور ہم آپ کی خدمت میں یہ درخواست لیکر آئے ہیں۔ بی بی فرزندِ رسول کے یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد مدینۂ رسول ویران ہو جائے گا۔ مسجدِ رسول میں خاک اڑنے لگے گی۔ محلہ بنی ہاشم کی طرف پھر کسی کا رُخ کرنے کو دل نہ چاہے گا۔

جناب زینب نے فرمایا بی بیو! تمہاری یہ ہمدردی حد درجہ قابلِ شکر یہ ہے کس کو اپنا وطن چھوڑنا پسند آتا ہے خاص کر اس گرمی کے موسم میں لیکن میرے ماں جائے حسینؑ ایسے ہی مجبور ہوئے ہیں کہ بغیر ترکِ وطن کوئی چارۂ کار ان کو نظر نہیں آتا۔ بنی امیہ خاندانِ رسول کی تباہی و بربادی پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ حسین سے بیعتِ یزید طلب کی جا رہی ہے بھلا کیونکر ممکن ہے کہ رسول کا نواسہ۔ ایک بدکار شراب خوار انسان کی اطاعت قبول کرے۔ حسین کو مرنا گوارا ہے۔ لیکن یزید کی بیعت منظور نہیں۔

یہ جواب سنکر وہ بی بیاں زار زار رونے لگیں اور عرض کرنے لگیں اچھا اگر فرزندِ رسول سفر پر مجبور ہیں تو اپنے ساتھ عورتوں کو نہ لے جائیں اس سخت موسم اور خوفناک سفر میں کسی طرح ان کا لے جانا مناسب نہیں۔ جناب زینب نے فرمایا اے بی بیو! خدا کے لئے ایسا نہ کہو ہم کو کسی طرح فرزندِ رسول کی جدائی گوارا نہیں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اپنے بھائی سے جدا ہونے کے بعد زینب زندہ رہ سکتی ہے۔

مومنین سنا آپ نے جناب زینب کی محبت کا حال۔ دنیا میں کسی بہن کو اپنے بھائی سے اتنی محبت نہ ہو گی۔ جتنی جناب زینب کو اپنے بھائی سے تھی۔ آہ! اس بھائی کی محبت میں ہماری شہزادی نے کونسی مصیبت گوارا نہ کی۔ گرمی کے مہینوں میں سفر کیا۔ سخت دھوپ اور گرم لُو کی ایذا جھیلی۔ پیاس کے صدمے اٹھائے۔ اپنی اولاد کو بھائی پر قربان کیا۔ سر سے چادر چھنوائی بازوؤں میں رسن بندھوائی نامحرموں کے ہاتھوں قید ہونا گوارا کیا۔ بے کجاوہ عماری کے اونٹوں پر سر کھلے بیٹھنا منظور کیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے تا شام سر برہنہ قید ہو کر جانا برداشت کیا۔ بازاروں میں تشہیر ہونا۔ دربارِ ابن زیاد اور دربارِ یزید میں انتہائی ذلت سے کھڑا ہونا سب کچھ دینِ الٰہی کی نصرت اور حسین کی محبت میں زینب خاتون نے منظور کیا۔ آہ۔ آہ! کیسے شقی اور بدبخت تھے وہ لوگ جن کو ذریتِ رسول پر رحم نہ آیا اور ان پر ایسے ظلم کئے کہ زمین و آسمان تک کانپ گئے

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

تیسری مجلس

تفسیر آیۂ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ ذکرِ موت۔ امام علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی مُحْکَمِ کِتَابِہٖ وَمُتْقَنِ خِطَابِہٖ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ۝

دنیا کی ہر شئے فنا ہونے والی ہے اور سوائے ذاتِ خدا کوئی باقی رہنے والا نہیں۔ حضرات! انسان کو چاہیے کہ ہر وقت اپنی موت کا خیال پیشِ نظر رکھے اور اعمالِ خیر بجالاتا رہے کیونکہ نیکیوں کے سوا اور کوئی شئے آدمی کے ساتھ جانے والی نہیں۔ انسان کو ایک دن خدا کے سامنے ضرور جانا ہے۔ پس اس کو خدا کی مرضی کے خلاف کام کرنے سے ڈرتے رہنا چاہیے تاکہ پرسشِ اعمال کے وقت اس کو خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

مومنین! دنیا کی محبت نے ہم کو ایسا بے ہوش بنادیا ہے کہ نہ اللہ کے حقوق کا خیال ہے نہ بندوں کے۔ نہ حلال کی تمیز ہے نہ حرام کی۔ اپنی ضرورتوں میں ایسے اندھے ہو رہے ہیں کہ جس طرح جو ہاتھ آگیا ہے اس کو اپنے خرچ میں لے آتے ہیں۔ ہم قطعاً اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ خدا نے ہم کو انسان بنا کر کیا کیا فرائض ہمارے ذمے قرار دیئے ہیں۔ دنیا کی حرص ہم پر ایسی غالب آگئی ہے کہ ذرا اپنے کام کا انجام نہیں سوچتے۔ ہم اپنے کو صاحبِ ایمان کہتے اور حضراتِ ائمہ کا پیرو جانتے ہیں، حالانکہ ہمارے اعمال ایمان والوں کے اعمال سے بہت دور ہیں۔ جو باپ اپنی اولاد کی پرورش کا سامان بہم نہیں پہنچاتا اور ان کی ضروریات کو محنت و مشقت سے پورا نہیں کرتا۔ جو اولاد اپنے ماں باپ کے حقوق ادا نہیں کرتی ان کی مطیع و فرمانبردار نہیں جو عورت اپنے شوہر کے حقوق نہیں پہچانتی یا جو مرد اپنی زوجہ کے حقوق ادا نہیں کرتا یا جو کوئی اپنے عزیزوں سے صلۂ رحم نہیں کرتا وہ کب اس قابل ہے کہ اس کو مومن کہا جاسکے۔

حضرات! یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس پر انسان کو مغرور نہ ہونا چاہیے اور اس کے جھگڑوں میں پھنس کر اپنی آخرت کو برباد نہ کرنا چاہیے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب آدمی کا سن چالیس برس کا ہوتا ہے تو ایک منادی آسمان سے ندا کرتا ہے اے شخص تیرے کوچ کا وقت قریب آگیا۔ اپنا زادِ راہ درست کر لے۔

مومنین! ہم کو ذرا دیر کے لئے یہ تصور کرنا چاہیئے کہ ہمارے کیسے کیسے عزیز اور دوست اور ہم سن ہماری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے اٹھ گئے۔ دنیا کی گردش نے کیسی کیسی زبردست ہستیوں کو ہمارے سامنے خاک میں ملا دیا۔ کیسے کیسے خاندانوں کے چراغ گل کردیئے جو کل تک ہمارے گھروں کی رونق اور ہماری محفلوں کی زینت تھے۔ آج وہ منوں خاک کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ جن کا نظر سے اوجھل ہونا دم بھر کے لئے گوارا نہ تھا وہ اب ایسے جدا ہوئے ہیں کہ دوبارہ ان سے ملنے کی آس نہیں۔ ان کی خوابگاہیں خالی پڑی ہیں۔ ان کی جلوہ گاہیں ویران ہیں۔ انہوں نے اس دارِ دنیا میں کس محنت و مشقت سے مال جمع کیا تھا۔ کس کوشش و جانفشانی سے زندگی کے ساز و سامان فراہم کئے تھے۔ آہ! وہ سب کا سب یہیں دھرا رہ گیا اور جانے والے خالی ہاتھ اس دنیا سے اٹھ گئے اور انتہائی حسرت سے ان سب چیزوں کو تکتے چلے گئے۔ اب وہ انتہائی بے کسی بے بسی

کے عالم میں اپنی تنگ و تاریک قبر کے اندر پڑے ہوئے خدا کے آخری حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ نہ بیچاروں کا کوئی مونس و ہمدم ہے نہ یار و مددگار۔ اب اپنے اعمال پر حسرت و ندامت ہے مگر بیکار۔ نیک عمل بجا لانے کی خواہش ہے مگر بے سود۔ اس دنیا میں جن لوگوں کو اپنا سمجھے ہوئے تھے وہ سب غیر ثابت ہوئے۔ جن چیزوں کو اپنی ملکیت تصور کیا تھا وہ سب اب قبضہ سے باہر ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ مرد مسلمان کے تین دوست ہیں ایک وہ کہ زندگی بھر اس کا ساتھ دینے والا ہے اور بعد مرنے کے فوراً اس سے جدا ہو جاتا ہے اور یہ دوست اس کا مال ہے کیونکہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا مال اس کے وارثوں کو مل جاتا ہے پس خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے وارث ان کے مال کو نیک کاموں میں صرف کریں۔ ایسی ہی اولاد کو باقیات الصالحات کہتے ہیں۔ دوسرا دوست اس کی اولاد ہے جو قبر تک اس کا ساتھ دینے والی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ بندۂ مومن جو صاحب اولاد ہو کر مرے اور اس کے بیٹے اس قابل ہوں کہ اپنے باپ کے جنازہ کو قبر تک پہنچا دیں۔ تیسرا دوست وہ ہے کہ مرنے کے بعد سے قیامت تک اس کے ساتھ رہنے والا ہے اور وہ اس کے اعمالِ خیر ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جو اس دنیا میں برابر نیک کام کرتا رہے۔

نیک عمل کے لئے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ ہو۔ ریاکاری اور دکھاوے کے لئے جو عمل کیا جاتا ہے وہ خدا کی سرکار میں مقبول نہیں ہوتا۔ ایسے عمل کے کرنے سے نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ حضرات یہ نہ سمجھنا کہ ہمارے اعمال کا کوئی دیکھنے والا نہیں۔ ہمارے حال سے کوئی آگاہ نہیں۔ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔ اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہٗ والمومنون۔ تم جو چاہو کرو اللہ اور اس کا رسول اور کچھ ایمان والے دیکھنے والے ہیں۔ یعنی ایک دو نہیں بلکہ تین تین آنکھیں دیکھنے والی ہیں۔ پس ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے عمل کی کھوٹ چھپ سکے ایک جگہ قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ بہت سخت سے سخت عمل کرنے والے ایسے بھی ہیں کہ وہ بجائے نیک جزا پانے کے الٹے جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان کے تمام اعمال بیکار قرار دیئے جائیں گے اور روزِ قیامت میزانِ حساب میں ان کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ پس ان آیتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر بندۂ مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل میں ریا و نمائش کو دخل نہ دے اور ہر نیک عمل خلوص و سچائی کے ساتھ انجام دے۔ تاکہ خدا و رسول و ائمہ اس کے عمل سے خوش ہوں۔

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہم میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں کہ نیک کام نمائشی طور پر کرتے ہیں یا محض کسی رسم کو پورا کرنے کے لئے۔ مراسم عزا کے متعلق یہ بات خصوصیت سے دیکھی جاتی ہے۔ اکثر لوگ مجلس و ماتم میں اس خیال سے شرکت کرتے ہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ نہ اس غرض سے کہ امام حسین علیہ السلام کا حق ان پر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک امام علیہ السلام کی شخصیت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے آنحضرت کی ذات سے سچی محبت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک سچی محبت نہ ہوگی۔ مراسم عزا کی بجا آوری میں خلوص پیدا نہ ہوگا اور جب تک خلوص نہ ہوگا ان اعمالِ خیر کی نہ ملے گی۔ جاننا چاہیئے کہ امام حسین علیہ السّلام کے ساتھ سچی محبت یہی ہے کہ ہم افعال و اقوال میں ان کی تاسی کریں ورنہ صرف رونا مفید نجات نہیں اور نہ اس صورت میں ان سے شفاعت کی امید ہو سکتی ہے۔

مومنین! امام مظلوم نے اسلام پر بڑا احسان کیا ہے اگر حضرت اپنی اور اپنے اعزہ و انصار کی گرانقدر قربانیاں پیش نہ کرتے تو دنیا بہت جلد دیکھ لیتی کہ دین اسلام مسخ ہو کر ایک ایسا دین بن جاتا کہ دنیا کے تمام ادیان اس پر ہنستے اور قہقہہ لگاتے۔ امام مظلوم کے دل میں دینِ خدا کا سچا درد تھا

ان کے نانا حضرت رسولخدا نے اسی دین کی خاطر ۲۳ سال طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ چنانچہ جب حضرت نے دیکھا کہ یزید بدکار کی حکومت میں دینِ الٰہی برباد ہو رہا ہے۔ حلالِ محمدی کو حرام اور حرامِ محمدی کو حلال کیا جا رہا ہے۔ تو آپ سے ضبط نہ ہو سکا اور حمایتِ دین کے لئے کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے اور دنیا کی تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کو آمادہ کر لیا۔ آپ جانتے تھے کہ جب تک پوری طاقت کے ساتھ یزید کا مقابلہ نہ کیا جائیگا اسلام کے سر سے یہ بلا ٹل نہیں سکتی۔

منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے روانگی کا قصد کیا تو بنی ہاشم میں ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ ہر دل اس واردے بےچین نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ جب حضرت رخصتِ آخر کے لئے جناب اُمِّ سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو انہوں نے بے اختیار آپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور رو رو کر فرمانے لگیں اے فرزند سنتی ہوں کہ تمہارا ارادہ عراق کی طرف جانے کا ہے۔ بیٹا! جب سے یہ خبر سنی ہے میرا غم سے عجب حال ہے۔ میں تمہارے نانا حضرت رسولخدا سے سُن چکی ہوں کہ میرا فرزند حسین سرزمین عراق پر قتل کیا جائے گا۔ آنحضرت نے ایک دن مجھے تھوڑی خاک بھی دی تھی۔ اور فرمایا تھا اے اُمِّ سلمہ یہ مقتل حسین کی خاک ہے اس کو بحفاظت تمام اپنے پاس رکھو جس روز یہ خاک سُرخ ہو جائے تو سمجھ لینا کہ میرا پارہ جگر حسین شہید ہو گیا۔ بیٹا! میں نے اس خاک کو بحفاظت ایک شیشہ میں رکھ چھوڑا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آنحضرت کی پیشنگوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ اے حسین! اے میرے لختِ جگر اس غم میں میرا بُرا حال ہے۔ میرا دل تمہاری مفارقت گوارا نہیں کرتا۔

حضرت نے فرمایا اے نانی جان جو خدا کی مشیت ہے وہ ہو کر رہے گی۔ میں اس سفر میں ضرور شہید ہوں گا۔ اور میرے اہلبیت اسیر ہو کر دربدر پھریں گے۔ میرا گھر لوٹا جائے گا۔ میں اور میرے تمام عزیز و انصار گوسفندان قربانی کی طرح تین دن کے بھوکے پیاسے نہر فرات کے کنارے ذبح کر دیئے جائیں گے اے نانی جان! آیئے میں آپ کو اپنی قتل گاہ کا منظر دکھاؤں۔ یہ فرما کر حضرت نے اپنی دو انگلیوں کے درمیان نظر کرنے کو کہا آہ آہ! اب جو جناب اُمِّ سلمہ نے دیکھا تو وہ قیامت کا منظر نظر آیا کہ تابِ ضبط نہ رہی چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ دیکھا کہ جا بجا کچھ بوڑھے کچھ جوان کچھ کم سن بچے سر کٹے خون میں نہائے پڑے ہیں۔ ان کے لاشے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس طرح کچلے گئے ہیں کہ کوئی عضو اصلی حالت پر باقی نہیں رہا۔ ریتی پر جو خیمے نصب ہیں ان میں آگ لگی ہوئی ہے۔ کچھ بی بیاں سر برہنہ انتہائی بدحواسی کے عالم میں ہر طرف کو بھاگ رہی ہیں اور ان بیکسوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

الغرض جب جناب اُمِّ سلمہ کا دل کچھ قابو میں آیا تو حضرت امام حسین نے وہ تمام امانتیں اور تبرکات جو حضرت رسولخدا نے جناب امیر علیہ السلام کے سپرد فرمائے تھے اور ان جناب سے حضرت تک پہنچے تھے سب جناب اُمِّ سلمہ کے سپرد کر کے فرمایا میری شہادت کے بعد جب میرے اہلبیت پھر مدینہ آئیں تو یہ سب چیزیں میرے فرزند زین العابدین کے سپرد کر دینا کیونکہ میرے بعد وہی میرے وصی و جانشین ہیں۔

منقول ہے کہ اس زمانہ میں امام علیہ السلام کی ایک صاحبزادی جن کا نام فاطمہ صغرا تھا تپ شدید میں مبتلا تھیں اور اس درجہ کمزور و ناتواں ہو گئی تھیں کہ کسی طرح حضرت کے ساتھ سفر کرنے کے قابل نہ تھیں۔ حضرت اپنے جانے کی خبر کئی روز تک اس لئے چھپاتے رہے کہ بیمار اس صدمہ سے ہلاک نہ ہو جائے۔ لیکن جب گھر میں سفر کا سامان بندھنے لگا اور کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں تو فاطمہ صغرا کو یہ لاحق ہوئی اور ایک ایک بی بی سے پوچھنا شروع کیا کہ بابا جان کہاں جانے کا قصد فرما رہے ہیں۔ جناب رباب سے ضبط نہ ہو سکا۔ فرمایا

تمہارے باپ کو عراق کا سفر درپیش ہے۔ بیٹی چونکہ تم مریض و ناتواں ہو اور سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔ اس لئے فرزند رسول تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ سننا تھا کہ جناب فاطمہ صغرا بے چین ہو کر رونے لگیں اور جناب رباب سے عرض کرنے لگیں۔ اماں جان! جب ماما جان کو جلد بلوایئے میں اپنا حالِ زار خود ان سے بیان کروں گی۔ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ سارا کنبہ تو حضرت کے ساتھ چلا جائے اور میں بیمار اکیلی اس سنسان گھر میں پڑی رہوں۔ اس صورت میں تو میں نہ مرتی ہوں گی تو مر جاؤں گی۔

لکھا ہے کہ جب امام حسین علیہ السّلام فاطمہ صغرا کے پاس تشریف لائے تو بیمار نے دردناک لہجہ میں کہا۔ بابا جان سنتی ہوں کہ آپ مادۂ سفر ہیں۔ فرمایا اے نورِ دیدہ! کیا کروں ظالم بنی امیہ مجھے مدینۂ رسول میں نہیں رہنے دیتے۔ بیمار نے عرض کی بابا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ حضرت یہ سنکر آبدیدہ ہوئے اور بیٹی کو چھاتی سے لگا کر فرمایا۔ صغرا میں تم کو ضرور ساتھ لے چلتا لیکن کیونکر لے چلوں تم بیماری سے اس درجہ نحیف و ناتواں ہو کہ سفر کی تکالیف برداشت نہیں کر سکتیں۔ یہ سخت گرمی کا موسم ہے لو چل رہی ہے۔ پہاڑوں اور ریگستانوں کا سفر ہے ایسے سخت سفر میں تندرست لوگ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ بیماروں کا تو ذکر ہی کیا۔ میں تم کو اپنی نانی جناب ام سلمہ کے سپرد کئے جاتا ہوں جس وقت منزلِ مقصود پر پہنچکر اطمینان کی صورت نظر آئے گی۔ فوراً علی اکبر کو بھیجکر تمہیں بلوا لوں گا۔

بیمار نے رو رو کر عرض کی بابا! ایک تو میں یوں ہی مرض سے جاں بلب ہوں۔ اگر آپ مجھے ساتھ نہ لیں گے تو کنبہ کی جدائی میں چند ہی روز بعد میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ بابا! جب یہ بھرا گھر مجھے سونا نظر آئے گا۔ تو میری دحشت اور بے چینی اور زیادہ ہوگی۔ آپ میری طرف سے مطمئن رہیں۔ میں سفر میں کسی قسم کی شکایت آپ سے نہ کروں گی۔ اگر خدا نے چاہا تو تبدیلی آب و ہوا سے جلد مجھے صحت ہو جائے گی۔

حضرت نے فرمایا اے نورِ دیدہ ہمارا سفر معمولی سفر نہیں انتہائی تکلیفوں اور پریشانیوں کا سفر ہے کسی طرح اس حالت میں تمہیں لیجانا مناسب نہیں جانتا۔ یہاں نانی ام سلمہ تمہاری ہر طرح تیمارداری کریں گی۔ تم محلہ کی لڑکیوں سے اپنا دل بہلانا۔ میں ہر منزل کی اطلاع تم کو دیتا رہوں گا۔

آہ مومنین۔ جب جناب فاطمہ صغرا بالکل مایوس ہو گئیں تو اپنی ماں بہنوں اور پھپھیوں سے مل مل کر خوب روئیں۔ ہر ایک سے کہتی تھیں خدا کے لئے بابا سے میری سفارش کرو۔ آہ! میں تم لوگوں کی جدائی میں کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں۔ فاطمہ صغرا کی گریہ و زاری اور نالہ و بیقراری سے اہلحرم میں ایک کہرام بپا تھا۔ سب بی بیاں چھاتی سے لگا لگا کر تسلی دیتی تھیں۔ لیکن فاطمہ صغرا کو کسی طرح چین نہ آتا تھا جناب امام حسین علیہ السّلام بیٹی کی مفارقت کے غم میں نہایت بے چین تھے۔ بار بار سمجھاتے اور پیار کرتے تھے۔ آخرکار جب فاطمہ صغرا کو کسی قدر سکون ہوا تو حضرت نے حکم دیا کہ سامانِ سفر اونٹوں پر بار کیا جائے۔

مومنین! اس وقت کی کیا حالت بیان کی جائے تمام زنانِ بنی ہاشم جو اہلِ حرم کو رخصت کرنے کے لئے آئی تھیں سفر کی تیاری دیکھ کر ایسی بے چین تھیں کہ ان کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ کوئی بی بی روتی تھی کوئی سینہ کوبی کرتی تھی۔ حضرت سب کو تسلی دے کر فرماتے تھے صبر کرو اور اس قدر بے تابی سے نہ روؤ۔ وہ جواب میں کہتی تھیں فرزندِ رسول ہم کیونکر نہ روئیں اور اپنی بیتابی کا اظہار نہ کریں۔ آج کا دن ہمارے لئے حضرت رسولِ خدا کی رحلت کے دن سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ جب حضرت نے رحلت فرمائی تھی تو آلِ عبا میں چار شخص موجود تھے

جن سے ہم کو بڑی تقویت تھی جب آپ کی مادر گرامی اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ تب بھی تین بزرگ باقی تھے اور ان کو دیکھ کر ہمیں تسکین ہوتی تھی۔ جب جناب امیر علیہ السلام کی شہادت ہوئی تو اس وقت آپ دونوں بھائی موجود تھے جن کے دم سے ہم کو بڑی ڈھارس تھی۔ لیکن جب امام حسن علیہ السلام شہید ہوئے تو آپ کے سوا ہمارا کوئی سرپرست اس دنیا میں باقی نہ رہا۔ واحسرتاہ! اب آپ بھی ہم سے جدا ہورہے ہیں۔ فرمائیے ہمارے دل کو کیونکر چین آئے۔ آج کا دن ہمارے نزدیک خاتمۂ آلِ عبا کا دن ہے۔ ہمارے دلوں پر آپ کی جدائی کے تصور میں چھری چل رہی ہے۔ ہم اس عظیم الشان غم کو کیونکر برداشت کرسکتے ہیں۔ فرزند رسول ہم کو اس سفر سے بوئے خیر نہیں آتی اور انجام اس کا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کے بعد ہم سب ذلیل و خوار اور بے وارث و والی ہوجائیں گے۔ ہم خدا و رسول کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس سفر کا ارادہ ملتوی کیجئے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام زنانِ بنی ہاشم کی یہ بیقراری دیکھ کر زار زار رونے لگے اور سب کو انتہائی شفقت کے ساتھ صبر کی تعلیم دیکر فرمایا مجھے نہایت ملال ہے کہ اپنے اس سفر کو تمہارے کہنے سے ملتوی نہیں کرسکتا میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتیں۔

آہ جب زنانِ بنی ہاشم مایوس ہوگئیں تو زنانِ اہلبیت سے گلے مل مل کر خوب روئیں اور ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگیں ہر ایک پر حسرت و مایوسی چھا رہی تھی۔

گھر میں تو یہ کہرام بپا تھا اب باہر کا حال سنئے۔ جناب عباس حضرت علی اکبر اور دیگر جوانانِ بنی ہاشم سواریوں کے اہتمام میں مصروف تھے سامان اونٹوں پر بار کیا جارہا تھا۔ ہودج باندھے جارہے تھے۔ ان پر پردے چھوڑے جارہے تھے۔ جب محملیں بالکل تیار ہوگئیں تو جناب عباس نے خدمت امام میں آکر عرض کی کہ سواریاں تیار ہیں۔ اگر حکم ہو تو عورتوں کو سوار کیا جائے۔ فرمایا۔ ہاں اب تاخیر غیر ضروری ہے۔ یہ حکم سنتے ہی جناب عباس نے جوانانِ بنی ہاشم سے فرمایا۔ قناطیں ہر طرف کھڑی کرو۔ چاروں طرف راستوں پر کچھ لوگ جا کھڑے ہوں تاکہ کوئی آنے جانے والا ادھر سے نہ گزرے کہ دخترانِ علی و فاطمہ سوار ہوتی ہیں۔

آہ آہ امومنین! سواری کا یہ اہتمام سنکر مجھے ایک اور وقت یاد آگیا۔ آہ جن بی بیوں کے پردہ کا کسی وقت یہ اہتمام تھا ایک دن وہی بے مقنعہ و چادر سر کھلے برہنہ پشت اونٹوں پر سوار بازار کوفہ و شام میں بندیانِ ترک و دیلم کی طرح تشہیر کی جارہی تھیں۔

شامیاں بستند بازو زینب و کلثوم را ‏ ‏ ‏ ‏ اے فلک آل ابتدا ایں انتہائے اہلبیت

آہ جب بی بیوں کے سوار ہونے کا وقت آیا تو گھر الحرم میں ایک کہرام بپا ہوا۔ ساری عورتیں جناب زینب و ام کلثوم، رباب و رقیہ، ام فروہ اور زوجہ جناب عباس وغیرہ سے گلے مل مل کر اس کرب سے روتی تھیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ خاصکر جب الحرم فاطمہ صغرا کو رخصت کرنے لگے۔ اس وقت ایک ایک بی بی کا فرطِ غم سے عجب حال تھا۔ ہر ایک دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جناب فاطمہ صغرا ہر ایک بی بی کے گلے میں باہیں ڈال کر انتہائی منت و سماجت سے کہتی تھیں خدا کے لئے اگر کوئی صورت ہوسکے تو بابا جان سے سفارش کرکے مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ اس سونے گھر میں مجھ سے ایک دن نہ رہا جائے گا میں تمہاری جدائی کے صدمہ سے بے موت مرجاؤں گی۔ ہائے یہ گھر مجھے ابھی سے کاٹے کھاتا ہے۔ سب بی بیاں دلاسہ دیتی تھیں اور بآہ و زاری رخصت ہوتی جاتی تھیں۔

یہ جدائی معمولی جدائی نہ تھی۔ سب کے دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ آہ آہ! بیمار فاطمہ صغرا کے دل پر اس وقت کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ فرطِ غم سے بار بار غش آرہے تھے۔ کبھی ماں سے رخصت ہوتی تھیں کبھی پھوپیوں سے۔ کبھی بہنوں کو چھاتی سے لگاتی تھیں کبھی اپنے شیر خوار بھائی علی اصغر کو گود میں لے کر منہ پر منہ ملتی تھیں اور دھاڑیں مار کر روتی تھیں۔ ان کی یہ بے چینی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ سب کے کلیجے شق ہو رہے تھے۔

آخر کار سب بی بیاں رخصت ہو کر گھر سے نکلیں۔ جناب فاطمہ صغرا بھی عصا کے سہارے ان کے ساتھ ساتھ کنبہ کی روانگی دیکھنے کے لئے دروازے تک پہنچیں۔ جناب عباس اور جناب علی اکبر نے ایک ایک بی بی کا بازو پکڑ کے بڑے اہتمام کے ساتھ محملوں میں سوار کرنا شروع کیا تاکید تھی کہ کوئی نامحرم قریب نہ آنے پائے۔ لوگوں نے اپنی اپنی دکانیں بند کر دی تھیں۔ راہگیروں نے راستہ چلنا چھوڑ دیا تھا۔ چاروں طرف سے قناتیں کھینچی ہوئی تھیں۔ محملوں پر پردے پڑے تھے۔ آہ ایک ان ہی بی بیاں بعد شہادت امام مظلوم اس حال سے پائی گئیں کہ دشمنانِ دین نے ان کے سروں سے چادریں تک چھین لی تھیں۔ اور ان کو ایسے اونٹوں پر سوار کیا تھا جن پر نہ محمل تھی نہ عماری۔

الغرض جب سب بی بیاں سوار ہو چکیں اور یہ قافلہ وہاں سے چلا تو لوگوں نے دیکھا کہ صغرا نہایت بے چینی کے ساتھ پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں پس اونٹوں کو روکا گیا پوچھا اے صغرا اب تم کیوں آرہی ہو۔ کہنے لگیں میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بار سب بی بیوں سے پھر رخصت ہو لوں۔ فوراً اونٹ بٹھا دیئے گئے اور سب بی بیاں اتر پڑیں اور پھر ایک ایک بی بی نے گلے مل مل کر تسلی دی۔ منقول ہے کہ جب حضرت علی اصغر سے رخصت ہونے کو آئیں تو جناب رباب سے کہنے لگیں۔ اچھا بی بیوں اب آپ شوق سے تشریف لے جائیں میں اپنا دل اس سنسان گھر میں اپنے اس ننھے منے بھیا سے بہلاوں گی یہ میرا مونسِ تنہائی ہوگا۔ اس سے میرے ہجراں رسیدہ اور فراق دیدہ دل کو تسلی ہوگی۔ یہ سنکر جناب رباب نے فرمایا بیٹی یہ چند دن کا شیر خوار بچہ بغیر ماں کے کیونکر رہ سکتا ہے۔ فاطمہ صغرا نے کہا آپ اس کی فکر نہ کریں میں ان کو زنانِ بنی ہاشم کا دودھ پلوا کر پرورش کروں گی۔ یہ سنکر سب بی بیاں فاطمہ صغرا کو سمجھانے لگیں۔ لیکن وہ کسی طرح حضرت علی اصغر کو اپنی گود سے جدا کرنے پر راضی نہ تھیں۔ آخر جب زیادہ زور دیا گیا تو کہنے لگیں اچھا بی بیو مجھ سے میرے ننھے بھیا کو بہ جبر نہ لو۔ اگر وہ کسی کی گود میں خوشی سے چلا جائے گا تو پھر میں کچھ نہ کہوں گی۔

یہ سنکر ہر ایک بی بی علی اصغر کو لینے کے لئے بڑھی لیکن علی اصغر نے کسی کی طرف رُخ نہ کیا۔ اور بدستور اپنی بیمار بہن سے پلٹے رہے آہ مومنین علی اصغر کیونکر اپنی بیمار بہن فاطمہ صغرا کو چھوڑنا گوارا کرتے جبکہ ان کو اس مریض غم سے دوبارہ ملنے کی آس نہ تھی۔ آخر جب ہر بی بی اپنی کوشش میں ناکامیاب رہی اور علی اصغر نے کسی طرح اپنی پیاری بہن کو چھوڑنا گوارا نہ کیا تو امام علیہ السّلام آنکھوں میں اشک بھرے ہوئے اپنے شیر خوار بچہ کے پاس تشریف لائے اور جھک کر کوئی ایسی بات کان میں کہی کہ علی اصغر فوراً فاطمہ صغرا کی گود چھوڑ کر جناب رباب کی گود میں آگئے۔ غالباً حضرت نے اس شیر خوار بچے کے کان میں یہی کہا ہوگا۔ بیٹا! اگر یہاں فاطمہ صغرا کے پاس رہنا چاہتے ہو حالانکہ کربلا کے شہدا کی فہرست میں تمہارا نام ہے لے فرزند اگر میرے شہادت نامہ کو مکمل کرنا چاہتے ہو تو فاطمہ صغرا کی آغوش چھوڑ دو۔

منقول ہے کہ علی اصغر سے جدا ہونے کے بعد فاطمہ صغرا کو وہ صدمہ عظیم ہوا کہ قریب تھا کہ غش کھا کر گر پڑیں۔ جناب قاسم اور جناب علی اکبر

دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت عباس نے بار دیگر الجرم کو سوار کیا۔ جب قافلہ چلا تو فاطمہ کی جدائی اور ان کی تنہائی کے تصور سے ایک ایک بی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دوسری طرف فاطمہ صغرا کا یہ حال تھا کہ کسی طرح بیقرار دل کو چین نہ آتا تھا۔ جناب ام سلمہ اور دیگر زنانِ بنی ہاشم طرح طرح سے سمجھا رہی تھیں۔ لیکن آہ بھرے کنبہ کی جدائی کا غم ایسا معمولی غم نہ تھا کہ بیمار صغرا کو صبر آ جاتا۔ جب تک قافلہ نظر کے سامنے رہا فاطمہ صغرا دونوں کے بازو پر تکیہ کئے برابر ٹکٹکی باندھے بنگاہ حسرت و یاس اسی طرف کو تکتی رہیں۔

آہ آہ! جب قافلہ نظر سے اوجھل ہو گیا تو کلیجہ ہاتھوں سے پکڑے ہوئے گھر میں واپس آئیں۔ مومنین اس وقت اس بیمار کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ جب سارا گھر سونا نظر آیا ہوگا۔ چند منٹ پہلے جو گھر کھچا کھچ زن و مرد سے بھرا ہوا تھا اب وہ ایسا ویران و سنسان ہے کہ سوائے جناب ام سلمہ اور ام البنین کے کوئی غریب کو تسلی دینے والا نہیں۔ نہ اب علی اصغر کا جھولا ہے نہ علی اکبر کی مسند۔ نہ سامنے ماں ہے نہ باپ نہ بھائی بہنیں ہیں۔ آہ سارے پرستار سارے خریدار قسمت نے آناً فاناً میں جدا کر دیئے۔ اول تو بیمار کا دل یوں ہی کمزور ہوتا ہے اس پر سارے کنبہ کی جدائی۔ یونہی صبر آتا۔ لیکن مومنین انسان پر جیسی پڑتی ہے جھیلتا ہے۔ غریب صغرا نے ایک ایک دن جس تکلیف میں گزارا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مہینوں اس امید پر زندہ رہیں کہ ایک دن پھر بچھڑے ہوئے کنبہ سے مل کر دل خوش کریں گی۔ لیکن آہ آہ زمانہ کی گردش نے اس حسرت دار ارمان بھرے دل کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ کنبہ ایک مدت کے بعد واپس تو ہوا مگر اٹھارہ جوانانِ بنی ہاشم کا سوگوار بن کر سارا گھر برباد کر کے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظَّالِمِیْن وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ٥

چوتھی مجلس

تفسیر آیۂ یوفون بالنذر، الخ امام علیہ السلام کا مکہ معظمہ پہنچنا۔ اہل کوفہ کے خطوط اور حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ہ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ہ (خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ جو نذر خدا سے کر لیتے ہیں اس کو پورا بھی کرتے ہیں اور اس روز سے ڈرتے ہیں جس کا شر بہت طولانی ہے اور وہ خدا کی محبت میں مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تم کو یہ کھانا محض قربۃً الی اللہ کھلا رہے ہیں نہ تم سے کسی بدلہ کے خواستگار ہیں نہ شکرگزاری کے)

ان آیات کی شانِ نزول میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک بار حضرت امام حسن اور امام حسین سخت بیمار ہوئے روز بروز ناتوانی بڑھنے لگی ایک روز جبریل امین حضرت رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے آپ کے پیارے نواسوں کے شفایاب ہونے کی تدبیر اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ علی و فاطمہ سے کہیں کہ وہ تین روزے نذر مانیں اور جب شفا ہو جائے تو اس نذر کو پورا کریں۔

بعد نمازِ عشا جب آنحضرت اپنی پیاری بیٹی کے یہاں تشریف لائے تو جبریل امین کی گفتگو بیان کی۔ اسی وقت حضرت علی اور جناب سیدہ نے منت مانی کہ یا اللہ! اگر ہمارے بچے اچھے ہو جائیں تو ہم تین دن روزے رکھیں گے۔ جب حسنین علیہما السلام نے یہ بات سنی تو انہوں نے بھی اپنے ماں باپ کی طرح یہی نذر مانی۔ اس وقت جناب فضہ بھی پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کو اپنے شہزادوں سے وہی محبت تھی جو ایک شفیق ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ فوراً انہوں نے بھی اس نذر میں شرکت کی۔

خداوند عالم نے اس نذر کی بدولت بہت جلد دونوں بچوں کو شفا عطا فرمائی اب ایفائے نذر کا وقت آیا۔ پانچوں بزرگوں نے روزہ رکھا مومنین حسنین علیہم السلام کے یہ پہلے ہی روزے تھے۔ دنیا میں یہ دستور ہے کہ جب بچوں کے پہلے روزے ہوتے ہیں تو افطار میں بڑا اہتمام کیا جاتا ہے کنبہ جمع ہوتا ہے۔ بہت سے مومنین افطار کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ ماں باپ فطرتاً اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہمارے بچوں کا پہلا روزہ بڑا شاندار ہو۔ لیکن حسنین علیہما السلام کا یہ پہلا روزہ اس شان سے ہوا کہ اس روز سیدۂ عالم کے یہاں کھانے کو بھی نہ تھا ایسی حالت میں بنی زادی کیا اہتمام کر سکتی تھیں۔ اہتمام تو بڑی چیز ہے وہاں تو افطار کے بعد بچوں کے کھانے کے لئے نان و نمک کا سہارا بھی نہ تھا۔ دوسری ماں ہوتی تو نہ معلوم اس صدمہ سے اس کا کیا حال ہوتا۔ لیکن ان کی باتیں انہی کے ساتھ تھیں۔ سوائے خوشنودیٔ خدا وہ دنیا کی کسی نعمت کے خواہاں نہ تھے۔ لیکن چونکہ بقائے زندگی کے لئے تھوڑی سی غذا کا کھانا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا دوپہر ڈھلنے کے بعد جناب سیدہ نے امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کی اے ابوالحسن آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے گھر میں کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں اگر کہیں سے ممکن ہو تو اتنی غذا فراہم کر دو کہ افطار کے بعد میرے بچے کھا سکیں۔ میرے بچے ابھی کم سن ہیں۔ اور ان کے یہ پہلے روزے ہیں۔ ابھی بستر بیماری سے اٹھے ہیں وہ بھوک

کی زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ سنکر امیر المومنین باہر تشریف لائے اور ایک یہودی سے کچھ اُون اجرت پر کاتنے کے لئے لی اور اس کی مزدوری کے جَو بشگی لے کر واپس تشریف لائے اور جناب سیدہ سے فرمایا اے دختر رسول میں یہ اُون لایا ہوں اور اس کی کتائی میں یہ جَو ہیں۔

انہوں نے اس اُون کے بھی تین حصے کئے اور جَو کے بھی۔ پہلے ایک حصہ اون کا کاتا اور اس کی اجرت کے تہائی جَو لے کر خود ہی چکی میں پیسے اس کے بعد آٹا خمیر کر کے خود ہی پانچ روٹیاں پکائیں۔ باوجودیکہ جناب فضہ جیسی خادمہ موجود تھیں لیکن رسول زادی نے یہ سب کام اپنے ہاتھ ہی سے انجام دیئے۔ اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ مسلمان عورتوں کو یہ سبق سکھانا تھا کہ امور خانہ داری کو اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں کبھی شرم نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ محنت مشقت سے انسان کی صحت قائم رہتی ہے۔ دوسرے ان امیر عورتوں کو جن کی خدمت کے لئے کنیزیں اور ماماتیں موجود رہتی ہیں اپنے گھر کا سب بار ان ہی بیچاریوں پر ڈالنا نہ چاہیئے بلکہ خود بھی اس میں حصہ لینا چاہیئے کیونکہ وہ بھی آدمی ہیں کام کرتے کرتے اکتا جاتی ہیں یا کبھی کبھی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے ان کو گھر کا کام کاج کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ تیسرے رسول زادی کے اخلاق نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جس فضہ نے میرے بچوں کی ہمدردی میں تین روزے رکھنے گوارا کئے ہیں اس سے روزے کی صورت میں یہ کام لوں۔ اس میں شک نہیں کہ احسان شناسی اور محبت کی قدر اہلبیتِ رسول سے زیادہ کوئی کر نہ سکا۔ انہوں نے عزیزوں سے زیادہ غلاموں اور کنیزوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کنیز اور غلام ان کی غلامی کو آزادی سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔

الغرض جب افطار کا وقت آیا تو پانچوں بزرگوار اپنی اپنی روٹی کھانے کے لئے بیٹھے۔ لقمہ منہ میں دینا ہی چاہتے تھے کہ ایک سائل نے آواز دی اے اہلبیتِ رسول میں مدینہ کے مسکینوں میں سے ایک مسکین ہوں اور بھوکا ہوں مجھے کھانا دو خدا اس کے بدلے میں تم کو جنت کے دسترخوان سے عطا فرمائے۔ یہ سننا تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام اپنی روٹی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ اس سائل کو دیں جناب سیدہ نے عرض کی اے ابوالحسن ایک روٹی شاید اس سائل کے لئے کافی نہ ہو میری روٹی بھی لیتے جائیے۔ حضرات جب حسنین علیہما السلام نے یہ دیکھا کہ ماں باپ نے ایک سائل کو اپنی ذات پر ترجیح دی ہے تو ننھے ننھے ہاتھوں پر اپنی اپنی روٹی رکھ کر عرض کرنے لگے بابا جان شاید یہ شخص بال بچوں والا ہو اور دو روٹیاں اس کو کفایت نہ کریں لہذا ہماری روٹیاں بھی اس کے لئے حاضر ہیں۔ اس کے بعد جناب فضہ نے بھی جو محبتِ اہلبیت کی برکت سے معرفتِ الہیٰ کے بہترین مدارج پر فائز تھیں اپنی روٹی امیر المومنین علیہ السلام کے سپرد کی اور حضرت وہ پانچوں روٹیاں اس سائل کو دے کر چلے آئے اور سب نے پانی سے روزہ کھولنے پر قناعت کی۔

جب دوسرا دن ہوا تو پھر اسی طرح جناب سیدہ نے اُون کو کاتا جَو پیسے آٹا خمیر کیا اور پانچ روٹیاں تیار کیں۔ آج باوجودیکہ رسول زادی پر متواتر دو روز نہ کھانے سے ضعف کا غلبہ تھا۔ مگر خوشنودئ خدا حاصل کرنے کے لئے اس تکلیف کو خوشی گوارا کر لیا۔ اور ذرا شکایت سے زبان آشنا نہ ہوئی۔ نہ تو عبادت ہی میں کوئی کمی تھی اور نہ امور خانہ داری ہی میں کوئی فرق تھا۔ اللہ اللہ کیسے صبر و قناعت والے یہ لوگ تھے کہ جس حال میں رہتے شکر خدا بجالاتے۔

بہر حال روز گزشتہ کی طرح جب پھر افطار کرنے بیٹھے اور منہ میں لقمہ دینے کا ارادہ کیا تو ایک سائل نے دروازہ پر پھر یہ کہہ کر آواز دی اے اہلبیتِ رسول میں مدینہ کے یتیموں میں سے ایک یتیم ہوں۔ مجھے کھانا دو۔ خدا تمہیں جنت کے دسترخوان سے کھانا دے۔

حضرات! اول تو یتیم کی آواز سنکر یوں ہی اہل ایمان کا دل تڑپ جاتا ہے اور یہ تو اہلبیتِ رسول تھے۔ جن سے زیادہ یتیموں پر کوئی شفیق نہ تھا جوں ہی یہ آواز سب کے کان میں پڑی دل ماہیٔ بے آب کی طرح سینوں میں تڑپ گئے۔ اور بدستور سابق اپنی اپنی روٹی اس سائل کی نذر کردی۔ اور پھر پانی سے روزہ کھول کر رہ گئے۔

تیسرے دن پھر اسی طرح روٹیاں تیار ہوئیں اور جب کھانے بیٹھے اور لقمہ منہ میں دینے کا قصد کیا تو پھر ایک سائل نے یہ کہہ کر اپنی طرف متوجہ کیا اے اہلبیتِ رسول میں مدینہ کے قیدیوں میں سے ایک قیدی ہوں مجھے کچھ کھانے کو دو خدا تمہیں جنت کے دسترخوان سے طعام لذیذ کھلائے۔ قیدی کی یہ درد بھری آواز سنتے ہی اہلبیتِ رسول کے دل پھر سینوں میں تڑپ اٹھے اور باوجود تین دن کی فاقہ کشی کے اپنی اپنی روٹیاں سائل کو دے دیں۔

حضرات دیکھا آپ نے اس گھر کی سخاوت کو۔ کیا دنیا میں ان کے علاوہ کوئی اور نظیر بھی ایسی مل سکتی ہے جو بنی نوعِ انسان کی ایسی ہمدرد ہو جو غریبوں، محتاجوں، یتیموں اور اسیروں پر ایسی مہربان و شفیق ہو۔ جو دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دیتی ہو ہرگز نہیں یہ سخاوت تو فقط اہلبیتِ رسول ہی سے مخصوص تھی۔ انہوں نے دنیا اور دنیا کی لذتوں کو ہمیشہ خدا کی خوشنودی اور بندگانِ خدا کی حاجت برآری کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا۔

لکھا ہے کہ جب تین روز اہلبیت کو اسی طرح بھوک میں گزر گئے تو خداوند عالم نے اپنے رسول پر وحی کی کہ خانۂ سیدہ میں جاؤ اور سورۂ دہر کی ان کے سامنے تلاوت کرو۔ کہ یہ تمام سورہ انہی کی شان میں ہے چنانچہ جب حضرت اپنی بیٹی کے یہاں تشریف لائے تو دیکھا کہ سب کا بھوک سے غیر حال ہے۔ دونوں نواسے نڈھال پڑے ہیں۔ بھوک سے رخسار کملائے ہیں۔ آنکھوں میں حلقے ہیں اور کھڑے ہونے سے پیر کپکپاتے ہیں۔

آپ نے دونوں بچوں کو اپنی آغوش میں لے کر پیار کیا۔ اور جناب سیدہ سے فرمانے لگے بیٹی! میرے بچوں کا بھوک سے یہ حال ہوگیا اگر میں موجود نہ تھا تو میرے گھر سے کچھ منگا کر ان کو کھلانا چاہیئے تھا عرض کی باباجان! مجھے اپنے گھر کے فقر و فاقہ کا حال دوسروں سے کہتے شرم آئی۔ حضرت نے فرمایا اے بیٹی میں تجھے بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی سرکار میں تم سب کی عبادت مقبول ہوئی۔

بیٹی! تیرا مرتبہ مریم سے زیادہ ہے۔ بیٹی! یہ فضیلت تیرے اور تیرے شوہر اور بیٹوں ہی سے مخصوص ہے کہ خدا نے پورا سورۂ دہر تم لوگوں کی تعریف میں نازل کیا اور چند آیتیں خاص طور پر اس واقعہ کے متعلق بیان کیں۔ یہ بشارت سنکر سب کے چہرے فرطِ مسرت سے چمک گئے اور اپنی جسمانی تکلیف کو بھول گئے۔ امام شافعی نے خوب فرمایا ہے سہ

إلى ما الام و حتى حتى ... أعاتب في حب هذا الفتى

فهل زوجت فاطمه غيره ... وفي غيره هل أتى هل أتى

یعنی اس جوان (علی) کی محبت میں کب تک لوگ مجھ پر عتاب کریں گے۔ کوئی مجھے بتاؤ کہ علی کے سوا فاطمہ جیسی بی بی کسی اور کی بھی ہے اور کوئی اور بھی ایسا ہے جس کی شان میں سورۂ ہل اتی نازل ہوا ہو۔

افسوس صد افسوس مسلمانوں کے ایسے سچے ہمدردوں کی دشمنانِ دین نے ذرا قدر نہ کی۔ حضرت رسولِ خدا کی آنکھ بند ہوتے ہی ایک ایک

سب کے دل اہلبیت کی طرف سے پھر گئے۔ کون سا ظلم تھا جو ان پر نہ ہوا۔ جناب فاطمہ حضرت رسولخدا کی رحلت کے بعد چند روز زندہ رہیں لیکن
ایک دن لوگوں نے ان کو چین سے نہ رہنے دیا۔ اول تو ان کے ہلاک کرنے کو باپ کی جدائی کا صدمہ ہی کم نہ تھا۔ پھر اس پر لوگوں کا ان کو دکھ دینا اور ستانا
اور بھی غضب تھا۔ خود فرماتی ہیں۔

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّھَا　　　صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

یعنی مجھ پر وہ مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر دنوں پر پڑتیں تو کالی راتیں بن جاتے۔

جناب سیدہ ہی پر کیا منحصر ہے اہلبیت میں سے ہر ایک کو دشمنوں نے ایسا ہی ستایا اور کسی ایک کو چین کی زندگی نہ بسر کرنے دی
امیر المومنین علیہ السلام کی سلطنت میں منافقوں نے کیا کیا رخنے نہ ڈالے آئے دن جنگ ہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک شقی کے ہاتھوں آپ
کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ آنحضرت کے بعد امام حسن کا نمبر آیا۔ سلطنت و حکومت کو آپ سے بجبر چھینا گیا۔ وظیفہ آپ کا بند کیا گیا۔ آپ کے دوستوں
کو طرح طرح سے ستایا گیا۔ یہاں تک کہ زہر دے کر آپ کو بھی شہید کر دیا۔ کاش اسی پر بس کرتے۔

آہ آہ! اس شہید مسموم اور امام مظلوم کے جنازے پر اعدائے دین نے تیر برسائے روضۂ رسول میں دفن نہ ہونے دیا۔

امام حسن علیہ السلام کے بعد پنجتن پاک میں صرف ایک دم حسین کا باقی تھا دشمنوں نے نہ چاہا کہ وہ جناب بھی مدینۂ رسول میں امن و امان
سے زندگی بسر کر سکیں۔ یزید بدکار نے تخت نشین ہوتے ہی آپ سے بیعت طلب کی اور در صورتِ انکار درپے قتل ہوا۔

جب حضرت کو اس شقی کے ارادہ کا حال معلوم ہوا تو مدینہ میں اپنا قیام مناسب نہ سمجھ کر مکہ کی جانب سفر کیا تاکہ خانۂ کعبہ میں جو تمام سلاطین
کے نزدیک جائے امن و امان ہے پناہ لیں لیکن آہ ہمارے مظلوم آقا کو وہاں بھی پناہ نہ مل سکی۔

منقول ہے کہ جب امام علیہ السلام مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے اہل کوفہ کے بہت سے خطوط حضرت کی طلب میں آئے مفصل حال یہ ہے
جب معاویہ کے مرنے اور یزید کے تخت نشین ہونے کی خبر اہل کوفہ کو پہنچی تو وہ نہایت مضطرب ہوئے بالخصوص اس خبر سے کہ یزید حسین
سے طالب بیعت ہے۔ اور آنحضرت ترکِ وطن فرما کر مکہ معظمہ میں تشریف لے آئے ہیں۔

ایک دن وہ لوگ سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر میں جمع ہوئے اور خلافتِ یزید کے متعلق ذکر ہونے لگا جناب سلیمان نے فرمایا دوستو
تم کو معلوم ہے کہ یزید بدکار امام ابرار سے طالب بیعت ہوا ہے اور وہ جناب مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے ہیں ہم کو یقین ہے کہ فرزند رسول
ہرگز یزید جیسے فاسق و فاجر انسان کی بیعت نہ کریں گے اس صورت میں یزید ان جناب کے قتل کا خواہاں ہوگا۔ پس اس صورت میں ہمارا فرض
ہے کہ امام علیہ السلام کی نصرت کریں اگر تم لوگ صدق دل سے آمادہ ہو تو آنحضرت کو اپنے ارادہ سے آگاہ کر دو اور اگر تمہارے ارادوں میں تامل
اور ضعف ہے تو صاف صاف اس وقت ظاہر کر دو تاکہ حضرت ہماری طرف سے دھوکہ میں نہ رہیں۔ یہ سنکر انہوں نے کہا ہم ضرور حضرت کی
نصرت کریں گے اور ان کے دشمنوں کو بغیر قتل کئے نہ رہیں گے۔ جناب سلیمان نے ان کی ہمت پر مرحبا کہا اور اس مضمون کا ایک خط امام علیہ السلام
کو لکھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں اعیانِ کوفہ سلیمان صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد بجلی، حبیب

بن مظاہر اور دیگر شیعیانِ کوفہ کی طرف سے روانہ کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ خدا نے آپ کے دشمن کو ہلاک کیا۔ اس نے امتِ محمد مصطفےٰ پر بڑا ظلم کیا تھا۔ بے شمار مسلمانوں کے حق غصب کر لئے تھے۔ احکام خدا کی خلاف ورزی کی تھی۔ بہت سے بے گناہوں کو قتل کیا تھا۔ مالِ خدا میں تصرف کو جائز رکھا تھا۔ اب اس کا بیٹا یزید جو ایک فاسق و فاجر انسان ہے اس کا جانشین بنا ہے۔ ہم اس کی بیعت ہرگز نہیں کر سکتے۔ ہم تو اپنا ہادی و امام آپ ہی کو جانتے ہیں۔ پس آپ یہاں تشریف لایئے ہم سب آپ کی بیعت کریں گے۔ ہم چونکہ بے امام کے ہیں لہٰذا آپ پر ہماری ہدایت فرض ہے۔ اگر آپ تشریف نہ لائے تو ہم روزِ جزا حضرت رسولِ خدا سے آپ کی شکایت کریں گے۔

یہ خط عبداللہ بن سمع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ یہ دونوں مکہ معظمہ پہنچے اور دسویں رمضان المبارک کو یہ خط امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کیا۔ اس کے بعد اہلِ کوفہ نے پے درپے ایک سو پچاس خط حضرت کی خدمت میں اور روانہ کئے۔ آخر خط میں لکھا تھا اَلْعَجَلْ اَلْعَجَلْ یعنی آپ بہت جلد تشریف لایئے۔

حضرت ان کے جواب دینے میں ابھی تامل فرما رہے تھے کہ ایک روز چھ سو خط اشراف و اعیانِ کوفہ کے حضرت کی خدمت میں پہنچے جن میں حضرت تشریف آوری پر بہت زور دیا گیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ ہزار خط حضرت کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ آخر حضرت نے ان کے جواب میں تحریر فرمایا۔

میں فی الحال تمہاری ہدایت کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو روانہ کرتا ہوں یہ میرے اہلبیت سے ہیں اور ان پر مجھ کو بڑا اعتماد ہے جب وہ مجھے وہاں کے حالات سے مطمئن کر دیں گے تو میں بھی یہاں سے روانہ ہو کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

اس کے بعد حضرت نے جناب مسلم کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا اے بھائی اہلِ کوفہ محتاجِ ہدایت ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ اور ہدایت کرو اگر وہ لوگ بالاتفاق تمہاری بیعت کر لیں۔ اور ہر طرح ہماری نصرت و یاری پر آمادہ ہوں اور ان کے اقوال و افعال سے محبت و خلوص کا پتہ چلتا ہو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ میں سب کو لے کر وہاں آجاؤں گا۔ اس کے بعد جناب مسلم اور ان کے دو کمسن بچوں کو اسی طرح رخصت کیا جیسے کسی کے دوبارہ کی آس نہ ہو۔ حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور بار بار حضرت مسلم کو سینہ سے لگا کر اظہار محبت فرماتے تھے۔

منقول ہے کہ جناب مسلم مکہ سے روانہ ہو کر پہلے مدینہ منورہ آئے اور مسجد رسول میں نماز ادا کی پھر اپنے عزیزوں سے رخصت ہو کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے دو راہبر آپ نے اجرت پر اپنے ہمراہ لئے۔ وہ بخیر راہ سے آپ کو لے جا رہے تھے کہ اتفاقاً راستہ بھول گئے۔ پانی اس راہ میں نایاب تھا ان لوگوں پر پیاس اس درجہ غالب ہوئی کہ آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جناب مسلم نے ان کو وہیں چھوڑا اور حکمِ امام کی بجا آوری میں کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب آپ وہاں پہنچے تو لوگوں کے گروہ کے گروہ آپ کی خدمت میں آنے شروع ہو گئے۔ حضرت مسلم نے امام علیہ السلام کا خط ان لوگوں کے سامنے پڑھا۔ سب کے دل محبتِ امام میں بھر آئے اور ہر طرح نصرتِ امام پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلے ہی روز آٹھ ہزار آدمیوں نے آپ سے بیعت کی۔ اس کے بعد ہر روز یہ سلسلہ جاری رہا تا اینکہ چار روز کے اندر اٹھارہ ہزار آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہو گئے۔

جناب مسلم نے ان کی ظاہری حالت سے مطمئن ہو کر امام حسین علیہ السلام کو خط لکھا کہ یہاں کے حالات نہایت اطمینان بخش ہیں آپ فوراً ادھر کا قصد فرمایئے۔ آہ آہ مومنین! حضرت مسلم کو کیا خبر تھی کہ اہل کوفہ چند ہی روز بعد اپنے عہد سے پھر جائیں گے اور غداری و بیوفائی پر کمر باندھ کر اولادِ رسول پر وہ ظلم کریں گے کہ سننے والوں کے دل ہل جائیں گے۔

جب یزید لعین کو یہ معلوم ہوا کہ مسلم بن عقیل کوفہ میں آگئے ہیں اور لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں تو اس شقی نے حاکم کوفہ کو معزول کر کے ابن زیاد بدنہاد کو گورنر بنا کر کوفہ بھیجا۔ اس شقی کو اہلبیتِ رسول سے سخت عداوت تھی۔ وہ بہت جلد منزلیں مارتا رات کے وقت داخل کوفہ ہوا۔ لوگ یہ سمجھ کر کہ امام حسین علیہ السلام تشریف لا رہے ہیں۔ جوق جوق گروہ گروہ استقبال کے لئے نکل پڑے اور خوش ہو کر نعرے مارنے شروع کئے یا ابن رسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ ہمارے ہادی دین ہیں۔ ہم چالیس ہزار آدمی آپ کی نصرت کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جب آگے بڑھ کر یہ معلوم ہوا کہ ابنِ زیاد بدنہاد ہے تو رنج و غم سے عجب حال ہوا سب اسی وقت پراگندہ ہونے شروع ہو گئے۔

صبح کو ابنِ زیاد نے شہر میں منادی کرا دی کہ سب لوگ جامع مسجد میں حاضر ہوں مجھے ایک ضروری حکم سنانا ہے۔ جب لوگ جمع ہوئے تو اس شقی نے منبر پر جا کر کہا ایہا الناس۔ امیر المومنین یزید نے مجھے تم پر حاکم مقرر کر کے بھیجا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ جو کوئی میرا حکم نہ مانے اس کو بے تامل قتل کر دوں۔ اور جو اطاعت و فرمانبرداری کرے اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دوں۔ یاد رکھو جو کوئی ہمارے دشمن کو اپنے گھر میں پناہ دے گا وہ سخت سے سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ شقی منبر سے اتر آیا۔

جب حضرت مسلم کو ابنِ زیاد کے آنے اور یہ ظالمانہ حکم سنانے کی خبر ملی تو آپ مختار کے گھر سے نکل کر ہانی بن عروہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ لوگ خفیہ طور پر آ کر آپ سے بیعت کرتے تھے۔ اب حضرت مسلم نے ارادہ کیا کہ اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لے کر ابنِ زیاد سے جنگ کریں۔ لیکن جناب ہانی مانع ہوئے اور کہا آپ اس معاملہ میں جلدی نہ کیجئے۔

اسی زمانہ میں شریک بن اعور ہمدانی بھی بصرہ سے ابنِ زیاد کے ساتھ آئے تھے۔ اور بیمار ہو جانے کی وجہ سے حضرت ہانی کے گھر میں مقیم تھے۔ انہوں نے حضرت مسلم سے کہا ابنِ زیاد میری عیادت کو ضرور آئے گا میں اس کو باتوں میں لگاؤں گا۔ جب میں کہوں کہ میرے لئے پانی لاؤ تو آپ فوراً باہر نکل کر اس کو قتل کر دیجئے۔ چنانچہ جب ابنِ زیاد وہاں آیا تو دیر تک شریک سے باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے قرارداد کے مطابق پانی مانگا لیکن جناب مسلم اس کے قتل کے لئے باہر نہ نکلے۔ شریک نے یہ سمجھتے ہوئے کہ وقت نکلا جا رہا ہے ایک شعر پڑھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ موت کا پیالہ پلانے میں جلدی کرنی چاہیئے۔ ابن زیاد اس شعر سے متوحش ہوا اور فوراً وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد جب جناب مسلم باہر آئے تو شریک نے کہا کیا وجہ ہوئی کہ آپ اس شقی کے قتل سے باز رہے جناب مسلم نے فرمایا دو وجوں سے میں نے اس ارادہ کو ترک کیا۔ اول مجھے ناگوار ہوا کہ دھوکہ سے قتل کر کے بنی ہاشم کی شجاعت پر دھبہ لگاؤں۔ دوسرے میں نے یہ سمجھا کہ میری وجہ سے میرا میزبان ہانی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہانی نے کہا اے مسلم یہ بڑا اچھا موقع آپ نے ہاتھ سے نکال دیا مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو اس بدبخت پر قابو حاصل نہ ہوگا۔

لکھا ہے جب ابنِ زیاد کو یہ پتہ چلا کہ جناب مسلم ہانی بن عروہ کے یہاں پوشیدہ ہیں تو اس نے جناب ہانی کو بلا کر کہا کہ مسلم ابن عقیل کو فوراً

میرے سامنے حاضر کرو ورنہ ابھی تجھے قتل کرادوں گا۔

جناب ہانی کو یہ سنکر غصہ آگیا فرمایا میرا قتل کرنا آسان نہیں اگر تو نے ایسا کیا تو میری قوم تیرے ٹکڑے اڑادے گی وہ شقی یہ سنتے ہی غصہ سے تھرتھر کانپنے لگا اور اپنی چھڑی کو اتنی مرتبہ ان کے چہرہ پر مارا کہ پیشانی اور رخساروں سے خون کی دھاریں پھوٹ نکلیں اور تمام کپڑے خون آلود ہو گئے پھر اس شقی نے اس مومن پاک کو قتل کرادیا۔

جب جناب ہانی کی شہادت کی خبر حضرت مسلم کو پہنچی تو آپ بہت زیادہ شکستہ دل اور غمگین ہوئے اور اسی روز آپ نے ابن زیاد سے مقابلہ کا قصد کیا۔ کئی ہزار آدمی آپ کی نصرت کا وعدہ کر چکے تھے۔ آپ نے ان سب کو کہلا بھیجا کہ آج شب کو بعد نماز عشاء ہم خروج کریں گے۔ لیکن ابن زیاد کا خوف اہل کوفہ پر اس درجہ غالب آیا کہ اس رات کو بہت کم لوگ آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کو آئے۔ جب آپ نماز مغرب سے فارغ ہوئے اور پیچھا پھر کے دیکھا تو پچیس تیس آدمی سے زیادہ شریک جماعت نہ تھے۔ اس غداری اور بیوفائی پر آپ بہت رنجیدہ ہوئے اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا اگرچہ اہل کوفہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ لیکن میں نے جو ارادہ کیا ہے اس کو ضرور پورا کروں گا چنانچہ جب نماز عشاء کے بعد آپ چلے تو بقیہ لوگ بھی ادھر ادھر راستوں سے کترا کر نکل گئے اور جب آپ نے مڑ کر دیکھا تو دس آدمیوں سے زیادہ ساتھ نہ تھے۔ چند قدم آگے بڑھے تو وہ بھی غائب ہو گئے اب کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ آپ کو راستہ بتائے۔

آہ! اب حضرت مسلم بیچارے سرگردان و پریشان کوفہ کے گلی کوچوں میں پھرتے تھے اور کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ بار بار کف افسوس مل کرتے تھے میں نے کیا غضب کیا کہ فرزند رسول کو یہاں آنے کے لئے لکھا خدا کرے کہ حضرت ادھر تشریف نہ لائیں۔ الغرض اسی پریشانی میں چلے جارہے تھے کہ ایک عورت جس کا نام طوعہ تھا اپنے دروازہ پر کھڑی نظر آئی۔ آپ نے فرمایا اے کنیز خدا شدت تشنگی سے میرا برا حال ہے کیا یہ ممکن ہے کہ تھوڑا سا پانی مجھے پلادے۔ یہ سنکر وہ اندر گئی اور پانی لے کر آئی۔ جناب مسلم پانی پی کر وہیں دروازہ پر بیٹھ گئے۔ اس عورت نے کہا اے بندۂ خدا میں نے تیری خواہش کو پورا کر دیا۔ اب تو کس لئے دروازہ پر بیٹھا ہے زمانہ پر آشوب ہے اپنے گھر کیوں نہیں جاتا۔

یہ بات سنکر حضرت مسلم کے دل پر ایک چوٹ لگی اس کے دروازہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت دردناک لہجہ میں فرمایا اے کنیز خدا میں آوارہ وطن پردیسی ہوں نہ یہاں میرا گھر ہے نہ عزیز و اقارب ہیں کہاں جاؤں اور کس سے اپنا درد دل کہوں۔ اس نے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ آپ نے فرمایا اے ضعیفہ میں مسلم بن عقیل ہوں مجھ سے اہل کوفہ نے فریب کیا اور پردیس میں سب میرا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے

جب اس نے حضرت مسلم کا نام سنا تو آپ کے قدموں پر گر پڑی اور کہنے لگی آپ میرے سید و سردار ہیں میں آپ کی ادنیٰ کنیز ہوں میرا گھر آپ ہی کا گھر ہے آپ شوق سے تشریف لائیے جو خدمت مجھ سے ممکن ہو گی انجام دوں گی۔

الغرض طوعہ آپ کو اپنے گھر لے گئی اور کھانا لا کر آپ کے سامنے رکھا آپ نے فرمایا فرط رنج و غم سے میری بھوک جاتی رہی ہے میں اس وقت کچھ نہ کھاؤں گا۔ صبح دیکھا جائے گا۔ طوعہ نے کہا اچھا میں فرش بچھائے دیتی ہوں آپ آرام فرمایئے۔ جناب مسلم اس کے کہنے سے لیٹ تو رہے لیکن تمام رات نیند نہ آئی۔ صبح کو جب طوعہ وضو کے لئے پانی لے کر آئی تو اس نے عرض کی اے میرے سید و مولا اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ تمام شب بے چین رہے فرمایا رات ذرا دیر کو میری آنکھ لگی تھی کہ میں نے اپنے چچا امیر المومنین علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا اے مسلم جلد حاضر ہو

جلد حاضر ہو۔ پس میرا گمان غالب یہ ہے کہ آج کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔

منقول ہے کہ کسی نے ابن زیاد ملعون کو یہ خبر پہنچا دی کہ مسلم بن عقیل طوعہ کے گھر میں پنہاں ہیں پس اس شقی نے محمد بن اشعث کو بلا کر حکم دیا کہ پانچسو سواروں کو لے جا کر مسلم کو گرفتار کر لے۔ اور اگر گرفتاری ممکن نہ ہو تو قتل کر ڈالے۔ ابن اشعث فوراً روانہ ہوا جب لوگ طوعہ کے مکان کے قریب پہنچے اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اس کے کان میں آئی تو اس نے جناب مسلم کو خبر دی آپ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پھر آپ نے اپنی زرہ پہنی اور ہتھیار بدن پر سجا کر مقابلہ کے لئے آمادہ ہوئے طوعہ سے فرمایا مجھے ڈر ہے کہیں یہ لوگ تیرے گھر میں نہ گھس آئیں اور پھر میں جنگ کرنے کا موقع نہ پا سکوں۔ اس نے کہا اگر یہ لوگ آپ کو قتل کر دینگے تو میں ان سے خود اس حد تک جنگ کروں گی کہ قتل ہو جاؤں۔

الغرض حضرت مسلم باہر نکلے اور ان ملاعین سے لڑنا شروع کیا یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں ایک سو پچاس آدمیوں کو داخلِ جہنم کیا۔ جب محمد بن اشعث نے جناب مسلم کی شجاعت کا یہ حال دیکھا تو ایک سوار کو دوڑا کر ابن زیاد سے اور کمک طلب کی اس نے پچاس سوار اور بھیجے۔ جناب مسلم نے ان سے بھی مقابلہ کیا اور بہت سوں کو مار گرایا۔ لیکن کئی گھنٹہ کی متواتر جنگ میں بے شمار تیر حضرت مسلم کے جسم مبارک میں پیوست ہو گئے تھے۔ اور جا بجا زخموں سے خون کی دھاریں بہ رہی تھیں اسی حالت میں ایک شقی نے ایسا نیزہ آپ کے منہ پر مارا کہ اوپر کا ہونٹ کٹ گیا اور آپ کے کئی دانت بھی ٹوٹ کر گر پڑے۔ اسی حال میں کچھ لوگ کوٹھوں پر چڑھ گئے اور ہر طرف سے اس غریب الوطن اور بے یار و مددگار سید پر پتھر برسانے شروع کئے حضرت مسلم اسی حال میں برابر حملہ کئے جاتے تھے آخر جب بہت زیادہ زخمی ہو گئے اور کھڑے ہونے کی طاقت باقی نہ رہی تو چاروں طرف سے گھیر کر اس شیر بیشۂ شجاعت کو گرفتار کر لیا۔ حضرت مسلم نے فرمایا اے ظالمو مجھے تھوڑا سا پانی دو کہ بہت پیاسا ہوں۔ ایک شقی کو ان کی مظلومی پر رحم آیا اور ایک کوزہ پانی کا بھر کر دیا۔ جب آپ نے پینا چاہا تو منہ کا خون پانی میں مل گیا۔ حضرت مسلم نے وہ پانی پھینک دیا اور فرمایا ہماری قسمت میں پیاسا ہی مرنا لکھا ہے۔ اس کے بعد آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک شقی نے ازروئے طنز کہا۔ اے مسلم! بہادر اس طرح نہیں رویا کرتے۔ فرمایا اے بدبخت میں جان کے خوف سے نہیں روتا بلکہ اپنے آقا امام حسین علیہ السلام کے تصور میں رو رہا ہوں ان جناب کے ساتھ عورتیں اور بچے ہیں اگر میرے خط پر ادھر چلے آئے تو یہ کوفی ان سے بھی اسی طرح دغا کریں گے جس طرح میرے ساتھ کی ہے۔

اس کے بعد آپ نے محمد اشعث سے فرمایا اے شخص میں چاہتا ہوں کہ اس وقتِ آخر میں میرے ساتھ ایک نیکی کر اور وہ یہ ہے کہ ایک قاصد امام علیہ السلام کی طرف روانہ کر دے۔ وہ حضرت سے مل کر یہ بیان کرے کہ مسلم بن عقیل دشمن کے ہاتھ میں قید ہو گئے ہیں۔ شاید آج شام تک قتل ہو جائیں پس آپ ادھر آنے کا قصد نہ فرمائیے۔ اہل کوفہ سے وفا کی امید نہیں۔ مومنین! مکار ابن اشعث نے اس وقت تو جناب مسلم سے وعدہ کر لیا لیکن اس وعدہ کو وفا نہ کیا۔ اور امام علیہ السلام کو اطلاع نہ پہنچی۔

الغرض جب حضرت مسلم گرفتار ہو کر ابن زیاد کے سامنے آئے تو اس شقی کو سلام نہ کیا۔ لوگوں نے کہا اے مسلم امیر کو سلام کرو۔ حضرت نے فرمایا میرا امیر حسین بن علی کے سوا کوئی نہیں۔ ابن زیاد کو وہ سلام کرے گا جو موت سے ڈرتا ہو گا۔ ابن زیاد یہ سنکر غضبناک ہوا اور کہنے لگا میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔ فرمایا میں جانتا ہوں کہ تو مجھے ضرور قتل کرے گا لیکن اتنی مہلت دے کہ میں کسی شخص سے وصیت کروں۔ وہ ملعون یہ سنکر چپ رہا۔ جناب مسلم نے اس کے درباریوں پر ایک نظر ڈالی عمر سعد بیٹھا ہوا نظر آیا۔ آپ نے اس سے کہا اے پسر سعد تیرے اور ہمارے درمیان قرابت ہے میں چاہتا ہوں کہ

تجھ سے چند وصیتیں کروں بشرطیکہ تو بجا لانے کا اقرار کرے۔ اس ملعون نے اول تو انکار کیا لیکن جب ابن زیاد نے اجازت دی تو سننے پر راضی ہوا جناب مسلم نے فرمایا پہلی وصیت یہ ہے کہ میرے اوپر سات درہم کا قرضہ ہے پس میری زرہ بیچکر اس کو ادا کر دینا۔ دوسرے میرے پاس لوگوں کی کچھ امانتیں ہیں وہ واپس کر دینا۔ تیسرے میرے سید و مولا امام حسین کو لکھ بھیجنا کہ اس طرف تشریف نہ لائیں ورنہ جو مصیبت مجھ پر گزری ہے وہ ان پر بھی گزرے گی عمر سعد نے کہا پہلی دو باتیں تو مجھے منظور ہیں لیکن حسین بن علی کو تمہارا پیغام نہ پہنچاؤں گا میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آئیں اور قتل کئے جائیں۔ یہ سنکر جناب مسلم نے فرمایا او شقی تجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ فرزند رسول کے متعلق کیسی بدزبانی کر رہا ہے۔

اس کے بعد ابن زیاد نے حکم دیا کہ مسلم کو کوٹھے پر لیجا کر قتل کر دو اور ان کی لاش کو اوپر سے نیچے پھینک دو۔ یہ حکم سنتے ہی ابن زیاد کے غلام دوڑے اور جناب مسلم کو پکڑ کر کشاں کشاں کوٹھے پر لے گئے جب انہوں نے قتل کا ارادہ کیا۔ تو آپ نے فرمایا اے بدبختو! مجھے اتنی مہلت دو کہ دو رکعت نماز ادا کر لوں۔ انہوں نے کہا ہم نہیں جانتے کہ نماز کیا ہے۔ آخرکار انہوں نے اس شیر کو چاروں طرف سے گھیر کر قتل کر دیا اور لاش کو کوٹھے پر سے زمین پر پھینک دیا۔

آہ آہ مومنین! ظالم ابن زیاد نے اسی پر بس نہ کی بلکہ حکم دیا کہ مسلم اور ہانی دونوں کے پیروں میں رسی باندھ کر لاشوں کو کوفہ کے گلی کوچوں میں گھسیٹا جائے تاکہ لوگ خوف زدہ ہوں اور پھر کوئی یزید کی مخالفت کا ارادہ نہ کرے۔ ہائے ایسی بے کسی کی موت بھی کسی کی نہ ہوگی۔ گھر سے دور، وطن سے دور نہ کوئی مونس نہ غمخوار نہ یار و نہ مددگار۔ ظالم دونوں لاشے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔ لکھا ہے جب یہ خبر قوم مذحج کو پہنچی تو وہ مسلح ہو کر چڑھ آئے اور بجبر دونوں لاشوں کو چھین کر لے گئے۔ اور غسل و کفن دے کر دفن کر دیا۔

آہ مومنین! ایک خیال نے اس وقت میرے کلیجے کے ٹکڑے کر دیئے۔ آہ مسلم و ہانی کی لاشیں بنی مذحج نے دفن تو کر دیں لیکن کربلا میں کوئی ایسا نہ تھا کہ ہمارے مظلوم امام کی لاش مطہر کو جلتی ریت سے اٹھا کر دفن کر دیتا۔ آہ ظالموں نے تین روز تک لاشہائے شہدا کو یوں ہی بے غسل و کفن خاک و خون میں اٹا ہوا پڑا رہنے دیا۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

پانچویں مجلس

خانہ کعبہ کی فضیلت۔ امیر المومنین کا خانہ کعبہ میں پیدا ہونا۔ بیت اللہ کی خصوصیات اور امام علیہ السلام کی مکہ سے عراق کو روانگی

قال اللہ تبارک و تعالیٰ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (سب سے پہلا گھر جو مکہ میں لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مبارک اور تمام عالموں کے لئے باعثِ ہدایت ہے) حضرات! خانہ کعبہ وہ مقدس گھر ہے جس کو حضرت ابراہیم جیسے برگزیدہ نبی نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ جناب اسمٰعیل اور حضرت جبریل پتھر لاتے تھے۔ اور حضرت خلیلِ الٰہی عمارت کو بناتے تھے۔ اس کی برکت کا کیا ٹھکانہ ہے قیامت تک کے لئے عبادت گزاروں کا قبلہ بن گیا۔

اس خانہ کعبہ کو بیت اللہ یا اللہ کا گھر بھی کہتے ہیں۔ مگر غور کے قابل بات یہ ہے کہ اللہ کی ذات جسم و جسمانیت اور مکان و مکانیات سے منزہ مبرا ہے۔ اس کو مکان کی ضرورت کیا۔ گھر تو بندوں کے لئے درکار ہے نہ کہ خالقِ کائنات کے لئے وہ کسی ایک مکان میں محدود ہو کر رہنے والا نہیں بلکہ اپنی قدرت کاملہ سے ہر جگہ موجود ہے پھر اس نے اپنا یہ گھر کس لئے بنوایا؟

بات یہ ہے کہ قوم کی زندگی عمل سے ہے اور عمل کی رونق اور جان اجتماع سے ہے۔ اور اجتماع کے لئے ایک ایسے مرکز کی ضرورت ہے جہاں متفرق قوتوں کو ایک جا کیا جا سکے۔ یہ مرکز متفرق افراد میں انس و محبت کا باعث بھی ہوتا ہے اور ان کی ڈھارس اور تسلی کا سبب بھی۔ کسی فوج میں دلیری سے جنگ و پیکار کی قوت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک لشکر کا جھنڈا لہرا رہتا ہے یہی جھنڈا فوج کی متفرق قوتوں کو جمع کرنے کا مرکز اور عملی جدوجہد کی جان بنا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے قائم رکھنے میں پوری قوت سے کام لیا جاتا ہے اور اس کی تنظیم کرنا ہر سپاہی کا فرض ہوتا ہے اور اسی اہمیت پر نظر رکھتے ہوئے اس کا محافظ یا علم بردار فوج کے اس بہادر سردار کو بنایا جاتا ہے جس کی قوتِ عمل اور شجاعت و وفاداری پر سب سے زیادہ بھروسہ ہوتا ہے۔ پس خانہ کعبہ درحقیقت مسلمانوں کی عملی زندگی کا ایک بہترین مرکز ہے اور چونکہ اس عمل سے عبدیت کا اظہار ہوتا ہے لہٰذا وہ بیت اللہ کے نام سے موسوم ہوا اور چونکہ قیامت تک مسلمانوں کو اس کے ذریعے سے خیر و برکت حاصل کرنے کی ترغیب دینی مقصود تھی۔ لہٰذا خدا نے اس کو ایسے ہی لوگوں سے بنوایا جن کی عملی زندگی سب سے بہتر اور عبدیت ہر طرح قابلِ وثوق تھی۔ مذکورہ بالا آیت بتا رہی ہے کہ اللہ نے اپنے خلیل سے یہ گھر کچھ خاص لوگوں کے لئے بنوایا تھا تاکہ ان کا حسنِ عمل قیامت تک دوسروں کے لئے باعثِ ہدایت ہو۔ چونکہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل نے اس مبارک گھر کو تعمیر کیا تھا لہٰذا اس کی ملک بطور میراث انہی کی اولاد ہونی چاہیئے۔ خدا کی ذات منصف و عادل ہے وہ کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا جناب امیر علیہ السلام کا خانہ کعبہ میں پیدا ہونا اس کی دلیل ہے کہ خدا نے اس بیت کا ان کو اہل سمجھا جب ہی تو اہلبیت یعنی بیت اللہ کے مالک کہلائے۔ جناب مفتی سید محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

مطلب ز انشائے کعبہ بہر میلاد تو بود
ورنہ شخص لامکاں را خانہ کے بایستے روا

حضرات خانۂ خدا میں پیدا ہونا معمولی فضیلت نہیں۔ یہ رتبہ انبیاء کو بھی حاصل نہیں ہوا چنانچہ کتب تواریخ میں ہے کہ جب حضرت مریم کو دردِ زہ عارض ہوا۔ تو انہوں نے چاہا کہ ان کا بچہ بیت المقدس کے اندر پیدا ہو۔ چنانچہ وہ اس خیال سے وہاں پہنچیں ناگاہ ایک ہاتفِ غیبی کی یہ آواز کان میں آئی اے مریم یہ عبادت خانہ ہے زچہ خانہ نہیں تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ وہ معظمہ وہاں سے چلی آئیں اور جناب عیسیٰ ایک درخت کے نیچے پیدا ہوئے۔ لیکن اب تھوڑا سا حال حضرت علی کی ولادت کا بھی سُن لیجئے اور فخر کے ساتھ کہیئے سے

خوشا ما خوشا دین و دنیائے ما کہ ہمچو علی ہست مولائے ما

منقول کہ جب فاطمہ بنتِ اسد کو دردِ زہ عارض ہوا تو وہ اس ارادہ سے کعبہ کی طرف گئیں کہ دیوارِ خانۂ کعبہ کو اپنے بطنِ مبارک سے مس کریں تاکہ ولادت میں سہولت ہو۔ جس وقت آپ قریبِ دیوارِ کعبہ کے پہنچیں تو بقدرتِ خدا دیوار شق ہوگئی اور ایک ہاتف نے ندا دی اے فاطمہ اندر داخل ہوجاؤ۔ یہ بشارت سنتے ہی آپ اندر داخل ہوگئیں۔ اور دیوار بدستور ویسی ہی ہوگئی۔ ۱۳ رجب کو جناب امیر علیہ السلام خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ذات کیسی مقدس ذات تھی کہ خدا نے خانۂ کعبہ جیسے مقدس مکان کو ان کا مولد قرار دیا اگر جناب فاطمہ بنتِ اسد معمولی دروازہ سے جاتیں تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اپنی فضیلت کے خیال سے خود ہی داخل ہوگئی ہوں گی۔ لیکن دیوار کے شق ہونے کے بعد اس قسم کے شیطانی وساوس پیدا ہونے کا موقع نہیں رہتا۔

منقول ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام کعبہ میں پیدا ہوئے تو اس وقت جتنے بُت کعبہ کے اندر طاقوں میں رکھے ہوئے تھے سب کے سب اوندھے منہ زمین پر گر پڑے گویا گھر کے مالک کو دیکھتے ہی ناجائز قبضہ کرنے والوں کے بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ مستند کتابوں میں ہے کہ ولادت کے بعد نہ تو جناب امیر علیہ السلام نے اپنی ماں کا دودھ پیا اور نہ آنکھیں کھولیں۔ جناب فاطمہ بنتِ اسد اس حالت سے حد درجہ متردد ہوئیں۔ دوسرے یا تیسرے روز جب حضرت رسولِ خدا کو ولادتِ علی کی خبر پہنچی تو آپ بکمالِ شوق بیت اللہ میں تشریف لائے اور اپنی چچی سے فرمایا لاؤ میرے بھائی کو میری گود میں دو۔ یہ میرا قوتِ بازو ہے۔ یہ میرا شریک کار ہے۔ حضرت کی آواز سُنتے ہی مولودِ کعبہ نے ہمکنا شروع کیا سے

ادہر آغوش کی حسرت اُدہر دیدار کا ارماں علی نے کھول دیں آنکھیں نبی نے ہاتھ پھیلائے

حضرت کی آغوش میں آتے ہی حضرت علی علیہ السلام نے بیٹے سے آنکھیں کھول دیں اور دنیا میں سب سے پہلے جمالِ جہاں آرائے رسالت پر نظر کی۔ شاید اسی وجہ سے اب تک حضرت نے اپنی آنکھیں نہ کھولی تھیں۔ آپ کو پسند نہ آیا کہ پہلی نظر ان بتوں پر پڑے جو خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ امامت اپنی پہلی نظر چہرۂ رسالت پر ڈالنا چاہتی تھی۔ جب جناب فاطمہ نے بیٹے کی آنکھیں کھلی ہوئی دیکھیں تو فرطِ مسرت سے باغ باغ ہوگئیں جناب رسولِ خدا سے فرمانے لگیں اے فرزند اس بچہ نے ابھی تک میرا دودھ نہیں پیا۔ حضرت نے فرمایا اے چچی آپ متردد نہ ہوں اس بچہ کی پہلی غذا میرے پاس ہے۔ یہ فرما کر آپ نے اپنی زبان مبارک حضرت علی علیہ السلام کے منہ میں دے دی۔ آپ نے خوشی کے ساتھ اس کو چوسنا شروع کیا۔ حضرات! یہ لعابِ رسول نہیں چوسا جا رہا تھا بلکہ علوم کا ایک چشمہ تھا جو سینۂ رسول سے نکل کر زبانِ رسول کے ذریعہ سے علی کے دل میں پہنچ رہا تھا

اس ولادت کے بعد کس کو اس امر میں شبہ ہوسکتا ہے کہ ان کے سوا کوئی دوسرا اس گھر کا مالک و وارث نہیں ہوسکتا یہی اہلبیت اور یہی

الحرم ہیں۔ انہی کے لیے حضرت ابراہیم نے اس گھر کو بنایا تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس علی کا مولد قیامت تک کے اہلِ عالم کا قبلہ قرار پایا اس کا مقابلہ فضیلت میں کون کر سکتا ہے۔

کئی فضیلتیں حضرت علی علیہ السلام کو خدا نے ایسی عطا فرمائی تھیں کہ کسی دوسرے کو ان میں حصہ ہی نہ ملا تھا۔ اول خانۂ کعبہ میں پیدا ہونا دوسرے جناب سیدہ جیسی بی بی کا شوہر بننا۔ تیسرے نفسِ رسول ہونا۔

لوگ تو خانہ کعبہ کی کلید برداری اور حرم میں حاجیوں کو پلانے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے پھر بھلا اس فخر کا کیا ٹھکانہ ہے جو حضرت علی علیہ السلام کو مولود کعبہ بننے کی بنا پر حاصل ہوا تھا۔

کعبہ کی خاص صفت اللہ تعالٰی نے یہ بیان فرمائی ہے ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی وہ تمام عالموں کے لئے ہدایت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کعبہ معمولی اینٹ پتھر کا بنا ہوا ایک مکان ہے۔ اور کسی مکان میں بذاتہ ہدایت کرنے کی قابلیت نہیں ہوا کرتی۔ اگر بحیثیت مکان خانۂ کعبہ ہادی بن سکتا تو اس کے اندر بُت داخل نہ رہتے یا جو شخص اس کے اندر داخل ہو جاتا اعلیٰ درجہ کا نیک انسان بن جاتا حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ کئی کئی حج کرنے کے بعد بھی بری باتوں سے نہیں بچتے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مکان کے فضائل صاحبِ مکان کی وجہ سے ہوتے ہیں جیسا جس گھر کا مالک و مکین ہوتا ہے۔ ویسی ہی اس کی شہرت ہوتی ہے۔ اس گھر کے اہلبیت چونکہ سب کے سب معصوم تھے اور قیامت تک دنیا میں ان کا سلسلہ باقی رہنے والا تھا اس لئے اس گھر کی صفت ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ بیان کی گئی جس کے معنی یہ ہیں کہ اس گھر کے مالک و وارث وہ لوگ ہیں جو تمام عالموں کو ہدایت کرنے والے ہیں چونکہ حضرت علی کا آنول نال کعبے کے اندر گڑا ہے لہٰذا یہی اس کے مالک ہیں اور ان کے بعد ان کی اولاد میں گیارہ امام اس گھر کے مالک ہیں۔ انہی سے ہر زمانہ کے لوگ ہدایت پاتے رہے اور قیامت تک پاتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بارہویں امام کعبہ ہی سے خروج فرمائیں گے اور اپنے ساتھیوں کو کعبہ ہی میں اپنے پاس بلائیں گے۔

حضرات کعبہ کی ایک صفت خداوند عالم نے یہ بھی بیان فرمائی ہے مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا یعنی جو اس میں داخل ہو گیا امان میں ہے۔ چونکہ کعبہ کی نسبت خدا کی طرف ہے یعنی وہ خدا کا گھر کہلاتا ہے لہٰذا قدرت نے اس کا یہ احترام ملحوظ رکھا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والا جب تک اس کے اندر رہے گا۔ اس کو نہ کوئی گرفتار کر سکتا ہے اور نہ قتل۔ اس مقدس سرزمین کا احترام اس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ کوئی وہاں کے پرندوں کو شکار نہیں کر سکتا۔ وہاں کے درخت کی شاخ تک نہیں کاٹ سکتا۔ بلکہ وہاں کی گھاس تک اپنے پیروں سے نہیں روند سکتا۔ اللہ اللہ! جو انسان و حیوان سب کے لئے جائے پناہ اور مقام امن و امان ہو کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس گھر میں غریب الوطن نبی زادے کو پناہ نہ مل سکے۔

کتب تواریخ میں منقول ہے کہ ماہِ شعبان سنہ ٦٠ھ سے ماہ ذی الحجہ تک امام حسین علیہ السلام مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ جب یزید پلید کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے چالیس آدمی حاجیوں کے لباس میں بھیجے کہ ایام حج میں عین کعبہ کے اندر حضرت کو شہید کر دیں۔ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو اس خیال سے کہ حرمت خانۂ کعبہ برباد نہ ہو اور آپ کا خون حرم مقدس میں نہ بہایا جائے۔ آپ نے احرام حج کو کھول ڈالا اور اس کو عمرہ سے

بدل فرما کر آٹھویں یا نویں ذی الحجہ کو وہاں سے عراق کی طرف روانگی کا قصد فرمایا۔ آہ آہ مومنین! یہ وہی تاریخ تھی جس میں حضرت مسلم کوفہ میں شہید کر دیئے گئے تھے۔

ہمارے مظلوم امام کو کیا علم تھا کہ دنیائے اسلام ان پر ظلم کرنے کے لئے اس حد تک کمر بستہ ہو گئی ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ان کو پناہ دینی نہیں چاہتی۔ آہ حضرت کو کیا معلوم تھا کہ ان کا غریب الوطن سفیر پردیس میں اشقیائے امت کے انتہائی ظلم و ستم اٹھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

بروایت لہوف اور ابومخنف واقدی زرارہ ابن صالح سے منقول ہے کہ مکہ معظمہ سے تشریف لے جانے سے تین روز پہلے میں امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا ابن رسول اللہ سنتا ہوں کہ آپ کا قصد عراق کی طرف جانے کا ہے۔ میری رائے ہے کہ حضور اس طرف کا قصد نہ فرمائیں۔ کوفہ کے لوگ سست عہد اور بے وفا ہیں۔ ان کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے دشمنوں کے حکم پر چلتی ہیں فرمایا اے زرارہ تم اس بات کو نہیں جانتے جس کو میں جانتا ہوں مجھے یہ خبر مل چکی ہے کہ اگر میں سوراخ مور و مار میں بھی پناہ لوں گا تو بنی امیہ وہاں بھی مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے مجھے معلوم ہے کہ میرے احباب و انصار میں سے کوئی بھی سوائے میرے فرزند علی بن الحسین کے زندہ نہ بچے گا حضرت سے یہ سنکر میں خاموش ہو رہا۔ لیکن میرا دل حضرت کی مصیبت کے تصور سے بری طرح کڑھ رہا تھا۔

صاحب منتخب لکھتے ہیں کہ جب جناب محمد حنفیہ کو یہ معلوم ہوا کہ امام حسین علیہ السلام عازم عراق ہیں تو حاضر خدمت ہو کر عرض کرنے لگے اے بھائی سنتا ہوں کہ کل آپ کا ارادہ مکہ سے تشریف لے جانے کا ہے۔ اے بھائی آپ اہل کوفہ کے غدر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے پدر بزرگوار اور برادر عالی مقدار سے جو کچھ بدسلوکی کی ہے۔ اس سے مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی وہی عمل کریں گے بہتر یہی ہے کہ آپ یہیں حرم خدا میں پناہ گزیں رہیں۔ امید ہے کہ یہاں دشمنوں کے شر سے آپ کو نجات مل جائے گی حضرت نے فرمایا مجھے یہ خوف ہے کہ یزید مجھے حرم خدا میں قتل کرا دے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے حرمت خانہ کعبہ برباد ہو۔ انہوں نے عرض کی اچھا اگر یہ خوف ہے تو آپ یمن کی طرف تشریف لے جایئے وہاں بکثرت آپ کے شیعہ ہیں یزید ہرگز وہاں آپ کے ستانے پر قادر نہ ہوگا۔ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو آپ پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف نکل جائیں کہ بہ نسبت کوفہ کے ان مقامات پر امن و امان کی زیادہ توقع ہے۔

حضرت نے فرمایا اے بھائی میں اپنے انجام سے باخبر ہوں میں جانتا ہوں کہ بنی امیہ کی تلواروں سے مجھے کسی جگہ پناہ نہیں مل سکتی لیکن چونکہ تم ازراہ شفقت و محبت کہہ رہے ہو۔ لہٰذا میں اس بارہ میں کچھ غور کروں گا۔

بروایت ابن طاؤس جب صبح حضرت کا سامان سفر اونٹوں پر بار ہونے لگا تو محمد حنفیہ پھر حاضر خدمت ہوئے اور بے تابانہ ناقہ کی باگ پکڑلی اور رو رو کر کہنے لگے آپ نے غور کرنے کا وعدہ فرمایا تھا پھر کیا وجہ ہوئی کہ آپ نے اس قدر جلد سفر کا تہیہ فرمایا۔ حضرت نے فرمایا رات میں نے حضرت رسول خدا کو خواب میں یہ کہتے ہوئے سنا اے حسین جلد مکہ سے نکل مرضی الٰہی یہی ہے کہ تجھ کو اپنی راہ میں مقتول دیکھے۔

انہوں نے کہا اچھا اگر آپ جانا ہی چاہتے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جایئے کہ یہ موسم بہت خطرناک ہے۔ اس سخت گرمی میں پہاڑوں اور ریگستانوں کا سفر کرنا اپنے کو سخت ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ راستہ میں کوسوں پانی کا نشان نہیں ہر قدم پر دشمنوں کا خطرہ ہے ایسا نہ ہو کہ آپ کسی بلا میں گرفتار ہو جائیں۔

حضرت نے آبدیدہ ہوکر فرمایا نانا نے خواب میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ خدا ان عورتوں کو بھی اپنی راہ میں اسیر دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ اہلبیت مجھ سے اس درجہ مانوس ہیں کہ کسی طرح میرا تنہا جانا اور مجھ سے جدا ہونا گوارا نہ کریں گے۔ جب محمد حنفیہ مایوس ہوگئے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور بکمال حسرت و یاس ایک ایک کو رخصت کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ اسی وقت ابنِ عباس بھی حاضر خدمت ہوئے اور حضرت سے عرض کرنے لگے یا ابن رسول اللہ اگر آپ آمادۂ سفر ہیں تو اہل حرم کو اپنے ہمراہ نہ لے جایئے۔ حضرت نے فرمایا اے ابنِ عباس! یہ سب امانتِ حضرت رسولخدا ہیں مجھ کو کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس کے سپرد کر کے یہ امانت چلا جاؤں۔ دوسرے یہ لوگ مجھ سے اس درجہ مانوس ہیں کہ کسی طرح میرا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کریں گے۔

جب ابنِ عباس سے یہ گفتگو ہو رہی تھی پسِ پردہ سے ایک بی بی کے رونے کی آواز آئی اور انہوں نے فرمایا۔ واہ ابنِ عباس تم فرزندِ رسول کو خوب مشورے دے رہے ہو کہ فرزندِ رسول ہم کو چھوڑ جائیں اور تنہا یہاں سے چلے جائیں۔ خدا کی قسم اے ابن عباس ہماری زندگی اور موت حضرت کے دم کے ساتھ ہے۔ سوائے اس سہارے کے ہمارا دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ ہم کو مرنا گوارا ہے مگر حسین کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں۔ مومنین! یہ آواز کس بی بی کی تھی۔ یہ حسین کی دکھیا بہن جناب زینب تھیں جن کو اتنا مشورہ بھی ابن عباس کا گوارا نہ ہوا۔

آہ آہ مومنین! روزِ عاشورہ جناب زینب کے دل پر اس وقت کیا گزری ہوگی۔ جب جناب سید الشہداء رخصتِ آخر کے لئے خیمہ میں تشریف لائے ہوں گے اور جناب زینب کو اپنے مظلوم بھائی کی زندگی کی طرف سے قطعاً مایوسی ہوگئی ہوگی۔

الغرض امام حسین علیہ السلام آٹھویں ذی الحجہ کو مع اپنے اہلحرم کے عراق کی طرف روانہ ہوئے جب منزلِ ذاتِ عرق میں نزول اجلال فرمایا تو جناب عبداللہ مع اپنے دونوں فرزندوں عون و محمد کے وہاں پہنچے۔ دیر تک حضرت تنہائی میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ آپ نے حضرت عبداللہ سے فرمایا کہ میں تمہارا مدینہ میں رہنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ وہاں حرم رسول جناب اُمّ سلمہ اور حرم امیر المومنین جناب اُمّ البنین اور دیگر مستورات ہمارے خاندان کی ہیں۔ آپ چونکہ مدینہ میں ذی اثر ہیں۔ لہٰذا آپ کو میں وہیں رہنے کا حکم دیتا ہوں۔ جب جناب عبداللہ کو واپس ہونا پڑا تو اپنے دونوں فرزندوں کو خدمت امام میں پیش کر کے فرمایا اے فرزندو! خبردار تم حضرت سے ایک آن کے لئے جدا نہ ہونا اور راہِ خدا میں حضرت کے ساتھ جہاد کرنا میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اب میری جگہ فرزندِ رسول کو سمجھنا۔ اس کے بعد جناب عبداللہ تشریف لے گئے۔

بروایت لہوف جب حضرت منزل ثعلبیہ پر پہنچے تو نماز ظہر کے بعد آپ تھوڑی دیر کے لئے سو گئے۔ ناگاہ خواب میں کسی کو کہتے سُنا۔ یہ لوگ روانگی میں جلدی کر رہے ہیں اور موت ان کو جنت کی طرف لے جانے میں جلدی کر رہی ہے جب حضرت خواب سے بیدار ہوئے تو اپنے خواب کو حضرت علی اکبر سے بیان کیا۔ شہزادے نے عرض کی بابا جان! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ فرمایا بیٹا ہم ضرور حق پر ہیں۔ تب علی اکبر نے ایک شجاعانہ انداز سے کہا پھر ہم کو موت کی ذرا پروا نہیں۔ حضرت نے سینہ سے لگا کر فرمایا اے فرزند خدا تجھ کو جزائے خیر دے۔

اسی کتاب میں ہے کہ دوسرے روز جب حضرت نماز صبح سے فارغ ہوئے تو ابو ہرہ ازدی کوفہ کی طرف سے آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر پہلے تو مودبانہ سلام کیا پھر عرض کرنے لگا اے فرزند رسول اس کا کیا سبب ہے کہ آپ اس زمانہ میں حرم خدا و رسول کو چھوڑ کر عازم سفر ہوئے ہیں؟ آپ نے فرمایا اے ابو ہرہ سُن۔ بنی امیہ نے ہمارا مال ہم سے چھینا ہم نے صبر کیا۔ لیکن جب وہ جان و آبرو کے خواہاں ہوئے

تو مجھے گھر چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ ابو ہرہ کہتا ہے کہ حضرت کی یہ دردناک گفتگو سنکر میرے آنسو نکل پڑے۔

بروایت ارشاد جب حضرت منزل حاجز میں پہنچے تو حضرت نے قیس بن مسہر صیداوی کو اور ایک روایت کے موافق عبداللہ بن یقطر کو ایک خط دے کر کوفہ کی طرف روانہ کیا کیونکہ آپ حضرت مسلم کی طرف سے بہت متردد تھے۔ قیس اس خط کو لے کر قادسیہ تک پہنچے تھے کہ حصین بن نمیر نے جو ابن زیاد کی طرف سے امام علیہ السلام کی راہ روکنے آیا تھا ان کو گرفتار کر لیا اور حضرت کے خط کا تجسس کرنے لگا۔ قیس نے اس کا ارادہ معلوم کر کے خط کو فوراً چاک کر ڈالا۔ اس پر ابن نمیر کو غصہ آیا اور اس مومن پاک اعتقاد کو قید کر کے ابن زیاد کے پاس بھیجدیا۔ ابن زیاد نے ڈانٹ کر کہا تو نے خط کو کیوں چاک کیا۔ انہوں نے کہا اس لئے کہ تو میرے امام کے حالات سے واقف نہ ہو۔ ابن زیاد نے کہا میں تجھے اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک تو ان لوگوں کے نام مجھے نہ بتائے گا۔ جن کے نام خط بھیجا گیا تھا قیس نے فرمایا میں ہرگز تجھے ان میں سے کسی ایک کا نام بھی نہ بتاؤں گا یہ سنکر اس شقی نے حکم دیا کہ قیس کو مسلم بن عقیل کی طرح کوٹھے پر سے گرا کر ہلاک کر دو۔ منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام کو قیس کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو آپ آبدیدہ ہوئے اور دیر تک ان کی مغفرت کے لئے دعا فرماتے رہے۔

منقول ہے کہ جب ابن زیاد کو یہ معلوم ہوا کہ امام حسین علیہ السلام کوفہ کی طرف آرہے ہیں تو اس شقی نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی اور جابجا پہرے بٹھا کر آنے جانے والوں کا راستہ روک دیا۔ حضرت کو اس بندوبست کی اطلاع نہ تھی۔ آپ برابر منزلیں طے کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ جناب زہیر قین اور ان کے چند عزیز بھی مکہ سے حضرت کے ہم سفر تھے لیکن کسی منزل پر حضرت کے خیموں کے پاس اپنے خیمے نصب نہ کرتے تھے بلکہ دور دور رہتے تھے۔ ایک دن صبح کے وقت وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ کہ امام علیہ السلام کا بھیجا ہوا ایک شخص ان کے پاس آیا۔ اور سلام کر کے کہنے لگا مجھے حضرت امام حسینؑ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی ہر شخص نے نوالہ اپنے ہاتھ سے رکھ دیا اور ایسے خاموش ہو بیٹھے گویا کوئی پرندہ ان کے سروں پر بیٹھا ہے۔

بروایت ابن طاؤس زہیر کی بیوی نے جو پس پردہ بیٹھی تھی جب یہ حال دیکھا تو جھڑک کر کہنے لگی۔ مرحبا! اے زہیر تمہاری حمیت پر کہ فرزند رسول اپنا آدمی تمہارے لئے بھیجیں اور تم فوراً حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہو۔ اے زہیر تمہاری شجاعت وغیرت کو کیا ہو گیا۔ کم سے کم اتنا تو پوچھا ہوتا کہ حضرت کس غرض سے بلا رہے ہیں اے زہیر اگر تمہیں وہاں جانے میں تامل ہو تو اجازت دو کہ میں اپنے امام کی خدمت میں حاضر ہو کر تمہارے بلانے کا سبب معلوم کروں۔ یہ سنکر زہیر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت نے کچھ دیر ان سے گفتگو کی اب جو زہیر وہاں سے پلٹے تو چہرہ پر شگفتگی کے آثار نمایاں تھے فوراً اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خیمے یہاں سے اکھاڑ کر امام علیہ السلام کے خیموں کے پاس لگائے جائیں۔

اس کے بعد جناب زہیر نے اپنی بی بی سے فرمایا میں نے آج سے اپنے تئیں امام علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔ اب میں اپنی جان حضرت پر فدا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو بہتر یہ ہے کہ طلاق لے کر تم اپنے قبیلہ میں چلی جاؤ مجھے یہ گوارا نہیں کہ بعد میرے ناموس کی ہتک ہو۔ یہ سننا تھا کہ وہ مومنہ رو کر کہنے لگی اے زہیر مرحبا تم نے کیا خوب میرے آرام کی صورت نکالی اے زہیر مقام تامل ہے تمہیں اپنی بی بی کی آبرو کا تو اتنا لحاظ ہے اور ان نبی زادیوں کا کچھ خیال نہیں جو میرے سید و مولا امام حسین کے ساتھ اس سفر میں ہیں۔ اے زہیر! تم میرا غم نہ کرو تم شوق سے فرزند رسول پر اپنی جان فدا کرو۔ میں دختران علی و فاطمہ کی خدمت کروں گی میرے لئے

اس سے زیادہ اور کیا شرف ہو سکتا ہے کہ کنیزوں کی طرح ان کی خدمت میں ہر وقت لگی رہوں۔ لے زہیر! مجھ سے یہ ہرگز نہ ہو گا کہ طلاق لیکر یہاں سے چلی جاؤں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب زہیر نے انہیں سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیک سیرت بی بی کربلا میں موجود تھیں۔

آہ مومنین! ہمارے مظلوم امام پر کیسا مصیبت کا وقت آ گیا تھا کہ غیر عورتیں ہمدردی کا اظہار کر رہی تھیں۔ الغرض اس کے بعد جناب زہیر نے اپنے ساتھیوں کو تو رخصت کیا اور وہاں سے برابر امام علیہ السلام کے ساتھ رہے تا آنکہ کربلا میں جام شہادت نوش کیا۔

کتاب ارشاد میں ہے کہ جب حضرت مقام زرود میں پہنچے تو ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا حضرت نے فرمایا اس شخص سے کوفہ کا حال معلوم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ لوگ گئے اور اس کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے۔ آپ نے اس سے پوچھا اے بھائی تجھے کچھ حال کوفہ کا بھی معلوم ہے اس نے کہا میں وہاں کا کیا حال بیان کروں مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ شہید کر دیئے گئے اور ان دونوں کے پیروں میں رسی باندھ کر کوفہ کے بازاروں میں کھینچا گیا۔ تمام اہلِ کوفہ آپ کے خلاف ہیں بہتر یہ ہے کہ آپ یہاں سے پلٹ جائیں اور ہرگز کوفہ کا قصد نہ فرمائیں۔

آہ آہ جب حضرت نے یہ ملال انگیز خبر سنی تو دل تڑپ گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔ آپ نے اولادِ عقیل کی طرف دیکھکر فرمایا مسلم تو قتل ہو گئے اب تمہاری کیا رائے ہے انہوں نے عرض کی قسم خدا کی جب تک ہم مسلم کے خون کا بدلہ نہ لیں گے ہرگز یہاں سے نہ پلٹیں گے خواہ ہم سب قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ حضرت نے فرمایا بے شک مسلم کے بعد اب لطفِ زندگی نہیں رہا۔ آہ مسلم کی شہادت نے میرے کلیجہ کو پارہ پارہ کر دیا۔ دنیا اس وقت میری آنکھوں میں اندھیر ہے۔

سیّد ابنِ طاؤس اور صاحب ریاض المصائب لکھتے ہیں کہ جب حضرت مسلم کی خبر شہادت امام حسین علیہ السّلام نے سُنی تو آپ بحالِ پریشان خیمہ میں تشریف لائے۔ اور دختر جناب مسلم کو جو بہت ہی کمسن تھیں اپنے پاس بلا کر پیار کرنے لگے۔ بار بار اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ بھی کچھ سمجھی۔ عرض کرنے لگی پچاجان! آپ اس وقت میرے اوپر اس طرح شفقت فرما رہے ہیں جیسے یتیموں پر کی جاتی ہے۔ یہ تو فرمایئے میرے بابا تو خیر سے ہیں۔ آہ یہ سنتے ہی حضرت کو تابِ ضبط نہ رہی بے اختیار رو رو کر فرمانے لگے بیٹی ابھی کوفہ سے خبر آئی ہے کہ تیرا باپ شہید کر دیا گیا۔ آہ مسلم کی موت نے حسین کو زندہ در گور کر دیا۔

لکھا ہے کہ جب بی بیوں نے حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سُنی تو ایک کہرام بپا ہو گیا ہر طرف سے واسلماہ واسلماہ کی آواز آ رہی تھی خاصکر جناب مسلم کی زوجہ اور ان کی اولاد کا اس غم سے عجیب حال تھا۔ اول تو یوں ہی کسی عزیز کا مرنا دل کے ٹکڑے کر دیتا ہے اور پھر یہ غریب الوطنی کی موت۔ آہ کیا حال ہوا ہو گا اہل حرم کا جب یہ سنا ہو گا کہ انتہائی بیکسی کے ساتھ جناب مسلم شہید ہوئے اور ان کی لاش گلی کوچوں میں کھینچا گیا۔ اپنے کسی عزیز کی لاش کی توہین سے جو صدمہ انسان کے دل کو پہنچتا ہے اس کو کون نہیں جانتا۔ اس خبر سے جو خیر حال ان بی بیوں کا ہوا ہو گا اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ آہ جناب مسلم کی شہادت تباہی و بربادی کا پیش خیمہ تھی۔

حضرات! ذرا تصور کیجئے کہ جناب مسلم کی زوجہ کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ ایک تو اپنے عزیز شوہر کے قتل ہونے کا صدمہ، دوسرے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال۔ اول تو یہ مظلوم یوں ہی ان کی جدائی کے غم میں شب و روز رویا کرتی تھیں اب جو یہ خبر سُنی ہو گی کہ باپ بھی پردیس ہی میں ان سے جدا ہو گیا تو صدمہ سے کلیجہ پھٹ گیا ہو گا۔ یہ خیال دل کو کتنا بےچین بنا رہا ہو گا کہ میرے کمسن بچوں پر باپ کی شہادت کے بعد کیا گزری ہو گی کس سے فریاد کی ہو گی کہاں پناہ لی ہو گی اول تو کمسنی اور پھر یتیمی کی بلا سارا شہر دشمن کہاں گئے ہوں گے اور کیا کیا ہو گا۔ ان باتوں کے تصور سے ان کا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہو گا چاہتی تھیں کہ کسی طرح جلد از جلد کوفہ پہنچکر اپنے پریشان حال بچوں کو چھاتی سے لگا لیں۔ آہ آہ۔ اس دکھیا ماں کو کیا خبر تھی کہ کوفہ میں اس کے دونوں کمسن بچوں کے گلے پر چھری چل گئی۔ اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

چھٹی مجلس

مہمان نوازی کے فضائل۔ امام علیہ السلام کی حُر سے ملاقات اور کربلا میں ورود

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ اکرموا الضیف ولوکان کافراً۔ یعنی اپنے مہمان کا اکرام کرو اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام میں مہمان کا خاص مرتبہ ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کے یہاں اگر کوئی بندۂ خدا مہمان ہو اور اپنا رزق اس کے دسترخوان پر بیٹھ کر کھائے۔ لکھا ہے کہ عرب اتنے بڑے مہمان نواز تھے کہ جب ان کے یہاں کوئی مہمان آجاتا تھا تو سارے گھر میں عید ہو جاتی تھی اس گھر کے تمام زن و مرد بچے اور بوڑھے سب اس کی خدمت کرنا اپنی سعادت جانتے تھے۔ وہ راتوں کو پہاڑوں کے اوپر اس لئے آگ روشن کر دیتے تھے کہ بھولا بھٹکا مسافر ہماری آبادی کا پتہ لگا کر ہمارے یہاں مہمان ہو جائے۔ جو شخص ان کے یہاں مہمان ہوتا تھا وہ اس کی جان و مال کے ایسے محافظ بنتے تھے کہ اپنی جان دے دیتے تھے مگر مہمان پر آنچ نہ آنے دیتے تھے۔

منقول ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام اس درجہ مہمان نواز تھے کہ جب تک کوئی مہمان نہ آتا تھا آپ کھانا نہ کھاتے تھے آپ کا معمول تھا کہ روز سرِ راہ جا کر کھڑے ہوتے اور ادھر سے گزرنے والے لوگوں سے اپنے گھر مہمان ہونے کی درخواست کرتے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ دو دن تک کوئی شخص آپ کے یہاں مہمان نہ ہوا اور آپ برابر اس کے انتظار میں بھوکے رہے تیسرے دن آپ حسبِ معمول پھر تلاش مہمان میں نکلے اتفاقاً ایک شخص اس طرف سے گزرا آپ نے نہایت لجاجت کے ساتھ فرمایا اے شخص میرا دل چاہتا ہے کہ آج تجھ کو اپنا مہمان بناؤں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو میری اس آرزو کو پورا کرے۔ اور میری روکھی سوکھی روٹی پر قناعت کرے۔

وہ شخص حضرت ابراہیم کی مہمان نوازی کا حال سن چکا تھا۔ اس بات کے سنتے ہی خوش ہو گیا۔ اور آپ کے ساتھ چلنے لگا۔ جنابِ خلیل بڑے احترام کے ساتھ اس مہمان کو لے کر اپنے گھر آئے اور اپنے غلاموں کو دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ جب سب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو جناب ابراہیم اور آپ کے متعلقین نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر کھانا شروع کیا۔ لیکن مہمان کی زبان سے یہ کلمات نہ سنے گئے۔ حضرت نے فرمایا اے شخص کیا یہ شرطِ مروت و انسانیت نہیں کہ جب تو کھائے تو روزی دینے والے کے نام سے اس کا آغاز کرے۔ اس نے کہا میرے مذہب میں ایسا کہنے کا حکم نہیں۔ پوچھا اے شخص تو کس دین کا پیرو ہے۔ اس نے کہا میں آتش پرست ہوں۔ یہ سُن کر جناب ابراہیم مکدر ہوئے اور اس کو دشمنِ خدا سمجھ کر نہایت ذلت کے ساتھ اپنے گھر سے نکلوا دیا۔

اس کا گھر سے نکلنا تھا کہ جناب خلیل پر وحی ہوئی کیوں اے ابراہیم کیا مہمان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا روا ہے اے ابراہیم اگر وہ دشمن تھا تو میرا نہ کہ تمہارا۔ باوجودیکہ وہ مجھے خدا نہیں مانتا مگر میں نے آج تک اپنی نعمت کو اس پر بند نہیں کیا۔ باوجودیکہ میں نے اسے پیدا کیا ہے ہر قسم کی آسائش دی ہے مگر وہ بجائے میرے آگ کو سجدہ کرتا ہے تاہم میری رحمت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ کہ اپنی روزی سے اس کو محروم رکھوں۔

اے خلیل! تم نے اسے پیدا کیا ہے نہ تم اس کے روزی رساں ہو۔ نہ تم اس کے معبود ہو پھر بھی تم کو اس پر اتنا غصہ آیا۔ اے ابراہیم! وہ اپنی روزی صرف تمہارے دسترخوان پر کھانا چاہتا تھا تم نے اتنی بات بھی منظور نہ کی۔ اگر تمہاری طرح ہم بھی اپنے بندوں کو اسی طرح ذلت و ناکامی کے ساتھ اپنے دسترخوانِ کرم پر سے اٹھا دیں تو بتاؤ پھر ان کا روزی دینے والا کون ہے۔

اے خلیل تم نے یہ امر ہماری مرضی کے مطابق نہ کیا۔ اگر تم ہم کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو ابھی جاؤ اور جس طرح بنے اسے راضی کرکے لاؤ۔ اس وحی الٰہی سے حضرت ابراہیم تھر تھر کانپنے لگے اور اسی وقت دوڑے ہوئے اس شخص کے پیچھے گئے۔ اور انتہائی منت و سماجت کے بعد اس کو راضی کرکے واپس لائے۔

حضرات! سنا آپ نے مہمان کا کتنا بڑا مرتبہ ہے۔ اسلام نے اس بارہ میں بڑی تاکید کی ہے کہ مہمان کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ اہلبیت علیہم السلام کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی مہمان ان کے یہاں آتا تو وہ چاہے خود فاقہ پر فاقہ کر لیتے لیکن مہمان کا فاقہ سے سلانا گوارا نہ کرتے اور جب مہمان رخصت ہونے لگتا تو جو کچھ ممکن ہوتا بطور تحفہ اس کی خدمت میں پیش کرتے۔

حضرت رسولِ خدا کی نظر میں مہمان نوازوں کی اتنی بڑی عزت تھی کہ ایک جنگ کے بعد جب کچھ قیدی آپ کے سامنے پیش ہوئے تو ان میں عرب کے مشہور و معروف سخی و مہمان نواز حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی جب حضرت کے سامنے اس کا نام لیا گیا تو آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو۔ اس کا باپ بڑا سخی و مہمان نواز تھا مجھے شرم آتی ہے کہ ایسے مہمان نواز کی لڑکی کو اپنے سامنے قیدی کی صورت میں کھڑا رکھوں۔

کیوں حضرات جس گھر سے مہمان نوازی کی تعلیم اس طرح دی گئی ہو افسوس صد افسوس اہل کوفہ نے انہی برگزیدگانِ الٰہی کو مہمان بلا کر وہ غداری کی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر ڈھونڈی نہیں ملتی۔ آہ آہ امام حسین علیہ السلام کو اہل کوفہ نے خط پر خط بھیجکر بلایا لیکن جب حضرت بصورت مہمان وہاں پہنچے تو ظالموں نے نگاہ پھیر لی اور وہ وہ ظلم کئے کہ ان کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

لکھا ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام منزلِ شراف سے آگے بڑھے تو ایک آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے باآوازِ بلند تکبیر کہی حضرت نے پوچھا اس وقت تمہارے تکبیر کہنے کا کیا سبب ہے اس نے کہا مجھے دور سے خرمے کے درخت نظر آ رہے ہیں جس سے میں سمجھتا ہوں کہ پانی ہم سے قریب ہے اب ہم اپنی مشکوں کو بھر لیں گے۔ یہ سنکر حضرت کے بعض اصحاب نے کہا خدا کی قسم ہم نے اس مقام پر کبھی خرمے کے درخت نہیں دیکھے حضرت نے کہا پھر تم کو کیا معلوم ہوتا ہے انہوں نے بغور نگاہ کرکے کہا ہم کو تو نیزوں کی انیاں اور گھوڑوں کے کان نظر آتے ہیں۔ یقیناً کوئی لشکر اس طرف آ رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا بے شک مجھے بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اگر کوئی مقام یہاں پناہ کا مل جاتا تو ہم اپنی پشت اس طرف رکھتے اور سامنے سے دشمن کا مقابلہ کرتے۔

اصحاب میں سے ایک نے کہا آپ بائیں طرف میل فرمائیں۔ وہاں ذو حشم مقام پر انصار کا ایک قبیلہ رہتا ہے۔ اول تو وہ مقام محفوظ ہے دوسرے وہ لوگ ہماری مدد کریں گے حضرت کو یہ رائے پسند آئی اور بائیں طرف کا رخ کیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ گھوڑوں کی گردنیں صاف نظر آنے لگیں اور ان کے رخ بھی اسی طرف کو ہو گئے جدہر حضرت جا رہے تھے مگر حضرت کا قافلہ ان لوگوں سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔

حضرت نے حکم دیا کہ خیمے استادہ کرکے الجوم کو ان میں اتارو اور اس قوم سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

دوپہر کا وقت تھا سخت دھوپ پڑ رہی تھی کہ وہ لوگ جو ایک ہزار کی تعداد میں تھے مع اپنے سردار حُر بن یزید ریاحی کے وہاں پہنچے۔ لیکن پیاس سے ان کا غیر حال تھا۔ ایک ایک سپاہی کی جان لبوں پر تھی۔ گھوڑوں کی زبانیں باہر نکل آئی تھیں قریب تھا کہ بے دم ہو کر خاک پر گر پڑیں امام علیہ السّلام کا یہ رحم و کرم دیکھنے کے قابل ہے کہ ان کی یہ تباہ حالت دیکھ کر آپ نے ہاشمی جوانوں کو حکم دیا کہ اس قوم کو اور اس کے حیوانوں کو سیراب کرو۔ کسی نے عرض کی فرزندِ رسول اول تو یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ دوسرے اگر ہم نے سب پانی ان کو پلا دیا تو پھر ہم کیا پئیں گے۔ ہمارے ساتھ عورتیں اور ننھے ننھے بچے ہیں یہ کیونکر بغیر پانی کے رہ سکتے ہیں۔ یہاں آس پاس ہم کو کہیں پانی نظر نہیں آتا۔ حضرت نے فرمایا جو کچھ بھی ہو لیکن مجھ سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ الغرض حضرت کا یہ حکم سنتے ہی جوانانِ علوی و جعفری و عقیلی نے پانی کے بھرے ہوئے مشکیزے اٹھا لئے اور فوجِ حُر کو پانی پلانا شروع کیا۔ جب تمام لشکر سیراب ہو گیا۔ تو پھر ان کے گھوڑوں کے سامنے پانی سے بھرے ہوئے طشت رکھے گئے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے خود سقائی کی اور اس قوم کو بار بار پانی پلا کر سیراب کیا۔

جب پانی پلانے سے فراغت ہوئی تو نماز ظہر کا وقت آ گیا حضرت نے حجاج ابنِ مسروق کو حکم دیا کہ اذان کہیں اس کے بعد آپ نے لشکر حُر سے مخاطب ہو کر فرمایا اے قوم! میں اپنی خواہش سے اس طرف نہیں آیا بلکہ جب تم لوگوں نے بہ کثرت خطوط میری طلب میں بھیجے اور پے در پے قاصد روانہ کئے تب ادھر کا قصد کیا ہے۔ تم نے بار بار مجھے اپنے خطوط میں لکھا کہ یہاں ہمارا کوئی ہادی و امام نہیں۔ آپ جلد تشریف لائیے تاکہ ہم ہدایت حاصل کریں۔ پس اگر تم اپنے اس قول پر قائم ہو تو میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اپنے عہد و پیمان سے مجھے مطمئن کر کے خوش کرو۔ اور اگر تم میرے آنے سے ناخوش ہو تو میں یہیں سے واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت کا یہ کلام سنکر سب خاموش ہو گئے اور کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

پس حضرت نے موذن کو اقامت کہنے کا حکم دیا اور آپ کے ہمراہی صفیں باندھ کر نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ حضرت نے حُر سے فرمایا تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا کرو۔ انہوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا ہم بھی آپ کے ساتھ پڑھیں گے پس دونوں لشکروں نے حضرت کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ بعد نماز حضرت اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اور حُر اپنے لشکر کی طرف واپس چلے گئے۔ جب نماز عصر کا وقت آیا تو حضرت پھر خیمے سے برآمد ہوئے اور پھر دونوں لشکروں نے حضرت کے پیچھے نماز پڑھی۔

نماز کے بعد آپ لشکرِ حُر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ایہا الناس اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو اور اہل حق کے حق کو سمجھو تو خدائے تعالیٰ تم سے راضی ہوگا۔ لوگو! اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے اور ہمارے حقوق کے متعلق تمہاری رائے بدل گئی ہے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔

حُر نے عرض کی قسم بخدا جو کچھ آپ نے فرمایا میں ان باتوں سے قطعاً بے خبر ہوں مجھے نہ تو خطوط بھیجنے کی اطلاع ہے نہ قاصدوں کے روانہ کرنے کی۔

حضرت نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا ذرا وہ خُرجیاں تو لے آؤ۔ جن میں اہلِ کوفہ کے خطوط ہیں۔ جب وہ خطوط سے بھری ہوئی خُرجیاں آئیں تو آپ نے حُر کے سامنے رکھ کر فرمایا یہ سب خط اہلِ کوفہ کے ہیں۔ حُر نے کہا میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے آپ کے پاس یہ خطوط بھیجے ہیں میں ابن زیاد امیر کوفہ کی طرف سے اس امر پر مامور ہوا ہوں کہ آپ کا ساتھ اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک آپ کو اس کے سامنے کوفہ میں نہ پیش کروں۔ حضرت نے فرمایا اے حُر تیری موت بہ نسبت تیرے ارادہ کے تجھ سے زیادہ قریب ہے۔

اس کے بعد حضرت نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ اور سفر کی تیاری کرو۔ سب اصحاب حکمِ امام کے منتظر تو تھے ہی فوراً سامان اور اہل
پربار کے اہلِ حرم کو سوار کیا اور وہاں سے روانگی پر آمادہ ہوئے۔ حُر کے لشکر نے آگے بڑھ کر راستہ روکا۔ حضرت نے غضبناک ہو کر حُر سے فرمایا۔ تیری ماں
تیرے ماتم میں بیٹھے کیا ارادہ رکھتا ہے۔ حُر نے کہا یا ابن رسول اللہ اگر آپ کے سوا کوئی دوسرا یہ کلمہ کہتا تو میں بھی جواب میں اس کی ماں کا ذکر اسی طرح
کرتا لیکن آپ کی مادرِ گرامی کے متعلق سوائے ذکرِ خیر اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا آخر تیرا کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ کو ابنِ زیاد کے سامنے پیش کر دوں۔ فرمایا میں ہرگز اس کو
گوارا نہ کروں گا۔ حُر بولے تو میں بھی آپ کو نہ چھوڑوں گا۔ مجھے ابن زیاد نے آپ سے لڑنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ صرف کوفہ تک لانے کا حکم دیا ہے پس اگر
آپ کو کوفہ جانے سے انکار ہے تو ایسی راہ اختیار کیجئے جو نہ کوفہ کو جاتی ہو نہ مدینہ کو تاکہ میں بدنام نہ ہوں۔ میں ابن زیاد کو آپ کے متعلق خط لکھتا ہوں
ممکن ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی سامان ایسا پیدا ہو جائے کہ آپ مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔

الغرض حضرت وہاں سے بائیں طرف کو روانہ ہوئے۔ لشکرِ حُر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ راستہ میں حُر نے کہا فرزندِ رسول مجھے
اس امر کی فکر ہے کہ اگر آپ نے جنگ کا قصد کیا تو یہ لوگ آپ کو بغیر قتل کئے نہ چھوڑیں گے۔ حضرت نے فرمایا وائے ہو تجھ پر تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے
اے حُر! میں ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

جب حُر نے دیکھا کہ حضرت کسی طرح اس کی رائے پر عمل کرنے والے نہیں تو اپنے لشکر کو حضرت کے لشکر سے جدا کر کے ایک دوسری راہ اختیار کی

کتاب منتخب المجالس میں ہے کہ جب امام حسین علیہ السّلام کا ورود سرزمینِ کربلا پر ہوا تو لیکایک آپ کا گھوڑا چلتے چلتے رک گیا۔ ہر چند حضرت
نے بہتیری کوشش کی لیکن گھوڑے نے قدم نہ اٹھایا۔ آپ اس گھوڑے پر سے اتر پڑے اور دوسرا گھوڑا بدلا لیکن وہ بھی رک گیا نہ بڑھا۔ بروایت ابو مخنف حضرت
نے چھ گھوڑے بدلے لیکن کسی ایک نے بھی قدم نہ اٹھایا۔ تب آپ نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا اس مقام کا کیا نام ہے؟ انھوں نے کہا اس کو
غاضریہ کہتے ہیں فرمایا اس کا کوئی اور نام بھی ہے۔ کہا اس کو نینوا بھی کہتے ہیں۔ حضرت نے پوچھا ان دو ناموں کے سوا کوئی اور نام بھی ہے؟ انہوں نے
کہا ہاں اس کو کربلا بھی کہتے ہیں۔ یہ سنکر حضرت نے آہِ سرد اپنے دردمند دل سے کھینچی اور آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ واللہ یہی سرزمین ہماری قتل گاہ
ہے پھر اپنے ہمراہیوں سے فرمایا بس ہمارا سفر تمام ہوا اونٹوں کو بٹھاؤ۔ اور اہلِ حرم کو اتارو۔ بخدا یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارا خون پانی کی طرح بہایا جائیگا
یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم سب کی قبریں بنیں گی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ہم روزِ قیامت اٹھیں گے۔ یہی وہ میری وعدہ گاہ ہے جس کی خبر میرے نانا
حضرت رسولِ خدا نے دی تھی۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت کو معلوم ہوا کہ یہ سرزمینِ کربلا ہے تو تھوڑی سی خاک وہاں کی اٹھا کر پہلے خود سونگھی اس کے بعد جناب
زینب کو سونگھائی۔ آہ آہ مومنین! جوں ہی جناب زینب نے اس خاک کو سونگھا۔ گھبرا کر کہنے لگیں۔ بھیا اس خاک کو پھینکو مجھے اس سے آپ
خون کی بو آتی ہے۔ میرا دل سخت بے چین ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے جلد اس سرزمین سے آگے بڑھو۔ حضرت نے رو کر فرمایا اے بہن بس ہمارا سفر تمام
ہو گیا۔ اب آگے ہم کو کہیں نہیں جانا

بروایت مناقب کربلا میں حضرت کا ورود ۲ محرم روزِ چہارشنبہ یا پنجشنبہ سنہ ۶۱ھ میں ہوا۔ بروایت منتخب جب حضرت کو یہ معلوم ہو

یہ زمین کربلا ہے تو آپ گھوڑے سے اتر پڑے اور نہایت دردناک لہجہ میں آپ نے چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ ہے۔

اے دنیا! وائے ہو تیرے اوپر تو عجب بے وفا دوست ہے کہ انسان کو صبح و شام تجھ سے رنج پہنچتا ہے اے دنیا تو نے کیسے کیسے حق پسند اور صداقت شعار لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ لیکن پھر بھی تجھ کو قناعت نہ ہوئی اور برابر لوگوں کو ہلاک کئے چلی جارہی ہے بے شک ہر زندہ کو یہ راہ درپیش ہے۔ جو میرے سامنے آنے والی ہے۔ بے شک ہر امر کی انتہا خدائے جلیل تک ہے۔

حضرت بار بار ان اشعار کو پڑھتے تھے یہاں تک کہ جناب زینب نے بھی حضرت کا یہ کلام سنا گھبرا کر حضرت کے پاس آئیں اور رو رو کر عرض کرنے لگیں اے بھائی! کاش اس دکھیا بہن کو موت آجاتی اور آپ سے ایسا یاس آمیز کلام نہ سنتی۔ اے یادگار گزشتگان اے سرپرست باقی ماندگان آپ اس وقت ایسا کلام فرمارہے ہیں جیسا اپنی زندگی سے مایوس انسان کہا کرتا ہے۔

آہ آہ! آج کا دن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے نانا حضرت رسولخدا اور پدر بزرگوار حضرت علی مرتضیٰ نے قضا کی ہے۔ آج میرے دل پر وہی رنج و غم طاری ہے جو میری مادر گرامی جناب فاطمہ زہرا یا میرے بھائی حسن مجتبےٰ کی رحلت کے دن ہوا تھا میں سمجھتی ہوں کہ آج خاتمہ پنجتن ہے۔ بھائی جان! آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا ہے۔ فرمایا۔ ہاں بہن تمہارا خیال درست ہے۔ میری زندگی کی مدت عنقریب ختم ہونے والی ہے۔ اور موت میرے سامنے آرہی ہے۔

یہ سنتے ہی جناب زینب کو تاب ضبط نہ رہی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کی آواز گریہ سنکر تمام عورتوں میں کہرام بپا ہو گیا حضرت سب کو تسکین دینے لگے اور فرمانے لگے۔ اس غم سے ہلاک نہ کرو۔ دنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے کو نہیں آیا۔ ایک نہ ایک دن ہر شخص کو موت کا تلخ جام پینا ہے۔ یہ سنکر جناب زینب و ام کلثوم نے عرض کی اے بھائی اگر آپ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا ہے۔ تو ہم کو ہمارے نانا کے روضہ پر پہنچا دیجئے کیونکہ ہم سے آپ کا قتل ہونا نہ دیکھا جائے گا۔ آہ بھائی ہم بیکسوں کا آپ کے بعد کون ہوگا حضرت نے آہ سرد بھر کر فرمایا اے بہن اگر میرا اختیار ہوتا تو تم کو اس بلا میں کیوں پھنساتا۔ اے بہن صبر کرو اور جو مصیبت سر پر آئے اس کو برداشت کرو کہ پیش خدا صابروں کا بڑا اجر ہے اے بہن مرضی خدا میں کسی کا زور نہیں۔ خدا کی مشیت یہی ہے کہ وہ اپنی راہ میں مجھ کو مقتول دیکھے۔

کشکول عاملی میں ہے کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام وارد کربلا ہوئے تو آپ نے قبیلہ بنی اسد کے چند سرداروں کو جو کربلا کے زمیندار تھے بلا کر فرمایا میں چاہتا ہوں کہ تم یہ زمین میرے ہاتھ بیع کر دو۔ انہوں نے عرض کی حکم امام کی تعمیل میں ہم کو کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس سرزمین پر جو نبی یا وصی آیا اس نے ضرور تکلیف اٹھائی۔ ہماری رائے یہ ہے کہ آپ یہاں قیام کا ارادہ نہ فرمائیں۔ یہ جگہ رہنے کی نہیں۔ حضرت نے فرمایا مشیت الہیٰ یہی ہے کہ قیامت تک ہماری خوابگاہ یہی زمین ہو۔ الغرض آپ نے ساٹھ ہزار درہم میں چار میل زمین مول لی۔ اس کے بعد وہ کل زمین بطور تصدق انہی زمینداروں کو عطا فرمادی لیکن دو شرطوں کے ساتھ اول یہ کہ جس جگہ میری اور میرے اصحاب کی قبریں بنائی جائیں تم کبھی اس پر زراعت نہ کرنا۔ دوسرے یہ کہ اگر ہمارے شیعوں میں سے کوئی شخص ہمارے قبور کی زیارت کو آئے تو اس کو تین دن اپنا مہمان رکھنا اور میرے زائروں کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچانا۔

حضرات ہمارے امام مظلوم نے تین دن مہمان رکھنے کی شرط شاید اس لئے لگائی تھی کہ جب ہمارے شیعوں کو تین روز راحت ملیگی

تو وہ یہ تصور کریں گے کہ ہمارے مظلوم امام کو اس سرزمین پر تین روز آب و دانہ نہ ملا تھا۔

آہ آہ مومنین! ہمارے مظلوم آقا نے تو اپنے زائروں کے لئے یہ اہتمام ملحوظ رکھا تھا لیکن اشقیائے امت نے زائرانِ سید الشہداء کو وہ اذیتیں پہنچائیں کہ ان کے بیان سے دل ہلتا ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ متوکل عباسی کے زمانہ میں کسی کو اجازت نہ تھی کہ قبر حسین کی زیارت کا شرف حاصل کرے جو لوگ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے وہاں پہنچتے تھے۔ ان کو کوڑوں سے مارا جاتا تھا ان کے گھر لوٹ لئے جاتے تھے۔ ایک مدت تک زائرین حسین پر طرح طرح کے ظلم و ستم ہوتے رہے۔

قبروں کے بارہ میں حضرت نے بنی اسد سے یہ شرط کی تھی کہ زراعت نہ کرنا تاکہ میری قبر کا نشان باقی رہے لیکن کیسے شقی اور بدبخت تھے وہ لوگ جو اپنے کو مسلمان کہہ کر نواسہ رسول کی قبر کا نشان تک بھی دنیا میں باقی نہ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ متوکل عباسی ملعون نے کئی بار قبر مبارک امام حسین علیہ السلام کے مسمار کرنے کا حکم دیا لیکن اس کی یہ ظالمانہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

ایک بار اس شقی نے ایک بہت بڑا لشکر کربلا میں بھیجا کہ تمام قبروں کو مسمار کر کے وہاں ہل چلا دے اور فرات کا پانی بہا کر بالکل نام و نشان مٹا دے۔ لکھا ہے کہ جب فرات کو کاٹ کر پانی لائے تو وہ ضریح اقدس کے چاروں طرف گھوم کر ٹھہر گیا گویا اس ظلم پر اپنی حیرانی کا اظہار کر رہا تھا حضرت پانی کو شرم آئی ہو گی کہ جب میں زندگی میں ان پیاسوں تک نہ پہنچ سکا تو اب مرنے کے بعد کیا منہ لے کر سامنے جاؤں ؎

اے آب خاک شو کہ ترا آبرو نہ ماند — آزردہ رفت از تو لب تشنہ حسین

آہ آہ مومنین! اسی فرات کا پانی تھا جس کو روز عاشور چھوٹے چھوٹے بچے ترپ رہے تھے اور ہمارے مظلوم آقا کا یہ حال تھا کہ پیاس کی شدت سے بار بار زبان ہونٹوں پر پھیرتے تھے ؎

از آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں — خوش داشتند حرمتِ مہمانِ کربلا

بودند دام و دد ہمہ سیراب و مے مکید — خاتم ز قحط آب سلیمانِ کربلا

مقتل ابو مخنف میں ہے کہ جب ابن زیاد کو یہ معلوم ہوا کہ امام حسین علیہ السلام کوفہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں تو اس نے تمام سرداران لشکر کو جمع کیا اور ان سے کہا اے گروہ عرب تم کو لازم ہے کہ دنیوی دولت و منصب حاصل کرنے کی طرف مائل ہو۔ پس تم میں کون بہادر ایسا ہے کہ حسین بن علی کا سر کاٹ کر لائے اور اس کے بدلہ میں یزید کی سرکار سے مستحق دولت و اکرام ہو۔ اس بدانجام کا یہ کلام سنکر کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوسری بار پھر اس نے کہا تم میں کون ایسا ہے کہ حسین کا سر کاٹ کر لائے اور اس کے عوض بیس برس تک ملک رے پر قابض رہے۔ یہ سنکر ابن سعد ملعون اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے امیر مجھے ایک رات کی مہلت دے میں کل صبح اس کا جواب دوں گا۔ پس اس ملعون نے ایک شب کی مہلت دی عمر سعد وہاں سے اپنے گھر آیا۔

جب اس عاقبت برباد کے اس ارادہ کی خبر مشہور ہوئی تو بہت سے لوگ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے وائے ہو تجھ پر اے پسر سعد تو فرزند رسول ثقلین حضرت امام حسین سے لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حالانکہ تیرا باپ سعد سادس الاسلام تھا۔ اس بے حیا نے ان سے تو کہہ دیا آپ اطمینان رکھیں میں یہ کام نہ کروں گا۔ لیکن اپنے دل میں متردد تھا کہ اگر قتلِ حسین گوارا نہیں کرتا تو ملک رے میرے ہاتھ سے جاتا ہے آخر کار اس

ملعون نے حکومت کو اختیار کیا، اور دوسرے دن پسر زیاد سے جا کر کہا اے امیر میں اس عظیم الشان خدمت کو انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ ابن زیاد نے خوش ہو کر کہا بے شک تو ہی اس کام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اب تجھے لازم ہے کہ بہت جلد یہاں سے روانہ ہو اور جہاں کہیں حسین بن علی علیہ السلام کو پائے ان کو گھیر لے۔ ہر گز مہلت نہ دینا اور ان پر اور ان کے رفقاء پر پانی بند کر دینا پھر ان کو شہید کر کے سر میرے پاس بھیج دینا۔

لکھا ہے کہ پہلے ابن زیاد نے چھ ہزار سواروں کی جمعیت سے عمر سعد کو روانہ کیا اس کے بعد عروہ بن قیس کو دو ہزار سواروں کے ساتھ بھیجا پھر سنان بن انس کو چار ہزار سوار دے کر بھیجا۔ پھر شمر ذی الجوشن کو چار ہزار سوار کے ساتھ روانہ کیا۔ راوی کہتا ہے کہ ساتویں محرم تک کربلا میں ستر ہزار فوج کوفے آکر جمع ہو گئی اور مقتل ابو مخنف میں ہے کہ اسی ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے اس شقی نے قتل حسین کے لئے روانہ کئے اس کے بعد جو شخص بھی اس کے سامنے آیا برابر کربلا کی طرف روانہ کرتا رہا یہاں تک کہ فوج کی کثرت سے کربلا کا تمام میدان پر ہو گیا۔

کتب مقاتل میں ہے جوں جوں فوجوں کی آمد کا حال اہل حرم کو معلوم ہوتا تھا ان کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ خاصکر ہماری شہزادی جناب زینب کا حال سب سے زیادہ خراب تھا۔ بار بار امام علیہ السلام کو بلا کر پوچھتی تھیں۔ کیوں بھائی آپ کی نصرت کے لئے بھی کوئی آیا؟ حضرت فرماتے تھے اے بہن! یہ سب ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ اس عالم غربت و بیکسی میں ہماری مدد کو کون آئے گا۔ آہ آہ مومنین! اس فوج بد شعار کی آمد سے جناب رباب مادر جناب علی اصغر کے دل کو کچھ ایسا غیر معمولی صدمہ پہنچا کہ آپ کا دودھ خشک ہو گیا پے در پے رسالوں اور فوجوں کی آمد کی خبر اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے اہل حرم کے دل سینوں میں ہلا دیئے تھے آہ بہتر بھوکے پیاسے مجاہدوں کے لئے جن میں جناب علی اصغر اور کئی ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے۔ ظالموں کی یہ ٹڈی دل فوج جمع ہوئی تھی۔ لیکن سبحان اللہ کیسے بہادر تھے رفقائے حسین کہ فوج کی اس کثرت سے ذرا ان کے دل پر ہراس نہ تھا اور تین روز کی بھوک پیاس میں بھی مرتے دم تک ان کی وہی آن بان اور شجاعانہ شان باقی رہی۔

منقول ہے کہ جب میدان کربلا میں کوفہ و شام کی فوجیں داخل ہوتی تھیں اور زمین گھوڑوں کی ٹاپوں سے لرزتی تھی تو جناب زینب حضرت عباس سے دریافت فرماتی تھیں۔ اے بھائی اب کون سردار آیا ہے۔ جناب عباس اسی کا نام بتا دیتے تھے۔ جس روز کربلا میں شمر ذی الجوشن کا داخلہ ہوا تو جناب زینب کا اضطراب خود بخود زیادہ بڑھا۔ حضرت عباس کو بلا کر دریافت کرنے لگیں اے بھائی آج یہ کون سردار کربلا میں آیا ہے کہ میرا دل خود بخود رنج و غم سے بیٹھا جاتا ہے اور وہ پریشانی لاحق ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ جناب عباس نے فرمایا اے بہن آج شمر ذی الجوشن کئی ہزار کی جمعیت سے آیا ہے۔ آہ مومنین جوں ہی جناب زینب نے شمر کا نام سنا ایک آہ سرد دل پر درد سے کھینچی۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔ چونکہ یہ خبر سن چکی تھیں کہ میرے ماں جائے کا قاتل شمر بدکردار ہو گا۔ لہذا اب بھائی کی طرف سے زینب خاتون کو مایوسی ہو گئی۔ جناب فضہ سے فرمایا تم میرے بھائی سے جا کر کہو کہ اس وقت زینب کا غیر حال ہے ذرا دیر کے لئے خیمے میں ہو جائیے۔ جب امام حسین علیہ السلام کو یہ خبر پہنچی تو فوراً خیمے میں تشریف لائے۔ جناب زینب گلے میں باہیں ڈال کر بے اختیار رونے لگیں۔ حضرت نے فرمایا اے بہن تمہاری اس غیر معمولی بے چینی کا کیا سبب ہے۔ عرض کی اے بھائی اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ شاید آپ دشمنوں کے خطرہ سے بچ جائیں لیکن اب مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کی جان بچنے والی نہیں حضرت نے پوچھا اے بہن تم نے کیونکر سمجھا۔ رو رو کر کہنے لگیں سنتی ہوں کہ آج آپ کا قاتل شمر بھی کربلا میں آگیا۔

آہ آہ مومنین! امام حسین علیہ السلام اس وقت اپنی ستم رسیدہ بہن کو کیونکر تسکین دیں۔ کیونکہ وہ تو پوری طرح اصل حال سے آگاہ تھیں

پ خاموش سر جھکائے کھڑے رہے۔ جناب زینب دیر تک گلے میں باہیں ڈالے روتی رہیں۔ اس وقت خیمۂ امام میں ایک کہرام بپا تھا کسی کے ہوش بجا نہ تھے۔ آخر امام علیہ السلام نے ان سے فرمایا مرضی خدا میں کسی کا زور نہیں تم سب کو راضی برضائے خدا ہونا چاہیئے۔ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ میں اس کی راہ میں انتہائی ظلم و ستم سے شہید کیا جاؤں تو میرے لئے اس سے زیادہ سعادت کا موقع نہیں تم سب کو اس مصیبتِ عظیم میں صبر کرنا چاہیئے۔ صبر کا اجر خدا کے نزدیک بہت زیادہ ہے۔

صاحب مصائب الائمہ لکھتے ہیں۔ کہ جب فوجیں خوب جمع ہو گئیں اور عمر سعد نے خاطر خواہ بندوبست کر لیا تو اس نے کثیر بن شہاب کو بلا کر کہا کہ تو حسین بن علی کے پاس جا کر دریافت کر کہ آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔ یہ حکم سنکر کثیر ملعون حضرت کے لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوا جب خیام اقدس کے قریب پہنچا تو ابو ثمامہ صیداوی نے بڑھکر ڈانٹا کہ او شقی بے اجازت کیوں بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس نے کہا پسر سعد کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ فرمایا ٹھہر جا میں اپنے امام سے اجازت حاصل کر لوں۔ اگر بے اجازت قدم اٹھایا تو ابھی سر تن سے جدا کر دوں گا۔ یہ سنکر وہ شقی رک گیا اور جناب ابو ثمامہ نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی مولا کثیر ملعون آنا چاہتا ہے۔ آپ اس شقی سے باخبر رہیں وہ بڑا شریر النفس ہے حضرت نے فرمایا اسے آنے دو اللہ میرا حافظ و مددگار ہے۔ اللہ اکبر! ابو ثمامہ کو امام غریب سے کس درجہ محبت تھی جب کثیر ملعون کو ہمراہ لے کر چلے اور امام علیہ السلام کے خیمے کے قریب پہنچے تو فرمایا او شقی اپنی تلوار مجھے دے کہ میں تیری طرف سے مطمئن نہیں۔ اس نے کہا سبحان اللہ کہیں سپاہی اپنا ہتیار بھی کسی کو دیا کرتے ہیں۔ اگر تم مسلح مجھے نہ جانے دو گے تو میں ابھی واپس جاؤں گا۔

خیمہ کے اندر اس تکرار کی آواز حضرت امام حسین علیہ السلام نے سُنی تو درِ خیمہ پر آ کر فرمایا اے ابو ثمامہ اگر یہ نہیں مانتا تو اسی طرح آنے دو ابو ثمامہ نے حکمِ امام سے مجبور ہو کر آگے تو بڑھنے دیا مگر احتیاطاً اس کی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ تاکہ بے ادبی نہ کر سکے۔ کیوں مومنین! کہاں تھے ابو ثمامہ صیداوی جیسے جاں نثار اس وقت جبکہ شمر ملعون خنجر کھینچے امام علیہ السلام کے سینۂ اقدس پر سوار تھا۔

الغرض جب کثیر ملعون خدمتِ امام میں آیا تو اس نے کہا مجھے پسر سعد نے آپ کی خدمت میں یہ معلوم کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ اس طرف کس ارادہ سے تشریف لائے ہیں۔ فرمایا میں اپنی خوشی سے ادھر نہیں آیا جب اہل کوفہ نے متواتر خطوط اور قاصد روانہ کئے تب میں نے اس طرف کا قصد کیا ہے۔ کثیر یہ جواب لے کر پسرِ سعد کے پاس آیا۔ جب وہ حضرت کی تشریف آوری کے سبب سے آگاہ ہوا تو اس نے ابن زیاد کو اس مضمون کا خط لکھا کہ میں نے کربلا میں پہنچ کر حسین بن علی سے اس طرف آنے کا سبب معلوم کیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ میں خود نہیں آیا بلکہ اہلِ کوفہ کی طلبی پر آیا ہوں۔ پس اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے تو اجازت دو کہ میں یہاں سے پلٹ جاؤں۔

حسان بن قائد کہتا ہے کہ جب عمر سعد کا یہ خط ابنِ زیاد کے پاس پہنچا تو میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ ابن زیاد نے اس خط کو پڑھ کر ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب حسین ہمارے چنگل میں آ گئے ہیں چاہتے ہیں کہ کسی طرح نکل جائیں۔ لیکن اب ان کا صحیح سلامت ہمارے پنجہ سے نکل جانا ممکن نہیں۔ پھر اس نے جواب میں لکھا اے پسر سعد تیرے خط کے مضمون سے آگاہ ہوا۔ پس تجھے لازم ہے کہ اس خط کے پہنچتے ہی حسین بن علی کو بیعت یزید پر مجبور کر پس اگر وہ انکار کریں تو ان سے جنگ کر اور ان کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے۔ جب یہ خط پسرِ سعد کے پاس پہنچا تو اس نے حضرت سے بیعت کا سوال نہ کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حضرت اس کو گوارا نہ کریں گے

راوی کہتا ہے کہ ابنِ زیاد نے یہ خط روانہ کر کے بعد کوفہ کے گلی کوچوں میں ڈھنڈورا کرایا کہ جو شخص اپنے گھر میں پوشیدہ رہے گا اور کربلا میں لڑنے کے لئے نہ جائے گا تو اس کا خون مجھ پر حلال ہو گا۔ اس حکم کے سنتے ہی تمام اہلِ کوفہ لرز گئے اور اپنے اپنے گھروں سے نکل کر کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ نویں محرم تک بہ کثرت لوگ کربلا میں جمع ہو گئے۔

منقول ہے کہ جب امامِ مظلوم نے تمام میدانِ کربلا سواروں اور پیادوں سے بھرا ہوا پایا تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اب اہلِ حرم کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اے سعادتمندو! اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور میرے ساتھ خیمہ گاہ کی پشت کی طرف خندق کھود کر اس میں آگ روشن کر دو۔ تاکہ دشمن ادھر سے نہ آسکے۔ یہ سنکر تمام اصحاب اٹھ کھڑے ہوئے اور بہت جلد ایک خندق کھود کر اس میں آگ روشن کر دی اس وقت ایک سوار لشکر پسر سعد سے باہر آیا اور پکار کر کہنے لگا اے حسین! آتشِ آخرت سے قبل آتشِ دنیا کی طرف بہت جلدی کی حضرت نے غضبناک ہو کر جواب دیا اے دشمنِ خدا آتشِ دنیا و آخرت ہمارے اجسام کو مس نہیں کر سکتی کیونکہ خدا نے آگ کو ہم پر حرام قرار دیا ہے۔ پھر آپ نے اپنے اصحاب سے پوچھا یہ شقی کون ہے کسی نے کہا یہ ملعون جبیرہ کلبی ہے۔ حضرت نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا کر اس شقی کے حق میں بددعا کی کہ خداوندا جلد اس کو آگ کی طرف کھینچ۔ ابھی حضرت کی یہ دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ اس ملعون کا گھوڑا بگڑا اور اس شقی کو سر کے بل خندق میں گرا دیا۔ چند منٹ کے اندر وہ شقی جل بھن کر داخلِ جہنم ہوا۔

مقتل ابو مخنف میں ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ ہزار ہا اشقیائے امت قتل پر آمادہ ہیں تو آپ نے عمر سعد کے نام پیغام بھیجا کہ میں چاہتا ہوں کہ آج کی شب دونوں لشکروں کے درمیان تجھ سے بات چیت کروں اور جو امر بلحاظ دنیا و آخرت تیرے لئے بہتر ہو وہ تجھ سے بیان کروں۔ پسر سعد نے اس بات کو منظور کیا اور رات کے وقت وہ حضرت کی ملاقات کو آیا۔ آپ نے فرمایا اے پسر سعد میں دیکھتا ہوں کہ تو میرے قتل پر آمادہ ہے۔ حالانکہ تو خوب جانتا ہے کہ میرے نانا حضرت رسولِ خدا اور میری ماں فاطمہ زہرا ہیں۔ اے ابنِ سعد! تجھے خدا کا خوف نہیں کہ مجھے بے قصور قتل کرنا چاہتا ہے۔ تیرے لئے بہتر صورت یہی ہے کہ میرے لشکر میں شامل ہو جا کہ باعث خوشنودی خدا اور رسول ہو۔ اس نے کہا اگر میں ایسا کروں گا تو ابنِ زیاد میرا گھر تک کوفہ میں کھدوا ڈالے گا۔ حضرت نے فرمایا تو اس کا غم نہ کر میں مدینہ میں اس سے بہتر گھر تیرے لئے بنوا دوں گا۔ اس نے کہا میری تمام املاک ضبط ہو جائے گی۔ فرمایا اس کے عوض سرزمین حجاز پر تجھے ایسی جاگیر دوں گا جو تیری جاگیر سے بہتر ہو گی۔ یہ سنکر پسر سعد خاموش ہو رہا۔ حضرت نے پوچھا تیرے سکوت کی کیا وجہ ہے؟ کیا تو میرے قتل کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ اس شقی نے کہا ہاں مجھے آپ کا قتل ہی مقصود ہے تاکہ اس سے فارغ ہو کر ملک رے پر قابض ہو جاؤں اور ستر ہزار سوار میرے ماتحت رہیں۔ حضرت نے فرمایا اے شقی خدا جلد تجھ کو تیرے فرش پر ذبح کرے اور روزِ قیامت تجھ پر سخت عذاب نازل کرے۔ بخدا مجھ کو یقین ہے کہ تجھے ملکِ رے کے گیہوں کھانے نصیب نہ ہوں گے اور وہاں کی حکومت بھی تجھے نصیب نہ ہو گی اور تو انتہائی مایوسی سے داخلِ جہنم ہو گا۔ اس شقی نے بطور تمسخر کہا اگر گندم نہ ملیں گے تو میرے لئے جو ہی کافی ہیں۔ یہ بے حیائی کا جواب اس شقی سے سنکر حضرت نے اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا اور واپس تشریف لے آئے۔ دوسرے دن صبح سے پسر سعد نے امام حسین اور ان کے ساتھیوں پر سختی کرنا شروع کی۔ نہرِ فرات پر ہر طرف پہرے بٹھا دیئے اور نگہبانوں کو تاکید کی خبردار اب لشکرِ حسین میں پانی کا ایک قطرہ نہ جائے۔

آہ آہ مومنین! وہ گرمی کی فصل اور کربلا کی جلتی ریت نہ کہیں درخت کا سایہ نہ کہیں امن کی جگہ۔ کھلے میدان میں امام مظلوم کے خیمے برپا تھے۔ ہر طرف سے گرم ہوا کے تھپیڑے لگتے تھے۔ یوں ہی ایک ایک گھڑی قیامت کی گزر رہی تھی۔ آہ کیا حال ہوا ہوگا جب پانی بھی ان پر بند ہو گیا ہوگا پانی ایسی چیز نہیں کہ انسان اس کے بغیر زندہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی اس نعمت کو اتنا عام کر دیا ہے کہ جہاں کنواں کھودو پانی نکل آتا ہے۔ اس کے علاوہ جابجا زمین پر چشمے اور دریا بہا دیئے ہیں۔ خداوند عالم نے اپنی مخلوق کا بھوک، خوف، مالوں کی کمی، جانوں کی کمی اور اولاد کی کمی میں تو امتحان لیا ہے۔ لیکن پانی میں کسی کا امتحان نہیں لیا کیونکہ یہ ایسی چیز نہیں کہ انسان زیادہ مدت تک بغیر اس کے زندہ رہ سکے

منقول ہے کہ جنگ صفین میں معاویہ نے لشکر امیر المومنین علیہ السلام پر پانی بند کر دیا تھا اور جابجا گھاٹوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے لیکن جب امیر المومنین علیہ السلام کا اس پر قبضہ ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ لشکر معاویہ پر پانی بند نہ کیا جائے۔ کسی نے عرض کی امیر المومنین! جب وہ لوگ ہمارے ساتھ ایسی بدسلوکی کر چکے ہیں تو ہم جواب میں ان کے ساتھ ایسا کیوں نہ کریں۔ آپ نے فرمایا میری حمیت تقاضا نہیں کرتی کہ خدا کی ایک ایسی نعمت سے ان کو باز رکھوں جس کے بغیر ان کی زندگی محال ہے۔

افسوس صد افسوس جس علی نے اپنے دشمنوں کے ساتھ یہ رحیمانہ برتاؤ کیا تھا آج کربلا میں اسی کی اولاد پر پانی بند ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس کی شدت سے تڑپ رہے تھے۔ بار بار خیام امام سے آواز العطش العطش بلند ہوتی ہے۔ بچے خالی کوزے لئے خیمہ گاہ کے دروازے پر آتے ہیں اور نہایت دردناک لہجہ میں فریاد کرتے ہیں کہ کوئی تھوڑا سا پانی لا کر ہمارے سوختہ دلوں کو ٹھنڈا کرو۔ ہمارے کلیجے شدت تشنگی سے کباب ہو رہے ہیں۔ ہونٹوں پر پیڑیاں جم گئی ہیں۔ بات کرنے کی طاقت نہیں۔ جانیں لبوں پر آگئی ہیں۔ خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم کھاؤ۔ کیوں مومنین جب اصحاب حسین بچوں کی ان دردناک آوازوں کو سنتے ہوں گے تو ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اپنی بیکسی اور بے بسی پر نظر کر کے تڑپتے دل ہاتھوں سے پکڑ کر رہ جاتے ہوں گے۔ ہائے ان اشقیائے امت کے ہاتھوں اولاد رسول کیسی مصیبت میں مبتلا ہو گئی تھی وہ ظالم انسان نہ تھے بلکہ حیوانوں سے بدتر تھے جو معصوم بچوں کو جو ان کے رسول کی اولاد تھی اس بیدردی سے تڑپا رہے تھے۔

لکھا ہے کہ پیاسے بچے سوکھی زبانیں اپنے خشک ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے اور فرط ضعف سے لڑکھڑاتے ہوئے ایک ایک خیمہ میں پانی تلاش کرتے پھر رہے تھے اور سوکھے مشکیزے کھول کھول کر دیکھتے تھے کہ شاید چند قطرے پانی کے کہیں سے مل جائیں مگر آہ آہ ان بیکسوں کی یہ مراد بھی پوری نہ ہوتی تھی یہاں تک کہ جب خیمہ جناب زینب میں پہنچے اور رو رو کر پانی مانگا تو ان کا غم سے عجب حال ہوا ایک ایک بچہ کو چھاتی سے لگا کر دی اور ان سب کو لے کر خود تلاش آب میں نکلیں کہ شاید انصار کے کسی خیمہ میں پانی ہو مگر آہ آہ جب کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو ایک سرد بھر کر رہ گئیں۔ اور بچوں کا یہ حال ہوا کہ غش کھا کھا کر گرنے لگے۔ آہ کافروں کی اولاد سے بھی وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو مسلمانوں نے اپنے نبی کی اولاد سے کیا۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْن وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ٥

ساتویں مجلس

یتیموں پر شفقت کرنے کا ذکر اور حالِ شہادت پسرانِ جنابِ مسلم علیہ السلام

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ اَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ یعنی یتیم پر غیظ و غضب کا اظہار نہ کرو۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص یتیم پر رحم نہیں کرتا روزِ قیامت اس کی جگہ جہنم ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب کوئی یتیم نالہ کرتا ہے تو عرشِ الٰہی کانپ جاتا ہے۔ حضرات یتیم بچوں کے لئے بڑی مصیبت ہے۔ جس طرح کوئی درخت بغیر جڑ کے تازہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح یتیم ہونے کے بعد بچوں کی شگفتگی جاتی رہتی ہے خدا نہ کرے کہ کسی بچہ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جائے۔ یتیم ہو کر بچوں کے تمام جذبات مر جاتے ہیں۔ اور ان کی تمام آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے پھر دنیا میں کوئی ان کا ناز اٹھانے والا اور سچے دل سے پیار کرنے والا باقی نہیں رہتا۔ ان کا دل حد درجہ نازک ہو جاتا ہے۔ وہ بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ تم یتیم کے سامنے اپنی اولاد کا منہ نہ چومو انہیں پیار نہ کرو کیونکہ تمہارے اس عمل سے اس کو اپنا باپ یاد آئے گا اور اس کے دل پر چوٹ لگے گی۔

خداوندِ عالم نے صدقات میں ذوی القربیٰ کے بعد یتیموں کا درجہ رکھا ہے یعنی انسان کو چاہیئے کہ اپنے مال سے راہِ خدا میں جو کچھ دینا چاہتا ہو سب سے پہلے تو اپنے رشتہ داروں کی حاجت برآری کرے اور ان سے جو بچے تو دوسرا نمبر یتیموں کا ہے۔

منقول ہے کہ ایک روز حضرت رسولِ خدا کہیں تشریف لئے جا رہے تھے کہ ایک طرف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ آپ کا دل اس کی آواز سے ہل گیا۔ لوگوں سے پوچھا یہ بچہ کس کا ہے اور کیوں رو رہا ہے۔ انہوں نے کہا یہ ایک بیوہ کا فرزند ہے۔ کسی بات پر ہٹ کی ہے اس پر اس کی ماں نے مارا ہے۔ فرمایا اس کی ماں سے جا کر کہو کہ اس بچہ کو نہ مارا کر اس کے رونے سے مجھے اذیت ہوتی ہے۔ اگر یہ اپنی کسی آرزو کا اظہار کیا کرے تو اس کو مجھ سے بیان کر دیا کریں میں اس کے پورا کرنے کا ذمہ دار ہوں۔

مروی ہے کہ ایک امیر کبیر کہیں جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک یتیم بچہ کے پیر میں کانٹا چبھا ہوا ہے اور وہ اس کی تکلیف سے بلبلا بلبلا کر رو رہا ہے۔ وہ بیتاب ہو کر اس کے پاس پہنچا اور کانٹا اس کے پیر سے نکال کر اس پر شفقت کا اظہار کیا وہ بچہ اور زیادہ رونے لگا۔ اس نے کہا اے لڑکے میں نے تیری تکلیف کو دور کیا ہے نہ کہ کوئی ایذا پہنچائی ہے کہ تو اتنا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ اس نے کہا مجھے اس وقت اپنے مرحوم باپ کی شفقت یاد آگئی وہ بھی اسی طرح میرے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا کرتے تھے۔ یہ سننا تھا کہ وہ بزرگ بے چین ہو گئے۔ اور اسے چھاتی سے لگا کر دیر تک روتے اور پیار کرتے رہے۔ چند روز کے بعد اس نیک آدمی کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے ایک دوست نے خواب میں دیکھا کہ باغِ جنت میں حورانِ بہشتی کے ساتھ جنتی لباس زیب تن کئے ٹہل رہا ہے۔ اس نے پوچھا اے دوست یہ تو بتا تو نے ایسے کیا نیک عمل کئے تھے

جن کی جزا میں یہ اعلیٰ مرتبہ ملا۔ اس نے کہا یہ صرف ایک عملِ خیر کی جزا ہے میں نے ایک بار ایک یتیم کے پیر سے کانٹا نکالا تھا۔ اسی کا یہ صلہ خدا نے مجھے دیا ہے۔

منقول ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اتنے بڑے یتیم نواز تھے کہ آپ اپنی خلافت کے زمانہ میں خود یتیموں کے گھر جا جا کر ان کی خدمات انجام دیتے تھے حضرت کا یہ معمول تھا کہ نمازِ مغرب کے بعد روٹیوں اور خرموں کی زنبیل کندھے پر رکھ کر بیوں اور یتیموں کے دروازے پر پہنچتے اور دروازہ پر دستک دے کر اپنے آنے سے ان کو آگاہ کرتے۔ جب بیوہ عورتیں اور یتیم بچے کھانا لینے کے لئے آتے تو اپنا منہ نقاب سے ڈھانپ لیتے یا دوسری طرف پھیر لیتے تاکہ لینے والوں کو حجاب نہ آئے۔ تمام زمانۂ خلافت آپ اس خدمت کو انجام دیتے رہے اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ رات کو کھانا پہنچانے والا کون ہے البتہ جب ماہِ رمضان کی انیسویں شب کو عبدالرحمٰن بن ملجم شقی کے ہاتھ سے آپ مسجدِ کوفہ میں زخمی ہوئے اور اس رات کو ان گھروں میں کھانا نہ پہنچا تو بہت سے یتیم بچے جو بھوک سے بلبلا رہے تھے اپنی ماؤں سے دریافت کرنے لگے آج ہمارا وہ شفیق باپ کیوں نہیں آیا جو ہر رات ہمارے لئے روٹیاں اور خرمے لایا کرتا تھا۔ اگر کچھ پتہ معلوم ہو تو بتا دو ہم خود جا کر اپنی روزی لے آئیں اور اگر وہ ہم سے ناخوش ہو گئے ہوں تو ان کے پیروں پر سر رکھ کر اپنا قصور معاف کرا لیں۔ مائیں یہ سنکر کہتی تھیں اے فرزندو! ہمیں خدا کے اس برگزیدہ بندہ کا کچھ پتہ نہیں۔ نام بتانا تو درکنار اس نے تو آج تک اپنی صورت بھی نہیں دکھائی کہ تم کو کچھ نشان دے سکیں۔ الغرض یہ جواب سنکر وہ سب یتیم بچے ملول و رنجیدہ ہو کر رہ گئے۔

حضرات اس کا پتہ اکیسویں ماہِ صیام کو چلا جب امیر المومنین کا جنازہ گھر سے نکلا تو لوگوں نے دیکھا کہ بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں ساتھ ہیں۔ بچے وا ابتاہ اور عورتیں وا وارثاہ کے نعرے مارتی چلی جاتی تھیں۔ بچے فریاد کرتے تھے اے امیر المومنین ہم کو پہلے سے نہ معلوم ہوا کہ ہر شب کو ہمیں کھانا پہنچانے والے اور ہمارے حال پر پدرانہ محبت کرنے والے آپ تھے۔ ہم نے آپ کی شفقتیں دیکھ کر اپنے باپوں کو بھلا دیا تھا۔ آہ ہم بیکسوں پر اب کون رحم کھائے گا اور آپ کی سی شفقت ہمارے حال پر کون کرے گا۔ ان کی فریاد سنکر لوگوں کے کلیجے منہ کو آتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک بار امیر المومنین علیہ السلام ایک بازار کی طرف سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک عورت کو دیکھا کہ غلہ کی ایک بوری سر پر رکھے چلی جا رہی ہے اور زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے تھوڑی دور پر رُک کر دم لیتی ہے آپ فوراً اس کے پاس پہنچے اور فرمایا اے ضعیفہ کیا تیرا شوہر نہیں کہ اس خدمت کو انجام دے۔ اُس نے عرض کی میں بیوہ ہوں اس لئے گھر کا سب کام کاج مجھی کو کرنا پڑتا ہے یہ سنتے ہی آپ کا دل تڑپ گیا۔ اور آپ نے اس کا بوجھ لیکر اپنے سر پر لاد لیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر تک گئے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آپ امیر المومنین علی بن ابی طالب ہیں جب آپ نے اس کی یہ حاجت برآری کر دی تو اس نے اپنے حال پر شفیق پا کر شکریہ ادا کیا حضرت نے فرمایا اے ضعیفہ! ابھی میرا دل تیری خدمت سے سیر نہیں ہوا۔ اس نے کہا اے شخص میرے چند چھوٹے چھوٹے بچے ہیں وہ بھوک سے بلبلا رہے ہیں اگر اتنی شفقت اور میرے حال پر ہو جائے کہ ذرا دیر آپ انہیں بہلا لیں تو میں تھوڑا سا پانی لے آؤں اور آٹا پیس لوں۔ آپ نے فرمایا بچے اپنی ماں سے ہی خوب بہلتے ہیں تو شوق سے ان کو بہلا لے میں تیرے سب کام انجام دوں گا پس

آپ مشکیزہ لے کر گئے اور پانی بھر کر لائے۔ پھر آپ نے بقدر ضرورت آٹا پیسا اور ضعیفہ سے فرمایا اب تو اس کو خمیر کر لے میں تنور روشن کرتا ہوں۔ جب تنور روشن ہو گیا تو آپ نے فرمایا اچھا اب تو روٹی پکا اور میں تیرے بچوں کو بہلاتا ہوں۔ وہ بیچاری روٹی پکانے لگی اور امیر المومنین علیہ السلام بچوں کی طرح اس کے بچوں سے کھیلنے لگے۔ آپ شفقت سے کبھی ان کو پشت پر بٹھاتے تھے کبھی شانوں پر۔

جب حضرت وہاں سے چلنے لگے تو اس عورت نے کہا اے بھائی مجھے کم از کم اپنا نام کو بتاتے جاؤ۔ حضرت نے فرمایا نام سے تجھے کیا کام میں نے جو کچھ کیا ہے خوشنودئ خدا کے لئے کیا ہے۔ یہ کہکر آپ وہاں سے تشریف لے گئے۔ اتفاقاً ہمسایہ کی ایک عورت حضرت کو کام کاج کرتے دیکھ رہی تھی۔ جب حضرت دروازے سے باہر ہو گئے تو اس نے اپنی ہمسائی سے کہا کم بخت تو پہچانتی بھی نہیں۔ کہ یہ کون شخص ہے جس سے تو یہ خدمتیں لے رہی تھی یہ ہمارے بادشاہِ وقت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام تھے۔ یہ سنتے ہی وہ عورت دوڑی اور حضرت کے قدموں پہ گر کر کہنے لگی اے امیر المومنین مجھے معاف فرمایئے نادانستہ میں نے آپ سے خدمت لی ہے حضرت آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے اے ضعیفہ! اس کا خیال نہ کر اگر تو میری خدمات سے خوش ہوئی ہے تو خدا سے دعا کر کہ وہ علی سے راضی رہے۔

حضرات آپ نے سنا امیر المومنین علیہ السلام کی یتیم نوازی کو۔ آہ آہ! جو بزرگ ایسے یتیم پرور تھے۔ ان کے خاندان کے یتیم بچوں پر شقیائے امت نے وہ وہ ظلم کئے کہ سننے والوں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اس وقت مجھے جناب مسلم بن عقیل کے دو آوارہ وطن یتیم بچے یاد آگئے۔

ہائے ان کے چھوٹے چھوٹے سن بھولی بھولی صورتیں ماں دور باپ سے جدا آوارہ وطن دشمن کا ملک نہ کوئی یار نہ مددگار نہ غمخوار ہر وقت دشمن کا کھٹکا جان جانے کا اندیشہ کس سے اپنا درد کہیں۔ کس سے فریاد کریں۔ آہ دونوں بھائی باپ کی شہادت کے بعد کوفہ کے گلی کوچوں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ ذرا کہیں پتہ کھڑکتا تو ننھے سے دل سینوں میں دھڑکنے لگتے۔ رات سر پر آگئی اور ان بیچاروں کو کوئی جگہ پناہ کی نہ ملی۔ ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتے ٹھوکریں کھاتے چلے جاتے تھے کہ ایک عورت دروازہ پر کھڑی نظر آئی اس کے پاس جا کر منت و سماجت سے کہنے لگے۔ اے کنیزِ خدا ہم یتیم و بیکس و بے یار ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ تو رات کی رات ہم کو اپنے گھر میں پناہ دے۔ ان کی بھولی بھولی صورتوں اور پریشان حالی پر اس کو رحم آ گیا۔ شفقت سے پوچھنے لگی اے بچو تم کون ہو۔ کہ اس پرآشوب زمانہ میں یوں مارے مارے پھر رہے ہو۔ ڈرتے ڈرتے سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگے اگر تو کسی سے ہمارا حال نہ کہے تو اپنا دردِ دل تجھے سنائیں۔ اس نے کہا تم ڈرو مت جہاں تک ممکن ہو گا تم کو حفاظت سے رکھوں گی جب یہ شفقت دیکھی تو کہنے لگے اے ضعیفہ ہم مسلم بن مسلم عقیل کے فرزند ہیں۔ ہمارے باپ قتل کر دیئے گئے۔ اب اس شہر میں ہمارا کوئی دوست نہیں کہ اس کے یہاں جا کر پناہ لیں۔ کوفہ کا چپہ چپہ ہمارا جانی دشمن ہے کہاں جائیں اور کس سے اپنا حال کہیں وہ عورت محبِ اہلبیت تھی جوں ہی یہ سنا کہ مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں تڑپ گئی دونوں کو چھاتی سے لگا کر پیار کرنے لگی اور تسلی دے کر کہنے لگی اے فرزندو! تم گھبراؤ مت میرا گھر تمہارا ہی گھر ہے میں تمہیں اپنی آنکھوں پر جگہ دوں گی۔

الغرض وہ مومنہ دونوں کو اپنے ساتھ لے گئی منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی حاضر کیا۔ پریشان بالوں سے گرد و غبار دور کیا پھر کھانا سامنے رکھا۔ بچوں نے کہا اے مادرِ مہربان ہم کو کھانے کی خواہش نہیں۔ بس اتنا چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی جگہ بتا دے کہ ہم وہاں جا کر پڑ رہیں

کئی راتوں سے ہم نہیں سوئے اور آج دن بھر چلتے چلتے پیر درد کرنے لگے ہیں۔ اس نے کہا مجھے صرف اتنا کھٹکا ہے کہ میرا داماد جس کا یہ گھر ہے ابنِ زیاد کا دوست اور آلِ رسول کا دشمن ہے اگر وہ آگیا تو نہ معلوم کیا غضب ڈھائے۔ بچوں نے کہا رات زیادہ گئی ہے شاید اب وہ نہ آئے الغرض اس نے ایک حجرہ میں فرش بچھا کر دونوں بچوں سے کہا تم یہاں آرام کرو جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا بچے تھکے ہوئے تو تھے ہی گلے میں باہیں ڈال کر سو رہے۔ نصف رات گزرنے کے بعد حارث ملعون جو اس گھر کا مالک تھا آیا اور غصہ میں اپنے ہتھیار ادھر ادھر پھینک کر فرشِ خواب پر لیٹ رہا۔ ضعیفہ نے کھانے کے لئے پوچھا اس نے کہا مجھے بھوک نہیں آج تمام دن مسلم بن عقیل کے بچوں کی تلاش میں گھومتا رہا لیکن افسوس کہ وہ میرے ہاتھ نہ لگے اور میں انعام سے محروم ہو گیا وہ کہنے لگی اے شخص اب سو جا رات زیادہ گئی ہے۔ الغرض وہ غم و غصہ میں بھرا ہوا لیٹ رہا۔

اب تھوڑا سا حال بچوں کا سنئے پہلے چھوٹا بھائی خواب سے چونکا اور بڑے بھائی کو جگا کر کہا میں نے اس وقت بہت ہولناک خواب دیکھا ہے۔ بابا جان ابھی ابھی یہاں تشریف فرما تھے مجھے چھاتی سے لگا کر کہہ رہے تھے۔ جانِ پدر گھبراؤ مت اب تم بہت جلد میرے پاس آنے والے ہو۔ بڑے بھائی نے کہا یہی خواب میں نے دیکھا ہے۔ الغرض دونوں بھائی اپنے باپ کو یاد کر کے رونے لگے۔ مومنین جب ان کے رونے کی آواز حارث ملعون کے کان میں پہنچی تو چونکا ہوا اور ضعیفہ سے پوچھنے لگا یہ کس کے رونے کی آواز ہے۔ اس نے کہا پڑوس میں کوئی بچہ رو رہا ہوگا تو کیوں اس طرف خیال کرتا ہے۔ اس جواب سے اس شقی کی تسلی نہ ہوئی۔ شمع روشن کر کے حجرہ کے اندر داخل ہوا جوں ہی بچوں نے اس کو آتا دیکھا سہم گئے۔

اس ملعون نے پاس جا کر پوچھا تم کون ہو؟ بچوں نے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہا اے شخص اگر تو ہم پر رحم کرنے کا وعدہ کرے تو ہم تجھ سے اپنا حال بیان کریں۔ اس نے وعدہ کیا۔ بچوں نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا اے شخص ہم مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں بیکس اور غریب الدیار ہیں تیرے گھر میں آکر پناہ لی ہے۔ امید ہے کہ تو ہماری کمسنی پر رحم کرے گا۔

آہ یہ سنتے ہی وہ ملعون مسکرایا اور کہا سبحان اللہ میں تمہاری تلاش میں کئی روز سے مارا مارا پھر رہا ہوں اور تم میرے ہی گھر میں چھپے ہوئے ہو۔ یہ کہہ کر دونوں کے نرم و نازک بازو پکڑے اور زور سے کھینچتا ہوا حجرے سے باہر لایا۔ اس وقت بچوں کی بیتابی دیکھنے کے قابل تھی۔ بار بار خوشامد کرتے اور منت و زاری کرتے تھے۔ اے شخص ہم یتیم ہیں سید زادے ہیں آوارہ وطن ہیں۔ ہمارے حالِ زار پر رحم کر۔ آہ اس شقی کا دل پتھر سے زیادہ سخت تھا۔ بچوں کی فریاد و زاری پر ذرا رحم نہ آیا اور دونوں کو ستونِ در سے کس کر باندھ دیا اور اپنے بستر پر آکر لیٹ رہا۔ بچے اسی حالت میں رو رو کر کہہ رہے تھے اے شخص ہم بے گناہ ہیں۔ ہماری حالت پر رحم کر ہمارے لئے یتیمی اور غریب الوطنی کا درد ہی بہت کافی ہے۔ ایک طرف تو بچے اس طرح فریاد کر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ ضعیفہ انتہائی خوشامد کر رہی تھی مگر اس شقی نے ایک نہ سنی اور چپ چاپ پڑ کر سو رہا بچے تمام رات اسی طرح ستونِ در سے بندھے کھڑے رہے اور وہ زنِ مومنہ بیچاری تمام رات ان کے پاس بیٹھی روتی رہی۔

جب صبح نمودار ہوئی تو حارثِ ملعون نے اپنے بدن پر ہتھیار سجے پھر بچوں کو کھولا۔ آہ آہ! ان کے نازک بدنوں پر جا بجا رسّی

کے نشان پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ شقی دونوں کے گیسو پکڑ کر گھر سے باہر چلانے لگا بچے تڑپ گئے اور ضعیفہ رو رو کر فریاد کرنے لگی۔ اور بے تابانہ بچوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔ میں تو اس طرح ان معصوم بچوں کو اپنے گھر سے نہ جانے دوں گی۔ او بد بخت ذرا سے لالچ میں آخرت کا دائمی عذاب مول نہ لے۔ اے ظالم یہ سیّد زادے ہیں یتیم ہیں۔ مہمان ہیں۔ ان کو کہاں لئے جاتا ہے۔ وہ شقی یہ بات سنکر جھنجھلا گیا اور تلوار نیام سے نکال کر اسی وقت اس کا کام تمام کر دیا۔ آہ چھوٹے بچوں نے جب اس مومنہ کا خون بہتا ہوا دیکھا تو قریب تھا کہ غش کھا کر گر پڑیں۔

حارث ملعون نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھ کر بہت تیزی سے بچوں کو کھینچا اور گھر سے باہر ہو گیا۔ راستہ بھر بچے روتے اور فریاد کرتے چلے جاتے تھے۔ راہ میں جو کوئی ان کو اس حال میں دیکھتا تھا تڑپ جاتا تھا اور حارث ملعون سے ان کے چھوڑنے کی سفارش کرتا تھا لیکن آہ آہ خاندانِ رسول سے اس ظالم کو کیسی سخت عداوت تھی اور مالِ دنیا پر کس درجہ فریفتہ تھا کہ کسی ایک کی بات کان کو نہ لگی۔ اور وہ بچوں کو کشاں کشاں لئے چلا ہی گیا۔ تا اینکہ وہ نہر کے کنارے جا پہنچا۔

اب بچوں نے اس سے پوچھا اے شخص اتنا تو بتا دے کہ اب تیرا ارادہ کیا ہے اس نے کہا اب میں تم کو یہاں قتل کروں گا اور تمہارے سر ابنِ زیاد کے پاس لے جاؤں گا اور وہ خوش ہو کر مجھے اکرام و انعام عطا کرے گا۔ بچوں نے کہا اے شخص اگر تو مال و زر کی طمع میں ایسا کرنا چاہتا ہے تو ہم کو غلام بنا کر جہاں چاہے بیچ لے ہم ایسی جنس نہیں کہ ہمارا کوئی خریدار نہ ہو۔ اس نے کہا میں اس بات کو پسند نہیں کرتا بچوں نے کہا اگر یہ منظور نہیں تو ہمارے ساتھ مدینہ کو چل ہم اپنی مادرِ گرامی اور عزیزوں سے تیری شفقت کا حال بیان کر کے تجھے اتنا مال و دولت دلوا دیں گے کہ تو عمر بھر راحت و آرام سے اپنی زندگی بسر کر سکے۔ اس نے کہا مجھے یہ بھی منظور نہیں۔ آہ مومنین! جب بچوں نے دیکھا کہ وہ شقی کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتا تو اس سے بہ منت کہنے لگے۔ اچھا اگر تجھے ابنِ زیاد ہی سے انعام و اکرام حاصل کرنا ہے تو ہمیں زندہ اس کے سامنے لے جا۔ اس نے کہا وہ تم کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ تمہارے سر دیکھنا چاہتا ہے۔

آہ آہ یہ سنتے ہی معصوم بچوں کے ننھے ننھے دل سینوں میں دھڑکنے لگے اور اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک بھائی دوسرے سے گلے مل کر رونے لگا۔ اس شقی نے بجبر دونوں کو جدا کر دیا اور کہا بس رو چکے۔ اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بڑے بھائی نے کہا اے ظالم قتل سے پہلے ہمیں اتنی مہلت دے کہ دو رکعت نماز ادا کر لیں۔ اس نے تیوری بدل کر کہا نمازوں سے کچھ فائدہ نہیں یہ تمہاری موت کو روک نہیں سکتیں۔ بچوں نے کہا اے شخص ہم موت کو ٹالنے کے لئے نمازیں نہیں پڑھنا چاہتے بلکہ سجدہ میں سر دینا اور موت سے قبل ذکرِ الٰہی کرنا ہمارے خاندان کا آئین ہے۔ اس نے کہا میں تمہارے اس خاندانی آئین کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سنکر بڑے بھائی نے کہا اے ظالم تو نے ہمارا کوئی ایک کہنا بھی اب تک نہیں مانا اچھا اتنا تو مان لے کہ پہلے مجھے قتل کر ڈال کیونکہ اپنے چھوٹے بھائی کا خون بہتا ہوا مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ چھوٹے نے کہا اے شخص پہلے میرا سر قلم کریں۔ اپنے پیارے بھائی کا خون کن آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔

الغرض اس شقی نے پہلے اپنی تلوار ظلم کر کے بڑے کا سر تن سے جدا کیا اور اس کی لاش کو دریا میں پھینک دیا۔ لکھا ہے وہ لاش اس وقت تک پانی کے اوپر تیرتی رہی جب تک چھوٹے بھائی کی لاش پانی میں نہ پھینکی گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں لاشے ایک جگہ ہوئے اور بھائی نے بھائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دونوں پانی میں بیٹھ گئے۔

منقول ہے کہ حارثِ ملعون جب دونوں بچوں کے خاک و خون میں اٹے ہوئے سر ابنِ زیاد بدنہاد کے سامنے گیا تو وہ بھی باوجود انتہائی شقاوت و سنگدلی کے ان کی بھولی بھولی صورتیں دیکھ کر تڑپ گیا۔ اور کہنے لگا او ظالم یہ کس کے معصوم بچے ہیں جن کو تو ذبح کرکے لایا ہے اس نے کہا اے امیر یہی تو مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں۔ میں نے تیری خوشنودی کے لئے وہ کام کیا ہے جو دنیا میں کوئی ظالم سے ظالم انسان بھی نہ کر سکتا۔ اب حسبِ وعدہ اپنے اکرام و انعام سے مجھے مالا مال کر اس نے غضبناک ہو کر کہا۔ اے شقی تو کیسا قسی القلب ہے کہ ان کم سن بچوں پر تجھے ذرا رحم نہ آیا۔ او ظالم میں نے تجھے قتل کرنے کو کب کہا تھا۔ بخدا اگر تو جیتا پکڑ لاتا تو میں ان کی کم سنی پر رحم کھا کر چھوڑ دیتا۔ اب اس ظلم کی سزا میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

آٹھویں مجلس

تفسیر آیہ مودت، حضرت رسولِ خدا کی امام حسینؑ سے محبت اور حالِ شبِ عاشور

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی: (اے رسول کہہ دو میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا مگر یہ کہ میرے ذوی القربیٰ سے محبت کرو) مفسرین نے اس آیت کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ ایک بار کچھ لوگ حضرت رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے اے خدا کے برگزیدہ رسول آپ نے تبلیغِ رسالت میں بڑے بڑے مصائب اٹھائے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو کچھ عوض اس کا دیں۔ ہماری جاگیریں ہمارا مال و دولت حاضر ہے۔ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ ہر شخص اپنی دولت میں سے ½ حصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دے۔ امید ہے کہ آپ اس کو منظور فرمالیں گے۔ حضرت نے فرمایا میں بغیر وحی الٰہی کچھ نہیں کہہ سکتا اس کے بعد آپ پر وحی ہوئی قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰیo

حضرات ہمارے رسول کی رسالت کا جو اجر معین کیا گیا ہے وہ رسول کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور وہ ایک ایسا اجر ہے جس کو ہر مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب جوان ہو یا بوڑھا مرد ہو یا عورت دیسی ہو یا پردیسی ہر جگہ اور ہر وقت با آسانی ادا کر سکتا ہے پھر اس اجر میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اجر دینے والے کا اس میں نقصان نہیں بلکہ سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ رسولِ خدا کے وہ ذوی القربیٰ جن کی محبت اجرِ رسالت قرار دی گئی ہے معصوم بندے ہیں۔ ان کی ہدایت میں ضلالت کا شک و شبہ بھی نہیں ہو سکتا وہ مسلمانوں کو اسی صراطِ مستقیم پر چلانے والے تھے۔ جن کے لئے ہم نمازوں میں پانچ وقت ثابت قدم رہنے کی خدا سے دعا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث ثقلین میں حضرت رسولِ خدا نے صاف طور سے یہ امر بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں ایہا الناس میں تم میں دو برگزیدہ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک کتابِ خدا دوسرے میری عترت جو میرے اہلبیت ہیں۔ پس اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونے والے نہیں تا آنکہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں۔

خداوندِ عالم نے اجرِ رسالت جو ذوی القربیٰ کی محبت کو قرار دیا۔ اس میں راز یہ ہے کہ محبت مقتضی اطاعت ہے یعنی جب لوگ ذوی القربیٰ رسول کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیں گے تو لامحالہ ان کی اطاعت بھی کریں گے اور جب اطاعت کریں گے تو ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر حضرت کی رسالت کا اجر ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس میں قیامت تک مسلمانوں کی ہدایت کا انتظام ہے۔ اگر مالِ دنیا کو اجرِ رسالت قرار دیا جاتا تو وہ ان روحانی فیوض و برکات کا صحیح معنی میں اجر قرار نہیں پا سکتا تھا جو حضرت رسولِ خدا نے ۲۳ سال کے اندر انتہائی محنت و شفقت کے ساتھ مسلمانوں کو پہنچائے تھے۔ دوسرے انسان

مال کی طرف بالطبع حریص ہے۔ اگر اس کو اجر رسالت قرار دیا جاتا تو لوگوں کو بہت سے حیلے کرنے کا موقع مل جاتا جس طرح لوگ خمس و زکوٰۃ سے بچنے کے لئے حیلے اور بہانے کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ادائے اجر رسالت میں بھی چہ میگوئیاں کرتے۔ علاوہ بریں یہ اجر ایک محدود حد میں ہو جاتا یعنی صرف مالدار لوگ ہی اس کو ادا کر سکتے اور غریب لوگ اس سعادت سے محروم رہتے۔ خدا نے چاہا کہ ایسے رسول کی رسالت کا اجر جو کافۃ الناس کی طرف بھیجا گیا ہو ایسی چیز کو قرار نہ دیا جائے جس کو کوئی تو ادا کر سکے اور کوئی نہیں۔ دوسرے اگر مال دنیا اجر رسالت قرار پاتا تو عہد رسالت کے لوگ اس کو خدمت رسول میں پیش کر کے رہ جاتے اور دوسروں کو اس میں شرکت کی سعادت حاصل نہ ہوتی برخلاف ذوی القربیٰ کی محبت کے کہ قیامت تک ہر مسلمان ہر وقت اور ہر زمانہ میں اس اجر کو بہتر سے بہتر صورت میں ادا کر سکتا ہے۔

قرآن مجید میں اور انبیاء کے اجر رسالت کا بھی ذکر ہے جو ان الفاظ میں ہے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ یعنی میرا اجر رسالت صرف اللہ پر ہے۔ جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے پیغمبر آخر الزماں کے اور کسی نبی کا اجر رسالت اس کے ذوی القربیٰ کی محبت کو قرار نہیں دیا گیا جس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ انبیاء کے ذوی القربیٰ میں عموماً یہ صلاحیت نہ تھی کہ ان کی محبت اجر رسالت قرار پا سکتی۔

مذکورہ بالا آیت میں ذوی القربیٰ سے مراد جناب فاطمہ زہرا حضرت علی مرتضیٰ اور ان کے بعد گیارہ امام ہیں جو اہلبیت اور عترت رسول بھی کہلاتے ہیں۔ قیامت تک ہدایت خلق انہی سے وابستہ ہے۔ فخر الدین رازی اور دیگر علمائے اہلسنت نے لکھا ہے کہ اہلبیت رسول پانچ باتوں میں رسول کے ساتھ شریک ہیں۔ اول طہارت دوسرے وجوب مودت تیسرے صلوات چوتھے سلام پانچویں تحریم صدقہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ذوی القربیٰ رسول کی مودت جزو ایمان بلکہ اصل ایمان ہے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا اے علی تم کو دوست نہ رکھے گا مگر مومن اور تم سے عداوت نہ رکھے گا مگر منافق۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسولخدا نے حسنین کے بارہ میں فرمایا اے خدا میں ان کو دوست رکھتا ہوں پس تو بھی ان کو دوست رکھ اور اس کو بھی دوست رکھ جو ان کو دوست رکھے۔

حضرات مقام غور ہے کہ جب ذوی القربیٰ رسول کی مودت جزو ایمان بلکہ اصل ایمان ہے اور یہ محبت اجرِ رسالت ہے تو جن لوگوں نے ذوی القربیٰ رسول سے دوستی نہیں رکھی گویا انہوں نے اجر رسالت ادا نہیں کیا اور جنہوں نے ایسا نہیں کیا انہوں نے گویا رسول کو رسول ہی نہیں مانا پس تمام اعمال ان کے بیکار گئے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جب آیہ مودت نازل ہوئی تو لوگوں نے حضرت رسولخدا سے پوچھا کہ آپ کے ذوی القربیٰ کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب کی گئی ہے۔ فرمایا وہ علی و فاطمہ اور حسن و حسین اور ان کی اولاد (مراد ہمارے ائمہ) ہیں دنیا میں حضرت رسولِ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہستیاں یہی حضرات تھے اس لئے نہیں کہ یہ آپ کے قریبی رشتہ دار تھے بلکہ اس لئے کہ امت رسول کی ہدایت ان کے دم سے وابستہ تھی۔ شریعت اسلام کی محافظت کا بار ان کے ذمہ تھا۔ دین کی حمایت میں وہ سب سے پیش پیش تھے۔ چنانچہ جب کبھی دینِ الٰہی پر کوئی سخت وقت آ کر پڑا انہی حضرات نے آگے بڑھ کر اس بلا کو رد کیا۔ اگر ان حضرات میں ہدایت کی صلاحیت نہ ہوتی تو حضرت رسولخدا ہرگز اس درجہ محبوب نہ رکھتے۔

افسوس مسلمانوں کی حالت پر جو زبان سے تو یہ کہتے تھے کہ حضرت رسولِ خدا کا اتباع کرتے ہیں۔ لیکن ان کا عمل عمل رسول کے بالکل خلاف تھا۔ لہٰذا اگر مسلمان ذرا بھی اس الفت و محبت کا لحاظ کرتے جو حضرت رسولِ خدا کو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تھی تو کربلا کا قیامت خیز ہنگامہ ہرگز پیش نہ آتا۔

آہ آہ جس حسین کو اشقیائے امت نے اس بیدردی سے شہید کیا وہ وہی حسین تھے جن کی محبت خدا نے مسلمانوں پر واجب کی تھی وہ وہی حسین تھے جن کو حضرت رسولِ خدا نے اپنی چھاتی پر رکھ کر پالا تھا جن کے لئے روزِ عید آنحضرت اونٹ بنے تھے۔ یہ وہی حسین تھے جن کے ہونٹ حضرت اس طرح چوستے تھے جیسے کوئی رطب تازہ کو چوستا ہے۔ یہ وہی حسین تھے جن کو حضرت رسولِ خدا اگر ایک دن نہ دیکھتے تو بیچین ہو جاتے۔ یہ وہی حسین تھے جن کو شانوں پر بٹھا کر آنحضرت صحابہ کے مجمع میں تشریف لاتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک بار عید کے دن امام حسین علیہ السلام نے حضرت رسولِ خدا سے کہا نانا جان آج عید کا دن ہے۔ مدینہ کے سب بچے اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر عیدگاہ کو جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی اونٹ نہیں کہ اس پر سوار ہو کر جائیں۔ حضرت نے فرمایا اے حسین تو آزردہ نہ ہو تیرا اونٹ میں ہوں۔ یہ کہہ کر حسین کو اپنے کاندھے پر سوار کیا۔ پھر امام حسین نے کہا نانا جان اور سب بچے تو اپنے اپنے اونٹوں کی نکیلیں پکڑے ہیں۔ ہمارا اونٹ کیسا ہے کہ اس کی نکیل ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ حضرت نے فوراً اپنے گیسوئے مبارک حسین کے ہاتھوں میں دے دیئے اور فرمایا بیٹا لو تمہارے اونٹ کی نکیل یہ ہے۔ پس جدھر حسین گیسو کو حرکت دے کر چلنے کا اشارہ کرتے تھے۔ آنحضرت اسی طرف کو مڑ جاتے تھے۔ پھر حسین نے کہا نانا جان سب کے اونٹ تو بولتے ہیں۔ ہمارا اونٹ کیسا ہے کہ بولتا ہی نہیں۔ یہ سنکر حضرت نے عفؑ عفؑ اپنی زبانِ مبارک سے کہنا شروع کیا۔ پھر حضرت اپنے پیارے نواسہ کو شانہ پر بٹھائے باہر تشریف لائے۔ دروازہ پر عمر کھڑے تھے کہنے لگے واہ واہ اے حسین تمہارا اونٹ کیا ہی اچھا ہے۔ حضرت نے فرمایا اے عمر مجھ سے بھی تو یہ کہو اے رسول آپ کا راکب کیا ہی اچھا ہے۔

مروی ہے کہ ایک بار حضرت رسولِ خدا مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ امام حسین علیہ السلام وہاں پہنچ گئے بچے تو تھے ہی سجدہ کی حالت میں آنحضرت کی پشت پر سوار ہو گئے حضرت نے ذکر سجدہ کو طول دینا شروع کیا یہاں تک کہ آپ نے ستر مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ ارشاد فرمایا اور جب تک حسین خود پشتِ مبارک سے نہ اترے آپ برابر ذکر سجدہ فرماتے رہے۔ جب حضرت نماز سے فارغ ہوئے تو کسی صحابی نے کہا یا رسول اللہ آج حسین نے آپ کو بڑی زحمت دی میں نے کئی بار چاہا کہ آپ کی پشتِ مبارک پر سے ان کو ہٹا دوں۔ لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ شاید آپ کو ناگوار ہو۔ فرمایا اے شخص جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہمارے بڑوں پر بھی رحم نہیں کرتا اے شخص تو حسین کے مرتبہ کو اتنا نہیں جانتا جتنا میں جانتا ہوں۔

منقول ہے کہ ایک روز حضرت رسولِ خدا اپنے زانو پر امام حسن کو بٹھائے بار بار ان کے دہن مبارک پر بوسے دے رہے تھے کہ جناب امام حسین علیہ السلام بھی آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے ان کو دوسرے زانو پر بٹھا لیا اور ان کے گلوئے مبارک کو چومنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد امام حسین ملول ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی والدۂ گرامی سے جا کر کہا اماں جان ذرا میرے منہ کو تو سونگھئے کیا اس سے بدبو آتی ہے جناب سیدہ نے سونگھ کر فرمایا نہیں بیٹا تمہارے منہ میں بو کا نام بھی نہیں۔ عرض کی پھر کیا وجہ کہ نانا جان بھائی حسن کا تو منہ چومتے ہیں اور

میرا گلا اب میں نانا کے پاس کبھی نہ جاؤں گا۔ فرمایا بیٹا تم میرے ساتھ چلو میں بابا جان سے اس کا سبب معلوم کروں گی۔ پس امام حسین کا ہاتھ پکڑے ہوئے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں بابا جان میرا حسین آپ سے اس بات پر رنجیدہ ہے کہ آپ اس کا منہ کیوں نہیں چومتے۔ آہ آہ مومنین! یہ سننا تھا کہ حضرت رسولخدا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرمانے لگے اے نور دیدہ اس کی وجہ نہ پوچھ اس کے سننے سے تجھے قلق ہوگا۔ جناب سیدہ نے عرض کی اب تو اس کے سننے کے لئے میرا دل اور زیادہ بے چین ہو رہا ہے جلد بیان فرمائیے تب حضرت نے فرمایا اے بیٹی! میں حسن کا منہ اس لئے چومتا ہوں کہ میری امت کے اشقیا اس کو زہر دے کر شہید کریں گے اور اس کے کلیجہ کے ٹکڑے منہ سے باہر آئیں گے اور حسین کا گلا اس لئے چومتا ہوں کہ اس کو تین دن کا بھوکا پیاسا گوسفند قربانی کی طرح ذبح کیا جائیگا اور اس کا گلا خنجر ظلم سے کاٹا جائے گا۔ یہ سنکر جناب سیدہ زار زار رونے لگیں اور پوچھنے لگیں کیوں بابا میرے بچے کو کس قصور پر قتل کیا جائیگا فرمایا اے بیٹی اس کا قصور کچھ نہ ہوگا۔ بنی امیہ محض رشک و حسد کی وجہ سے ایسا کریں گے۔

مومنین! جس وقت کی خبر حضرت رسولخدا نے دی تھی وہ سنہ ۶۱ھ کا محرم تھا۔ افسوس صد افسوس جس حسین کی محبت خدا نے اجر رسالت قرار دی تھی جس حسین کو حضرت رسولخدا جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک دن وہی حسین کربلا میں زغۂ اعدا میں گھرے ہوئے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے لاکھوں اشقیا ان کے قتل پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ ساتویں محرم سے امام مظلوم اور ان کے بچوں پر پانی بند کر دیا گیا تھا۔ رہ رہ کر خیموں سے آواز العطش العطش بلند ہو رہی تھی۔ بی بیوں کی حالت حد درجہ غیر تھی۔ جب ننھے ننھے بچے پیاس کی شدت سے فریاد کرتے تھے تو سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ہائے نازوں کے پالے بچے بھولے بھالے بچے کربلا میں آکر کیسی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

کتاب تبر المذاب میں واقدی اور ہشام بن محمد سے منقول ہے کہ جب امام حسینؑ نے یہ دیکھا کہ وہ گروہ بد شعار کسی طرح ان کے قتل سے باز نہیں آتا تو بغرض اتمام حجت آپ قرآن کو لے کر اس گروہ کے سامنے تشریف لائے اور فرمایا اے قوم یہ کتاب خدا تمہارے اور ہمارے درمیان حکم ہے اس کو پڑھو اور سمجھو کہ خدا نے ہماری مودت تم پر فرض کی ہے۔ ہماری اطاعت کا تم کو حکم دیا گیا ہے۔ اے قوم مجھے بتا کہ آخر میرا خون کیوں حلال سمجھا گیا ہے۔ یہا الناس۔ کیا میں تمہارے رسول کی بیٹی کا بیٹا نہیں کیا تم نے میرے جد امجد کی یہ حدیث نہیں سنی کہ حسن و حسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔

آہ کیسے شقی تھے وہ لوگ کہ حضرت کا یہ کلام سنکر کہنے لگے اے حسین ہم یہ سب جانتے ہیں۔ لیکن جب تک آپ یزید بن معاویہ کی بیعت نہ کریں گے ہم ہرگز آپ کے قتل سے دست بردار نہ ہوں گے۔ یہ سنکر امام مظلوم لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے ہوئے خیمہ گاہ کی طرف واپس ہوئے یہ واقعہ نویں محرم کا ہے۔ منقول ہے کہ اسی تاریخ بعد زوال شمر ملعون لشکر گاہ حسین کی طرف بڑھا اور با آواز بلند پکار کر کہنے لگا کہاں ہیں میری بہن کے بیٹے عبداللہ و جعفر و عباس ذرا دیر کے لئے میرے پاس آئیں کہ میں ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جناب عباس کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کوئی اس شقی سے جاکر کہدو کہ ہم تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا اے بھائی یہ امر مروت کے خلاف ہے کہ وہ تم کو بلائے اور تم نہ جاؤ۔ اگرچہ یہ مرد فاسق و فاجر ہے مگر رشتہ دار ہے مناسب ہے کہ اس

کے پاس جاکر یہ معلوم کرو کہ وہ کہتا کیا ہے۔ حکم امام سنکر جناب عباس مع اپنے بھائیوں کے شمر کے پاس گئے اور پوچھا او شقی کیا کہنا چاہتا ہے اس بے حیا نے کہا اے میری بہن کے فرزندو میں نے ابن زیاد اور عمر سعد سے تمہارے لئے امان حاصل کرلی ہے۔ پس تم کو لازم ہے کہ میرے ساتھ چلو اور حسین کا ساتھ دے کر خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو اگر تم میرے ساتھ چلوگے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ پسر سعد سے کہہ کر تمہیں لشکر کی سپہ سالاری دلوادوں گا۔ یہ سُنا تھا کہ جناب عباس غصہ سے تھر تھر کانپنے لگے اور فرمانے لگے۔ او دشمن خدا تجھ پر بھی لعنت اور تیری امان پر بھی لعنت او بدبخت فرزند رسول کے لئے تو امان نہ ہو اور ہم غلاموں کے لئے امان ہو او شقی تجھے ہرگز ہرگز ہم سے یہ امید نہ رکھنی چاہیئے کہ ہم اپنے بھائی اور آقا امام حسین کا ساتھ چھوڑ کر یزید فاسق و فاجر کی بیعت اختیار کرلیں گے۔ او دشمنِ خدا ہمارے سامنے سے دور ہوجا ورنہ ابھی تیرا سر تلوار سے اڑادیں گے

کتاب تبر المذاب میں ہے کہ شمر یہ جواب سنکر سخت غضبناک ہوا اور اس نے واپس جاکر ابنِ سعد سے کہا کہ اب حسین پر حملہ میں دیر نہ کرنی چاہیئے ابھی لشکر کو حکم دے کہ یکبارگی حملہ کرکے ان سب کا خاتمہ کردیں۔ چنانچہ شمر کے ورغلانے سے پسر سعد اپنے خیمہ سے نکل کر لشکر میں آیا اور چلا چلا کر کہنے لگا اے لشکرِ خدا اپنے گھوڑوں پر سوار ہو میں تم کو جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ یہ سنتے ہی تمام لشکر تیار بدل پر سجکر حملہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

امام حسین علیہ السلام اس وقت خیمہ کے دروازہ پر تشریف فرما تھے کہ یکایک آپ نے دیکھا کہ لشکر یزید گھوڑے بڑھائے چلا آرہا ہے۔ یہ حال دیکھکر حضرت اٹھ کھڑے ہوئے اور جناب عباس کو بلاکر فرمایا تم فوراً کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بڑھو اور ان ظالموں سے پوچھو تمہارے ادہر آنے کا کیا سبب ہے۔ چنانچہ جناب عباس بیس سلح سوار لے کر جس میں ہاشمی جوانوں کے علاوہ جناب زہیر قین اور حبیب ابنِ مظاہر بھی تھے بڑھے اور ان لوگوں کی راہ روک کر کہا کیا ارادہ ہے انہوں نے کہا ہمارے امیر کا حکم ہے کہ ہم اول تو تم سے بیعت یزید کا اقرار لیں اور اگر نہ مانو تو جنگ کرکے تم میں سے ایک ایک کو قتل کردیں۔

جناب عباس نے فرمایا ٹھہرو تمہارا مقصد معلوم ہوگیا میں اپنے بھائی حضرت ابو عبداللہ الحسین کی خدمت میں جاکر یہ بات عرض کرتا ہوں۔ یہ سنکر وہ ستم شعار وہیں رک گئے اور حضرت عباس گھوڑا بڑھا کر امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں کا قول بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا اے بھائی تم ان لوگوں کے پاس پھر جاؤ اور جہاں تک ممکن ہو کہہ سنکر ان لوگوں سے ایک رات کی مہلت اور مانگو تاکہ ہم یہ رات عبادتِ الٰہی اور دعا و استغفار میں بسر کریں۔ پس جناب عباس پھر اس قوم کی طرف واپس آئے اور حضرت کی خواہش بیان کی۔

بروایت منتخب عمر سعد نے شمر ملعون سے پوچھا تیری کیا رائے ہے۔ مہلت دی جائے یا نہیں۔ اس ملعون نے کہا اگر میں امیر ہوتا تو ہرگز مہلت نہ دیتا۔ یہ سنکر عمرو بن حجاج نے کہا اے شمر وائے ہو تیرے اوپر بخدا اگر یہ لوگ ترک و دیلم کے کفار بھی ہوتے اور ہم سے مہلت مانگتے تو ہم ضرور قبول کرلیتے چہ جائیکہ یہ سب آل محمد ہیں۔ اگر ایک رات کی مہلت مانگتے ہیں تو اس کے منظور کرنے میں کیوں تامل ہے۔ یہ سنکر پسر سعد کو بہت شرم آئی اور جناب عباس سے کہنے لگا اچھا حسین سے جاکر کہہ دیجئے کہ میں نے ان کو ایک رات

کی مہلت اور دی۔

حضرات اصحاب امام علیہ السلام کیسے بہادر اور صاحب ہمت و جرأت تھے کہ جب یہ خبر ملی کہ صبح کو جنگ ہونا طے پا گیا ہے تو شوقِ شہادت میں رنگ ان کے چہروں کا نکھر گیا۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح خوش ہو کر ہمکلام ہونے لگا گویا روزِ عید ہے حقیقت یہ ہے کہ جیسے نیک باوفا صاحبانِ ایمان اور متقی و پرہیزگار اصحاب امام حسین علیہ السلام کو ملے تھے نہ کسی نبی کو ملے نہ رسول کو۔ یہاں تک کہ حضرت رسولخدا کو ایسے بہادر اور باوفا اصحاب کم ملے تھے۔ جنگ احد میں باوجودیکہ آپ فتح کی بشارت سنا رہے تھے مگر پھر بھی لوگ آپ کو میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اور یہاں امام مظلوم نے باوجودیکہ بار بار یہ فرما دیا تھا کہ روزِ عاشور میرے ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی نہ بچے گا پھر بھی ان میں سے کسی نے امام کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ کسی شاعر نے ان کی شجاعت و ہمت کی تعریف میں خوب کہا ہے ؎

قَوْمٌ اِذَا نُوْدُوْا لِدَفْعِ مُلِمَّۃٍ وَالْخَیْلُ بَیْنَ مُدَعَّسٍ وَمُکَرْدَسٍ

لَبِسُوا الْقُلُوْبَ عَلَی الدُّرُوْعِ وَاَقْبَلُوْا یَتَہَافَتُوْنَ عَلٰی ذِہَابِ الْاَنْفُسِ

یعنی سبحان اللہ کیا شجاع و بہادر تھے انصار و اقربائے حسین کہ جب مصیبت میں ان کو آواز دی گئی کہ فرزند رسول کی نصرت کو چلو تو انہوں نے فوجوں کی کثرت کا خیال نہ کیا اور فوراً اپنے دلوں کو اپنی زرہوں پر پہن لیا۔ یعنی ان کے دل ایسے مطمئن تھے کہ مضبوطی میں لوہے سے بھی بڑھ گئے تھے اور جان دینے میں اس طرح ایک دوسرے پر سبقت کر کے گرے پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔

حضرات جب ہی تو ان کا یہ مرتبہ تھا کہ معصوم زیارتِ عاشور میں فرماتے ہیں۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَنْصَارَ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَاُمِّیْ طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْاَرْضُ فِیْہَا دُفِنْتُمْ وَفُزْتُمْ فَوْزًا عَظِیْمًا فَیَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزَ مَعَکُمْ

یعنی سلام ہو میرا حضرت ابوعبداللہ الحسین کے انصار پر۔ پھر معصوم فرماتے ہیں میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں تم پاک ہو گئے اور وہ زمین بھی پاک ہو گئی جس میں تم دفن ہوئے اور تم کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور تمہارے درجہ پر فائز ہوتا۔ اللہ اکبر اس مرتبہ کا کیا کہنا ہے کہ معصوم اس کی آرزو کرتا ہے۔

ابن شبیب سے منقول ہے کہ روز میں جناب امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا مولا کیسے خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ شہادت پائی۔ مولا کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ ہم لوگ بھی نصرتِ حسین کا ثواب حاصل کرسکیں۔ فرمایا ہاں صدق دل سے میرے جد مظلوم کو یاد کیا کرو اور کہا کرو یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ اے ابوعبداللہ کاش میں آپ کے ساتھ ہوتا پس خدائے تعالیٰ تم کو نصرتِ حسین کا ثواب عطا کرے گا۔ پھر حضرت نے فرمایا اس کلمہ کا ثواب اس لئے ہے کہ میرے جد مظلوم روزِ عاشورہ اپنے دوستوں کو مخاطب کر کے مقام شوق میں اس طرح فرماتے تھے۔

یَا لَیْتَکُمْ فِیْ یَوْمِ عَاشُوْرَ جَمِیْعًا تَنْظُرُوْنِیْ کَیْفَ اَسْتَسْقِیْ لِطِفْلِیْ فَاَبَوْا اَنْ یَرْحَمُوْنِیْ

یعنی اے میرے شیعو! کاش تم دیکھتے کہ میں اپنے شش ماہہ بچے کے لئے کس طرح اس قوم جفا کار سے پانی مانگتا تھا لیکن انہوں نے مجھ پر رحم کھانے سے انکار کر دیا۔ منشا امام کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب مولائے دوجہاں نے ہم کو اپنا ہمدرد سمجھ کر کربلا میں اس طرح یاد کیا تو ہمارا بھی فرض ہے کہ حضرت کی آواز پر لبیک کہیں اور آپ کی نصرت کی آرزو کرتے رہیں۔

الغرض حضرات اصحاب امام حسین علیہ السلام نے روز عاشورہ وہ کام کیا کہ دنیا حیرت میں آگئی۔ منقول ہے کہ شب عاشور جناب امام حسین علیہ السلام نے اپنے تمام اصحاب کو ایک خیمہ میں جمع کر کے فرمایا اے باایمانو! تم نے اب تک جو ہمدردی میرے ساتھ کی خدا تم کو اس کی جزائے خیر دے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے اور اس قوم جفا کار کے درمیان اب صلح کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہم نے صرف ایک رات کی مہلت ان سے طلب کی ہے۔ صبح کو ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ہے۔ میں تم کو دھوکہ میں رکھنا نہیں چاہتا بلکہ صاف بتائے دیتا ہوں کہ کل میں اور میرے ساتھی شہید کر دیئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ میرا شیر خوار بچہ بھی قتل ہو جائے گا۔ سوائے میرے فرزند علیل علی بن الحسین کے اور کوئی باقی نہ رہے گا۔ پس میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ میری وجہ سے ہلاک ہو۔ میں نے اپنی بیعت تم لوگوں کی گردنوں سے اٹھا لی ہے بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جس کا دل جدھر چاہے اس پردہ شب میں چلا جائے کہ ابھی راہیں تم لوگوں کے لئے کھلی ہوئی ہیں اور بہتر یہ ہو کہ میرے اقربا میں سے بھی ایک ایک کو ساتھ لے لے کیونکہ یہ اشقیا صرف میرے ہی خون کے پیاسے ہیں۔ میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ اگر تم یہاں رہ گئے اور کل میری آواز استغاثہ سن کر میری مدد نہ کی تو خداوند عالم تم کو اوندھے منہ جہنم میں دھکیل دے گا۔ یہ فرما کر آپ نے اس شمع کو گل کر دیا جو خیمہ میں جل رہی تھی تاکہ جانے والوں کو شرم نہ آئے اور منہ چھپائے ہوئے چلے جائیں۔ اس کلام کو سن کر کچھ لوگ تو چلے گئے اور جو کامل الایمان اور ثابت قدم تھے وہ رونے لگے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی یا ابن رسول اللہ آپ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ ایک جان کیا چیز ہے اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو آپ کے قدموں پر نثار کر دیں۔ اے سید و آقا ہمارے لئے آپ کی نصرت میں جان دینے سے زیادہ اور کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔ ہم آخر وقت تک آپ کا ساتھ دیں گے اور بغیر آپ کے قدموں پر جان دیئے یہاں سے ہرگز نہ جائیں گے یہ سن کر آپ نے فرمایا جزاکم خیراً الجزا۔ بے شک مجھے تمہاری وفاداری اور حق پرستی سے یہی امید ہے۔

جناب سکینہ بنت الحسین راوی ہیں کہ جب میرے پدر بزرگوار اپنے اصحاب کے مجمع میں یہ فرما رہے تھے اور آپ نے چراغ گل کیا تو میں نے دیکھا کہ لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ میں گھبرائی ہوئی اپنی پھوپی جناب زینب کی خدمت میں آئی اور رو رو کر عرض کرنے لگی اے پھوپی اماں غضب آگیا لوگ ہمارے پدر بزرگوار کا ساتھ چھوڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہائے جناب زینب کے دل کو کیسی لگی تھی یہ سنتے ہی بے چین ہو گئیں۔ اور جناب فضہ کو بلا کر کہا تم میرے ماں جائے کے پاس جاؤ اور میری طرف سے عرض کرو کہ دکھیا بہن اس وقت بہت مضطرب ہے۔ ذرا دیر کے لئے خیمہ میں ہو جائیے۔ چنانچہ جب حضرت تشریف لائے تو بہن نے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور رو رو کر کہنے لگیں اے بھائی سنتی ہوں کہ آپ کے ساتھی ساتھ چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ فرمایا اے بہن تم غم نہ کرو میرے جو حقیقی ناصر ہیں وہ سب موجود ہیں۔ شہزادی نے کہا اے بھائی جو لوگ رکے ہوئے ہیں ان کی وفاداری پر آپ کو پورا پورا اعتماد بھی ہے؟ فرمایا اے بہن! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جیسے وفادار اور نیک اصحاب مجھے ملے ہیں دنیا میں کسی نبی یا ولی کو نہیں ملے

حضرات کسی نے یہ خبر جناب حبیب ابن مظاہر کو بھی پہنچا دی۔ حبیب گھبرا کر خیمے سے نکلے اور اصحاب امام کے خیموں کے درمیان کھڑے ہو کر فرمانے لگے اے انصار حسین کیا چین سے خیموں میں بیٹھے ہو غضب آ گیا۔ دختر علی و فاطمہ کو تمہاری وفاداری پر اعتماد نہیں ذ ہم سب مل کر در خیمہ پر چلیں اور دختران علی و فاطمہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلائیں۔ حبیب کی یہ بات سنکر تمام انصار حسین خیمہ سے نکل آئے اور حبیب کے ساتھ امام علیہ السلام کے خیمے کے دروازہ پر آئے اور بآواز بلند کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ بَیْتِ النُّبُوَّۃِ وَ مَعْدَنِ الرِّسَالَہ۔

مومنین! آج تک اس دروازہ کی یہ قدر و منزلت تھی کہ بڑے بڑے کامل الایمان لوگ فخر کے ساتھ سلام کرتے تھے۔ لیکن کل بعد شہادت امام مظلوم اسی گھر کو اشقیائے امت نے آگ سے جلایا اور اہل حرم کو اس بیدردی سے لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر نہ رہی۔ الغرض جب انصار کے سلام کی آواز جناب زینب نے سنی تو پوچھا کہ میرے بھائی کے انصار خدا ان پر اپنی رحمت نازل کرے کس غرض سے آئے ہیں۔ میرا سلام بھی ان کو کہو۔ انصار حسین نے عرض کی ہماری طرف سے دختران فاطمہ کی خدمت میں عرض کرو کہ آپ کے بھائی کے ناصر و مددگار آپ کو یہ یقین دلانے کے لئے حاضر ہوئے ہیں کہ جب تک ہماری شہ رگ میں خون کا آخری قطرہ بھی باقی رہے گا اپنے مظلوم آقا کی نصرت سے پہلو تہی نہ کریں گے۔ شہزادی ذرا صبح ہونے تو دیجئے پھر آپ کو ہماری وفاداری کا حال معلوم ہو جائے گا۔ یہ کلام سنکر جناب زینب کے ٹوٹے دل کو بڑی ڈھارس ہوئی اور سب اہل حرم نے خوش ہو کر ناصران حسین کے لئے دعائے خیر کی۔

منقول ہے کہ شب عاشور حبیب ابن مظاہر نے تمام انصار حسین کو اپنے خیمہ میں جمع کیا۔ اور فرمایا دوستو تم کو معلوم ہے کہ کل دشمنان آل محمد سے جنگ ہے یہ سب جفا شعار اولاد رسول کا خون بہانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ دوستو اگر ہماری آنکھوں کے سامنے اولاد رسول میں سے ایک بچہ بھی قتل کر ڈالا گیا تو پھر روز محشر حضرت رسول خدا کو منہ دکھانے کا موقع نہ رہے گا۔ جناب زہیر نے پوچھا پھر تمہاری کیا رائے ہے؟ حبیب نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ ہم سب انصار اقربائے حسین سے پہلے اپنی جانوں کو نثار کر دیں تاکہ اولاد رسول کا خون ہماری آنکھوں کے سامنے نہ بہایا جائے۔ سب نے بالاتفاق کہا اے حبیب آپ کی رائے بہت درست ہے۔ انشاء اللہ کل کو اقربائے حسین سے پہلے ہم سب امام مظلوم کے قدموں پر اپنی جانیں نثار کر دیں گے۔

کسی نے یہ خبر جناب عباس کو پہنچا دی آپ نے تمام ہاشمی جوانوں کو اپنے خیمہ میں جمع کر کے فرمایا اے بیشۂ شجاعت کے شیرو! اے ہاشمی و علوی جوانو! تم نے سنا کہ انصار نے کیا ارادہ کیا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم سے پہلے اپنی جانوں کو قربان کر دیں۔ اے غیرت دارو! ایسا ہوا تو کل کو دنیا طعنہ دے گی کہ حسین نے پہلے غیروں کو کٹوا دیا اور اپنوں کو بچائے رکھا۔ خاندان رسالت کے لئے یہ بات سخت بدنما ہو گی یہ سنتے ہی حضرت علی اکبر کھڑے ہو گئے اور عرض کی چچا جان سب سے پہلے جان دینے کے لئے میدان کارزار میں میں نکلوں گا۔ جناب قاسم نے عرض کی چچا جان یہ کیسے ممکن ہے کہ غیر تو ہمارے سامنے شہید ہوں اور ہم اپنی جانوں کو بچائے رکھیں۔ سب سے پہلے شہید ہونے کو میں نکلوں گا۔ غرضکہ اسی طرح ہر ایک جوان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت عباس نے ان کی ہمتوں پر آفرین کہی۔

صاحب بحر البکا لکھتے ہیں کہ روز عاشور جب دونوں طرف کی فوجیں میدان میں نکل کر کھڑی ہوئیں اور فوج مخالف کی طرف سے

مبارزطلبی ہونے لگی تو اصحاب امام حسین علیہ السلام نے سامنے آ کر اجازتِ جنگ حاصل کرنی چاہی۔ لیکن حسین کی غیرت تقاضا نہ کرتی تھی۔ کہ اپنے جگر پاروں اور عزیزوں کے ہوتے ہوئے غیروں کو اجازت دیں۔ پس آپ نے اپنے کڑیل جوان بیٹے پر نظر ڈالی اور فرمایا یا بُنَیَّ تَقَدَّمْ اے بیٹا سب سے پہلے تم میدان کارزار میں جاؤ۔ یہ سنتے ہی حضرت علی اکبر جانے پر آمادہ ہوئے۔ جناب سعید جناب مسلم بن عوسجہ یہ دیکھ کر امام مظلوم کے قدموں پر گر پڑے اور رو رو کر عرض کرنے لگے۔ مولا! یہ ہماری تلواریں حاضر ہیں ان سے پہلے ہمارے گلے کاٹ دیجئے تب علی اکبر کو میدان میں بھیجئے۔ ہم سے ہرگز نہ دیکھا جائے گا کہ ہمارے ہوتے ہوئے شہزادہ لڑنے کو جائے۔ مولا خدا کے لئے علی اکبر کو روک لیجئے ورنہ ہم سب اپنی اپنی تلواروں سے گلے کاٹ کر مر جائیں گے۔ اے فرزندِ رسول یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم کھڑے دیکھا کریں اور اولادِ رسول ہمارے سامنے تیغ و تبر کھائے۔ الغرض جب انصارِ حسین نے انتہائی بے چینی کا اظہار کیا تو مجبوراً امامِ مظلوم نے جناب علی اکبر کو لڑنے جانے کا حکم دیا۔

آہ آہ مومنین! کہاں تھے اس وقت انصارِ حسین جب یہی شہزادہ علی اکبر شبیہ پیغمبر ظالموں کے زغہ میں گھرا ہوا ہر طرف سے تیغ و تبر اور نیزہ و خنجر کے وار کھا رہا تھا اور گھوڑے سے گرتے ہوئے حسین کو پکار رہا تھا یَا اَبَتَاہُ اَدْرِکْنِیْ اے بابا جان خبر لیجئے کہ میں نے اپنی جان آپ پر سے نثار کی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ٥

نویں مجلس

تفسیر آیہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ و حالاتِ شبِ عاشور

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۝ (بے شک اللہ نے خرید لیا مومنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے ہیں۔ وہ راہِ خدا میں قتال کرتے ہیں اور (سب کے سب) قتل ہو جاتے ہیں) مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت جناب امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی شان میں ہے۔ انہی کے جان و مال اس قابل تھے کہ اللہ نے ان کو خرید لیا اور وہی ایسے قتال کرنے والے تھے کہ سب کے سب قتل ہو گئے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کربلا والوں کی جان و مال کی قیمت جنت ہے پس جب امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب نے جان بیچ کر جنت خرید لی تو اب ان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص امام حسین علیہ السلام کے غم میں روئے رلائے یا رونے والوں کی سی صورت بنائے تو جنت اس پر واجب ہے۔ اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین پر سچے دل سے وہی شخص روئے یا رلائے گا یا کم از کم رونے والوں کی صورت بنائے گا جس کو حضرت کی ذات سے محبت ہو گی۔ پس جس کو محبت ہو گی وہ حضرت کا دوست ہو گا۔ جنت چونکہ حسین کی ہو چکی ہے لہٰذا وہ ضرور اپنے دوستوں کو عطا فرمائیں گے۔ پس جنت درحقیقت دوستیٔ حسین کا صلہ ہے۔ حسین کی جان کی قدر و قیمت کوئی خدا سے پوچھے جس نے جنت جیسی گرانقدر چیز کو اس کی قیمت قرار دیا ہے۔

امام حسین اور ان کے رفقاء کی جانوں کے علاوہ ایک اور جان بھی خدا نے خرید کی ہے اور اس کا صلہ جنت نہیں بلکہ اپنی مرضی کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اپنی جان کو مرضیٔ الٰہی حاصل کرنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں۔ مفسرین عامہ اور خاصہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت شبِ ہجرت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے واقعہ اس کے متعلق یہ ہے کہ جب کفار قریش نے حضرت رسول خدا کے قتل کے ارادہ سے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت پر وحی ہوئی کہ اے رسول کفار کا ایسا ارادہ ہے تم کو چاہیئے کہ اپنے بھائی اور وصی علی بن ابی طالب کو اپنے فرش پر سلا کر غار ثور کی طرف چلے جاؤ۔ پس حضرت نے امیر المومنین علیہ السلام کو بلا کر فرمایا اے علی حکم خدا یہ ہے کہ آج کی رات میں تم کو اپنے فرش پر سلا کر چلا جاؤں۔ عرض کی اگر میرے اس عمل سے آپ کی جان بچتی ہے تو ایک کیا ہزار جانیں آپ کے سے قربان، آپ ضرور تشریف لے جائیں۔ یہ سنکر آنحضرت خوش ہوئے اور آپ کے پاس جو امانتیں اہلِ مکہ کی تھیں، حضرت علی کی سپردگی میں دے کر فرمایا میں تین روز غار ثور میں قیام کرنے

کے بعد مدینہ کو روانہ ہوجاؤں گا۔ تم یہ سب امانتیں لوگوں کے سپرد کرکے چلے آنا اور راہ میں مجھ سے مل جانا۔ اس کے بعد حضرت نے وہاں سے روانگی کا قصد فرمایا۔

مومنین یہ ایک عجیب ہولناک وقت تھا۔ کفار قریش برہنہ تلواریں لئے خانۂ رسالت کا محاصرہ کئے اس ارادہ سے کھڑے تھے کہ جس وقت آپ گھر سے برآمد ہوں فوراً آپ کو ہلاک کردیں۔ پس بحکم خدا آپ بیت الشرف سے برآمد ہوئے اور ایک مٹھی بھر خاک ان کی طرف پھینکی اس کے اثر سے وہ ایسے اندھے ہوئے کہ حضرت ان کے درمیان سے نکلے چلے گئے اور ان کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ حضرت کے تشریف لیجانے کے بعد امیر المومنین علیہ السلام آپ کی یمنی سبز چادر اوڑھ کر آپ کے بستر پر لیٹ رہے۔ چونکہ خانۂ رسالت کی دیواریں نیچی نیچی تھیں اس لئے کفار بار بار اچک اچک کر دیکھتے تھے کہ حضرت گھر میں موجود ہیں یا نہیں۔ جب حضرت علی کو فرش خواب پر لیٹا ہوا پاتے تھے تو ان کو اطمینان ہوجاتا تھا۔ وہ تمام رات اس خیال سے کھڑے رہے کہ جب حضرت باہر نکلیں تو قتل کرڈالیں۔

حضرت علی کی یہ شجاعت دیکھنے کے قابل تھی۔ کہ باوجودیکہ کفار برہنہ تلواریں لئے کھڑے تھے۔ اور قتل ہوجانے کا پورا اندیشہ تھا مگر آپ بڑے اطمینان سے تمام رات سوتے رہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم خوف سے رونے لگتا یا چیخ پکار مچا دیتا۔ یا کم از کم فکر میں تارے ہی گنتا رہتا۔ لیکن علی کے پاس خوف کہاں۔ ایسا بہادر تو سرزمین عرب پر پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ وہ تو حمایت دین میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے بڑے اطمینان سے سوئے۔ کسی نے امیر المومنین علیہ السلام کو تمام تمام رات عبادت کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا حضرت آپ کسی رات کو چین سے سوئے بھی ہیں فرمایا ہاں شب ہجرت۔ اللہ اللہ جو رات سب سے زیادہ خوفناک تھی علی اسی رات کو سب سے زیادہ چین سے سوئے اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت کو خدا کی حمایت پر پورا پورا الیقین تھا۔

مختصر یہ ہے کہ جو مرتبہ لوگوں کو رو رو کر نہ ملا وہ آپ نے سو کر لے لیا اور جو اعزاز اوروں کو مر کر نہ حاصل ہوا وہ آپ نے اونگھ کر لے لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت رسولخدا کی وہ سچی مواسات و ہمدردی تھی جو کسی دوسرے سے بن نہ پڑتی۔ تمام خاندان بلکہ تمام مسلمانوں میں اس وقت صرف ایک حضرت علی ہی ایسے شخص تھے جن پر حضرت رسولخدا صحیح معنی میں اعتماد کرسکتے تھے۔ یہ معمولی بات نہ تھی اگر کوئی ڈرپوک آدمی اس موقع پر ہوتا اور وہ کفار کے خوف سے اس بھید کو کھول دیتا تو آج ہی رسالت کا خاتمہ ہوجاتا۔ علاوہ بریں اگر علی کی جگہ کوئی دوسرا شخص اس خدمت کے انجام دینے کے لئے مقرر کیا جاتا۔ تو ضرور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ آنحضرت خود تو اپنی جان بچا کر چلے گئے اور مجھے خطرہ میں چھوڑ گئے۔ علی علیہ السلام کے دل میں یہ شیطانی وسوسے آہی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ آپ نفسِ رسول تھے اور آنحضرت کی رسالت پر دل سے ایمان لائے ہوئے تھے۔

منقول ہے کہ جب علی علیہ السلام سے دین خدا کی یہ بے لوث خدمت انجام پارہی تھی۔ تو خداوند عالم نے اپنے ملائکہ مقربین سے فرمایا میں نے تم میں سے ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ قرار دی۔ پس تم میں کون ایسا ہے کہ اپنی عمر کو اپنے بھائی کے حق میں منتقل کردے یہ سنکر ملائکہ خاموش ہوگئے۔ تب خداوند عالم نے فرمایا دیکھو جس کام کو تم نہیں کرسکتے وہ میرا خاص بندہ علی کس شوق کے ساتھ انجام دے رہا ہے وہ اپنی جان کو راہِ خدا میں بیچے ہوئے کیسے اطمینان سے اپنے بھائی کے فرش پر سو رہا ہے۔ اچھا اے میرے ملائکہ تم زمین پر جاؤ اور تمام رات

علی کی حفاظت کرو۔ چنانچہ جبرئیل و میکائیل سرہانے کی طرف اور اسرافیل و عزرائیل پائنتی کی طرف تھے۔ اور تمام رات یہ کلمات کہتے رہے بشارت ہو تم کو اے علی بن ابی طالب کہ تمہاری اس جان نثاری اور وفاداری پر خلاقِ عالم فخر کرتا ہے۔ خوشا حال تمہارا اے پسر ابوطالب کہ درگاہِ الٰہی میں تمہاری یہ پیچی خدمت مقبول ہوئی ہے۔

الغرض جب قریب صبح کفار قریش سے ضبط نہ ہو سکا تو بے باکانہ خانۂ رسول میں در آئے۔ چاہتے تھے کہ تلوار سونت کر حضرت کا کام تمام کر دیں کہ جناب امیر علیہ السّلام ایک شجاعانہ انگڑائی لے کر اٹھے اب تو ان کو سخت حیرت ہوئی پوچھنے لگے بتاؤ محمد کہاں ہیں۔ فرمایا کیا تم ان کو میرے سپرد کر گئے تھے جو لینے کو آئے ہو۔ جہاں کہیں ہوں پتہ چلالو۔ وہ لوگ امیر المومنین علیہ السّلام کو چھوڑ کر اس خیال سے فوراً چل دیئے کہ ابھی محمد دور نہ گئے ہوں گے ہم راہ میں جا پکڑیں گے۔

یہ تھی وہ بے مثال خدمت جس کے صلہ میں سرکارِ الٰہی سے حضرت علی کو آیۂ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ کی سند ملی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے علی کا نفس مول لے لیا اور اپنی مرضی بطور قیمت علی کو دیدی۔ پس اب علی کا نفس خدا کا نفس بن گیا اور خدا کی مرضی علی کی چیز ہو گئی۔ جس طرح خدا کو اب یہ حق ہے کہ جہاں چاہے علی کے نفس سے کام لے۔ خواہ بدر میں لڑائے یا اُحد میں خندق میں کام لے یا خیبر میں علی کو انکار کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح علی کو یہ حق ہے کہ مرضی الٰہی کو جدھر چاہیں صرف کریں چونکہ علی اپنا نفس خدا کے ہاتھ بیچ چکے تھے۔ لہٰذا شب ہجرت بڑے اطمینان سے سوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس کی چیز ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا چنانچہ اس نے حفاظت کی اور بہترین صورت میں کی۔

یہ نکتہ بھی خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ علی کا نفس خدا کا نفس بن چکا تھا۔ لہٰذا حضرت نے عمر بھر اس سے خدا ہی کام لیا اپنی ذاتی خواہشوں کو ہمیشہ اس سے الگ رکھا۔ اس کا گواہ وہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک جنگ میں جب آپ نے دشمن پر غلبہ حاصل کیا اور اس کے سینہ پر قتل کے ارادے سے بیٹھے۔ تو اس نے اپنا لعاب دہن حضرت کی طرف پھینکا۔ آپ فوراً اس کے سینہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے کہا آپ نے یہ کیا کیا؟ فرمایا میں اس کو خوشنودی خدا کے لئے قتل کرنا چاہتا تھا میری کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی اب چونکہ اس نے اپنا لعاب دہن میری طرف پھینکا تو میرا جذبۂ انتقام جوش میں آیا بس میں فوراً اس سے جدا ہو گیا تاکہ میرا نفس اس کے قتل میں شامل نہ ہو۔

حضرات! علی کا نفس بھی عجیب نفس تھا خدا نے چاہا کہ میرا نفس ہو کر رہے اور رسول نے چاہا کہ میرا نفس بن کر رہے یہ خصوصیت اسی نفس کو حاصل تھی کہ بزم قدس کی زینت بننے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا اور بزم رسالت کو زیب دینے کے قابل بھی تھا آیۂ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نے نفس اللہ بننے کی سند عطا فرمائی اور آیۂ مباہلہ نے نفس رسول بننے کی بشارت دی۔

ایک یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آیۂ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي سے معلوم ہوتا ہے کہ علی نے اپنا نفس بیچا اور عنوان مجلس جو آیۂ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ سے ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ان نفوس کو خود خریدا۔ بہت فرق ہے اس بات میں کہ ایک شخص اپنی غرض سے کسی چیز کو بیچنا چاہے اور اس امر میں کہ خریدار اپنی خواہش سے کوئی شے خریدے ان دونوں آیتوں سے بظاہر ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ کربلا والوں کے نفوس کا مرتبہ نفسِ علی سے زیادہ تھا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صناع خاص چیز تیار کرتا ہے تو پہلے بطور نمونہ اہلِ نظر خریداروں کے سامنے خود پیش کرتا ہے۔ لیکن جب خریدار کو مال پسند آجاتا ہے تو خریدار مال لینے کی خواہش خود کرنے لگتا ہے۔ بلا تشبیہ یہاں بھی یہی صورت سمجھو اول جناب امیر علیہ السّلام نے شب ہجرت اپنا نفس پیش کیا۔ وہ خریدار کو ایسا پسند آیا کہ اس نے طے کر لیا کہ اس گھر کے جتنے نفوس ہوں گے وہ سب ہمارے ہیں چنانچہ کربلا کے کل نفوس اس نے خرید لئے۔

اللہ اکبر ایسے مقدس نفوس جن کو خداوند عالم نے خرید فرمایا ایک روز اشقیائے امت کے ہاتھوں سخت سے سخت مظالم برداشت کر رہے تھے کون سی تکلیف تھی جس کا ان کو سامنا نہ تھا۔ تین روز کی بھوک پیاس بھی تھی۔ جان و مال و آبرو کا خوف بھی تھا مگر واہ رے عاشقانِ خدا تمہارا کیا کہنا ایسے سخت وقتوں میں بھی جبکہ انسان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے تم ایک لحہ کو یادِ خدا سے غافل نہ ہوئے۔

حضرات امام مظلوم نے ایک رات کی مہلت محض اس وجہ سے حاصل کی تھی کہ دنیا میں آخری دن آنے سے پہلے خوب جی کھول کر یادِ خدا کر لیں۔ چنانچہ وہ تمام رات ان خاصانِ الٰہی نے یادِ خدا میں گزاری کہیں تلاوت کلام پاک تھی تو کہیں رکوع و سجود۔ کہیں تسبیح و تہلیل، کہیں تذکر و تشکر۔ منقول ہے کہ ہر خیمے سے ذکرِ الٰہی کی آوازیں کربلا کے کھلے میدان میں اس طرح گونج رہی تھیں۔ جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتوں سے بھنبھناہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ ساری رات حسین اور اصحابِ حسین کو جاگتے ہی گزری۔

آج اصحابِ حسین کو وہ خوشی تھی جو بچوں کو عید کی رات کو ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اصحاب کے حال میں لکھا ہے کہ جناب بُریر ہمدانی نے حبیب ابنِ مظاہر سے کچھ مزاحیہ کلام کیا۔ حبیب نے کہا اے بُریر یہ وقت مذاق و دل لگی کا نہیں۔ بُریر نے کہا اے حبیب آپ جانتے ہیں کہ میری عادت مذاق و دل لگی کی نہیں۔ لیکن اے حبیب جوشِ مسرت نے اس وقت یہ کلماتِ مزاحیہ میری زبان سے نکلوا دیئے۔ اے حبیب اس سے زیادہ خوش ہونے کا موقع ہمارے لئے کیا ہوگا کہ ہم نصرتِ حسین کی بدولت جنت میں جانے کو تیار ہیں۔ اے حبیب زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ انسان نیک اعمال کر کے دخولِ جنت کا استحقاق حاصل کرے پس جب حسین کے صدقہ میں ہمارا مقصد زندگی حاصل ہو رہا ہے تو ہم کو موت زندگی سے زیادہ کیوں نہ عزیز ہو۔ واللہ اے حبیب میں آج اتنا خوش ہوں کہ اپنی زندگی میں کسی روز اتنا خوش نہیں ہوا۔

کتاب ملہوف میں ہے کہ شبِ عاشور امام حسین علیہ السّلام نے اس طرح بسر کی کہ برابر تسبیح و تہلیل کی آواز آپ کے خیمہ سے بلند تھی۔ کتاب ارشاد میں جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ شبِ عاشور میں اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا اور میری پھوپی جناب زینب میری تیمارداری میں مصروف تھیں۔ اس وقت میرے پدر بزرگوار اپنے خیمے میں تنہا تھے صرف جون غلام ابوذر غفاری آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ تلوار سامنے رکھی ہوئی تھی اور آپ اس کو صاف کر رہے تھے۔ اور بار بار چند اشعار بے ثباتی دنیا کے متعلق کچھ ایسے دردناک لہجہ میں پڑھ رہے تھے کہ ان کو سنکر میرا دل الٹ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرے پدر بزرگوار کو اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی ہے۔ لیکن میری پھوپی جناب زینب سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس بیتابی

سے حضرت کے خیمہ کی طرف چلیں کہ ان کو سر ڈھانپنے کا ہوش نہ تھا۔ چادر زمین پر لٹک رہی تھی۔ جب حضرت کی خدمت میں پہنچیں تو رو رو کر کہنے لگیں۔ کاش مجھے موت آجاتی کہ آج کا دن میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی۔ مجھے آج یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میری ماں فاطمہ زہرا اور میرے پدر علی مرتضیٰ نے قضا کی ہے۔ آہ آہ ہمارے بھرے کنبہ میں صرف ایک دم آپ کا ایسا تھا کہ اس سے ہم بیکسوں کی ڈھارس تھی۔ آپ ہی ہمارے سرپرست اور بزرگوں کی یادگار باقی رہ گئے تھے اب جو آپ اس طرح اپنی موت کی خبر دے رہے ہیں تو بہن کی جان پر بن گئی ہے مجھے اب معلوم ہو گیا کہ آپ کا سایہ عنقریب ہمارے سر سے اٹھنے والا ہے۔ آہ! اس عالم غربت میں ہم بیکسوں کا حامی و مددگار کون ہو گا دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں ہم کس سے فریاد کریں گے اور کون ہماری دادرسی کے لئے آئے گا۔

بہن کا یہ حسرت آمیز کلام سنکر امام مظلوم کا دل سینہ میں تڑپ گیا۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا اے بہن صبر سے کام کو اور بھائی کی بیکسی و بے یاری پر نظر رکھو اے بہن اگر میرا اختیار ہوتا تو کیوں تم سب کو اس بلا میں اپنے ہاتھوں پھنساتا۔ اے بہن اپنے شکستہ دل کو سنبھالو تمہاری بیقراری و گریہ و زاری سے یہ سب عورتیں بدحواس ہو جائیں گی۔ اے بہن موت ایک دن سب کو آنی ہے۔ سوائے ذات خدا کوئی باقی نہ رہے گا۔ اے بہن خیال تو کرو میرے نانا اور باپ اور ماں جو مجھ سے بہتر و افضل تھے۔ جب وہی اس دنیا میں نہ رہے تو میں کیا ہمیشہ رہ سکوں گا۔ الغرض اس قسم کی باتیں کر کے حضرت نے اپنی مغموم بہن کو تسلی دی۔ اور امام زین العابدین کو خیمہ کی طرف واپس بھیجا۔

اس کے بعد حضرت خیمۂ اقدس سے برآمد ہوئے اور اصحاب باوفا کو بلا کر فرمایا کہ سب اپنے اپنے خیمے ملا کر استادہ کریں اور طنابیں ایک خیمہ کی دوسرے سے ملا کر باندھیں۔ پس بموجب حکم امام خیام اہلحرم کے گرداگرد تمام اصحاب نے اپنے خیمے نصب کئے تاکہ دشمن اگر حملہ آور ہوں تو اہل حرم تک نہ پہنچ سکیں۔ پھر حضرت نے چاہا کہ خیموں کے اندر اپنے اصحاب کا حال معلوم کریں۔ سب سے پہلے آپ انصار کے خیموں کی طرف تشریف لے گئے۔ ایک خیمہ کے قریب آپ نے جا کر دیکھا کہ حضرت کے بچپن کے دوست حبیب ابن مظاہر کمر کے ہتیار بدن پر سجے اس طرح تیار بیٹھے ہیں گویا ابھی ان کو جنگ کے لئے جانا ہے۔ غلام سامنے کھڑا ہے۔ جب تلاوت پاک سے فارغ ہوئے تو غلام نے عرض کی اے میرے سید و آقا آپ نے کئی روز سے اپنی ریش مبارک کو خضاب نہیں کیا اگر اجازت ہو تو خضاب لے آؤں۔ حبیب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ اب یہ میری داڑھی انشاء اللہ نصرت حسین میں میرے سر کے خون سے خضاب ہو گی۔ امام مظلوم یہ سنکر رو دیئے اور وہاں سے آگے بڑھے۔

اب آپ جناب زہیر قین کے خیمے کے سامنے تھے۔ دیکھا کہ جناب زہیر کے خیمہ میں ابو ثمامہ صیداوی بھی تشریف فرما ہیں۔ جناب زہیر ان سے پوچھ رہے ہیں کیوں ابو ثمامہ اب کتنی رات باقی ہو گی۔ وہ جواب میں فرماتے ہیں۔ ابھی نصف سے زیادہ رات باقی ہے۔ جناب زہیر فرماتے ہیں اللہ اللہ یہ رات کتنی طولانی ہو گئی کہ کسی طرح کٹنے ہی میں نہیں آتی۔ خدایا جلد صبح ہو کہ میں حسین کے قدموں پر اپنی جان نثار کر چکوں۔ جناب ابو ثمامہ بطور مزاح فرماتے ہیں اے زہیر اس عالم پیری میں حوران جنت سے ہم آغوش ہونے کا کس درجہ شوق ہے۔ وہ مسکرا کر جواب دیتے ہیں اے ابو ثمامہ مجھے جنت کی حوروں کا شوق تو بے چین نہیں بنا رہا بلکہ اپنے مظلوم امام کی نصرت میں شہید راہ خدا بننے اور حضرت رسولخدا سے سرخرو ہونے کا شوق اس درجہ ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

یہ سنکر امام حسین علیہ السلام نے زہیر کے حق میں دعائے خیر کی اور وہاں سے بڑھکر مسلم بن عوسجہ کے خیمے کے سامنے پہنچے دیکھا کہ یہ بوڑھا مجاہد اپنی کمر کسے اور ہتیار بدن پر سجے صبح کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے اور بار بار خدا سے دعا کرتا ہے کہ خداوند مجھے نصرت حسین میں کامیاب کرنا۔ اس کے بعد حضرت کا گزر وہب کے خیمہ کی طرف ہوا دیکھا کہ مادر وہب بیٹے کو سامنے بٹھائے سمجھا رہی ہیں۔ دیکھو بیٹا کل مجھے روح جناب سیدہ سے شرمندہ نہ کرنا۔ بیٹا میں نے تمہیں اسی دن کے لئے پالا تھا کہ دین خدا کا فدیہ بناؤں۔ اے وہب اگرچہ تو نوجوان ہے اور تیری شادی کو بھی ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں۔ جانتی ہوں کہ تیرے دل میں بہت سے ارمان ہیں مگر اے وہب پھر بھی تو مجھے میرے سید و آقا امام حسین سے زیادہ پیارا نہیں۔ بیٹا میرے مولا پر سخت وقت آپڑا ہے اس وقت اپنی جان کو فرزند رسول سے زیادہ عزیز نہ رکھ۔ جناب وہب عرض کر رہے ہیں اے مادر گرامی آپ اطمینان رکھیں میں آپ کے دودھ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نصرت امام میں ہرگز کوتاہی نہ کروں گا اور جب تک اپنی جان قربان نہ کر دوں گا میدان سے نہ ہٹوں گا۔ آہ آہ یہ دل دوز اور جگر سوز منظر دیکھ کر امام امام مظلوم کا دل بھر آیا اور دیر تک خیمۂ وہب کے قریب کھڑے روتے رہے۔

جب انصار کے خیموں کا باری باری معائنہ فرما چکے تو اب اپنے عزیزوں کے خیموں کی طرف رخ کیا۔ پہلے ام فروہ مادر جناب قاسم کے خیمے کی طرف آئے دیکھا کہ بیوہ بھاوج نے اپنے یتیم بچے کو بنا سنوار کر اپنے سامنے بٹھایا ہے۔ اور فرما رہی ہیں بیٹا تو اپنے مرے باپ کی نشانی ہے۔ میں نے تجھے بڑے چاؤ سے پالا ہے۔ تیرے جوان ہونے کے بڑے بڑے ارمان میرے دل میں تھے۔ لیکن بیٹا اب وہ سب حسرت و یاس سے بدل گئے۔ اب دکھیا ماں کے دل میں اس کے سوا اور کوئی ارمان نہیں کہ تجھے راہ خدا میں شہید دیکھوں۔ بیٹا تمہارے مظلوم چچا نرغہ اعدا میں گھر چکے ہیں۔ ہم سب پر ایک سخت وقت آپڑا ہے۔ اگر اس وقت تمہارے باپ زندہ ہوتے تو اپنے مظلوم بھائی کی ہر طرح مدد کرتے اب تم ان کے قائم مقام ہو اپنے باپ کے اس فرض کو ادا کرو۔ دیکھو بیٹا کل جب بازار موت گرم ہو تو مرنے سے جی نہ چرانا اور مجھے روح علی و فاطمہ سے روز حشر شرمندہ نہ کرنا۔ جناب قاسم ہاتھ جوڑ کر عرض کر رہے ہیں اے مادر گرامی آپ مطمئن رہیئے کیونکر ممکن ہے کہ اس وقت بیکسی میں میں اپنے شفیق چچا کا ساتھ چھوڑ دوں۔ حالانکہ انہوں نے باپ کی طرح مجھے شفقت سے پالا ہے۔ بس صبح ہونے تو دیجئے پھر آپ دیکھیں گی کہ آپ کا یہ کمسن فرزند کس طرح شجاعت ہاشمی کے جوہر دکھا کر اپنی جان اپنے چچا کے قدموں پر قربان کرتا ہے۔

آہ آہ مومنین کیا وقت مظلوم کربلا پر آگیا تھا کہ مخدرات عصمت و طہارت اپنی آنکھوں کے تاروں اور کلیجہ کے ٹکڑوں کو یوں جان دینے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ بیوہ بھاوج کے یہ کلمات سنکر امام مظلوم کا دل ہل گیا۔ اور زار زار روتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھے۔ اب خیمۂ جناب زینب کے سامنے تھے۔ مومنین کیونکر عرض کروں کہ اس خیمہ کے پاس آکر کیا جگر پاش منظر دیکھا۔ جناب زینب اپنے دونوں بیٹوں کو آراستہ کرکے بیٹھی ہیں اور فرما رہی ہیں اے فرزندو! حسین کو ماموں نہ سمجھنا انہوں نے باپ سے زیادہ تم پر شفقت کی ہے۔ اے فرزندو کل قربانی آل محمد کا دن ہے۔ دیکھو اگر نصرت حسین میں ذرا بھی تم نے کوتاہی کی تو ہرگز اپنا دودھ نہ بخشوں گی۔ اور تمہاری صورت دیکھنے کی روادار نہ ہوں گی۔ دیکھو بچو سمجھائے دیتی ہوں ایسا نہ کرنا کہ فوجوں کی کثرت دیکھ کر ڈر جاؤ۔ تم اس علی کے نواسے ہو جس نے بدر و احد و

خیبر و خندق جیسے معرکے سر کئے۔ تم اس جعفر کے پوتے ہو جو ہمیشہ فوجِ رسول کے علمدار رہے اور جنہوں نے نصرتِ دین میں اپنے بازو کٹا کر "طیار" کا لقب حاصل کیا۔ اے عون و محمد تمہارے بیکس ماموں پر بڑا سخت وقت آگیا ہے جہاں تک ہو سکے کل کو جلد از جلد اپنے کو ماموں پر سے فدا کر کے اس بلا کو رد کرنا۔ ماں کی یہ تقریر سنکر بچے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے اے مادرِ گرامی ہماری کیا مجال ہے کہ آپ کے حکم کے خلاف قدم اٹھا سکیں۔ کیا ہم ماموں کے مرتبہ سے آگاہ نہیں کیا ہم ماموں جان کی شفقتیں دیکھ نہیں رہے۔ کل آپ دیکھیں گی کہ علی کے نواسے اور جعفر طیار کے پوتے کس دلیرانہ شان سے لڑتے ہیں۔

اس کے بعد امام مظلوم روتے ہوئے ایک اور خیمہ کے پاس آئے۔ آہ کس زبان سے عرض کروں کہ یہ خیمہ کس کا تھا اور حسین نے کیا دردناک منظر دیکھا۔ مومنین یہ خیمہ ام لیلیٰ مادرِ حضرت علی اکبر شبیہ پیغمبر کا تھا۔ دیکھا کہ ام لیلیٰ نے اپنے کڑیل جوان کو آراستہ کر کے سامنے بٹھایا ہے۔ شمع جل رہی ہے اور دکھیا ماں بڑی حسرت سے اپنے بیٹے کا منہ تک رہی ہے اور حسرت بھرے لہجہ میں کہہ رہی ہے کیوں بیٹا کل یہ چاند سی صورت خاک میں مل جائے گی آہ مجھے کیا خبر تھی کہ میری اٹھارہ برس کی کمائی کربلا کے بن میں یوں خاک میں مل جائے گی۔ آہ بیٹا حسرت بھری ماں کو تمہارے بیاہ کا بڑا ارمان تھا دل چاہتا تھا کہ تمہاری چاند سی دلہن گھر میں بیٹھی دیکھتی۔ خدا کسی ماں پر دنیا میں یہ وقت نہ لائے۔ جو تمہاری دکھیا ماں پر آ پڑا ہے۔ فرزندِ رسول نرغۂ اعدا میں گھر چکے ہیں راہ چارہ مسدود ہو گئی ہے اب سوائے جاں دینے کے کوئی صورت نہیں اے علی اکبر اولاد اسی دن کے لئے ہوتی ہے کہ ماں باپ پر کوئی بلا آئے تو اس کو رد کرے۔ بیٹا! تم ماشاء اللہ جوان ہو۔ اس وقت بیکسی میں مظلوم باپ کی مدد کرو۔ جناب علی اکبر ایک شجاعانہ انداز سے فرما رہے ہیں۔ اماں جان آپ کیوں اس قدر رنجیدہ ہیں حیدری شیروں اور ہاشمی جوانوں کے سامنے ان نامردوں کا لشکر کیا حیثیت رکھتا ہے۔ بخدا جب ہماری تلواریں نیاموں سے نکلیں گی تو یہ روباہ صفت اس طرح بھاگتے نظر آئیں گے جیسے شیروں کے سامنے سے ہرنوں کا غول۔ امام مظلوم کے دل پر ماں بیٹوں کی یہ باتیں سنکر چھری چل گئی۔ زار زار رونے لگے اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

اب حضرت ابوالفضل العباس کے خیمے کے پاس آئے دیکھا کہ قمر بنی ہاشم یادگارِ شیرِ خدا حضرت عباس علمدار اپنے خیمہ میں بیٹھے تلوار پر صیقل کر رہے ہیں۔ اور ایک گوشے میں جناب ام کلثوم بیٹھی رو رہی ہیں۔ ناگاہ نظر جناب عباس کی دکھیا بہن پر جا پڑی فوراً اٹھ کر بہن کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ خواہرِ محترم آپ کیوں رو رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی جناب ام کلثوم کی ہچکی بندھ گئی اور فرمانے لگیں بھیا عباس تم ہی انصاف کرو میں کیونکر گریہ و زاری نہ کروں۔ کل قربانیٔ آلِ محمد کا دن ہے ہر بی بی اپنی اپنی اولاد کو میرے مظلوم بھائی پر قربان کرے گی۔ ام فروہ قاسم کو نثار کریں گی رباب علی اصغر کو۔ ام لیلیٰ علی اکبر کو میری بہن زینب اپنے دونوں بیٹوں عون و محمد کو لیکن آہ ام کلثوم کیسی بدنصیب ہے کہ اس کے کوئی فرزند نہیں کہ اپنے بھائی پر نثار کرے اپنی اس بدنصیبی پر جس قدر روؤں کم ہے۔ یہ سنکر حضرت عباس بیقرار ہو گئے۔ اور بکمال منت و زاری عرض کرنے لگے اے بہن آپ کیوں اس درجہ رنجیدہ و ملول ہیں عباس تو حاضر ہے آپ شوق سے کل مجھے فدیۂ حسین بنائیں۔ یہ سنکر جناب ام کلثوم کے چہرہ پر آثارِ بشاشت نمایاں ہوئے۔ آہ۔ آہ امام مظلوم نے جب بھائی بہن کی یہ گفتگو سنی تو تابِ ضبط نہ رہی خیمہ میں داخل ہوئے اور ام کلثوم کو گلے لگا کر دیر تک روتے رہے ۔ الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ٥

دسویں مجلس

تفسیر آیۂ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ الخ و بیانِ علم امیر المومنین و حال شبِ عاشور و شہادت حضرت حُر علیہ السلام

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (یہ تو کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشتوں کی طرف سے آؤ۔ بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو۔ اور اللہ سے ڈرو شاید فلاح پانے والے بن جاؤ) اس آیت کا پہلا حصہ تو خلیفہ ثانی کی شان میں ہے اور دوسرا حصہ حضرت علی کے متعلق ہے۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ عمر راتوں کو چھپ چھپ کر لوگوں کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ ایک رات حسب عادت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر کے اندر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ ان کو تاب کہاں فوراً دیوار پھاند گھر میں داخل ہوئے دیکھا کہ ایک مرد و عورت شراب پی رہے ہیں۔ ڈانٹ کر کہا اے خدا کے دشمنوں کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا کام خدا پر مخفی ہے۔ مرد نے جواب دیا اے امیر المومنین میں نے صرف ایک ہی خطا کی ہے مگر آپ سے تو پے در پے تین گناہ سرزد ہوئے انہوں نے غضبناک ہو کر پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا سنئے خدا فرماتا ہے۔ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا یعنی گھروں میں آنا چاہو تو دروازوں سے آؤ۔ آپ نے یہ غضب ڈھایا کہ دیوار پھاند کر تشریف لے آئے۔ دوسرے خدا فرماتا ہے جب گھروں میں داخل ہو تو اس کے اہل پر سلام کرو آپ نے ایسا نہیں کیا تیسرے خدا کہتا ہے احوال مسلمین کا تجسس نہ کرو۔ آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ یہ سنکر خلیفہ بہت شرمندہ ہوئے اور چپ چاپ باہر نکل گئے

دوسرے حصہ سے اس آیت کے یہ مراد ہے کہ علم کو غیر مقررہ طریق سے حاصل نہ کرو۔ کیونکہ یہ صورت ایسی ہے جیسے بجائے دروازے کے کوئی پشت مکان سے آ کود ے اور بطریق اہلبیت علیہم السلام مروی ہے کہ آلِ محمد ابواب اللہ ہیں۔ ان کے ذریعہ سے دعائیں قبول ہوتی ہیں ان کے وسیلہ سے لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ انہی کو قرآن میں اہل الذکر کہا گیا ہے۔ فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو) یہی وہ عالم ربانی ہیں جو پوری کتاب کا علم اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔ یہی وہ امام مبین ہیں جن کے اندر اللہ نے ہر شے کا احصا کر دیا ہے۔

نہج البلاغہ میں جناب امیر علیہ السلام کا یہ قول نقل ہے لوگوں نے فتنوں کے دریا میں غوطہ مارا ہے اور بجائے سنت پر عمل کرنے کے بدعت پر عامل ہیں۔ اس زمانہ میں مومنین منقبض ہیں اور جھوٹے اور گمراہ لوگ زبان درازیاں کر رہے ہیں۔ ہم شعار اسلام ہیں۔ ہم رسول کے اصحاب ہیں ہم علم کے خزانے اور دروازے ہیں۔ گھروں میں نہیں آیا جاتا مگر دروازوں سے۔ پس جو کوئی دروازوں کو چھوڑ کر ادھر ادھر سے آئے گا تو چور کہا جائیگا۔

ترمذی سے جامع الاصول میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِہٖ یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ پس جو علم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ دروازے سے آئے۔ اس حدیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ علم امیر المومنین علیہ السلام کس پایہ کا تھا جب ہی تو اس کو شہر علم نبی کا دروازہ کہا گیا۔ سب جانتے ہیں کہ گھر اور شہر کی حالت کا آئینہ دروازہ ہوا کرتا ہے۔ اگر کسی گھر کا دروازہ ٹوٹا پھوٹا ہو تو دیکھنے والوں کی نظر میں اس گھر کی وقعت گر جاتی ہے۔ اسی لئے سمجھدار لوگ اپنے گھر کا دروازہ شاندار بنایا کرتے ہیں۔ پس جب اینٹ مٹی کے گھروں کے لئے شاندار دروازہ درکار ہے تو پھر بھلا شہر علم نبی کے لئے بہترین در کیوں نہ درکار ہو بھلا حقیقت یہ ہے کہ علی سے بہتر دروازہ شہر علم نبی کو مل بھی نہیں سکتا تھا۔

اللہ اکبر اس شخص کے علم کا کیا ٹھکانہ ہے جس کو حضرت رسولخدا نے اس طرح بھرایا جیسے طائر اپنے بچہ کو بھراتا ہے۔ چنانچہ جناب امیر علیہ السلام خود فرماتے ہیں۔ زَقَّنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ زَقًّا زَقًّا اس میں ایک لطیف نکتہ قابل غور یہ ہے کہ حضرت نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے حضرت رسولخدا نے اس طرح علم پلایا جس طرح ماں اپنے بچہ کو دودھ پلاتی ہے کیونکہ دودھ ماں کی چھاتی میں بہت سی تبدیلی کے بعد بنتا ہے۔ اور طائر اپنے بچہ کو جو بھراتا ہے وہ بجنسہ وہی دانہ ہوتا ہے جو خود چنتا ہے۔ پس حضرت کا مقصد اس فرمانے سے یہ ہے کہ حضرت رسولخدا نے جو کچھ خدا سے حاصل کیا وہی بلا کم و کاست مجھے عطا فرما دیا۔

کسی کی کیا طاقت ہے کہ علم امیر المومنین علیہ السلام کا حال بیان کر سکے۔ ابن عباس کہا کرتے تھے علی علیہ السلام ایسے عالم ہیں کہ ان کو نبی نے تعلیم دی ہے اور نبی کو خدا نے تعلیم دی ہے۔ پس میرا علم علی کے علم سے ہے اور علی کا علم نبی کے علم سے ہے اور نبی کا علم خدا کے علم سے ہے اور میرا اور تمام اصحاب محمد کا علم علی کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے ایک قطرہ سات سمندروں کے مقابل۔ ایک اور موقع پر انہی ابن عباس نے یہ بھی فرمایا ہے کہ علم کے سات حصے ہیں ان میں سے چھ حصے علی کو ملے ہیں اور ایک حصہ تمام دنیا کو۔

شرح نہج البلاغہ میں ابن عباس سے منقول ہے کہ ایک رات امیر المومنین علیہ السلام نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کرنی شروع کی یہاں تک کہ صبح نمودار ہوئی۔ آپ نے فرمایا اے ابن عباس اگر رات ختم نہ ہوتی تو میں برابر یوں ہی بیان کرتا رہتا۔ لَوْ شِئْتُ لَاَوْقَرْتُ سَبْعِیْنَ بَعِیْرًا مِنْ تَفْسِیْرِ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ۔ یعنی اگر میں چاہوں تو صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کر دوں۔ اے ابن عباس آگاہ ہو جو کچھ تمام قرآن میں ہے وہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور جو کچھ سورۂ فاتحہ میں ہے وہ بسم اللہ میں ہے اور جو بسم اللہ میں ہے وہ بائے بسم اللہ میں ہے اور جو بائے بسم اللہ میں ہے وہ نقطہ بائے بسم اللہ میں ہے۔ وَاَنَا النُّقْطَۃُ تَحْتَ الْبَاءِ اور میں وہ نقطہ ہوں جو اس ب کے نیچے ہے اس سے حضرت کا مقصد یہ تھا کہ تمام قرآن کا علم میرے سینہ میں ہے جب ہی تو حضرت بر سر منبر فرمایا کرتے تھے۔ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ یعنی جو چاہو مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ مجھ کو نہ پاؤ۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا واللہ اگر میرے لئے مسند حکومت بچھا دی جائے تو میں اہل توریت کے درمیان توریت سے حکم کروں گا اور اہل انجیل کے درمیان انجیل سے اور اہل قرآن کے درمیان قرآن سے۔ یہاں تک کہ ہر کتاب اپنی زبان سے بول اٹھے گی کہ بخدا میرے بارے میں علی نے وہی حکم دیا ہے۔ جو خدا کا حکم ہے۔

ایک موقع پر حضرت نے فرمایا پوچھو جو پوچھنا ہے کہ میرے پاس علم اولین و آخرین ہے میں تم کو بتا سکتا ہوں کہ کونسی آیت محکم ہے اور کونسی متشابہ کونسی ناسخ ہے اور کونسی منسوخ۔ کونسی مکی ہے اور کونسی مدنی۔ کونسی سفری ہے اور کون سی حضری۔ کونسی دن میں نازل ہوئی اور

کونسی رات میں۔

ایک بار خلیفۂ ثانی کی سلطنت کے زمانہ میں دو عورتوں کے بچے پیدا ہوئے۔ ایک کے یہاں لڑکی دوسرے کے یہاں لڑکا۔ لڑکی والی عورت نے یہ چالاکی کی کہ اپنی لڑکی اس کے لڑکے سے بدل لی اور یہ ظاہر کیا کہ میرے یہاں لڑکا ہی پیدا ہوا ہے۔ لڑکی والی فریاد کرتی ہوئی خلیفہ کے دربار میں آئی یہ اس قضیہ پر سخت حیران ہوئے جب بات سمجھ میں نہ آئی تو حسبِ عادت جناب امیر علیہ السلام کی طرف رجوع کی۔ آپ نے فرمایا اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ دونوں عورتوں کا دودھ دو شیشیوں میں لے کر وزن کرو جس کا دودھ بھاری ہوگا اس کا لڑکا ہے اور جس کا ہلکا ہوگا اس کی لڑکی۔ خلیفہ نے کہا یہ حکم آپ نے کہاں سے بیان کیا فرمایا قرآن سے۔ خدا فرماتا ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ مرد کا حصہ عورت سے دونا ہے۔ یہ جواب سنکر خلیفۂ عمر حیرت میں رہ گئے اور کہنے لگے یا علی آپ صدورِ احکام میں بہت جلدی کرتے ہیں آپ کو جلدی میں کسی حکم کے غلط ہونے کا خوف نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا اے عمر تمہارے ہاتھ میں کے انگلیاں ہیں۔ انہوں نے بے تامل کہا پانچ۔ حضرت نے فرمایا اے عمر تم نے جواب میں جلدی کی یہ خوف نہ ہوا کہ مبادا جواب غلط ہو جائے۔ انہوں نے کہا یہ کیا بات سوچنے کی ہے یہ ہاتھ میرے سامنے ہے۔ فرمایا اے عمر آگاہ ہو جس طرح ہاتھ کی پانچوں انگلیاں تمہارے سامنے ہیں۔ اسی طرح کائنات کا سارا ورق میری نظر کے سامنے ہے پس کیونکر ممکن ہے کہ میرے جواب میں غلطی ہو جائے۔

ایک بار معاویہ نے بادشاہِ روم کو لکھا کہ میں خلیفۂ رسول ہوں اب تمہارا خراج میری طرف آنا چاہیئے۔ بادشاہ نے وزیر سے مشورہ کیا کہ اس بارہ میں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا پہلے اس بات کا امتحان ہو جانا چاہیئے کہ یہ شخص خلیفۂ رسول ہے یا نہیں۔ اور اس کے معلوم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس سے کوئی سوال پوچھا جائے اگر صحیح جواب دے دیا تو سمجھا جائے گا کہ جانشین رسول ہے ورنہ جھوٹا ہے۔ بادشاہ نے کہا تم ہی کوئی سوال بناؤ۔ وزیر نے کچھ سوچنے کے بعد کہا اس سے پوچھنا چاہیئے کہ "لاشئے" کیا چیز ہے چنانچہ ایک قاصد اس سوال کے ساتھ دمشق کو روانہ کیا گیا۔ جب معاویہ نے یہ سوال سُنا تو حیران رہ گیا۔ اپنے وزیر عمرو عاص سے کہا اب کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ آج کل جنگ صفین کے لئے علی بن ابی طالب کو گھوڑوں کی ضرورت ہے تم اپنے اصطبل کا ایک نہایت قیمتی گھوڑا کسی کے ہاتھ کوفہ بھیجو وہ اس کو علی کے سامنے پیش کرے۔ جب وہ قیمت پوچھیں تو "لاشئے" کہدے پس جو کچھ وہ دیں آیت قرآنی سے اس کا ثبوت طلب کرے اور وہی جواب مع اس ثبوت کے بادشاہ روم کے پاس بھیجدیا جائے۔ معاویہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور فوراً ایک شخص کو مع گھوڑے کے روانہ کیا۔

جب یہ شخص کوفہ پہنچا تو اتفاقاً اس وقت امیر المومنین علیہ السلام مع امام حسن علیہ السلام کے اسی رستے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے امام حسنؑ سے فرمایا بیٹا اس شخص سے معلوم کرو کہ گھوڑا بیچتا ہے۔ امام حسنؑ نے پوچھا تو اس نے کہا بیچتا ہوں مگر تمہارے ہاتھ نہیں پوچھا پھر کس کے ہاتھ؟ اس نے کہا علی کے سوا اور کسی کو نہ دوں گا۔ امام حسنؑ نے فرمایا آئیں میں تجھے ان تک پہنچا دوں۔ جب آپ اسے حضرت کی خدمت میں لے کر آئے اور آپ نے اس کی قیمت پوچھی تو اس نے وہی کہا "لاشئے"۔ آپ نے مسکرا کر امام حسن سے فرمایا اس گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لو اور ایک مٹھی بھر ریت اس کے دامن میں ڈال دو۔ اب تو وہ شخص بہت حیران ہوا۔ اور کہنے لگا واہ! تنے بڑے ڈیل ڈول والے

گھوڑے کی قیمت صرف ایک مٹھی ریت۔ میں تو لاشئے لینا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "لاشئے" یہی تو ہے۔ اس نے پوچھا ثبوت کیا ہے فرمایا خدا کہتا ہے کَسَرَابٍ بِقِیۡعَةٍ یَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ فَاِذَا جَآءَهٗ لَمۡ یَجِدۡهُ شَیۡئًا یعنی ان کی مثال جنگل کے ریت کی سی ہے کہ پیاسا اس کو پانی گمان کرتا ہے لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو لاشئے پاتا ہے۔ وہ شخص یہ سنکر ساکت ہوگیا اور گھوڑا امیر المومنین کے حوالے کرکے شام کی راہ لی۔ وہاں معاویہ تو انتظار میں تھا ہی۔ اس کے پہنچتے ہی پوچھنے لگا بتا کیا لایا۔ اس نے کہا یہ مٹھی بھر خاک ہے کہئے امیر کے چہرہ پر ڈال دوں۔ کہتے ہیں وزیر کے معاویہ علی علیہ السلام کی قرآن دانی پر حیران ہوگیا۔ اور وہی جواب قاصدِ روم کو دے کر واپس بھیجا۔ جب قاصدِ روم میں پہنچا تو بادشاہ نے کہا اتنے دن کیوں لگائے؟ اس نے سارا حال بیان کیا۔ پس بادشاہ نے کہا معاویہ جھوٹا ہے۔ وہ بادشاہ سہی مگر جانشین رسول نہیں ہمارا خراج کوفہ جائے گا نہ کہ شام۔

بیہقی نے مشاہیر صحابہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا مَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّنۡظُرَ اِلٰی اٰدَمَ فِیۡ عِلۡمِهٖ وَ اِلٰی نُوۡحٍ فِیۡ تَقۡوَاهُ وَ اِلٰی اِبۡرَاهِیۡمَ فِیۡ حِلۡمِهٖ وَ اِلٰی مُوۡسٰی فِیۡ هَیۡبَتِهٖ وَ اِلٰی عِیۡسٰی فِیۡ عِبَادَتِهٖ فَلۡیَنۡظُرۡ اِلٰی وَجۡهِ عَلِیِّ بۡنِ اَبِیۡ طَالِبٍ۔ یعنی جو شخص چاہتا ہے کہ آدم کو علم میں، نوح کو ان کے تقویٰ میں، ابراہیم کو ان کے حلم میں، موسیٰ کو ان کی ہیبت میں اور عیسیٰ کو ان کی عبادت میں دیکھے تو اس کو چاہیئے کہ علی کے چہرے کی طرف نظر کرے۔ یعنی سب کمالات اس کو علی کے اندر مل جائیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ آدم علم میں وہ درجہ رکھتے تھے کہ اس کی بدولت ان کو تمام ملائکہ پر شرف حاصل ہوا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا۔ اسی علم کی وجہ سے اللہ نے ان کو سجدۂ آدم کا حکم دیا۔ ملائکہ حضرت آدم سے اگرچہ بلحاظ عمر اقدم تھے۔ بلحاظ عبادت افضل تھے بلحاظِ تجربہ اعلیٰ تھے۔ لیکن حضرت آدم علم میں چونکہ ان سب سے افضل تھے پس سن کی کمی کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ اور ان کمسنی سے ان کے رتبہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام اگرچہ سن میں بہ نسبت اور صحابہ کے کم تھے۔ مگر بلحاظ علم سب سے زیادہ تھے۔ پس ان کا مرتبہ کوئی کیونکر پا سکتا ہے۔

پھر علم کے علاوہ ان میں نوح کا تقویٰ بھی تھا۔ ابراہیم کا حلم بھی تھا۔ موسیٰ کی ہیبت بھی تھی۔ عیسیٰ کی سی عبادت اور زہد بھی تھا ان سب فضیلتوں کے ہوتے ہوئے کسی صحابہ کو ان پر ترجیح نہیں ہو سکتی۔ صحابہ تو رہے ایک طرف وہ جملہ انبیاء سے افضل تھے کیونکہ بقاعدۂ فصاحت و بلاغت حضرت رسولخدا نے حضراتِ انبیاء کے اس وصف کا ذکر کیا ہے جس میں ان کو کمال حاصل تھا پس ایسے اوصاف میں مساوات دیگر اوصاف کی مساوات سے بے پروا کرتی ہے۔

چونکہ ذات امیر المومنین میں تمام انبیائے سابقین کے مخصوص اوصاف پائے جاتے تھے لہٰذا وہ ضرور ان سب سے افضل قرار پاتے ہیں حضرت آدم کے قصہ سے یہ ثابت ہوا کہ خلافت کا ملنا اعلمیت پر موقوف ہے۔ اسی لئے خدا نے ملائکہ کے احتجاج کی طرف توجہ نہ فرمائی اور آدم کو خلیفہ بنا دیا۔ پس جس طرح خلافتِ آدم کے بارے میں ملائکہ کی نہ چلی۔ اسی طرح حضرت علی کی خلافت کے بارہ میں ان کے مخالفین کی نہ مانی گئی۔

فَلۡیَنۡظُرۡ اِلٰی وَجۡهِ عَلِیِّ ابۡنِ اَبِیۡ طَالِبٍ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ فضائل علی علیہ السلام میں ایسے ابھرے ہوئے تھے کہ چہرہ سے پھوٹ نکلے تھے یعنی اندرون کے اندر وہ مخفی تھے۔ اور علی کے اندر جلی۔ اسی لئے حضرت کے چہرہ کی طرف نظر کرنا عبادت ہوگیا۔

حضرات یہی وہ اوصاف تھے جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کے دل میں رشک و حسد کی آگ بھڑکا دی تھی چونکہ وہ ان میں حضرت کا مقابلہ تو نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا دنیوی حیثیت سے ان کے مدارج گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا یہ روحانی اقتدار لوگوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کی موجودگی میں ہم کو دینی پیشوائی حاصل کرنے میں فروغ ہو نہیں سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ یزید امام حسینؑ کے درپے قتل ہوا۔ وہ جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک حسینؑ دنیا میں موجود ہیں وہ ملعون خلیفۂ رسول کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔

افسوس صد افسوس بجائے اس کے کہ مسلمان اہلبیت علیہم السلام کے علم و فضل سے روحانی برکات حاصل کرتے۔ ان کے ایسے جانی دشمن ہوئے کہ جب تک کربلا میں اس گھر کو اچھی طرح تباہ و برباد نہ کر لیا چین نہ آیا۔ آہ آہ کونسی تکلیف تھی جو دشمنانِ دین نے ان مقدس ہستیوں کو نہ پہنچائی۔ خاصکر کربلا میں تو وہ وحشیانہ مظالم ہوئے جن کے تصور سے کلیجہ لرزتا ہے۔ بہتر بیکسوں کو لاکھوں خونخوار درندے گھیرے ہوئے تھے دوسری محرم سے نبی کے نواسہ پر چڑھائی شروع ہوئی اور دسویں محرم کو پنجتن پاک کا خاتمہ ہو گیا۔

مومنین روزِ عاشور کی صبح وہ صبح تھی کہ آسمانِ ہدایت کے تابندہ ستارے زمین نینوا میں غروب ہو گئے اور درِ رسالت آبدار موتی خاک ماریہ میں بکھر گئے۔ یہ وہی صبح تھی جس کے بعد امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کو دوسری صبح دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ نبی کا ہرا بھرا باغ پامال کیا گیا۔ نبی زادیوں کے سروں سے چادریں چھینی گئیں۔ علی و فاطمہ کی بیٹیوں کو قید کیا گیا۔ آہ یہ صبح معمولی صبح نہ تھی بلکہ قیامت کی صبح تھی اس کا حال کوئی کربلا والوں کے دل سے پوچھے۔

منقول ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے چونکہ تمام رات عبادتِ الٰہی میں بیدار رہ کر گزاری تھی اس لئے قریب صبح ذرا دیر کے لئے آپ کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن ذرا دیر کے بعد آپ ایک ہولناک خواب دیکھ کر بیدار ہوئے اور اپنے اصحاب سے فرمایا میں نے اس وقت خواب میں دیکھا کہ چند کتے مجھ پر حملہ آور ہیں ان میں ایک ابلق کتا سب سے زیادہ حملہ کر رہا ہے اور میرے اوپر چڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ میرا قاتل ابرص ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اپنے جدِ امجد حضرت رسولِ خدا کو یہ فرماتے سنا بیٹا حسینؑ تو شہیدِ آلِ محمد ہے اے فرزند تمام اہلِ آسمان اور ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ تیرے آنے کی خوشیاں کر رہے ہیں۔ پس اے نورِ دیدہ اب اپنے آنے میں تاخیر نہ کر اور جلد اپنے کو مجھ تک پہنچا پس اس کی تعبیر یہی ہے کہ میری شہادت کا وقت اب بہت قریب آ گیا ہے۔ یہ سنکر تمام اصحاب حد درجہ ملول ہوئے۔

سید ابن طاؤس اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب صبح عاشور نمایاں ہوئی تو آپ نے شہزادہ علی اکبر کو اذان دینے کا حکم دیا اور اصحاب سے کہا مصلّے بچھاؤ تاکہ ایک بار ہم سب مل کر فریضۂ الٰہی کو ادا کر لیں۔ اب اس کے بعد ہم سب کو جماعت سے نماز پڑھنے کا موقع نہ ملیگا حکم سنتے ہی عاشقانِ الٰہی کے مصلّے برابر برابر زمین کربلا پر بچھ گئے۔ پانی تو کہاں تھا جو وضو کرتے تیمم کر کے سب اپنے اپنے مصلّوں پر آ گئے۔ جناب علی اکبر شبیہِ پیغمبر نے باآوازِ بلند اذان دینی شروع کی۔ آہ جب یہ آواز خیام الحرم میں پہنچی ہو گی تو مخدراتِ عصمت و طہارت بالخصوص جناب زینب اور جناب اُم کلثوم کے دل پر اس تصور سے کیسی چوٹ لگی ہو گی کہ کچھ دیر بعد یہ اذان دینے والا جوان ہم سے بچھڑ جائے گا اور ہم پھر کبھی اس کی آواز نہ سن سکیں گے۔

الغرض اذان کے بعد مسلم بن عوسجہ نے اقامت کہی اور امام مظلوم کے پیچھے تمام انصار اور اقربائے حسینؑ نے صفیں باندھیں اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ حضرات روزِ عاشور کی یہ نمازِ جماعت دیکھنے کے قابل تھی، یہ نماز حضرت امام حسین علیہ السلام کی اپنے رفقا کے ساتھ آخری تھی۔ چشمِ فلک نے ایسی جماعت کہاں دیکھی ہوگی جس میں ایک ایک مصلّی بادۂ عرفان سے سرشار تھا۔ یہ معمولی لوگوں کی جماعت نہ تھی یہ خدا کے ان سچے پرستاروں کی جماعت تھی جو حمایتِ دین میں مرنے پر کمر بستہ کھڑے تھے یہ ان خداشناسوں اور سچے دینداروں کی جماعت تھی جن کے خضوع و خشوع میں باوجود تین دن کی بھوک پیاس کے ذرہ برابر کمی نہ آئی تھی۔ اسی جماعت میں حافظانِ قرآن بھی تھے قاریانِ قرآن بھی تھے۔ مفسر و محدث بھی تھے۔ بڑے بڑے عباد و زہاد اور شریعت اسلام کے محافظ بھی تھے۔ نبی و علی کی صحبتوں سے فیض اٹھانے والے بھی تھے۔ بچہ سے لے کر جوان اور جوان سے لے کر بوڑھے تک سب زیورِ صلاح و تقویٰ اور زہد و ورع سے آراستہ تھے۔

کتاب کامل میں بروایت حلبی امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ صبح عاشور امام حسین علیہ السلام نے مع اپنے اصحاب کے نمازِ صبح ادا کی۔ اس کے بعد حضرت اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے میرے وفادار دوستو آج ہمارے قتل کا دن ہے۔ پس تم کو چاہیے کہ اس بلائے عظیم پر صبر کرو۔ اس دنیا میں خاصانِ خدا پر ہمیشہ بلائیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ اور انہوں نے صبر و ہمت سے ان کو جھیلا ہے۔ خدا کی سرکار میں صبر کرنے والوں کا بڑا اجر ہے۔

منقول ہے کہ اس طرف تو امام حسین علیہ السلام بعد نمازِ صبح اپنے اصحاب کو صبر و شکر کی تعلیم دے رہے تھے۔ اس طرف لشکر پسر سعد میں جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حضرت نے جناب بریر ہمدانی کو بلا کر فرمایا تم جاؤ اور ایک بار اور اس قوم بدشعار کو سمجھاؤ شاید یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں۔ پس بروایت بحار الانوار جناب بریر اس قوم جفاکار کے سامنے آئے اور فرمایا لوگو خدا سے ڈرو اور ایسا کام نہ کرو جس سے غضبِ خدا و رسول میں گرفتار ہو جاؤ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ امام حسین کون ہیں۔ اے بدبختو یہ تمہارے نبی کا نواسہ ہے وائے ہو تم پر جس نبی کا کلمہ پڑھتے ہو اسی کے نواسہ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہو۔ کیا تمہارے اس عمل سے حضرت رسولِ خدا خوش ہوں گے۔ اے قوم ان خیموں میں تمہارے رسول کی نواسیاں اور علی و فاطمہ کی بیٹیاں ہیں جن پر تین روز سے تم نے پانی بند کر رکھا ہے۔ اے ظالمو اتنے ہی ظلم پر بس کرو اور ان کو زیادہ مصیبت میں نہ ڈالو۔ کسی قوم نے اپنے نبی کی اولاد کے ساتھ ایسا برا سلوک نہیں کیا۔ جیسا تم اپنے نبی کی اولاد سے کر رہے ہو۔ اے قوم حیاتِ دنیا چند روزہ ہے۔ خدا سے ڈرو۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ تم خدا کے سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

بریر کی تقریر سنکر اس ناخدا ترس قوم نے جواب دیا کہ اے بریر بجائے ہمارے سمجھانے کے تم حسین بن علی کو کیوں نہیں سمجھاتے اگر وہ بیعت یزید کر لیں تو ابھی ان کو تمام مصائب و آلام سے نجات مل سکتی ہے۔ بریر نے فرمایا۔ استغفر اللہ وہ جناب ہرگز اس امر کو گوارا نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں سے آئے ہیں وہاں واپس چلے جائیں۔ اے اہلِ کوفہ وائے ہو تم پر کہ تم نے خط پر خط بھیجکر فرزندِ رسول کو اپنی طرف بلایا اور جب وہ جناب اس طرف متوجہ ہوئے تو اب تم ان کے قتل پر کمر بستہ ہو۔ کیا عرب کی مہمان نوازی یہی ہے کہ تم نے ان پر اور ان کی اولاد و اصحاب پر تین روز سے پانی بند کر رکھا ہے۔ خدا تم کو روزِ قیامت سیراب نہ کرے تم کیسے ظالم اور ستم شعار لوگ ہو۔ یہ سنکر ایک شخص نے جواب میں کہا اے بریر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس کے بعد کئی جفاکاروں نے جناب بریر پر تیر پھینکے

شروع کئے۔ جب اس قوم کی یہ بے حیائی دیکھی تو مجبوراً جناب بُریر واپس آئے۔

لکھا ہے جب حضرت کو اس قوم بد شعار کی طرف سے . . . . . بالکل مایوسی ہوگئی تو آپ نے اپنی اسی مختصر سی فوج کو جنگ کیلئے تیار کرنا شروع کیا۔ بروایتِ ارشاد حضرت کی فوج میں کل بتیس سوار اور چالیس پیادے تھے۔ آپ نے جناب زہیر کو میمنہ کا سردار بنایا اور جناب حبیب ابنِ مظاہر کو میسرہ کا اور اپنی فوج کا علم حضرت ابو الفضل العباس کو عطا فرمایا۔

جب دونوں طرف سے فوجیں آراستہ ہوگئیں تو عمر سعد شقی نے ایک تیر چلّہ کمان میں جوڑ کر لشکر گاہ حسینؑ کی طرف پھینکا اور کہا اے قوم گواہ رہنا کہ سب سے پہلے فوج حسینی کی طرف تیر پھینکنے والا اور اس جنگ کی ابتدا کرنے والا میں ہوں۔ اس کے بعد اس قوم جفا کار نے مبارز طلبی شروع کی۔ حضرت نے پھر بغرض اتمام حجت اس جاہل قوم کو سمجھانا مناسب جانا۔ آپ دونوں لشکروں کے درمیان تشریف لائے اور فرمایا اے قوم کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا ہے جس کا تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔ کیا میں نے کسی کا مال چھین لیا ہے یا کسی کو زخمی کیا ہے جس کے قصاص میں تم میرے درپے قتل ہو۔ کیا میں نے شریعتِ اسلام کو تبدیل کیا ہے۔ جس کی سزا دینا ضروری جانتے ہو۔ اے شیث بن ربعی اے حجار بن الحر اے قیس بن اشعث اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے اپنے خطوط میں یہ نہیں لکھا تھا کہ اب درختوں میں پھل پک گئے ہیں۔ باغات سرسبز ہیں۔ بہار کے دن ہیں لشکر آپ کی نصرت کو موجود ہیں۔ آپ ضرور ہماری طرف تشریف لائیے۔ کیا تم اپنے خطوط کا مضمون بھول گئے۔ کیا تمہارے دین میں مہمان کی یہی قدر کی جاتی ہے جو تم میری کر رہے ہو۔

یہ سنکر قیس بن اشعث ملعون نے جواب دیا ہم نہیں جانتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی جان پیاری ہے تو امیر المومنین یزید کی بیعت کر لیجئے ورنہ ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو جائیے۔ اس بدبخت ازلی کا یہ کلام سنکر حضرت لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے ہوئے واپس تشریف لائے۔ ابھی حضرت نے اپنے کسی ناصر کو اذنِ کارزار عطا نہ فرمایا تھا کہ حُر بن یزید ریاحی کے آنے کا شور ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ شب عاشور جب خیام حسینؑ میں العطش العطش کا شور مچا ہوا تھا۔ حُر اس وقت اپنے خیمے کے سامنے کسی تردد میں ٹہل رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے خیمہ سے دور نکل گئے۔ بار بار ان آوازوں پر کان لگاتے تھے جو خیام حسینؑ سے بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب اُدھر سے واپس ہوئے تو راہ میں بھائی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت جنابِ حُر کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور رفتار و گفتار سے انتہائی بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی بھائی نے پوچھا کیا بات ہے۔ اس وقت میں تم کو زیادہ پریشان پا رہا ہوں۔ جناب حُر نے کہا ذرا کچھ دور میرے ساتھ چلو۔ جب خیمہ گاہ حسینؑ سے قریب ہوئے تو حُر نے اپنے بھائی سے کہا ذرا کان لگا کر سنو تو یہ آوازیں کیسی ہیں۔ انہوں نے کہا یہ تو خیام حسینؑ سے صاف آواز العطش العطش آرہی ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ جناب حُر یہ سنکر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور سینہ پر ہاتھ مار کر کہا آہ اولادِ رسول کی تکلیف کا باعث میں ہوا۔ نہ میں فرزندِ رسول کو گھیر کر کربلا میں لاتا نہ اہلِ حرم اس بلا میں گرفتار ہوتے میرا کلیجہ ان بچوں کی فریاد سن سن کر پھٹا جاتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ سینہ پر خنجر مار کر مر جاؤں۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر کہ اولادِ رسول تو اس طرح پیاس سے تڑپے اور ہم خیموں میں پیر پھیلا کر سوئیں۔ بھائی نے کہا پھر کیا ارادہ ہے۔ حُر نے فرمایا بس اب تو عذاب الٰہی سے بچنے کی صورت یہی تدبیر ہے کہ جلد از جلد اپنے کو امام کے قدموں پر ڈال دوں اور اپنی گزشتہ گستاخی کی معافی مانگ کر ان کی نصرت و حمایت

میں اپنی جان قربان کردوں۔

بھائی نے کہا جزاک اللہ اس وقت تم نے وہ بات کہی جو میرے دل میں تھی۔ حرؑ نے فرمایا پھر دیر کیا ہے خیموں میں چل کر گھوڑوں پر زین کسو اور فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ ابھی لڑائی کا آغاز نہیں ہوا۔ چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے میں ہی اپنی جان امام کے قدموں پر نثار کردوں۔ بھائی نے کہا بسم اللہ میں بھی تیار ہوں۔ الغرض جناب حرؑ مع اپنے بھائی، فرزند، اور غلام کے اور بعض کے نزدیک تن تنہا لشکر امام کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہاں امام مظلوم سے آپ کے رفقاء و انصار اجازتِ کارزار طلب کر رہے تھے اور آپ فرما رہے تھے ٹھہرو ابھی مجھے اپنے ایک دوست کی آمد کا انتظار ہے۔ لوگ حیران تھے کہ اس وقت بیکسی میں کون ہماری مدد کو آنے والا ہے۔ ناگاہ لشکر پسر سعد کی طرف سے گرد نمودار ہوئی۔ امام علیہ السلام نے جناب عباس سے فرمایا۔ تم استقبال کو جاؤ حرؑ بن یزید ریاحی عفو تقصیر کو آرہا ہے۔ یہ حکم سنتے ہی جناب عباس گھوڑا بڑھا کر اس طرف روانہ ہوئے۔ جب حرؑ نے حضرت عباس کو اپنی طرف آتے دیکھا تو گھوڑے پر سے اتر پڑے اور بکمال انکساری عرض کرنے لگے یا ابا الفضل العباس میں خدمتِ امام میں عفو تقصیر کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ فرزند رسول الثقلین جناب امام حسین سے میری سفارش فرمادیں۔ میں سخت نادم ہوں کہ ان کو مجبور کر کے کیوں اس طرف لایا۔

الغرض جناب عباس مع حرؑ کے خدمت میں امام مظلوم کی حاضر ہوئے۔ حرؑ سر جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر حضرت کے سامنے کھڑے ہو گئے آنکھوں سے زار زار آنسو بہہ رہے تھے۔ حضرت نے جوشِ محبت میں حرؑ کو چھاتی سے لگا لیا اور فرمایا اے حرؑ میں نے تیری خطا معاف کی۔ خدا بھی تیری تقصیر معاف کرے۔ حرؑ نے عرض کی مولا اب اتنی آرزو دل میں اور باقی ہے کہ سب سے پہلے حضور کے قدموں پر یہ غلام اپنی جان نثار کرے۔ پس اجازتِ کارزار مرحمت ہو۔ حضرت نے فرمایا اے حرؑ تو ہمارا مہمان ہے۔ میں نے ابھی مہمان نوازی کی کوئی رسم ادا نہیں کی کیونکر اجازت دوں۔ اے حرؑ تو ایسی مصیبت کے وقت ہمارا مہمان ہوا ہے کہ ہم تین دن سے بھوکے پیاسے ہیں۔ حرؑ نے عرض کی حضور مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میرا دل زندگانی دنیا سے ایسا سیر ہو گیا ہے کہ اب میں ایک ساعت دنیا میں رہنا نہیں چاہتا۔

الغرض امام علیہ السلام سے اذن کارزار حاصل کر کے سب سے پہلے جناب حرؑ گھوڑا اکداتے ہوئے میدانِ جنگ میں تشریف لائے اور اہلِ کوفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اے اہلِ کوفہ تمہاری مائیں تمہارے ماتم میں بیٹھیں کس قدر شرم کی بات ہے کہ تم نے اس عبد صالح کو بھلا دیا جو تمہارے نبی کا نواسہ ہے۔ اے بے حیاؤ پہلے تو تم نے خط پر خط بھیج کر بلایا اور جب وہ جناب ادھر تشریف لائے تو تم ان کے دشمن ہو گئے۔ اے بے غیرتو! عرب کی حمیت کیا ہوئی میں دیکھ رہا ہوں کہ آج تم اپنے مہمان کے لئے تلواریں تیز کر رہے ہو۔ افسوس وہ پانی جس کو یہود و نصاریٰ بلکہ سگ و خوک تک پی رہے ہیں تم نے اپنے رسول کی ذریت پر بند کر رکھا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے جاں بلب ہیں اور تم کو ذرا رحم نہیں آتا تم مزے سے اپنے خیموں میں بیٹھے آب سرد و خوشگوار پی رہے ہو۔ اور تمہارے مہمان پانی کے ایک ایک قطرہ کو ترس رہے ہیں۔ اے بے غیرتو اگر تم اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتے۔ تو حسین بن علی کو اجازت

دو کہ وہ جس طرف چاہیں چلے جائیں۔

جناب حُر کی اس تقریر کا اس قوم بد انجام نے بجائے زبان کے تیروں سے جواب دیا۔ جناب حُر کو طیش آگیا۔ چند اشعار رجز کے نہایت جوش میں پڑھ کر اس قوم بدکار پر حملہ آور ہوئے اور تھوڑی سی دیر میں بہت سے ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ حضرت حُر کی غیر معمولی شجاعت دیکھکر عمر بن حجاج نے فوج یزید کو ڈانٹ کر کہا اے احمقو! کیا غضب کر رہے ہو کہ اس جوان سے ایک ایک کر کے لڑ رہے ہو۔ یہ تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر لشکر حسین میں گیا ہے اگر مقابلہ کو ایک ایک آدمی گیا تو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ چاروں طرف سے اسے گھیر لو۔ اور پتھر مار مار کر اس کا کام تمام کر دو۔ یہ سنکر بہت سے نابکار اس شیر غضبناک کی طرف بڑھے اور ہر طرف سے پتھر اور تیر برسانے شروع کئے۔ جناب حُر بھی انتہائی غضب میں ان پر حملہ آور تھے۔ یہاں تک کہ ۴۰ آدمی مار کر زمین پر گرا دیئے لیکن اس معرکہ میں حضرت حُر کے بدن پر بھی اس کثرت سے تیر پڑے کہ سارا بدن چھلنی ہو گیا۔ اللہ ری بہادری کہ اس حالت میں بھی جس طرح ممکن ہوا اپنے کو لشکر گاہ حسین میں پہنچایا اور خدمت امام میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔ مولا آپ اپنے اس غلام سے راضی ہیں۔ حضرت نے گلے لگا کر فرمایا اے حُر میں تجھ سے راضی ہوں میرا خدا بھی تجھ سے راضی ہو۔ اے حُر اب تم ٹھہرو کہ سارا بدن زخموں سے چور چور ہے۔ حُر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی مولا اب غلام کو نہ روکئے میرا دل حد درجہ شہادت کا مشتاق ہے۔

الغرض جناب حُر پھر میدان میں تشریف لائے اور ایک پُر جوش رجز پڑھکر حملہ کیا۔ اتفاقاً ایک ظالم نے ان کے گھوڑے کے پیر کاٹ دیئے اور وہ بے بس ہو کر زمین پر گر پڑے آواز دی یا ابن رسول اللہ ادرکنی اے فرزند رسول خبر لیجئے کہ میں جاں بلب ہوں۔ شاید زیارت آخری کا شرف حاصل کروں۔

آہ۔ حُر کی یہ آواز سنتے ہی مظلوم کربلا میدان قتال کی طرف روانہ ہوئے۔ مقتل ابو مخنف میں ہے۔ قبل اس کے کہ آپ وہاں تک پہنچیں۔ دشمنوں نے حضرت حُر کا سر کاٹ کر لشکر حسین کی جانب پھینک دیا پس حضرت وہیں ٹھہر گئے اور جناب حُر کا خون بھرا سر اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اپنے رومال سے خاک و خون چہرہ سے پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے اے حُر خدا کی قسم تیری ماں نے تیرا نام حُر خوب ہی رکھا تھا۔ بے شک تو آتش دوزخ سے آزاد ہے۔

کتاب امالی میں جناب صدوق علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب جناب امام حسین علیہ السلام حضرت حُر کے پاس پہنچے تو رمق جان باقی تھی۔ آپ نے حُر کا سر اپنے زانو پر رکھ کر فرمایا اے حُر تجھے مبارک ہو کہ تو آتش دوزخ سے آزاد ہے اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے

لَنِعْمَ الحُرُّ حُرُّ بَنِی رِیَاحٍ	صَبُوْرٌ عِنْدَ مُخْتَلِفِ الرِّمَاحِ
قبیلہ بنی ریاح کا حُر کیا ہی اچھا ہے	وہ نیزوں کی مار کے وقت بڑا ہی صابر تھا
وَنِعْمَ الحُرُّ اِذْ نَادٰی حُسَیْنًا	فَجَادَ بِنَفْسِہٖ عِنْدَ الصَّبَاحِ
کیا ہی اچھا ہے حُر جب اس نے حسین کو پکارا	اور صبح سویرے (سب سے پہلے) راہی جنت ہوا
وَنِعْمَ الحُرُّ فِی رَہَجِ المَنَایَا	اِذَا الْاَبْطَالُ تَخْفِقُ بِالصِّفَاحِ

کیا ہی اچھا حُر موت کی گرم بازاری میں ہے　　جبکہ بڑے بڑے بہادر شمشیر زنی کر رہے تھے
فَیَا رَبِّ اَضِفْہُ فِی الجِنَانِ　　وَزَوِّجْہُ مَعَ الحُوْرِ المِلَاحِ
اے خدا تو اسے جنت میں مہمان بنا　　اور حسین حوروں سے اس کی تزویج کر

منقول ہے کہ اسی حالت نزاع میں حضرت حُر نے اپنی آنکھ کھولی اور امام مظلوم کے چہرہ پر ایک حسرت بھری نظر ڈال کر جنت کی راہ لی۔ مومنین جب خیمۂ اہلبیت میں یہ خبر پہنچی کہ جناب حُر شہید ہو گئے تو اہلِ حرم نے اسی طرح ان پر سینہ زنی اور نوحہ خوانی کی جس طرح اپنے عزیز خاص پر کرتی تھیں۔

اے حُر اے فرزندِ رسول کے پہلے جاں نثار خوشا حال آپ کا کہ رسول کی نواسیاں اور علی و فاطمہ کی بیٹیاں آپ کا ماتم کرتی ہیں۔ آہ جناب حُر کے آنے سے جناب زینب کو بڑی مسرت ہوئی تھی وہ سمجھی تھیں کہ شاید حُر کے ادھر آنے سے اس قوم پر کوئی اچھا اثر پڑے اور بھائی کے سر پر آئی بلا ٹل جائے۔ لیکن آہ آہ حُر کی شہادت کی خبر سنتے ہی امید کی وہ ہلکی سی جھلک بھی مایوسی سے بدل گئی

حضرات کتنے خوش نصیب تھے انصار و اقربائے امام مظلوم کہ جب گھوڑے سے گرتے تھے تو فرزند رسول خود جا کر ہر ایک کی لاش اٹھا کر لاتے تھے اور سیدانیاں اس پر نوحہ و ماتم کرتی تھیں۔ مگر آہ آہ جب میرا مظلوم آقا زخموں سے چور چور ہو کر خاک پر گرا تو اس کی لاش اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ آہ مصیبت زدہ سیدانیوں کو نوحہ و بکا کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ حضرت کا فرق مبارک تن سے جدا کرتے ہی وہ اشقیا الحرم کو لوٹنے اور خیموں میں آگ لگانے کے لئے ٹوٹ پڑے اور اس بے دردی سے لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی۔ بالی سکینہ کے کان چیر کر گوشوارے تک لے لئے۔ اس مصیبت میں کون ان دکھیاریوں کا فریاد رس تھا۔ بار بار وا محمداہ وا علیاہ کے نعرے مارتی تھیں۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی القَوْمِ الظَّالِمِیْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

گیارہویں مجلس

تفسیر آیہ مباہلہ۔ فضائل امیرالمومنین و شہادت جناب وہب

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَکُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ ٥

اس آیہ وافی ہدایہ کا ترجمہ یہ ہے اے رسول (نصارائے نجران سے) کہدو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

اس آیت کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ ایک بار نصارائے نجران حضرت رسولخدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے ہم آپ سے حضرت عیسیٰ کے بارہ میں مباہلہ کرنا چاہتے ہیں آپ کہتے ہیں وہ خدا کے بیٹے نہ تھے ہم کہتے ہیں وہ خدا کے بیٹے تھے پس مباہلہ کریں ہم میں سے ہر ایک فریق اپنے مخالف پر لعنت کرے تاکہ جو جھوٹا ہو اس پر عذاب الٰہی نازل ہو۔ پس حضرت رسولخدا نے اپنی ایک چادر کے نیچے علی و فاطمہ اور حسن و حسین کو جمع کیا اور درگاہِ الٰہی میں عرض کی اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَھْلُ بَیْتِیْ۔ خداوندا یہ میرے اہلبیت ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ اصحاب کسا کہلاتے ہیں۔ یہ واقعہ خانۂ جناب ام سلمہ کا ہے۔ جب اس چادر کے نیچے جناب ام سلمہ نے پنجتن کو دیکھا تو چاہا کہ وہ بھی اس فضیلت میں شریک ہوں آنحضرت کے قریب جاکر فرمانے لگیں۔ کیا میں بھی اس فضیلت میں داخل ہو سکتی ہوں۔ حضرت نے فرمایا داخل تو نہیں ہو سکتیں لیکن تم خیر و نیکی پر ہو۔

غور کے قابل یہ بات ہے کہ جب رسول کی وہ بی بی جو حسب ارشادِ رسول نیک بخت تھیں اصحاب کسا میں داخل نہ ہو سکیں۔ تو بھلا اُن بی بیوں کا داخلہ اس مقدس چادر کے اندر کیونکر ہو سکتا ہے جن کی مذمت میں کھلم کھلا قرآن کی آیتیں موجود ہیں۔ اس چادر میں صرف وہی لوگ تھے جو اہل بیتِ رسول کہلاتے ہیں۔ یہ سب کے سب معصوم تھے۔ کفر و شرک سے بری تھے اہل طہارت تھے انہی کی شان میں آیت تطہیر نازل ہوئی ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ازواجِ رسول بھی اہلبیت میں داخل ہیں۔ انہوں نے نہ اہلبیت کے معنی پر غور کیا اور نہ آیتِ تطہیر کے مفہوم کو سمجھا بھلا رسول کی وہ بی بیاں کیونکر اہلبیت میں داخل ہو کر طہارتِ الٰہیہ کا مصداق بن سکتی ہیں۔ جن کی شان میں فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا (تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہو گئے) موجود ہے۔

الغرض حضرت رسولخدا اپنے اہلبیت کو لے کر اس طرح مباہلے کے لئے نکلے کہ امام حسین علیہ السلام آپ کی گود میں تھے۔ امام حسن علیہ السلام انگلی پکڑے تھے۔ آپ کے پیچھے فاطمہ زہرا تھیں اور ان کے پیچھے علی مرتضیٰ۔ یہ گویا مذکورہ بالا آیت کی عملی تفسیر تھی۔ جس ترتیب سے سوال مذکور ہے۔ اسی ترتیب سے رسول اپنے اہلبیت کو لئے جا رہے ہیں۔ آپ اپنے اہلبیت سے فرماتے جا رہے تھے۔ جب میں بد دعا

کروں تو تم آمین کہنا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ رسول کے بھرے کنبہ اور اصحاب کے تمام مجمع میں صرف چار ہی آدمی ایسے تھے۔ جو مباہلہ میں رسول کی رسالت کے سچے گواہ بنکر نکل سکتے۔ ہزاروں کے گروہ میں سے صرف چار ہی آدمی ایسے منتخب ہو سکے جن کی آمین مقبول ہونے پر رسولخدا کو اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا اپنی دعا کے مقبول ہونے پر یا یوں کہو کہ اس وقت کے مسلمانوں میں صرف چار ہی ہستیاں ایسی تھیں کہ ان کی صداقت پر رسول کو پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ لوگ نام کے صادق و صدیق نہ تھے بلکہ صداقت کے اصلی پیکر تھے اور ایسے سچے تھے کہ خدا نے ان کی صداقت کی تصدیق کی۔

منقول ہے کہ نصاریٰ کے سب سے بڑے پادری نے اپنی قوم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر محمد مباہلہ کے لئے عزیزوں کو لائیں تو سمجھ لینا ان کو اپنی صداقت پر پورا بھروسہ نہیں۔ اور اگر اپنے خاص رشتہ داروں کو لے کر آئیں تو سمجھ لینا کہ ان کو اپنی صداقت پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ قطعاً عذابِ الہیٰ سے بے خوف ہیں۔ چنانچہ جب اس نے حضرت رسولخدا کو اس شان سے آتے دیکھا تو اپنی قوم سے کہنے لگا تم ہرگز ان سے مباہلہ نہ کرنا۔ ورنہ قومِ نصاریٰ کا ایک شخص روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔ بخدا میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دعا کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ضرور ہٹ جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے مباہلہ نہ کیا۔ اور جزیہ دینا منظور کر لیا۔

مومنین! صداقت اس کو کہتے ہیں کہ پنجتنِ پاک کے چہروں سے پھوٹ نکلی تھی اور دوستوں کا کیا ذکر دشمن اس کی گواہی دے رہے تھے۔ جب لعنتِ خدا کاذبین پر پڑنے والی تھی اور اس قوم نے تصدیق کر دی کہ کاذبین نہیں بلکہ صادقین ہیں اور حکم خدا ہے کونوا مع الصادقین (سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) تو جن مسلمانوں نے ان کا راستہ چھوڑ کر دوسروں کا راستہ اختیار کیا وہ یقیناً جھوٹوں کے پیرو تھے اور نتیجہ میں ضلالت و گمراہی ان کو حاصل ہوئی۔

اس آیت میں چار امر فضیلت امیر المومنین علیہ السّلام پر دال ہیں اول حضرت رسولخدا سے قربِ منزلت یعنی نفسِ رسول قرار پانا۔ دوسرے حضرت رسولِ خدا کا ان کی دعا سے مدد طلب کرنا۔ تیسرے نصاریٰ کے پادری کا یہ اقرار کرنا کہ وہ مقرب ایزدی ہیں چوتھے حضرت علی کا انفسنا میں داخل ہونا نہ کہ ابنائنا میں

زمخشری کا یہ خیال غلط ہے۔ کہ آیہ مباہلہ میں نفس سے مراد نفسِ رسول ہے کیونکہ کسی شخص کا اپنے نفس کو بلانا کوئی معنی نہیں رکھتا اور جب حضرت علی نفسِ رسول قرار پائے تو خلافت ثابت ہوئی کیونکہ ان کو حضرت رسولخدا کے ساتھ سوائے نبوت و رسالت کے ہر رتبہ اور منزلت میں مساوات حاصل ہو گئی۔

اہلِ بیت کی مساوات بہت سے امور میں حضرت رسولخدا کے ساتھ ثابت ہے۔ اول سلام میں۔ نبی کے لئے ہے السلام علیک ایھا النبیّ اور اہلبیت کے لئے ہے۔ سلام علیٰ آل یٰسین۔ دوسرے صلوات میں۔ اللّٰھمّ صلِّ علیٰ محمّد و آلِ محمّد تیسرے طہارت۔ نبی کے لئے ہے طٰہٰ اور آلِ نبی کے لئے ہے و یطہرکم تطہیراً۔ چوتھے تحریم صدقہ یعنی جس طرح صدقہ محمد پر حرام اسی طرح آلِ محمد پر حرام۔ پانچویں وجوبِ مودت رسول کے لئے ہے۔ فاتبعونی یحببکم اللہ اور اہلبیت کے لئے ہے۔ قل لا اسئلکم۔

عَلَيْهِ اَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی چھٹے رسول اور اہلبیت رسول امان ہیں امت کے لئے عذاب الٰہی سے مَاكَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (اللہ نہیں عذاب کرے گا ان پر جب تک اے رسول تم ان میں ہو اور اہلبیت کی شان میں حضرت رسولخدا نے فرمایا اَلنُّجُوْمُ اَمَانٌ لِاَهْلِ السَّمَاءِ وَاَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِاُمَّتِيْ (ستارے اہل آسمان کے لئے امان ہیں اور میرے اہلبیت میری امت کے لئے) ساتویں بحالت جنابت مسجد نبوی میں جانا صواعق محرقہ میں ہے کہ حضرت رسول خدا نے حضرت علی سے فرمایا لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يُّجْنِبَ فِيْ هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرِيْ وَغَيْرِكَ (اے علی میرے اور تمہارے سوا کسی کو بحالت جنابت اس مسجد میں جانا جائز نہیں) آٹھویں حضرت علی کا دروازہ مسجد کی طرف کھلا رہنا چنانچہ ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت رسولخدا نے ان تمام اصحاب کو جن کے دروازے مسجد کی طرف کھلے ہوئے تھے بند کرنے کا حکم دیا۔ پس علی کے دروازہ کے سوا اور سب کے دروازے بند ہو گئے۔ اس پر لوگ ناخوش ہوئے اور حضرت سے شکایتاً کہا۔ آپ نے اپنے اصحاب و اعمام کے تمام دروازے تو بند کرا دیئے۔ لیکن علی کا دروازہ کھلا رکھا۔ حضرت نے ان کے جواب میں فرمایا نہ میں نے ان کا دروازہ کھلا رکھا ہے نہ میں نے اسکو بند کیا ہے بلکہ جو کچھ ہوا ہے حکم خدا سے ہوا ہے۔

نکتہ۔ علی کا دروازہ خانۂ خدا کی طرف کھلا رہا اور ان کا طریقہ خدا کی طرف منتہی ہوا۔ پس وہ اس بات کے لائق ہیں کہ ان کی اقتدا کی جائے نہ کہ وہ لوگ جن کا دروازہ بند ہوا اور جو ازخداوندی سے مطرود ہوئے۔ پس خوش خبری ہو ان لوگوں کو جنہوں نے حضرت رسولخدا کے بعد ایسے گھر کی طرف رجوع کی جس کے دو دروازے ہیں ایک دروازہ وہ جو مدینۃ العلم کی طرف پہنچاتا ہے اور دوسرا وہ جو بیت اللہ کی طرف کھلا ہوا ہے اور کیا ہی اچھا تھا اس گھر کا مالک جو بیت اللہ میں پیدا ہوا۔ اور بیت اللہ ہی میں شہادت پائی۔

بے بہرہ آنکہ گشت جدا از در علی	شد فیضیاب ہر دو سرا از در علی
یعنی کہ میرسی بخدا از در علی	بکشود مصطفےٰ در حیدر بمسجدش

نویں مقاتلت علی القرآن میں رسول کے ساتھ اہلبیت کو مساوات حاصل ہے۔ جیسا کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا یَا عَلِيُّ اِنَّكَ تُقَاتِلُ عَلٰی تَاْوِيْلِ الْقُرْاٰنِ كَمَا قَاتَلْتُ عَلٰی تَنْزِيْلِهٖ (اے علی تم تاویل قرآن پر اسی طرح قتال کرو گے جس طرح میں نے تنزیل پر کیا ہے)

دسویں اولیت میں چنانچہ حضرت رسولخدا نے فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ یعنی جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔

گیارہویں مواخات میں جیسا کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا ہے یَا عَلِيُّ اَنْتَ اَخِيْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اے علی تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔

بارہویں حُبّ و بُغض اور سب و ایذا میں چنانچہ فرمایا حضرت رسولخدا نے مَنْ اَحَبَّ عَلِيًّا فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَبْغَضَ عَلِيًّا فَقَدْ اَبْغَضَنِيْ وَمَنْ اٰذٰی عَلِيًّا فَقَدْ اٰذَانِيْ یعنی جس نے علی کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے علی سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا اور جس نے علی کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ اور جس نے علی کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی۔

بیہقی نے فضائل صحابہ میں روایت کی ہے کہ ایک دن جو علی علیہ السلام حضرت سرور انبیاء کی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا

هٰذَا سَیِّدُ الْعَرَبِ یہ سردار عرب ہیں۔ عائشہ نے کہا کیا آپ سید العرب نہیں حضرت نے فرمایا اَنَا سَیِّدُ الْعَالَمِیْنَ وَهٰذَا سَیِّدُ الْعَرَبِ میں تمام عالموں کا سردار ہوں اور یہ سردار عرب ہیں۔

چودھویں اصل میں چنانچہ ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا اَلنَّاسُ مِنْ اَشْجَارٍ شَتّٰی وَاَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ شَجَرٍ وَاحِدٍ یعنی لوگ مختلف درختوں سے ہیں اور میں اور علی ایک درخت سے ہیں۔ اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْ عَلِیٍّ وَلَا یُؤَدِّیْ عَنِّیْ اِلَّا عَلِیٌّ یعنی علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں میری طرف سے کوئی پیغام نہیں پہنچا سکتا مگر علی۔

پندرھویں درجات آخرت میں چنانچہ حضرت رسولخدا نے فرمایا یا علی تم اور میں روز قیامت ایک درجہ میں ہوں گے۔

حضرات سُنّے آپ نے فضائل و مناقب اپنے سید و مولا امیر المومنین علیہ السلام کے جب اتنے امور میں ان کو حضرت رسولخدا سے مساوات حاصل تھی تو پھر بعد رسول ان سے بہتر خلیفہ رسول اور کون ہو سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ بعد رحلت رسول مسلمانوں نے ان فضائل کا ذرا لحاظ نہ کیا اور امیر المومنین علیہ السلام کو وہ وہ اذیتیں پہنچائیں کہ ان کے تصور سے کلیجہ لرزتا ہے کس قدر افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ وہ علی و فاطمہ اور حسن و حسین جن کو حضرت رسولخدا روز مباہلہ اپنی نبوت کی تصدیق کے لئے لے کر نکلے تھے اور جو بنص قرآنی صادقین میں داخل تھے فدک کے بارہ میں ان سب کی گواہی رد کر دی گئی اور حکومت کرنے والوں نے اپنی طرح ان کو بھی جھوٹا سمجھا صواعق محرقہ میں ہے کہ روز شوریٰ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے استحقاق کے اثبات میں آیہ مباہلہ کو پیش کر کے اصحاب شوریٰ سے فرمایا تھا میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم میں کوئی حضرت رسول خدا سے بلحاظ قربت مجھ سے زیادہ ہے میں وہ شخص ہوں جس کو حضرت رسول خدا نے اپنا نفس قرار دیا اور جس کے بیٹوں کو اپنا بیٹا اور جس کی عورتوں کو اپنی عورتیں کہا ان سب نے کہا آپ بجا فرماتے ہیں ہم میں سے کسی کو یہ قربت حاصل نہیں۔

مگر افسوس شوریٰ کمیٹی کے ممبر کتنے چالاک اور فریب کار تھے۔ کہ زبان سے تو حضرت کی فضیلت کا اقرار کرتے تھے لیکن عملاً حضرت کو ان کے حقوق سے محروم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا چنانچہ اسی چالاکی اور عیاری کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت تیسری بار بھی اپنے حق سے محروم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت علی کو صرف ان کے جائز حقوق ہی سے محروم نہیں رکھا۔ بلکہ پوری کوشش اس بارہ میں بھی کی کہ آنحضرت کے فضائل و مناقب سے عام لوگ قطعاً نا آشنا رہیں اور جو روحانی اقتدار ان کو عہد رسالت میں حاصل تھا اس میں روز بروز ان کے اقتدار کو کم کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ کربلا میں اہلحرم کے اقتدار کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا۔ اہلبیت کے متعلق بے شمار احادیث رسول کی زبان سے سنکر کسی مسلمان کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک دن یہ برگزیدگان الٰہی اور مقربان رسالت پناہی اس کسمپرسی کے عالم میں جا پڑیں گے کہ تین روز کے بھوکے پیاسے نرغۂ اعدا میں گھرے ہوں گے۔ طرح طرح سے اپنے حال زار کو بیان کر کے رحم کی درخواست کرتے ہوں گے۔ لیکن رحم کرنا تو بڑی بات ہے کوئی ان کی بات بھی کان دھر کر نہ سنتا تھا۔

منقول ہے کہ جناب بریر نے روز عاشورا اس قوم بد شعار کے مقابل جو تقریر فرمائی تھی اس میں یہی کہا تھا کہ اے قوم تم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قاریان قرآن ہیں۔ کیا تم نے قرآن میں آیہ مباہلہ کو نہیں پڑھا۔ اگر پڑھا ہے تو بتاؤ آیہ مذکور میں ابناءنا سے کیا مراد ہے

کیا رسول روزِ مباہلہ حسن و حسین کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ اے قوم یہ وہی حسین ہے جو روزِ مباہلہ خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا گواہ بن کر نکلا تھا۔ آج تم نے اس کا رتبہ اتنا پست کر دیا کہ اب اس کی بات کان دھر کر بھی نہیں سنتے۔ یہ سنکر لشکر پسر سعد سے ایک شقی نکلا اور کہنے لگا اے بریر تم کیا کہہ رہے ہو ہم کچھ نہیں جانتے کہ حسین کون ہیں۔ چونکہ اس شخص نے امیر المومنین یزید بن معاویہ کے خلاف بغاوت اختیار کی ہے۔ لہذا اس کا قتل ہم پر واجب ہے۔ یہ سنکر جناب بریر کو سخت غصہ آیا۔ اور گھوڑا دوڑا کر ایک ایسا نیزہ اس کے سینہ پر مارا کہ وہ اسی وقت بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔

مومنین جناب بریر ہمدانی بڑے مومن صالح اور متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ اصحاب امام مظلوم میں ان کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ لکھا ہے کہ شب عاشور جب چھوٹے چھوٹے بچے در خیمہ پر خالی کوزے ہاتھوں میں لئے آواز العطش العطش بلند کر رہے تھے تو جناب بریر اپنے خیمے میں مشغول عبادت تھے۔ بچوں کی یہ فریاد سنکر ان کا دل لرز گیا خیمہ سے بے تابانہ نکلے اور اصحاب امام حسین کو جمع کر کے کہنے لگے دوستو! وائے ہو تمہاری اس حالت پر کہ اولادِ رسول پیاس کی شدت سے تڑپ رہی ہے اور ہم اپنے کانوں سے ان کی فریاد سن رہے ہیں سب نے کہا اے بریر بیشک ان کی فریادوں سے کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ زندگی وبالِ جان ہو رہی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان معصوم بچوں کی تکلیف کو کیونکر دور کریں۔

جناب بریر نے فرمایا یہ وقتِ شب ہے نہر کے پہرے دار سو رہے ہوں گے۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر چلو اور جس طرح بنے مشکیزوں میں پانی بھر لاؤ۔ واللہ اگر ایک بچہ بھی پیاس سے ہلاک ہو گیا تو روزِ قیامت جناب رسولِ خدا کو منہ دکھانے کا موقع نہ رہے گا میں اس کام کو انجام دینے کے لئے جا رہا ہوں جس کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے۔ یہ سنکر دو شخص جناب بریر کے ساتھ ہوئے بریر نے ایک سوکھا ہوا مشکیزہ اٹھا لیا پہلے در خیمہ پر آئے اور بچوں کو پیار کر کے کہنے لگے اے بچو گھبراؤ مت ہم تمہارے لئے پانی لینے جاتے ہیں یا تو اب پانی لے کر آئیں گے ورنہ تمہیں زندہ صورت نہ دکھائیں گے تم اپنے ننھے ننھے ہاتھ درگاہِ الٰہی میں اٹھا کر خدا سے دعا کرو کہ ہم کو اس کوشش میں کامیاب کرے یہ کہہ کر جناب بریر اور ان کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر نہر فرات کی طرف روانہ ہوئے۔

جب وہاں پہنچے تو فوجِ مخالف کے ایک سردار نے ٹوک کر کہا کون آتا ہے بریر نے اس کی آواز پہچان کر کہا اے عبداللہ بن برقع میں ہوں بریر بن خضیر ہمدانی اس لئے آیا ہوں کہ نہر سے اپنی پیاس بجھاؤں۔ اس نے کہا اے بریر چونکہ تم میرے ہم قبیلہ ہو لہذا اتنی اجازت دے سکتا ہوں کہ تم اور تمہارے ساتھی نہر سے اپنی پیاس بجھا لیں مشکیزوں میں پانی بھر کر نہ لے جانے دوں گا۔ جناب بریر نے فرمایا اے عبداللہ وائے ہو تجھ پر یہ ہے اور پر تو تجھے رحم آتا ہے مگر اولادِ رسول پر رحم نہیں آتا۔ آہ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے اس طرح تڑپ رہے ہیں کہ ان کی فریادوں سے دل ہلے جاتے ہیں یہ سنکر عبداللہ کے دل پر اثر ہوا کہنے لگا اچھا اے بریر اس وقت بہت سے پہرے والے سو رہے ہیں خاموشی سے اپنی مشکوں کو بھر کر جلد از جلد واپس ہو جاؤ۔

الغرض جناب بریر نہر میں داخل ہوئے پانی کو دیکھتے ہی دل پر چھری چل گئی چھوٹے چھوٹے بچوں کی پیاس کا تصور کر کے زار زار رونے لگے اور اپنے دل میں کہا اگرچہ شدتِ تشنگی سے میرا کلیجہ کباب ہو رہا ہے لیکن جس طرح پیاسا آیا ہوں اسی طرح پیاسا اس نہر سے

واپس جاؤں گا جب تک اولادِ رسول سیراب نہ ہولے یہ پانی میرے اوپر حرام ہے۔ یہ کہہ کر جناب بُریر نے پانی کا مشکیزہ بھرا اور خوش خوش وہاں سے نکلے۔ آہ آہ مومنین! ایک سپاہی نے ان کو پہچان کر شور مچایا کہ اے پہرہ والو کیا بے خبر پڑے سو رہے ہو، بُریر ہمدانی لشکرِ حسین کی طرف پانی لے جانا چاہتے ہیں۔ جلد انہیں گھیر کر پانی چھین لو۔ اس شقی کی یہ آواز سنتے ہی تمام پہرہ دار یکایک چونک پڑے اور چاروں طرف سے جناب بُریر اور ان کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔

سبحان اللہ اصحابِ حسین کیسے بہادر تھے کہ تینوں دینداروں نے تلواریں نیام سے نکال کر ان اشقیاء سے لڑنا شروع کیا یہاں تک کہ بہت سے ناریوں کو واصلِ جہنم کیا۔ ان کی بے پناہ تیغ زنی دیکھ کر وہ روباہ صفت بھاگ کھڑے ہوئے اور جناب بُریر صحیح سلامت مشکیزہ لئے ہوئے خیمہ گاہ حسین میں داخل ہوئے۔ مومنین اس وقت جناب بُریر کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ دور ہی سے باآوازِ بلند پکارنا شروع کیا اے بچو مبارک ہو کہ بُریر تمہارے لئے پانی لے آیا۔ اے پیاسے بچو جلد اپنے اپنے کوزے لے کر بڑھو اور اپنے سوکھے گلے تر کرو۔ جوں ہی یہ آواز ان پیاس کے مارے بچوں کے کان میں پہنچی خوشی سے عجیب حال ہوا بے تابانہ اپنے اپنے کوزے لے کر درِ خیمہ پر آگئے اور بُریر کو دعائیں دینے لگے۔ جناب بُریر نے وہ مشکیزہ جلدی سے ان کے سامنے ڈال دیا۔ آہ آہ رات کی تاریکی میں بچے گھبرا کر جو اس مشکیزے پر گرے تو دہانہ اس کا کھل گیا اور سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ اس وقت پیاسے بچوں کی بے چینی دیکھنے کے قابل تھی۔ رو رو کر فریاد کر رہے تھے اے بُریر غضب آگیا جو پانی آپ ہمارے لئے لائے تھے وہ سب بہہ گیا۔ اور ہم بدستور پیاسے کے پیاسے رہ گئے

مومنین! ہماری جانیں ان معصوم بچوں پر قربان ہوں۔ ہائے کیا پیاس کی شدت تھی کہ ہر ایک بچہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنا سوکھا گلا اس تر زمین پر رکھ دے۔

حضرات یہ رات جناب بُریر نے انتہائی بے چینی سے بسر کی۔ چاہتے تھے کہ جلد صبح ہو جائے تو اس قوم جفاکار سے اس بدکرداری اور ستم شعاری کا بدلہ لوں۔ چنانچہ روزِ عاشور حضرت حُر کی شہادت کے بعد جناب بُریر خدمتِ امام میں حاضر ہوئے اور اذنِ کارزار حاصل کر کے میدان میں آئے پہلے نہایت جوش میں چند اشعار بطور رجز فرمائے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

میں بُریر ابن خضیر ہمدانی ہوں۔ میری شجاعت کا تمام عرب میں سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ آج میں تم کو اپنی شمشیرِ آبدار کے جوہر دکھاؤں گا اور چن چن کر تمہارے بہادروں کو قتل کروں گا۔ جس کو حوصلہ ہو میرے مقابلہ کے لئے نکلے

اس کے بعد دشمن پر حملہ آور ہوئے اور تھوڑی دیر میں تیس اشقیا کو واصلِ جہنم کیا۔ جناب بُریر کی غیر معمولی شجاعت دیکھ کر دشمن کی فوج میں ہل چل پڑ گئی۔ جب ایک ایک کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی تو بحکم عمر سعد سب نے ایک بار اس شیر پر حملہ کر دیا۔ اور چاروں طرف سے گھیر کر نیزہ و شمشیر کے وار کرنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ جناب بُریر سر سے پیر تک زخمی ہو گئے۔ جب گھوڑے پر ٹھہرنے کی تاب نہ رہی تو آواز دی یا رسول اللہ ادرکنی اے فرزندِ رسول میری مدد کو آیئے کہ میں نے اپنی جان آپ پر سے نثار کی۔ یہ سن کر امام حسین علیہ السلام مع چند رفقا کے بُریر کے پاس پہنچے۔ لیکن آہ آہ حضرت کے پہنچنے سے پہلے جناب بُریر راہیِ جنت ہو گئے تھے۔ حضرت امام حسین بُریر کی لاش لیکر خیمہ میں آئے لکھا ہے جب بچوں کو یہ معلوم ہوا کہ بُریر کی لاش آئی ہے تو سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور بے اختیار رو رو کر کہنے لگے اے بُریر

تم ہمارے لئے سقائے غازی بریر تم نے ہماری وجہ سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ ہم کو تمہاری وجہ سے بڑی ڈھارس تھی۔ سید ابن طاؤس لکھتے ہیں کہ حسین کے بچے بریر کی لاش پر اس طرح نوحہ زنی کر رہے تھے جس طرح کوئی اپنے عزیز خاص کی لاش پر نوحہ کرتا ہے ان کی فریاد وزاری اور نوحہ وبیقراری سنکر رفقائے حسین کے دل سینوں میں ہلے جاتے تھے۔ بالخصوص جب وہ یہ کہتے تھے کہ اے بریر ہم پیاسے ہیں۔ اب ہمارے لئے پانی کون لائے گا۔

منقول ہے کہ بچوں کی یہ فریاد سنکر جناب وہب بن عبداللہ کلبی کی والدۂ گرامی کا دل تڑپ گیا۔ اور در خیمہ سے آواز دی اے وہب خدا دیر کے لئے میرے پاس آؤ۔ وہب یہ آواز سنکر دوڑے۔ اس زنِ مومنہ نے کہا اے وہب تم دیکھ رہے ہو کہ اولادِ رسول کا پیاس کی شدت سے کیا حال ہو رہا ہے۔ بیٹا اب تاخیر کا محل نہیں میرے آقا سے جس طرح بنے اجازت لے کر میدان میں جاؤ۔ اور ان لعینوں کو مار کر نہر سے پانی لاؤ مجھ سے بچوں کی یہ بے تابی نہیں دیکھی جاتی اے وہب یہ جان چرانے کا وقت نہیں بلکہ لڑ مرنے کا وقت ہے۔ میرا آقا اس وقت سخت مصیبت میں ہے میری دلی تمنا ہے کہ تم ان پر اپنی جان قربان کر کے مجھکو روحِ جناب سیدہ سے سرخ رو کرو۔

لکھا ہے کہ جناب وہب کی شادی کو کل سترہ روز ہوئے تھے ان کی بی بی بھی کربلا میں ان کے ساتھ تھیں۔ ماں کی یہ تقریر سنکر جناب وہب نے عرض کی اے مادر گرامی آپ اطمینان رکھیں میں ابھی اپنی زوجہ کو رخصت کر کے خدمتِ امام میں اذنِ کارزار کیلئے حاضر ہوتا ہوں۔ ہائے اس زنِ مومنہ کے دل کو کیا لگی ہوئی تھی کہنے لگیں اے وہب میں زوجہ سے رخصت ہونے کو تو منع نہیں کرتی لیکن اتنا کہے دیتی ہوں کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں میں نہ آنا چاہیئے۔ اے وہب اگر تم اپنی زوجہ کے کہنے سے رک گئے تو یاد رکھنا کہ اپنا دودھ نہ بخشوں گی۔ اور روزِ قیامت خدا اور رسول کے سامنے تمہاری شاکی ہوں گی۔ الغرض جناب وہب وہاں سے اپنی زوجہ کے پاس آئے۔ اس زنِ مومنہ نے کہا میں جانے سے تو نہیں روکتی صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہارے بعد میں کس کے سہارے سے جیوں گی۔ وہب نے فرمایا اگرچہ تم سے جدائی میرے دل پر بہت شاق ہے اور جانتا ہوں کہ یہ دائمی مفارقت ہے اور شادی کے بعد تمہارا کوئی ارمان پورا نہیں ہوا لیکن کیا کروں کچھ ایسا وقت آپڑا ہے کہ تم سے جدائی اختیار کئے بغیر چارۂ کار نہیں۔ بس تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں تم میری شہزادی جناب زینب وام کلثوم کی خدمت کرتی رہنا اور جو بلا دشمنوں کی بدولت تم پر آئے اس کو خوشی سے جھیلنا تاکہ خوشنودیٔ خدا حاصل ہو۔ اس بیچاری نے رو کر کہا بہتر ہوتا کہ تم مجھے میرے قبیلہ میں پہنچا دیتے۔ وہب نے فرمایا ہر طرف سے راستے بند ہو چکے ہیں۔ دشمن چاروں طرف سے نرغہ کئے ہوئے ہیں کسی طرح ممکن نہیں کہ تم کو یہاں سے نکال کر لے جا سکوں۔ وہ بیچاری یہ سنکر مایوس ہو گئی۔

کتبِ مقاتل میں ہے کہ جناب وہب کو اپنی زوجہ سے بات چیت میں جو دیر لگی تو ان کی والدہ گھبرا گئیں۔ اور پکار کر کہنے لگیں۔ بیٹا تم نے بڑی دیر لگائی جلد ہتیار بدن پر سجکر میدان میں جاؤ فرزندِ رسول تمہارے منتظر ہیں۔ اے وہب یہ وقت اطمینان سے باتیں کرنے کا نہیں۔ خبردار بی بی کی باتوں میں نہ آنا ورنہ روزِ حشر خدا اور رسول کے سامنے تمہاری شاکی ہوں گی۔ وہب یہ سنکر گھبرا گئے اور فوراً اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے اے مادرِ گرامی آپ اطمینان رکھئے میں کسی طرح جان نثاری میں قصور نہ کروں گا۔ اللہ اکبر

مادرِ وہب کیسی کامل الایمان اور عاشقِ حسین خاتون تھیں کہ بیٹے سے فرمانے لگیں اے فرزند تیری ماں کو تو اسی وقت اطمینان ہوگا جبکہ راہِ خدا میں تجھے شہید دیکھ لے گی۔

الغرض جناب وہب اپنی ماں سے رخصت ہو کر خدمتِ امام میں حاضر ہوئے اور اذنِ جہاد طلب کیا۔ حضرت نے فرمایا اے جوان کیونکر تجھ کو اذنِ کارزار دوں تیرے مرنے سے تیری ماں اور تیری بی بی کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچے گا۔ وہب نے عرض کی یا ابن رسول اللہ میری والدہ نے مجھ کو تاکید کے ساتھ بھیجا ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ مجھے راہِ خدا میں شہید دیکھیں۔ حضرت یہ سنکر کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ مادرِ وہب خیمہ سے دیکھ رہی تھیں بہ آوازِ بلند کہنے لگیں اے میرے مظلوم آقا آپ اس غلام کو اذنِ جہاد کیوں نہیں عطا فرماتے۔ شاید آپ کو میرے ملال کا خیال ہے۔ آقا میری ساری بضاعت بس یہی ہے میں خوشی سے اپنے اس اکلوتے فرزند کو آپ کے قدموں پر نثار کرنے کے لئے پیش کرتی ہوں۔ اگر عورتوں سے جہاد ساقط نہ ہوتا تو میں خود ان دشمنانِ دین سے لڑنے کے لئے نکلتی۔ اس زنِ مومنہ کی یہ تقریر سنکر امام علیہ السّلام چشم پُر آب ہوئے اور دعائے خیر سے یاد فرما کر میدان میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

جناب وہب شیر کی طرح میدان میں آئے۔ اور رجز پڑھ کر اس قوم جفاکار پر حملہ کیا پہلے ہی حملہ میں چالیس ناریوں کو فی النار کیا لیکن خود بھی زخموں سے چور چور ہو گئے۔ اسی حالت میں جس طرح ہو سکا اپنی والدہ کی خدمت میں پہنچے۔ اور عرض کی اے مادرِ گرامی آپ میری اس خدمت سے خوش ہوئیں؟ نہیں! اس زنِ مومنہ نے کہا اے وہب خدا تجھ کو اس عمل نیک کی جزا دے مگر میں تو پوری طرح اسی وقت راضی ہوں گی جب تجھ کو راہِ خدا میں شہید دیکھ لوں گی۔ بیٹا پھر میدان میں جاؤ اور راہِ خدا میں قتال کرو۔ چنانچہ جناب وہب میدان میں آئے اور اس قوم پر حملہ کیا۔ اب کی بار انیس سوار اور بارہ پیادے قتل کئے لیکن ایک شقی کی ضرب سے ان کا بایاں ہاتھ قلم ہو گیا۔

اسی اثنا میں جناب وہب نے دیکھا کہ ان کی زوجہ چوبِ خیمہ لئے ہوئے خیمہ سے نکل آئی ہیں اور دشمنوں سے لڑنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ وہب نے گھوڑا بڑھا کر کہا تم نے غضب کیا کہ خیمہ سے نکل آئیں۔ فوراً واپس جاؤ کہ یہ امر میرے لئے سبکی کا باعث ہے۔ اس زنِ مومنہ نے کہا میں ہرگز واپس نہ جاؤں گی تا اینکہ میں بھی تمہارے ساتھ جامِ شہادت نوش کر لوں۔ وہب یہ سنکر گھبرائے اور بآوازِ بلند کہا اے فرزندِ رسولؐ اپنی اس کنیز کو روکئے۔ امام علیہ السّلام فوراً آگے بڑھے اور زوجہ وہب کو سمجھا بجھا کر واپس لے آئے اس کے بعد وہب نے پھر جنگ کی ان کی یہ دلیری دیکھ کر ابن سعد نے حکم دیا کہ اس جوان کو چاروں طرف سے گھیر کر قتل کر ڈالو۔ چنانچہ کئی ہزار سوار ایک بار اس مومن دیندار پر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے نیزہ و شمشیر کے وار کرنے شروع کر دئے۔ یہاں تک کہ جناب وہب گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے اور اسی وقت راہیٔ جنت ہوئے۔ دشمنوں نے ان کا سر کاٹ کر لشکرِ امام کی طرف پھینکا۔ مادرِ وہب در خیمہ سے وہب کی جنگ دیکھ رہی تھیں۔ جب بیٹے کا سر پھینکا گیا تو آگے بڑھیں۔ سر کو اٹھا کر چھاتی سے لگایا۔ پیار کیا پھر اس کو دشمن کی طرف یہ کہہ کر پھینک دیا جو چیز راہِ خدا میں صدقہ دے دی اس کو واپس نہیں لیتے۔

اس کے بعد عمود خیمہ لے کر بڑھیں اور دو ظالموں کے سر پر مار کر واصلِ جہنم کیا۔ امام علیہ السلام ان کے پاس پہنچے اور فرمایا اے مادرِ وہب خیمہ میں جاؤ کہ جہاد عورتوں سے ساقط ہے۔ انشاء اللہ روزِ قیامت تم مع اپنے فرزند کے داخلِ جنت ہوگی۔

کتاب امالی میں ہے کہ جناب وہب کی شہادت کے بعد ان کی زوجہ لاش پر پہنچیں اور ان کے چہرہ سے خاک و خون صاف کر کے کہنے لگیں اے وہب شرط محبت یہ ہے کہ جنت میں میرے بغیر داخل نہ ہونا۔ اے وہب تم کو خدا جزائے خیر دے کہ تم نے نصرت فرزند رسول میں اپنی جان قربان کی۔

ابھی وہ شکستہ دل بی بی اپنے شوہر کی لاش پر بین کر رہی تھی کہ شمر ملعون نے اپنے ایک غلام کو حکم دیا کہ جلد اس عورت کا کام تمام کر دے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے دلخراش بین سنکر فوج کے نرم دل سپاہی بگڑ اٹھیں۔ چنانچہ وہ شقی آیا اور ایک گرز ایسا اس زن مومنہ کے مارا کہ اس کا سر شق ہو گیا۔ یہ پہلی بی بی تھی کہ لشکر امام میں قتل کی گئی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْن وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

بارہویں مجلس

تفسیر آیۂ من یرتد منکم عن دینہ، حضرت علی کے فضائل و شہادت حبیب ابن مظاہر

قال اللہ تعالیٰ یا ایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم ہ

(اے ایمان والو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو پھر جائے، خدا اس کے بدلے میں ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جس کو وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ خدا کو دوست رکھتے ہوں گے وہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ کریں گے۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔)

یہ آیت ایک گروہ کی مذمت میں ہے اور ایک گروہ کی منقبت میں۔ کچھ لوگ ایسے تھے کہ حضرت رسولِ خدا کو دھمکاتے کہ کہا کرتے تھے اگر آپ فلاں کام ہمارے مشورے کے مطابق نہ کریں گے تو ہم اسلام کو ترک کر کے یہود و نصاریٰ سے جا ملیں گے یا مشرکین کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے۔ خداوند عالم عز اسمہ ایسے لوگوں سے کہتا ہے اگر تم مرتد ہو جاؤ گے تو ہمیں اس کی کچھ پروا نہیں کیونکہ تم کیا اور تمہارا ایمان کیا۔ ہم تمہاری بجائے ایسے خالص الایمان لوگوں کو لے آئیں گے جو اللہ کو دوست رکھنے والے ہوں گے۔ اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہوگا۔ وہ مومنوں سے جھک کر ملتے ہوں گے اور کافروں کے مقابل بڑی شان سے آتے ہوں گے۔ وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو قطعاً دھیان میں نہ لاتے ہوں گے۔

اللہ اکبر اس قوم کے علوِ مرتبت اور کمالِ انسانیت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جس کی مدح و ثنا خلاقِ عالم اس شان سے کر رہا ہے۔ دنیا کے لوگوں کی تعریف اور ہے اور خالقِ کائنات کی تعریف اور ہے۔ تعریف ہے اور پوری تعریف ایک مکمل مدحیہ قصیدہ ہے کہ لسانِ قدرت پر جاری ہو گیا ہے۔ دنیا ایسی ہستیوں کے اعزاز و اکرام پر کیوں نہ مجبور ہو اور کیوں نہ ان کو اسلام کی مایۂ ناز ہستیاں قرار دے۔ اسلامی سطح پر ان ممدوحانِ ایزدی کے ہم پہلو کون ہو سکتا ہے۔ یقیناً اصحابِ رسول میں سب سے بالاتر مرتبہ اس قوم کا ہوگا۔ آیئے اب اس امر پر غور کریں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ جن میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں۔ ہم صرف ایک صفت کو بیان کر کے اس کا تحقیقی مصداق بنانا چاہتے ہیں اگر کل صفتوں کو بیان کیا جائے تو طول ہوگا۔

پہلی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ اللہ کو دوست رکھنے والے ہیں اور اللہ ان کو۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے تو بہت ہیں لیکن اس دعوے میں سچے صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ جن سے خدا بھی محبت کرتا ہو یعنی پلٹی ہوئی محبت ہو۔ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہوں اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہو۔ ہم کو ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہے پہلے خدا کے قول سے یہ دکھایا جاتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے

والے کون ہیں۔ سورۂ دہر میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا یعنی وہ لوگ (علی و فاطمہ حسن حسین) اللہ کی محبت میں مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا دیتے ہیں) اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلبیت محبت خدا رکھنے والے تھے۔ اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ اللہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے یا نہیں۔ محبت کے جانچنے کا بہترین موقع جنگ ہے۔ کیونکہ عیش کے دستر خوان پر تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔ البتہ سچا دوست وہ ہے جو مصیبت کے وقت کام آئے اور جنگ کے موقع پر اپنے دوست کا ساتھ دے۔ پس ہم ایک جنگ ہی کے موقع سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہیں جو خدا اور رسول کو دوست رکھتے ہیں اور خدا و رسول انکو دوست رکھتے ہیں یہ عقدہ زبانِ رسالت نے جنگ خیبر میں حل کر دیا۔

جب انیس روز تک جنگ خیبر کا معرکہ سر نہ ہوا اور مسلمان مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ بھاگ آئے تو ایک روز حضرت نے فرمایا۔ لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا كَرَّارًا غَيْرَ فَرَّارٍ يُحِبُّ اللهَ وَالرَّسُولَ وَيُحِبُّهُ اللهُ وَالرَّسُولُ (کل میں اپنا علم ایسے مرد کو دوں گا جو پے در پے حملہ کرنے والا ہوگا اور بھاگ کر آنے والا نہ ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوگا۔ اور اللہ اور رسول اس کو دوست رکھتے ہونگے

جب حضرت کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے تو بزدل نامردوں کے دل میں بھی اس آرزو نے چٹکی لی کہ کل یہ علم ہم ہی کو مل جائے کیونکہ اس علم کا ملنا اس کی سند ہوگا کہ وہ اللہ کا دوست ہے اور کرار غیر فرار ہے۔ باوجودیکہ فوج اسلام کے بڑے بڑے نامور سردار اور بہادر سپاہی پچھلے دنوں میں بار بار اپنی طاقت اور قوت کو یہودی فوجوں کے مقابل آزما چکے تھے اور پے در پے فراری ہونے کے لمبے لمبے سرٹیفکیٹ پا چکے تھے رسول کو اپنے سے مایوس کر چکے تھے۔ لیکن اس پر بھی ان عالی حوصلہ غیرت مندوں کے دل سے یہ آرزو نہ گئی۔

بعض نامور سپہ سالار تو تمام رات اس شوق میں نہ سوئے کہ جلد صبح ہو تو یہ علم حاصل کریں۔ ساری رات بیچارے ماضی تمنائی کے صیغوں کی گردان کرتے رہے ان کی امیدوں میں اس لئے اور زیادہ قوت پیدا ہو گئی تھی کہ اس زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام کی آنکھیں اس درجہ پر آشوب ہو رہی تھیں کہ آپ جنگ کے قابل نہ تھے۔

الغرض صبح نمودار ہونے سے پہلے ہی کچھ لوگ ہتیار بدن پر سج کر شجاعانہ انداز سے خیمۂ رسالت کے سامنے اس امید میں ٹہلنے لگے کہ شاید ہمارا ڈیل ڈول، درازی قد، سپاہیانہ شان نظر رسالت میں کھپ جائے اور خیمہ سے برآمد ہوتے ہی سب سے پہلے یہ علم ہم ہی کو عطا کر دیں۔

حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے خیمہ مبارک میں سے ان بندوں کی یہ ابلہ فریبیاں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کی عدم موجودگی میں یہ وار کسی طرح خالی جانے والا نہیں۔ لیکن جس کی قسمت میں قسام ازل نے یہ فضیلت لکھی ہی نہ ہو وہ کمزور امیدوں کے سہارے اس منصب جلیلہ پر کیونکر فائز ہو سکتا ہے۔

غرضکہ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب لوگوں نے حضرت پر تقاضا کرنا شروع کیا کہ جلد علم کسی کو عطا فرمایئے تاکہ جلد ہم فوج سے کر یہاں سے بڑھیں اور دشمن نامراد کا کام تمام کر کے سویرے ہی بفتح و فیروزی واپس آ جائیں۔

آج سے پہلے آنحضرت نے مسلمان غازیوں اور بہادر سرداروں کی یہ چستی اور کرمندی اور مصنوعی جوش کسی دن نہ دیکھا تھا اور

دلوں تو یہ حالت تھی کہ جس سردار کو بلا کر آپ مقابلہ کو بھیجنا چاہتے تھے وہی ناک بھوں چڑھانے اور پہلو بچانے لگتا تھا۔ آج یہ باسی کڑھی کو ابال اس لئے آیا تھا کہ باوجود بھاگ آنے کے بھی ایک ایسی فضیلت ہاتھ آجائے گی کہ پشتہا پشت نہ صرف اولاد بلکہ ہمارے تمام نام لیوا فخر کریں گے اور اس مخصوص مدح کو جھنڈوں پر گاتے بجاتے پھریں گے۔

جب زیادہ تقاضا ہوا تو آنحضرت نے فرمایا اینَ اخی علی بن ابی طالب یعنی میرے بھائی علی بن ابی طالب کہاں ہیں۔ ایک بزرگ نے جو حضرت کی خدمت مبارک میں بہت زیادہ گستاخ تھے بڑھکر کہا کیا حضور کو معلوم نہیں کہ علی کی آنکھوں پر آشوب ہے۔ ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ علی السلام سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ حالت آپ کی یہ تھی کہ دونوں آنکھوں پر ورم تھا اور اندر سرخی بہت زیادہ تھی حضرت نے فرمایا اے علی تمہارا کیا حال ہے؟ آپ نے عرض کی حضور آپ کی زیارت سے محروم ہوں۔ یہ سنکر آپ نے اپنا لعاب دہن دونوں آنکھوں پر مل کر فرمایا افتح عینیک یا ابن ابی طالب اے فرزند ابو طالب اپنی آنکھوں کو کھولو۔ اب جو حضرت نے اپنی آنکھیں کھولیں تو نہ سرخی تھی نہ ورم اور درد ساری تکلیفیں دور ہو گئیں اور ایسی دور ہوئیں کہ حضرت علی فرماتے تھے کہ اس کے بعد پھر کبھی میری آنکھیں دکھی ہی نہیں۔

پس حضرت نے اپنا علم نصرت شیم حضرت علی علیہ السلام کو دے کر فرمایا اے علی تم جاؤ اور دشمنوں سے لڑو۔ یہ سنکر پہلے امیدوار ہمہ یاں حال کہنے لگے۔ اے لیسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ہم سمجھے تھے ہمیں سے علم ملے گا یہاں بد قسمتی نے الف سے دالم، دلوایا۔

حضرت علی علیہ السلام فوراً علم لیکر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور میدان کارزار کا رخ کیا۔ چند قدم کے بعد ٹھہرے اور اسی طرح میدان کی طرف رخ کئے پوچھا یا رسول اللہ کب تک لڑوں فرمایا حتیٰ یفتح اللہ علیٰ یدیک یہاں تک لڑو کہ خدا تمہارے دونوں ہاتھ پر فتح دے کچھ یہ مدت العمر میں پہلا موقع تھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت رسول خدا کی طرف پشت کر کے کلام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کرار غیر فرار کا لقب پاکر آپ نہیں چاہتے تھے کہ برائے نام بھی میدان کی طرف پشت کریں۔ الغرض حضرت میدان میں آئے اور شان حیدری دکھلانے کے لئے ایک چٹان پر زور بازو سے علم کو گاڑ دیا۔ پتھر کی کیا طاقت تھی کہ شیر الٰہی کے علم کی نوک کو روک سکتا۔ موم بنکر اپنے سینے میں جگہ دیدی۔ اس کے بعد حضرت نے بطور رجز چند اشعار پڑھے جن کا پہلا شعر یہ ہے۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ ضرغام آجام ولیث قسورہ

یعنی میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔ میں بیشہ شجاعت کا شیر ہوں جس کو بہادری کا دعویٰ ہو میرے سامنے آئے لکھا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کے اس شجاعانہ رجز سے میدان خیبر گونج اٹھا اور بڑے بڑے بہادر یہودیوں کے دل سینوں میں لرز گئے۔ یہودیوں کو اپنے دو نامور بہادروں مرحب و حارث پر بڑا ناز تھا اور انہی دونوں کے خوف سے ہر روز مسلمان سپاہیوں کے قدم اکھڑ جاتے تھے۔ حضرت علی نے سب سے پہلے انہی کو اپنے مقابلے کے لئے بلایا اور بہت جلد دونوں کو تہ تیغ کر کے خیبر کا وہ عظیم الشان معرکہ سر کر لیا۔ جو انیس روز سے مسلمانوں کے ہوش گم کئے ہوئے تھا۔ جب یہودی شکست کھا کر میدان سے بھاگے تو انہوں نے قلعہ میں پناہ لی اور دروازے بند کر لئے۔

امیر المومنین علیہ السّلام مع لشکر اسلام جب قلعہ کے دروازے پر پہنچے تو آپ نے اس کے فولادی کواڑوں کو خدائی زور کی بنا پر اپنی انگلیاں داخل کر کے اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ جڑ سے اکھڑ کر ڈھال کی طرح حضرت کے ہاتھ میں آگیا۔ شانِ امامت سے بے خبر لوگ اس واقعہ کو بعید از عقل جان کر بہت کچھ ناک بھوں چڑھاتے ہیں ان پر واضح ہونا چاہیئے کہ معجزہ تو خلاف عادت ہوتا ہی ہے اگر عام لوگ ایسا کر دیں تو پھر وہ معجزہ ہی نہ رہے۔ باب خیبر کے اکھاڑنے کا تعلق قوت بشری سے نہ تھا بلکہ خدائی طاقت سے تھا چنانچہ جناب امیر علیہ السلام خود فرماتے ہیں مَا قَلَعْتُ بَابَ خَیْبَرَ بِقُوَّةٍ جِسْمَانِیَّةٍ بَلْ بِقُوَّةٍ رَبَّانِیَّةٍ یعنی میں نے باب خیبر کو جسمانی قوت سے نہیں اکھاڑا بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا ہے۔

تعجب ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی حالانکہ رات دن کا یہ مشاہدہ ہے کہ بجلی کا ایک پتلا سا تار جس کے اندر برقی کرنٹ دوڑا ہوا ہوتا ہے کیسے کیسے عجیب و غریب کرشمے دکھاتا ہے۔ بڑے بڑے طاقتور انجن اس کے زور سے چلتے ہیں۔ ٹرام، کاریں دوڑی پھرتی ہیں۔ یہ سب کرشمے اس باریک تار سے ظہور میں نہیں آتے بلکہ اس قوت برقی سے جو اس کے اندر دوڑی ہوئی ہوتی ہے۔ پس علی علیہ السّلام نے اگر خدائی طاقت کی بنا پر ایسا کر کے دکھا دیا تو کیوں تعجب کا محل ہے۔

منقول ہے کہ دروازہ کے اس طرف ایک بہت چوڑا خندق تھا جس کا تختہ یہودیوں نے اٹھا دیا تھا اور اس کی وجہ سے لشکر اسلام کا قلعہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ آپ مع آہنی کواڑوں کے اس خندق میں کود پڑے۔ داہنے ہاتھ میں تلوار تھی اور بائیں میں فولادی در۔ پہلے اس در کو خندق کے ایک کنارہ سے ملایا اور مسلمان سپاہیوں سے فرمایا تم اس پر آجاؤ۔ جب بہت سے آدمی اس پر کھڑے ہو گئے تو آپ نے ڈھال کی طرح اس کو بآسانی خندق کے دوسرے کنارے سے ملا کر ان لوگوں کو اتار دیا اور اسی طرح کل فوج خندق سے پار کر دی۔ اس میں اشارہ تھا کہ اے مسلمانوں اگر تم میری پیروی کرو گے تو جس طرح آج اس خندق سے پار اتارا ہے۔ کل اسی طرح پل صراط سے بھی پار کر دوں گا۔ مسلمان علی کے اس زور بازو کو دیکھ کر حیرت میں آگئے۔

مومنین! دیکھا آپ نے رسول کا یہ حکم کہ برابر لڑے جانا جب تک اللہ تمہارے دونوں ہاتھ پر فتح نہ دے علی نے کس طرح پورا کیا۔ ایک ہاتھ میں تلوار تھی اس سے دشمنوں کو قتل کر کے فتح حاصل کی اور دوسرے ہاتھ سے باب خیبر اکھاڑ کر۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ تمام اصحاب میں صرف ایک ذات علی کی ایسی تھی جو سچا مصداق اس آیت کا بن سکے کہ اللہ ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جن کو وہ دوست رکھتا ہو گا اور وہ لوگ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ اس قوم میں کی پہلی فرد علی بن ابی طالب ہیں۔ حضرت رسولخدا نے روز خیبر وہی الفاظ اعادہ فرمائے اور علی کو علم دے کر تمام مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ صحیح معنی میں خدا و رسول کو دوست رکھنے والا اور خدا و رسول کا سچا محبوب یہی ایک شخص ہے۔

اب ذرا محبتِ الٰہی کی انتہائی منزل بھی دیکھ لیجئے۔ ایک بار کسی نے حضرت رسولخدا کو ایک بھنا ہوا طائر بطور تحفہ پیش کیا۔ انس بن مالک جو ایک زمانہ میں حضرت رسولخدا کے پاس بطور خدمت گار رہتے ناقل ہیں کہ جب حضرت اس طائر کو دوپہر کے وقت کھانے کے لئے بیٹھے تو آپ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ ائْتِنِیْ بِاَحَبِّ خَلْقِکَ اِلَیْکَ یَاْکُلُ مَعِیْ ھٰذَا الطَّیْرَ اے میرے پروردگار اس وقت اپنے سب سے زیادہ محبوب بندے

کو میرے پاس بھیج دے تاکہ میرے ساتھ یہ طائر کھائے یہ حدیث نہایت معتبر و موثق طرق سے وارد ہوئی ہے جناب سرکار علامہ سید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے عبقات الانوار کی ایک پوری جلد اسی حدیث طیر کے متعلق لکھی ہے اور اس میں بکثرت اہلسنت راویوں سے اس کی نقل دکھائی ہے۔

انس کہتے ہیں جب میں نے آنحضرت کی زبان سے یہ کلمات سنے تو فوراً بھاگا ہوا دروازہ پر گیا کہ اگر اس وقت میرا کوئی دوست ادھر سے گزر رہا ہو تو اس کو بلا کر خانۂ رسالت میں داخل کر دوں تاکہ خدا کا سب سے زیادہ محبوب بندہ وہی قرار پائے۔ میں نے سوراخِ در سے بہت جھانکا لیکن اتفاق سے کوئی صاحب گزرے ہی نہیں میں واپس ہونے والا تھا کہ کسی نے دق الباب کیا میں نے گھبرا کر پوچھا کون صاحب ہیں۔ جواب ملا اے انس دروازہ کھول دو میں ہوں علی بن ابی طالب۔ چاہتا ہوں کہ اس وقت حضرت رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ سنکر میں حیرت میں آگیا۔ چونکہ میرا مقصد کچھ اور تھا اس لئے مجھے اس وقت علی کا آنا ناگوار ہوا میں نے کہا یا علی یہ وقت حضرت کے آرام کا ہے۔ یہ کہکر میں اندر آیا آنحضرت نے اپنی زبان سے پھر وہی کلمات ارشاد فرمائے۔ میں پھر بھاگا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ اس بار بھی وہی واقعہ پیش آیا۔ میں نے علی کو پھر ٹال دیا جب اندر آیا تو حضرت کو پھر وہی کہتے ہوئے سنا۔ میں پھر بھاگا ہوا دروازہ پر گیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی کوئی شخص نظر نہ پڑا علی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا اے علی میں بار بار کہے جاتا ہوں لیکن آپ کو شاید میرے کہنے کا یقین نہیں آتا کہ بار بار تشریف لا رہے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ آپ کو غصہ آگیا اور فرمایا اے انس کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اندر کا حال مجھ سے پوشیدہ ہے۔ اے انس دروازہ کھول دو کہ حضرت مجھے بار بار یاد فرما رہے ہیں۔ انس کہتے ہیں میں نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا اور علی اندر داخل ہوئے۔ آپ کو دیکھتے ہی آنحضرت کا چہرہ بشاش ہو گیا اور فرمایا اے علی میں بار بار تمہیں یاد کر رہا ہوں تم کہاں تھے کہ اتنی دیر میں پہنچے۔ آپ نے فرمایا یا رسول اللہ میں تو ہر بار حاضر ہوا لیکن انس نے روک روک دیا۔ یہ سنکر آپ انس پر ناراض ہوئے اس کے بعد آپ نے حضرت علی کے ساتھ وہ طائر تناول فرمایا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب حضرت علی السلام تھے۔

خدا کی محبت کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جو رسول کا صحیح معنی میں اتباع کرنے والے ہیں قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم کو دوست رکھے گا) رسول کے اتباع کا پورا پورا حال میدانِ جنگ میں کھلتا تھا پس جو لوگ میدانِ جنگ میں رسول کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہوں، جو رسالتِ رسول میں شک کرتے ہوں وہ ہرگز ہرگز تابعین رسول نہیں اور جب تابعین میں سے نہیں تو خدا کے محبوب بندے بھی نہیں۔ پورا پورا اتباع کرنے والے حضرت علی علیہ السلام تھے کہ سفر میں حضر میں، صلح میں جنگ میں، صحت میں اور مرض میں کبھی ایک آن کے لئے بھی حضرت علی نے آنحضرت کے حکم کے خلاف نہ ایک قدم اٹھایا نہ ایک کلمہ زبان سے کہا۔

حضرات! خدا کی محبت کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ بڑے بڑے اولیاء و اصفیاء کے لئے مقامِ غبطہ رہی ہے۔ ہر شخص اس محبت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ معمولی محبتیں جب زور پکڑ جاتی ہیں تو انسان اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے اور سوائے اپنے محبوب و مطلوب کے اور کوئی صورت اسکے سامنے نہیں رہتی۔ پھر خدائی محبت کے زور کا تو ٹھکانہ ہی کیا ہے۔ علامہ دمیری نے کتاب حیوٰۃ الحیوان میں نقل کیا ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ کا گزر کسی پہاڑ کی طرف ہوا دیکھا کہ ایک عابد تنہا ایک عبادت خانہ میں بیٹھا ہوا عبادت کر رہا ہے کثرتِ

ریاضت سے اس کی کمر خمیدہ ہو گئی ہے اور بدن سوکھ گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا تو یہاں کب سے ہے اس نے کہا ستر برس گزر چکے۔ صرف ایک حاجت درگاہِ خدا میں رکھتا ہوں۔ مگر اب تک پوری نہ ہوئی۔ کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ آپ درگاہِ الٰہی میں میری سفارش کر دیں گے۔

آپ نے پوچھا تیری حاجت کیا ہے۔ اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ خدا اپنی خالص محبت کا ایک ذرہ مجھے عطا فرما دے۔ حضرت عیسیٰ نے یہ سنکر اس کے لئے دعا کی۔ اسی شب میں وحی ہوئی اے عیسیٰ ہم نے تمہاری دعا کو قبول کیا۔ حضرت عیسیٰ وہاں سے چلے گئے کئی روز بعد جب پھر اس صومعہ کی طرف سے گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ عبادت خانہ گرا پڑا ہے اور اس کے نیچے کی زمین شق ہو گئی ہے۔ پس حضرت عیسیٰ اس شگافتہ زمین کے اندر تشریف لے گئے دیکھا کہ وہ عابد اس گڑھے میں کھڑا ہوا ہے اور منہ کھولے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے سلام کیا مگر اس نے جواب نہ دیا حضرت عیسیٰ کو اس حالت پر سخت تعجب ہوا۔ اور عرض کرنے لگے پروردگارا اس تیرے بندے کا یہ کیا حال ہے۔

ایک ہاتف نے ندا دی اے عیسیٰ اس نے ایک ذرہ ہماری محبت کا مانگا تھا مگر ہم نے یہ سمجھ کر یہ ہماری محبت کے برداشت کرنے کی زیادہ طاقت نہیں رکھتا اپنی محبت کے ستر ہزار حصوں میں سے ایک حصہ اس کو دے دیا ہے۔ دیکھتے ہو کیسا حیران بن گیا ہے۔ اگر ہم زیادہ محبت دے دیتے تو اس کا کیا حال ہوتا۔

محبت کی علامتیں چار ہیں۔ اول بدن کی لاغری، رنگ کی زردی اور مزاج کا تغیر۔ اس خوف میں کہ محبوب ہم سے ناراض تو نہیں ہے لیکن یہ بات انہی کے لئے ہے جن کو یہ معلوم نہ ہو کہ ان کا مرتبہ پیشِ محبوب کیا ہے نہ ان لوگوں کے لئے جو اپنی حالت کا پوری طرح اندازہ رکھتے ہوں چنانچہ ایک مرتبہ جناب امیر علیہ السلام سے کسی نے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ تمام عابدوں اور خدا کے محبوں کے چہرے زرد ہو جاتے ہیں اور جسم سوکھ جاتے ہیں لیکن آپ کا چہرہ بشاش ہے اور آپ کا بدن سب سے زیادہ قوی حالانکہ آپ کا مرتبہ وہ ہے کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا فرمایا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی منزلت پیشِ محبوب کیا ہے اور میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے گئے ہیں پس میں نے اپنے دل کی آنکھ سے اس کو دیکھ لیا چونکہ اپنے سے راضی پایا اس لئے خوف دور ہو گیا جب اس نے خود فرما دیا یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ تو اب ہراس کیا۔

مقامِ تقرب میں تو حضرت حد درجہ بشاش و بشاش رہتے تھے لیکن جب مقامِ عبدیت میں ہوتے تھے تو وقتِ عبادت رنگ چہرۂ مبارک کا اڑ جاتا تھا اور بدن میں رعشہ پڑ جاتا تھا منقول ہے کہ ایک بار آپ حج کو تشریف لے گئے اور ارادہ کیا کہ تَلْبِیَہ کہیں پس حضرت کا جسم خوف سے تھر تھر کانپا، چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا اور غش کھا کر گر پڑے۔ جب افاقہ ہوا تو لوگوں نے اس کا سبب پوچھا فرمایا مجھے یہ خوف ہوا کہ میں لبیک کہوں اور خدا کہے لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ اور جب وضو کرتے تھے۔ تو رنگ چہرہ کا زرد پڑ جاتا تھا اور جب نماز پڑھتے تھے تو بدن کا جوڑ جوڑ کانپنے لگتا تھا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آنحضرت میں اضداد صفات جمع تھیں جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

جُمِعَتْ فِی صِفَاتِکَ الْاَضْدَادُ فَلِهٰذَا عَزَّتْ لَكَ الْاَنْدَادُ

زاھِدٌ حاکِمٌ سیاسٌ شجاعٌ　　فاتکٌ ناسِکٌ فقیرٌ جوادٌ

دوسری علامت محبت کی رات کو جاگنا اور آتشِ محبت سے جلنا ہے۔ چنانچہ خداوندِ عالم نے حضرت موسیٰ سے فرمایا "اے موسیٰ! جھوٹا ہے وہ شخص جو میری محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور تمام رات چین سے سوتا بھی ہے۔ کیا ہر دوست اپنے دوست کے ساتھ خلوت کرنا پسند نہیں کرتا اے موسیٰ کاش تم ان کو دیکھتے جو اندھیری راتوں میں نماز پڑھتے ہیں۔ اور میں ان کی آنکھوں میں سمایا رہتا ہوں اے موسیٰ تم اپنی آنکھوں کے آنسو اور دل کی رجوع تو مجھے دے دو پھر اندھیری راتوں میں مجھے پکارو میں ضرور تمہاری ہر دعا کو قبول کروں گا۔"

اب اس علامت کو جناب امیر علیہ السلام میں دیکھو کہ راتوں رات محرابِ عبادت میں کھڑے رہتے تھے اور بیقرار ہو ہو کر روتے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔ یا دُنیا یا دُنیا الیکِ عَنّی ابی تعرضتِ ام الیّ تشوّقتِ ھیھاتَ ھیھاتَ لاحان حینکِ غُرّی غیری لاحاجۃ لی فیکِ (اے دنیا مجھ سے دور ہو کیا تو اپنے کو میرے سامنے پیش کرتی ہے یا تو میری شائق بنی ہے۔ دور ہو دور ہو۔ جا میرے غیر کو دھوکہ دے۔ مجھے تیری ضرورت نہیں۔

تیسری علامت محبت کی بلا ہے اور شوق کی آگ کا بھڑکنا ہے اسی وجہ سے دوستانِ خدا موت سے زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں کیونکہ زندگی مانع وصل ہوتی ہے امیر المومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ واللہ لابن ابی طالب آنسُ بالموتِ مِنَ الطفلِ بثدی اُمّہٖ۔ واللہ ابو طالب کا بیٹا موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا کہ ایک بچہ اپنی ماں کی پستان کا ہوتا ہے اور اپنے فرزند امام حسن سے فرمایا کرتے تھے یا بُنَیَّ لا یُبالی ابوکَ علی الموتِ وقعَ اَم وقعَ الموتُ علیہِ (بیٹا تمہارے باپ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ موت پر جا پڑے یا موت اس پر آ پڑے)۔ یہی تمنائے موت دوستانِ خدا کی پہچان ہے جیسا کہ سورۂ جمعہ میں ہے یا ایھا الذین ھادوا اِن زعمتم انکم اولیاءُ للہِ مِن دُونِ الناسِ فتمنّوا الموتَ اِن کنتم صادقین (اے یہودیو اگر تم کو یہ گمان ہے کہ سب سے زائے تم ہی اللہ کے دوست ہو تو ذرا تمنائے موت تو کرو اگر تم سچے ہو)

چوتھی علامت یہ ہے کہ اس کا اثر اعضاء و جوارح سے ظاہر ہونے لگے کیونکہ محبت ایک چھپی ہوئی آگ ہے جو عود و بخور کی طرح جسم کو جلاتی ہے۔ جب اہل جسموں میں یہ آگ لگتی ہے تو خوشبو دیتی ہے اور جب نا اہلوں کے جسم میں لگتی ہے تو بجائے خوشبو کے بدبو دیتی ہے۔ جو شخص زبان سے مدعی محبت ہو اور اس کے دل جلنے کی خوشبو اس سے نہ نکلتی ہو یعنی ظاہر میں کوئی اثر اعضاء پر محسوس نہ ہو تو وہ کاذب ہے کمال محبت یہ ہے کہ بے قصد ایسے افعال اعضاء سے سرزد ہونے لگیں جو مرضی محبوب کے مطابق ہوں یہ کیفیت پوری طرح جناب امیر علیہ السلام کے افعال سے ظاہر ہوتی تھی خیال کرو اس شخص کے اعمال کس حد تک مقبول ہوں گے۔ جس کی نسبت رسول اللہ یہ فرماتے ہوں۔ ضربۃُ علیٍّ یومَ الخندقِ افضلُ مِن عبادۃِ الثقلین۔

حقیقت یہ ہے کہ محبت کی تمام علامتوں میں بکا کا مرتبہ سب سے زیادہ ہے کیونکہ فراق کلیجہ کے ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل کو جلا دیتا ہے اور بکا سے زخمی دل کو تسلی ہوتی ہے اور آنسوؤں سے پوشیدہ آگ کے شعلے بجھ جاتے ہیں۔

انس سے منقول ہے کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا کہ حضرت شعیب اس قدر محبتِ خدا میں روئے کہ اندھے ہو گئے۔ خدا نے

پھر ان کی آنکھیں روشن کردیں۔ پھر اتنا روئے کہ اندھے ہوگئے۔ خدا نے پھر ان کو بینا کردیا۔ تیسری بار پھر اتنا روئے کہ بصارت زائل ہوگئی خدا نے پھر بینائی عطا کی اور وحی فرمائی اے شعیب ایسا کب تک کئے جاؤ گے۔ اگر خوفِ نار سے روتے ہو تو میں نے اس سے پناہ دی اور اگر شوق جنت میں روتے ہو تو میں نے عطا کی۔ عرض کی پروردگارا نہ میں عذاب نار کے خوف سے روتا ہوں اور نہ شوق جنت میں بلکہ تیری محبت میرے دل پر اثر کرگئی ہے میں جب تک تجھے دیکھ نہ لوں اس پر صبر نہیں کرسکتا۔ وحی ہوئی اے شعیب یہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب تم موت قبول کرو۔ اے شعیب اگر تمہاری کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ عرض کی بس میری یہی ایک حاجت ہے کہ تو ایک بار مجھے اپنا دوست کہہ کر پکارے آواز آئی یَا شُعَیْبُ اَنْتَ حَبِیْبِیْ اس بشارت کے سنتے ہی فرطِ شادی سے جناب شعیب کی روح پرواز کرگئی

مومنین مقام غور ہے کہ ہمارے آقا و مولا امیر المومنین علیہ السلام کا پیش خدا کتنا بڑا مرتبہ تھا کہ بغیر ان کی درخواست کے خدا فرماتا ہے۔ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ محبت کا مرتبہ خُلّت سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ خدا نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور حضرت محمد مصطفٰےؐ کو حبیب اور ایسا حبیب بنایا کہ جو محمدؐ کا حبیب ہے وہ حبیب اللہ ہے ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہے۔ ؎

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

یہ ظاہر ہے کہ نبی اسی سے محبت کرسکتا ہے جس سے خدا محبت کرتا ہو اور وہ خدا سے محبت کرتا ہو۔ صواعق محرقہ میں ابوالخیر حاکمی سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت علی جناب رسولخدا کی خدمت میں حاضر ہوئے عباس بھی اس وقت حاضر خدمت تھے جناب امیر علیہ السلام نے سلام کیا حضرت نے جواب سلام دیا اور کھڑے ہوئے پہلے معانقہ کیا پھر دونوں ابرو کے درمیان بوسہ دیا اور اپنی داہنی طرف بٹھا لیا۔ عباس نے عرض کی آپ کو علی سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے فرمایا خدا کو اس کی محبت مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اور مواہب لدنیہ میں عائشہ سے منقول ہے کہ حضرت رسولخدا کے نزدیک اَحَبُّ النسا فاطمہ اور احب الرجال علی تھے۔

ترمذی اور حاکم نے بریدہ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسولخدا نے فرمایا خدا نے مجھے چار شخصوں کی محبت کا حکم دیا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ وہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے لوگوں نے پوچھا وہ چار کون ہیں۔ فرمایا علیؑ و ابوذرؓ و سلمانؓ اور مقدادؓ۔ اور اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ حضرت نے فرمایا مجھے اپنے اہل میں سب سے زیادہ محبوب فاطمہ ہے۔ اور طبرانی اور ترمذی نے اسامہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسولخدا نے امام حسن اور امام حسین کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ھٰذٰنِ ابنائی وَابنا ابنتی اللھم اِنّی اُحِبُّھُمَا وَاُحِبُّ مَن یُحِبُّھُمَا (یہ میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ اے خدا میں ان کو دوست رکھتا ہوں اور جو ان کو دوست رکھتے ہیں ان کو بھی دوست رکھتا ہوں)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت کو اپنے نواسوں کی کس درجہ محبت تھی۔ خوشحال ان لوگوں کا جو حسین کو دوست رکھتے ہیں کیونکہ بموافق حدیثِ رسول ان کا شمار محبانِ رسول میں ہے۔ اس وقت مجھے امام حسین کے ایک خاص دوست یاد آگئے وہ کون جناب حبیب ابن مظاہر۔

منقول ہے کہ ایک بار جناب حبیب کے والد علی مظاہر خدمتِ رسول میں حاضر ہوئے حبیب بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان کا سن کچھ سات سال سے زائد نہ تھا۔ علی بن مظاہر آنحضرت کے پاس بیٹھے باتیں کررہے تھے ناگاہ آنحضرت کی نظر راستہ پر جا پڑی دیکھا کہ حسین حسن

طرف جاتے ہیں ایک لڑکا ان کے پیچھے پیچھے جاتا ہے اور ان کے پیروں تلے کی خاک اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لیتا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت کو سخت تعجب ہوا علی بن مظاہر سے پوچھا یہ لڑکا کون ہے۔ انہوں نے کہا یہ میرا لڑکا ہے۔ پوچھا اس کا کیا نام ہے وہ بولے حبیب۔ حضرت یہ سنکر بہت خوش ہوئے اپنے مقام سے اُٹھے اور حبیب کو پاس بلا کر دیر تک پیار کرتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب حبیب نے کربلا میں حق دوستی ادا کر دیا۔ چنانچہ منقول ہے کہ ایک روز حبیب ابن مظاہر بازار کوفہ میں ایک عطار کی دکان سے خضاب خرید رہے تھے کہ جناب مسلم بن عوسجہ کا اس طرف سے گزر ہوا۔ حبیب نے ان سے کہا بھائی مسلم میں دیکھتا ہوں کہ کوفہ میں فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ ہتیار بن رہے ہیں تمہیں کچھ معلوم ہے کہ اس کا سبب کیا ہے۔ مسلم یہ سنکر رونے لگے اور کہنے لگے اے حبیب کیا بیان کروں اہلِ کوفہ نے فرزند رسول الثقلین حضرت امام حسین کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا ہے یہ سب اسی کی تیاری ہے یہ سننا تھا کہ حبیب نے خضاب اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور کہا خدا کی قسم اب یہ میری داڑھی نصرت حسین میں سر کے خون سے خضاب ہو گی۔

اب تھوڑا سا حال امام حسین علیہ السّلام کا بھی سنئے جب حضرت کوفہ کی طرف تشریف لا رہے تھے تو ایک منزل پر پہنچکر آپ کو حضرت مسلم کی شہادت اور اہلِ کوفہ کے غدر کا حال معلوم ہوا۔ آپ سمجھ گئے کہ اب دشمن مجھ تک بھی ضرور پہنچیں گے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ بارہ عَلَم بناؤ اور چند لوگوں سے فرمایا تم میں سے ہر ایک ایک عَلَم اٹھا لے۔ جب گیارہ نشان لوگوں نے اٹھا لئے اور ایک باقی رہ گیا تو لوگوں نے پوچھا یہ علم کس کو دیا جائے۔ فرمایا اس کا اٹھانے والا عنقریب آیا چاہتا ہے۔

منقول ہے کہ چند روز قبل ایک خط امام حسین علیہ السّلام حبیب ابنِ مظاہر کے نام روانہ کر چکے تھے جس کا مضمون یہ تھا یہ خط حسین بن علی کی طرف سے مرد فقیہ حبیب ابنِ مظاہر کے نام ہے۔ اے حبیب مجھ کو جو قرابت حضرت رسولخدا سے ہے اس کو تم خوب جانتے ہو اے حبیب بنی امیہ ہمارے درپے آزار ہیں مجھ سے بیعت یزید طلب کی جا رہی ہے چونکہ تم صاحب غیرت و حمیت ہو اس لئے لکھتا ہوں کہ اس موقع پر ہماری نصرت سے جان چرانا زیبا نہیں روز قیامت خدا تم کو اس کی جزا دے گا۔

راوی کہتا ہے کہ حبیب ایک روز اپنی زوجہ کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ان کی زوجہ کے حلق میں لیکایک لقمہ گلوگیر ہوا کہنے لگیں اے حبیب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قاصد آنے والا ہے۔ ابھی یہی ذکر ہو رہا تھا کہ کسی نے دق الباب کیا۔ حبیب باہر گئے اور پوچھا کون ہے۔ اس نے کہا میں قاصد ہوں اور تمہارے نام امام حسین کا خط لے کر آیا ہوں یہ کہکر اس نے خط نکالا اور حبیب کو دیا۔ حبیب نے تعظیماً آنکھوں سے لگایا پھر بوسہ دے کر کھولا۔ جب مضمونِ خط سے آگاہی ہوئی تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے ان کی زوجہ نے پوچھا اے حبیب کیا ماجرا ہے یہ خط کس کا ہے کہ تم اس کو پڑھکر ایسے بے چین ہو گئے۔ حبیب نے کل حال بیان کیا ان کی زوجہ نے پوچھا پھر کیا ارادہ ہے حبیب نے اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو بمصلحت وقت کہہ دیا کہ میں ان معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا یہ سننا تھا کہ وہ زن مومنہ بگڑ گئی اور کہنے لگی اے حبیب تمہاری جرأت و ہمت پر وائے ہو کیا غضب آگیا کہ نبی کا نواسہ تم کو نصرت کے لئے بلاتا ہے اور تم اس کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ اے حبیب اگر تمہیں جانے میں تامل ہے تو یہ میری چادر تم لو اور اپنی تلوار مجھ کو دو میں خود اپنے آقا کی نصرت کو جاتی ہوں حبیب نے فرمایا تم اطمینان رکھو میں ضرور نصرتِ حسین کو جاؤں گا لیکن ابھی اس کا اظہار مناسب نہیں جانتا مبادا کوئی مخبر یہ خبر ابن زیاد تک

پہنچادے اور وہ مجھے گرفتار کرا کے قید میں ڈال دے اور میں اپنا ارادہ پورا کرنے سے باز رہوں۔ دوسرے مجھے تمہارا خیال ہے کہ بعد میرے تمہارا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔ اس زنِ مومنہ نے کہا اے حبیب تم میرا خیال نہ کرو میں خاک پھانک کر اور فاقہ کر کے بسر کرلوں گی۔ خدا کے لئے تم میری وجہ سے نصرتِ حسین کو ترک نہ کرو۔ اے حبیب جب خدمت فرزند رسول میں پہنچنا تو میری تسلیم عرض کرنا اور حضرت کے دست و پائے مبارک پر بوسہ دے کر کہنا۔ مولا اگر عورتوں سے جہاد ساقط نہ ہوتا تو میں خود آپ کی نصرت کے لئے حاضر ہوتی۔ اے حبیب اب سفر کے لئے جلد تیار ہو جاؤ یہ تاخیر کا محل نہیں اگر خدانخواستہ میرے مولا کو دشمنوں نے کوئی اذیت پہنچادی تو حشر میں منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔

الغرض حبیب نے اسی وقت سے سفر کی تیاری شروع کردی۔ گھوڑے پر زین کسی اور غلام سے فرمایا اسے لے جا اور فلاں مقام پر میرا انتظار کر میں بھی پیچھے پیچھے آتا ہوں خبردار میرا ارادہ کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ غلام گھوڑا لے کر چلا گیا۔ جب حبیب کو پہنچنے میں دیر ہوئی تو غلام گھبرایا۔ اور گھوڑے کو مخاطب کر کے کہنے لگا اے گھوڑے اگر تیرا مالک نہ آیا تو میں تجھ پر سوار ہو کر نصرتِ حسین کو جاؤں گا۔ غلام گھوڑے سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ حبیب بھی وہاں پہنچ گئے۔ غلام کا یہ کلام سنکر آبدیدہ ہوئے اور سینہ پر ہاتھ مار کر کہنے لگے اے فرزند رسول میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیسا وقت آپ پر آپڑا ہے کہ غلام تک آپ کی نصرت کی تمنا کر رہے ہیں۔ پھر حبیب نے غلام سے کہا جا میں نے تجھ کو راہِ خدا میں آزاد کیا۔ اس نے کہا اے حبیب خدا کی قسم میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا میں بھی نصرتِ فرزندِ رسول کے لئے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ حبیب نے اس کے حق میں دعائے خیر کی اور وہاں سے روانہ ہوئے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت امام حسین نے ایک منزل پر پہنچ کر اپنی فوج کے بارہ علم تیار کرائے تھے۔ گیارہ تو تقسیم کر دیئے تھے۔ ایک باقی رہ گیا تھا۔ یکایک گرد سامنے سے نمودار ہوئی۔ حضرت نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا دیکھو اس نشان کا اٹھانے والا آپہنچا۔ جب حبیب امام علیہ السّلام کے قریب آئے تو گھوڑے پر سے کود پڑے اور موافق رسم قدیم حضرت کے پائے مبارک کو بوسہ دیا۔

منقول ہے کہ جب جناب زینب نے یہ سنا کہ جناب حبیب ابنِ مظاہر میرے بھائی کی نصرت کو آئے ہیں تو ایک کنیز سے فرمایا حبیب سے جا کر میرا سلام کہو۔ مومنین جب حبیب نے یہ سُنا تو اپنے منہ پر طمانچے مارے اور رو رو کر کہنے لگے اللہ اکبر میرا یہ مرتبہ ہوگیا کہ امیر المومنین کی بیٹی مجھے سلام کہلا کر بھیجتی ہے۔ الغرض اس وقت سے حبیب برابر امام حسین کے ساتھ رہے وہ باوجودیکہ بوڑھے تھے مگر جوانوں کا سا حوصلہ رکھتے تھے ان کو نصرت حسین کا اتنا جوش تھا کہ شبِ عاشور تمام رات صبح شہادت کے انتظار میں ہتیار باندھے بیٹھے رہے۔

لکھا ہے کہ روزِ عاشور میدانِ جنگ میں جب کوئی نامرِ حسین گھوڑے سے گرتا تھا اور حضرت امام حسین گھبرائے ہوئے اس کے پاس پہنچتے تھے تو حبیب ابنِ مظاہر آپ کے ساتھ ضرور جاتے تھے۔ کیونکہ آپ کو ایک دم کے لئے حضرت سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب مسلم بن عوسجہ جنگ کرنے کے بعد گھوڑے سے گرنے لگے تو آواز دی یا ابن رسول اللہ ادرکنی۔ امام علیہ السّلام فوراً میدانِ قتال کی طرف روانہ ہوئے۔ حبیب بھی حضرت کے ساتھ ساتھ چلے۔ جب وہاں پہنچے تو مسلم کو جاں بلب پایا حضرت نے ان کا سر زانو پر رکھکر فرمایا اے مسلم خدا تم کو جزائے خیر دے تم نے ہماری نصرت بڑے خلوص سے کی اے مسلم تمہارے خاک پر گرنے سے حسین کا دل ٹوٹ گیا۔ جو مصیبت تم پر گزرنی تھی۔ گزر گئی اب ہم باقی رہ گئے۔

اس کے بعد حبیب نے مسلم سے فرمایا اے مسلم اگر میں جانتا کہ تمہارے بعد زندہ رہنے والا ہوں تو یامراد تم سے کہتا کہ کچھ وصیت کرو۔ لیکن میں تو تمہارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔ مگر چونکہ زمانہ کا دستور ہے کہ مرنے والے سے وصیت کو کہا کرتے ہیں لہذا اس رسم کی بناء پر تم سے کہتا ہوں کہ کوئی آرزو دل میں ہو تو بیان کرو۔ یہ سنکر مسلم نے آنکھ کھولی اور اپنی انگلی سے امام علیہ السّلام کی طرف اشارہ کرکے کہا اے میرے بھائی اے حبیب میری وصیت بس یہی ہے کہ ان سے بے خبر نہ رہنا اور نصرت میں کوتاہی نہ کرنا۔ اللہ اکبر کیا وفادار تھے اصحاب امام حسین علیہ السّلام کہ ہونٹوں پر جان تھی مگر آپ کی نصرت کا خیال اس وقت بھی ان کے دلوں میں تھا۔ ایک دوسرے کو وصیت کرتا تھا تو یہی کہ ان کی مدد سے جان نہ چرانا۔

حضرات اب سنئے کہ جناب حبیب ابن مظاہر نے کس حوصلہ کے ساتھ روز عاشورا اپنی جان فرزند رسول پر قربان کی۔ لکھا ہے کہ جب حبیب اجازت کارزار حاصل کرکے میدانِ جنگ میں تشریف لائے تو پہلے رجز پڑھا پھر اس قوم بدشعار کو سخت ملامت کی۔ اس کے بعد شمشیر آبدار نیام سے نکال کر وہ دلیرانہ جنگ کی کہ دشمن کے ہوش گم ہوگئے۔ بروایت محمد بن ابی طالب جناب حبیب نے پے در پے دو حملوں میں ۶۲ نامرد واصل جہنم کئے۔

بروایت مناقب حبیب جوشِ شجاعت میں ایک بار اس طرح ان جفاکاروں پر جا پڑے جیسے شیر ہرنوں کے غول پر جا پڑتا ہے حصین بن نمیر ملعون ان کی گھات میں تھا موقع پاتے ہی ایک نیزہ ان کے سینہ پر ایسا مارا کہ پھر گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ بدیل بن صریم ملعون نے فوراً حبیب کا سر تن سے جدا کردیا۔ مقتل ابومخنف میں ہے کہ حبیب کے قتل ہونے سے امام علیہ السّلام کا دل ٹوٹ گیا اور بہت زیادہ مایوسی چہرہ مبارک پر چھاگئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون کہہ کر فرمایا خدا حبیب پر رحم کرے کہ وہ ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔

حضراتِ جب حبیب کے مرنے کی خبر خیمہ میں پہنچی تو مخدراتِ عصمت وطہارت نے حبیب کا ماتم اسی طرح کیا جیسے اپنے عزیز خاص کا کرتے ہیں۔ بار بار جناب زینب فرماتی تھیں اے حبیب خدا تمہیں جنت میں اعلیٰ درجہ کرامت فرمائے تم نے میرے مظلوم بھائی کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اے حبیب تمہارے دم سے ہم اہلبیت کو بڑی ڈھارس تھی۔

مومنین کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اہل حرم انصار کے لاشوں پر تو صرف دل بلکا کرسکے۔ مگر جب ہمارے مولا و آقا امام مظلوم شہید ہوئے تو ان شکستہ دل اور ستم رسیدہ بی بیوں کو ان کی لاش پر رونا بھی نصیب نہ ہوا۔ آہ کیونکر رو سکیں وہ دکھیا بی بیاں جن پر بعد شہادت امام مظلوم مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دشمنوں نے فوراً خیموں میں آگ لگادی اور اس طرح اہلحرم کو لوٹنا شروع کیا کہ کسی بی بی کے سر برہنہ ڈھانپنے کو چادر بھی نہ رہی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ میت کے وارثوں اور پسماندوں کو تسکین دی جاتی ہے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن آہ کربلا میں کیسے مسلمان تھے کہ ذرا ان دکھیا عورتوں پر رحم نہ آیا جو ایک دو نہیں پورے بہتر کی سوگوار تھیں جن کی گودوں کے بچے تک قتل ہوچکے تھے۔ جن کے جوان تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تھے جن کے سروں سے وارثوں کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ ایک عزیز کا ماتم کس قدر سخت ہوتا ہے اور یہاں تو بھرا گھر خالی ہوگیا تھا۔ آہ ان ستم رسیدہ عورتوں کا دل کیا کہتا ہوگا۔ افسوس صد افسوس اس وقت بیکسی میں تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔ اَلاَ لَعنَۃُ اللّٰہِ عَلَی القَومِ الظّٰلِمِین وَسَیَعلَمُ الَّذِینَ ظَلَمُوا اَیَّ مُنقَلَبٍ یَّنقَلِبُون ٥

تیرھویں مجلس

تفسیر آیۂ انما ولیکم اللہ ورسولہ و فضائل جناب امیر و شہادت اصحاب حسین علیہ السلام

قال اللہ تبارک و تعالیٰ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون

بے شک تمہارا ولی اللہ ہے اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نماز کو قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کو ادا کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں، یہ آیۂ والی ہدایہ امیر المومنین حضرت علیہ السلام کی شان میں ہے۔ اس کی شانِ نزول کے متعلق جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک روز میں نے حضرت رسولخدا کے ساتھ نماز پڑھی۔ پس ایک سائل مسجد میں آیا۔ اور کچھ سوال کیا کسی نے اس کو کچھ نہ دیا۔ سائل نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ خداوندا گواہ رہنا کہ میں نے تیرے نبی کی مسجد میں سوال کیا مگر کسی نے مجھے کچھ نہ دیا، علی اس وقت نماز میں مشغول تھے، رکوع کی حالت تھی، انہوں نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے جس میں ایک انگوٹھی تھی، اس سائل کی طرف اشارہ کیا، سائل ان کے قریب گیا اور انگوٹھی کو انگلی سے اتار لیا، یہ واقعہ حضرت رسولخدا کے سامنے کا تھا، حضرت نے اپنا روئے مبارک آسمان کی طرف کر کے فرمایا خداوندا میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے سوال کیا تھا رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی واجعل لی وزیرا من اھلی ھارون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری (پالنے والے) میرے سینہ کو کشادہ کر دے، میرے امر کو آسان کر دے میری زبان کی بستگی کو کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں اور میرا وزیر میرے اہل سے میرے بھائی ہارون کو قرار دے اور میری پشت کو اس سے قوی کر دے اور میرے امر رسالت میں اس کو شریک کر دے، پس پروردگارا میں بھی یہی سوال کرتا ہوں میرا سینہ کشادہ کر دے میرا وزیر میرے اہل سے میرے بھائی علی کو قرار دے ابوذر فرماتے ہیں ابھی یہ دعا حضرت کی تمام نہ ہوئی تھی کہ جبریل امین آیۂ انما ولیکم اللہ لے کر نازل ہوئے۔

جن لوگوں کو اہلبیت علیہم السلام سے عداوت ہے انہوں نے لفظ ولی کے معنی میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے اور پوری کوشش اس امر کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی یہ مخصوص فضیلت خاک میں مل جائے، کسی نے کہا ولی کے معنی دوست کے ہیں، کسی نے کہا ناصر و مددگار کے ہیں لیکن شیعوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اس آیت میں ولی کے معنی حاکم اور اولی بالتصرف کے ہیں۔ دوست اور ناصر کے معنی یہاں پر صحیح ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ دوست اور ناصر تو بہت سے ہوتے ہیں اور اس آیت میں لفظ انما کلمہ حصر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حاکم اور سب سے زیادہ تمہاری جان اور مال میں تصرف کرنے والے صرف تین ہیں۔ ایک اللہ دوسرے اس کا رسول اور تیسرے وہ لوگ جو ایمان لانے والے ہیں اور حالتِ نماز میں زکوٰۃ دینے والے ہیں۔ اگر ولی کے معنی یہاں دوست کے لئے جائیں تو کلمہ حصر بیکار ہو جائے گا۔ اولی اور مولیٰ کے ایک ہی معنی ہیں۔ روز غدیر حضرت رسولخدا صاف طور پر اس کو بیان کر چکے

ہیں۔ آپ نے کئی لاکھ مسلمانوں کے مجمع میں فرمایا اَلَسْتُ اَوْلیٰ بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا۔ ہر طرف سے آواز آئی بے شک تب آپ نے فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلاہُ۔ یعنی جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے یہاں مولا کے معنی اولی بالتصرف ہی کے ہیں کیونکہ اول جملہ میں حضرتؐ نے لوگوں سے اسی امر کا اقرار کرایا تھا پس جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ نبی کی طرح علی بھی مولا اور حاکم اور اولی بالتصرف ہیں تو پھر آیہ انما ولیکم اللہ میں بھی ولی کے معنی اولی بالتصرف ہی کے ہوئے۔

اہلسنت کے مشہور و معروف عالم ابن اثیر نے اپنی کتاب نہایہ میں مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلاہُ کے تحت میں لکھا ہے کہ حضرت کا مقصود یہ تھا مَنْ کُنْتُ نَبِیَّہٗ فَعَلِیٌّ وَلِیُّہٗ یعنی جس کا میں نبی ہوں علی اس کا ولی ہے۔ شافعی نے بھی مولا کے معنی اولی بالتصرف ہی سمجھے ہیں اور اس کے ثبوت میں آیہ اِنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکَافِرِیْنَ لَا مَوْلیٰ لَھُمْ پیش کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ ایمان والوں کا حاکم ہے اور کافروں کا کوئی مولا نہیں۔ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ روز غدیر حضرت عمرؓ نے امیر المومنین علیہ السّلام کو اس طرح مبارکباد دی بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَدْ اَصْبَحْتَ وَاَمْسَیْتَ مَوْلایَ وَمَوْلیٰ کُلِّ مُؤْمِنٍ وَّ مُؤْمِنَۃٍ یعنی مبارک ہو اے علی بن ابی طالب کہ آج سے آپ میرے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا ہو گئے اگر اس قول میں مولا کے معنی اولی بالتصرف کے نہ لئے جائیں بلکہ دوست مراد لئے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس سے پہلے حضرت علی نہ حضرت عمر کے دوست تھے اور نہ کسی مومن و مومنہ کے۔ یا یہ کہ حضرت عمر مومن نہ تھے جو حضرت علی کی دوستی کا شرف ان کو حاصل ہوتا۔

چونکہ آیہ انما ولیکم اللہ واقعہ غدیر سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی اور ولی کے معنی دوست کے لئے گئے ہیں لہذا حضرت عمر کو اس آیت کے حکم کے بموجب حضرت علی کا دوست ہونا چاہیے تھا پس اگر وہ دوست تھے تو واقعہ غدیر کے بعد یہ مبارکباد بالکل مہمل ہو جاتی ہے کیونکہ جو شرف پہلے سے حاصل تھا اس کی مبارکباد اب کیسی؟ دوسرے آیہ انما المومنون بعضھم اولیاء بعض (مومنین آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں) صاف بتا رہی ہے کہ مومن مومن کا دوست ہے پس اگر حضرت عمر مومن تھے تو حضرت علی کے دوست بھی تھے اور جب دوست تھے تو پھر یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ آج سے آپ میرے اور ہر مومن و مومنہ کے دوست ہو گئے۔ چونکہ دوست کے معنی حضرت عمر کے اس قول میں صحیح نہیں بیٹھتے لہذا معلوم ہوا کہ حضرت عمر نے اپنے اس قول میں حاکم اور اولی بالتصرف ہی کے معنی مراد لئے تھے۔ پس جو لوگ ولی کے معنی دوست لیتے ہیں۔ وہ حضرت عمر کو صفت ایمان سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔

صد شکر کز رقیباں دامن کشاں گزشتی ۔۔۔ گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

قرآن و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیہ انما ولیکم اللہ حضرت علی ہی کی شان میں ہے کیونکہ دونوں میں لفظ اولی و مولی واقع ہوئے ہیں اور تینوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ ورنہ کلام خدا و کلام رسول میں موافقت ثابت نہ ہوگی اگر حدیث میں لفظ مولا کے معنی ناصر ہوں تو کئی خرابیاں لازم آتی ہیں۔ اول یہ کہ حدیث و قرآن میں موافقت نہیں رہتی۔ دوسرے حدیث و حدیث میں مخالفت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ پہلے آنحضرت نے بطور براعۃ الاستہلال یہ فرمایا تھا الست اولی بکم من انفسکم پھر فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلاہُ

پس اگر دونوں جگہ ایک ہی معنی نہ لئے جائیں تو ایک حکیم کا قول معمولی لوگوں کے کلام سے بھی از روئے محاورہ گر جائے گا۔ تیسرے یہ کہ ایک غیر ضروری شے کا اس خاص اہتمام سے روز غدیر میں بیان کرنا لازم آئیگا لفظ مولیٰ بمعنی اولیٰ کلام عرب میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور قرآن بھی یہی بتاتا ہے آیۂ مَاوٰاکُمُ النَّارُ ھِیَ مَوْلٰکُمْ مولاکھا آگ ہی تمہاری جائے پناہ ہے اور وہی تم پر سب سے زیادہ تصرف کرنے والی ہے یہ صاف یہی معنی ظاہر ہیں۔ لطیف بات یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے پس جس طرح منافقین کی مولا آگ ہے اسی طرح جناب امیر علیہ السلام مومنین کے مولا ہیں۔ اگرچہ لفظ ولی بمعنی دوست و ناصر بھی قرآن میں موجود ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جگہ ولی بمعنی دوست ہی ہوں۔ بہت سے الفاظ مختلف المعنی ہوتے ہیں۔ لیکن محل و مقام کے لحاظ سے ان کے معنی لئے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ بمعنی دعا بھی آیا ہے اور بمعنی نماز بھی۔ لیکن موقع کے لحاظ سے ہر جگہ معنی لئے جاتے ہیں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے یہ معنی نہیں کہ دعا کرو۔

علاوہ بریں امامت اسی طرح نیابت نبی میں ریاست عامہ ہے جیسے نبوت خدا کی نیابت میں ریاست عامہ ہے یعنی ریاست عامہ مطلقہ خدا کے لئے ہے اس کے بعد نبی کے لئے اس کے بعد نائب نبی کے لئے۔ آیۂ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ میں یہی تین ریاستیں بیان کی گئی ہیں اور اسی ترتیب سے بیان کی گئی ہیں۔ اسی امر کو حضرت رسولخدا نے روز غدیر خم ملحوظ رکھا تھا اور فرمایا تھا فَاِنَّ اللّٰہَ مَوْلَایَ وَاَنَا اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَلَا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ (اللہ میرا مولا ہے اور میں تمہاری جانوں پر حاکم ہوں اور جس کا میں حاکم ہوں اس کا علی حاکم ہے) اس حدیث کا بلحاظ منطق اگر صغریٰ و کبریٰ درست کر کے نتیجہ نکالا جائے تب بھی یہی ہے یعنی کُلُّ مُؤْمِنٍ فَاَنَا کُنْتُ مَوْلَاہُ — وَکُلُّ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ نتیجہ نکلا کُلُّ مُؤْمِنٍ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ حضرت عمر باوجودیکہ بوڑھیوں سے بھی کم علم فقہ رکھتے تھے مگر اتنی بات وہ بھی سمجھتے تھے ورنہ اس طرح مبارکباد نہ دیتے۔

اگر مولا بمعنی دوست ہوتا تو آنحضرت کو اس بارہ میں اس قدر اہتمام کی ضرورت کیا تھی کہ ٹھیک دوپہر میں سب کو جمع کرتے۔ پالان اشتر کا منبر تیار کراتے اور اس شد و مد سے خطبہ پڑھتے اور پھر یہ کلمات کہتے نہ حضرت عمر کو یہ ضرورت پیش آتی کہ وہ اس شد و مد سے مبارکباد دیتے۔ مولا کے معنی دوست کے ہوتے تو ایک شخص حضرت عمر سے یہ نہ کہتا کہ تم نے علی کے ساتھ وہ کیا جو اصحاب نبی میں سے کسی کے ساتھ نہیں کیا حضرت عمر نے فرمایا علی میرے مولا ہیں صرف دوست بن جانا کوئی ایسی بڑی فضیلت نہ تھی جس پر مضطرب ہو کر کہنے والا حضرت عمر سے ایسا کہتا۔

اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا کے معنی دوست کے نہ تھے ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ واقعہ غدیر کے بعد حرث بن نعمان فہری نے حضرت رسولخدا سے کہا اے محمد آپ نے توحید و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج وغیرہ کے احکام سنائے ہم نے سب قبول کرتے پس کیا آپ اس پر راضی نہیں ہوئے جو آج آپ نے اپنے ابن عم کو ہم سب پر فضیلت دی۔ اے محمد اگر آپ سچے ہیں اور میں جھوٹا ہوں تو خدا سے دعا کیجئے کہ مجھ پر عذاب نازل کرے چنانچہ آیۂ سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَہٗ دَافِعٌ اس واقعہ کی بابت ہے۔ حرث پر آسمان سے ایک پتھر گرا جو حلقہ ہو کر اس کے گلے میں پڑ گیا اور وہ مر گیا۔ پس کیا حرث کی مراد اس سے یہ تھی کہ آپ نے علی کو محب و ناصر مومنین قرار دیا یا یہ کہ آپ نے ان کو ولی امر بنایا اور ان کی ولایت کو مقرون بمعرفت و عبادت قرار دیا۔

ایک خاص بات قابل غور یہ ہے کہ عرب و عجم دونوں میں یہ رسم ہے کہ والیان امر اور ان کے احباب کے لئے دعا کی جاتی ہے اور ان

کے اعدا کے لئے بددعا۔ عربی میں کہا جاتا ہے ظلکم ظلیل وعدوکم ذلیل اور فارسی میں کہتے ہیں دوست شاد دشمن پامال یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر نے تہنیت دی پس اگر وہ مومن تھے تو ان کا یہ قول اس کا اقرار ہے کہ حضرت علی ان کے رئیس ہیں۔

آیۂ انما ولیکم اللہ میں حضرت علی کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں اول الذین امنوا دوسرے یقیمون الصلوٰۃ اور تیسرے یوتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں الذین امنوا آیا ہے ان کے رئیس و قائد علی علیہ السلام ہیں۔ سبحان اللہ ان کے ایمان کا کیا کہنا یہ تو مجسم ایمان تھے چنانچہ جنگ خندق میں جب حضرت علی عمرو بن عبدود کے مقابلہ کو چلے تو حضرت رسول خدا نے فرمایا برز الایمان کلہ الی الکفر کلہ۔ اگر عمرو کل کفر تھا تو علی کل ایمان یعنی مجسم ایمان تھے۔

اگر آیہ انما ولیکم اللہ میں الذین امنوا سے حضرت علی مراد نہ لئے جائیں تو اس حکم میں ہر وہ شخص داخل ہو جائے گا جو نماز پڑھتا ہو اور زکوٰۃ دیتا ہو۔ ایسی حالت میں حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ نیز قرینۂ روایت یہ ہے کہ مراد اس سے حضرت علی ہیں کیونکہ یہ انگوٹھی حضرت رسولخدا کی موجودگی میں دی گئی تھی اور آنحضرت نے وزارت کے لئے دعا کی تھی۔ ابھی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ جبرئیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آیت میں جمع کے صیغے ہیں اور علی علیہ السلام اکیلے تھے۔ پس کیونکر مراد ہو سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ کلام باری میں جمع کا اطلاق واحد پر کئی جگہ پایا جاتا ہے مثلاً انا نحن نزلنا الذکر دوسری جگہ ہے قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم اس آیت میں ناس اول سے مراد نعیم بن مسعود اور ناس ثانی سے مراد ابوسفیان ہے۔ باوجودیکہ ایک شخص ہے لیکن جمعوا جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ تیسرے موقع پر ہے اذ قالت الملائکہ یامریم ان اللہ اصطفاک یہاں ملائکہ سے مراد جبرئیل ہیں جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے چوتھے مقام پر ہے یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء یہاں لفظ نساء جمع ہے لیکن مراد حفصہ ہے چنانچہ رازی نے انس سے یہی روایت کی ہے۔ پانچویں آیۂ مباہلہ میں انفسنا و ابناءنا و نساءنا جمع ہے لیکن ان کے مصداق واحد ہیں اور اگر اس سے بھی انکار کیا جائے تو ہم کہیں گے کہ اس سے مراد حضرت علی اور ان کی اولاد ہے۔ چنانچہ یہ امر ثابت ہے کہ ہمارے ہر امام نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی۔

اس مقام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام کے خضوع کی یہ حالت تھی کہ حالت نماز میں تیر پیر سے نکال لیا جاتا تھا تو خبر نہ ہوتی تھی پھر بحالت رکوع ایک سائل کی آواز کیسے سن لی۔ اس کا جواب بمذاق عارفین یہ ہے کہ جس وقت سائل کی آواز درگاہ الٰہی میں پہنچی تو علی نے اس کو سن لیا کیونکہ اس درگاہ کے مقربان خاص میں سے ہیں۔ اور قربت کے انتہائی مدارج پر فائز ہیں اور بنا برمذاق معقول متوسط جواب یہ ہے کہ انہوں نے مقصد سائل بالہام ربانی معلوم کر لیا اور یہ استغراق کے منافی نہیں بلکہ دلیل کمال قربت ہے جیسا کہ وحی کا نزول جو الہام سے بدرجہا بڑھ کر ہے اس غشی کے منافی نہیں تھا جو خاتم الانبیا پر طاری ہوتی تھی بلکہ وہ غشی ہی سبب نزول وحی تھی جناب امیر علیہ السلام کا حالت نماز میں سائل یا اس کے سوال کی طرف رجوع کرنا اس کا مقتضی نہیں کہ آپ کی توجہ غیر شے کی طرف ہو گئی کیونکہ آنحضرت نے ایسا فعل کیا جس کی انتہا خدا کی طرف ہوتی ہے۔ بلا تشبیہ اس کو یوں سمجھو کہ ایک شراب خوار نشہ کی حالت میں اگر کوئی کام ہوشیاروں کا سا کر گزرے اور پھر بدستور پہلی حالت پر لوٹ جائے۔ تو اس کو صحیح نہیں کہتے اسی طرح جناب امیر علیہ السلام اگر ذرا دیر کے لئے حالت عباد

میں سائل کی طرف متوجہ ہو گئے تو عبادت سے خارج نہ ہوئے اور آپ کے استغراق میں فرق نہ آیا۔

جاننا چاہئے کہ وہ سائل ایک فرشتہ تھا جو خدا کی طرف سے بصورت سائل بھیجا گیا تھا پس کیونکر وہ عبادت گزار بحالت خضوع و خشوع اس کو نہ جانتا جس کی طرف وہ فرشتہ بھیجا گیا تھا بطریق اہلبیت مروی ہے کہ وہ سائل فرشتہ تھا اور اس نے آکر کہا تھا۔ السّلام علیکم یا ولیّ اللہ و اولی المؤمنین من انفسہم تصدّق علی مسکین یعنی اے اللہ کے ولی اور مومنوں کی جان کے ان سے زیادہ مالک ایک مسکین کو صدقہ دو۔ پس اگرچہ حضرت انتہائی خضوع و خشوع میں تھے لیکن اپنے خدا کے پیغام اور پیغام بروں سے تو غافل نہ تھے، چنانچہ حضرت نے اس کی آواز کو سن لیا اور اپنی عطا سے مشرف کیا یعنی سائل نے حضرت کی انگوٹھی آپ کی انگلی سے اتار لی۔

سخت حیرت ہے کہ ایسے لوگ کیونکر یہ اعتراض کرتے ہیں جن کی صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں حالت نماز میں اپنے لشکر کو تعلیم دیتا اور اس کی درستی کرتا ہوں یعنی دھتکار دیتا ہوں۔ حضرت عمر کی حالت بھی کس قدر عجیب تھی کہ جب جنگ کا وقت آتا تو بھاگ جاتے اور جب نماز کی حالت ہوتی تو لشکروں کو دھتکار بتاتے اور ان کے متعلق غور و فکر کرنے لگتے اور شیر بن جاتے۔ جناب امیر علیہ السلام کی حالت اس کے برعکس تھی۔

هُوَ البَكّاءُ فِي المِحْرابِ خَوفاً　　هُوَ الضَّحّاكُ فِي يَومِ الضِّرابِ

(وہ محراب عبادت میں خوفِ خدا سے پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے اور جنگ کے روز سب سے زیادہ ہنسنے والے تھے)

اگر حضرات اہلسنت یہ کہیں کہ تجہیز لشکر حضور قلب کے لئے منافی نہیں تو ہم کہیں گے کہ اسی طرح زکوۃ بھی نہیں۔ اگر وہ حالت نماز میں سپاہیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر سکتے ہیں تو یہ بھی حالت نماز میں انگلی کے اشارے سے سائل کو انگوٹھی دے سکتے ہیں بلکہ اس فعل اور اس فعل میں زمین و آسمان کا بل ہے۔ علی کا فعل ممدوح ہے اور عمر کا مذموم۔ بعض لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت علی سے حالت نماز میں فعل کثیر سرزد ہوا۔ زمخشری نے اس اعتراض کی تردید یوں کی ہے کہ حضرت علی نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتارنے کا اشارہ کیا، سائل نے بڑھکر اس کو اتار لیا پس کوئی عمل مفسد نماز واقع نہیں ہوا یہ اعتراض کرنا بھی حضرات اہلسنت کو زیبا نہیں کیونکہ ان کے امام رازی نے اپنی تفسیر میں یہ بیان کیا ہے کہ حضرت۔ ﷺ بحالت نماز جوتا اتار لیتے تھے اور ابن عباس کے گیسو پکڑ کر داہنی بائیں جانب حرکت دیتے تھے اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ آنحضرت سودہ بنت زمعہ کو بحالت قیام نماز گود میں اٹھائے رہتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تھے تو زمین پر بٹھا دیتے تھے، جامع الاصول میں بجائے سودہ کے امامہ لکھا ہے۔

بہر حال اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ تمام مسلمانوں کے حاکم یا ولی تین ہیں اول اللہ دوسرے رسول تیسرے وہ مومن جو بحالت رکوع زکوۃ دیتے ہیں اس صورت میں کسی مسلمان کو زیبا نہیں کہ ان کی مخالفت کرے۔ ورنہ اس پر بغاوت کا الزام عاید ہوگا پس جن لوگوں نے علی علیہ السّلام کی مخالفت کی یا ان کی ولایت کو غصب کیا وہ یقیناً اس آیت کے خلاف عمل کرنے والے ہوئے بعد رسول حضرت علی کو تمام امت کی جان و مال پر حق تصرف حاصل تھا وہ جس سے جو کام چاہتے سو لیتے۔ یہی وہ خاص مرتبہ تو تھا جو دنیا پرست لوگوں کی نظر میں خار کی طرح کھٹکا اور انہوں نے چاہا کہ جس طرح ممکن ہو حضرت کے اس شرف ہو خاک میں ملا دیا جائے۔ چنانچہ رسول کی آنکھ بند ہوتے ہی سقیفہ

میں کارروائی شروع ہوگئی۔ یہی وہ چنگاری تھی جس نے ایک روز بھڑک کر کربلا میں حسین کا گھر پھونک دیا۔

افسوس صد افسوس نبی کا نواسہ دینی پیشوا کربلا میں اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ کہ نماز بھی آزادی سے نہیں پڑھ سکتا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ بعد شہادت حبیب ابن مظاہر امام علیہ السلام نے نماز ظہر بصورت نماز خوف ادا فرمائی دشمن چاروں طرف سے تیر برسا رہے تھے اور لشکر گاہ حسینی میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ حضرت وہاں کھڑے ہو کر باطمینان نماز ادا کر سکتے لکھا ہے کہ جب حضرت نے نماز ظہر ادا فرمانے کا قصد کیا تو سعید بن خالد و ہلال بن نافع اور حضرت عباس وغیرہ صف باندھ کر اس رُخ پر کھڑے ہو گئے۔ جدھر سے دشمن تیر دل کا سینہ پر برسا رہے تھے۔ چنانچہ جب کوئی تیر اُدھر سے آتا تھا تو یہ لوگ سینے تان تان کر بڑھتے تھے اور تیروں کو اپنے سینوں پر لینے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے جب تک حضرت نے نماز ظہر ادا فرمائی حضرت عباس کے سینہ مبارک پر سترہ تیر پیوست ہوئے اور سعید بن خالد کے سینہ پر تیرہ تیر لگے۔ منقول ہے کہ جناب سعید کے سینہ پر ایک تیر اس زور سے لگا کہ آپ زمین پر گر گئے جناب عباس نے چاہا کہ سعید کو وہاں سے ہٹا دیں مگر انہوں نے وہاں سے ہٹنا گوارا نہ کیا اور کہنے لگے اے ابوالفضل العباس آپ میرا خیال چھوڑیئے ایسا نہ ہو کہ آپ میری طرف متوجہ رہیں اور کوئی تیر امام مظلوم کے جسم پر آ لگے۔

صاحب بحر البکا تحریر فرماتے ہیں کہ جب امام حسین علیہ السّلام نماز ظہر ادا فرما چکے تو جناب جوؔن اذن کارزار حاصل کرنے کے لئے خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ جناب جون پہلے حضرت ابوذر کے غلام تھے ان کی وفات کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں رہنے لگے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا اے جوؔن میں تم کو کیونکر مرنے کی اجازت دوں در آنحالیکہ تم نے کوئی راحت میرے پاس نہیں پائی تم اس خیال سے ہمارے ساتھ آئے تھے کہ راحت ملے گی لیکن آہ یہاں تین دن سے تمہیں آب و دانہ بھی میسر نہیں جون یہ سنکر رونے لگے اور عرض کرنے لگے یا ابن رسول اللہ میں ایک حبشی غلام ہوں میرا رنگ بھی کالا ہے اور میرے بدن سے پسینہ کی بو بھی آتی ہے کیا حضور کو یہ گوارا نہیں کہ حمایت دین میں میرا خون بھی آپ کے ناصروں کے پاک خون میں مل جائے۔ مولا میں غلام ضرور ہوں۔ لیکن آپ کی محبت میرے رگ و ریشہ میں پیوست ہے۔ یہ سنکر امام علیہ السّلام رونے لگے اور جون کو اجازت کارزار مرحمت فرمائی۔ جناب جون بدن پر ہتیار سج کر بنہایت بشاش و بشاش رجز شیرانہ ہمہمہ کرتے ہوئے میدانِ کارزار میں آئے۔ لکھا ہے کہ جب امام زین العابدین علیہ السّلام کو یہ معلوم ہوا کہ اب جون لڑنے کے لئے نکلے ہیں تو آپ نے کنیز سے فرمایا در خیمہ کا پردہ باندھ دے تاکہ میں بھی جون کی جنگ کو دیکھوں۔ اس کے بعد آپ عصا کے سہارے در خیمہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ جب جناب جون حملہ کرتے تھے اور دشمن کٹ کٹ کر گرتے تھے تو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے چہرہ پر آثار بشاشت نمایاں ہوتے تھے۔

منقول ہے کہ جناب جون نے سات دشمنوں کو قتل کیا آخر زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے اور آواز دی یا ابن رسول اللہ ادرکنی اے فرزند رسول میری مدد کو آیئے۔ یہ صدا سنتے ہی امام میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ جب جون کے پاس پہنچے تو وہ حالت نزع میں تھے آپ نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ جون نے پھر اپنا سر زمین پر رکھ لیا۔ دوسری بار امام نے پھر ایسا ہی کیا۔ جون نے پھر اپنا سر ہٹا لیا۔ حضرت نے پوچھا اے جون کیا تم کو زانو پر سر رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ عرض کی مولا تکلیف تو نہیں ہوتی مگر یہ سوء ادبی ہے کہ غلام کا سر آقا کے زانو پر رکھا جائے مولا آپ ازراہ شفقت ایسا کر رہے ہیں مگر میرا ایمان اجازت نہیں دیتا کہ اس کو گوارا کروں۔ امام علیہ السّلام پر ان پُر خلوص کلمات کا بیحد اثر ہوا اور آپ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ دعا فرمائی خداوندا جوؔن کے بدن کو رائحہ جنت سے معطر کر دے۔ راوی کہتا ہے کہ امام علیہ السلام کی

یہ دعا قبول ہوئی۔ بعد شہادت امام مظلوم جب لاشہائے شہداء کو دیکھا گیا تو جون کی لاش سے مشک و عنبر کی خوشبو آ رہی تھی۔

جون کی شہادت کے بعد ہلال بن نافع بجلی خدمتِ امام میں حاضر ہوئے اور اذنِ کارزار طلب کیا۔ جناب ہلال کے حال میں لکھا ہے کہ نہایت ہی حسین اور خوش جمال آدمی تھے ان کے دوسرے عقد کو تھوڑا ہی سا زمانہ گزرا تھا زوجہ ساتھ تھیں حضرت نے فرمایا اے ہلال تمہاری زوجہ پر تمہاری جدائی بہت شاق ہوگی۔ میں تم کو اختیار دیتا ہوں چاہے قتال کرو چاہے اپنی بی بی کو خوش رکھو۔ جب اس مومنہ کو یہ حال معلوم ہوا کہ ہلال میری وجہ سے رہ کے جا رہے ہیں تو خدمتِ امام میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگی مولا میری وجہ سے نہ روکئے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا شوہر سعادتِ شہادت سے محروم رہے۔ میں بیوگی کے مصائب خوشی سے برداشت کروں گی۔ لیکن آپ پر دشمنوں کا نرغہ نہیں دیکھ سکتی۔

الغرض جناب ہلال اپنی زوجہ کو رخصت کر کے میدان میں تشریف لائے اور رجز پڑھ کر دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں تیرہ آدمیوں کو مار ڈالا۔ آخر دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر حملہ شروع کر دیا۔ اور دونوں ہاتھ قلم کر ڈالے اب ہلال بیچارے لڑائی سے مجبور ہو گئے ان بے دینوں نے گرفتار کر کے شمر کے سامنے پیش کیا۔ اس نے طعن آمیز طور پر کہا اے ہلال نصرتِ حسین کا مزہ چکھا۔ یہ سنتے ہی جناب ہلال کو غصہ آ گیا اور فرمانے لگے او بے حیا یہ گستاخانہ کلمہ تو نے زبان سے کہا تو یہ سمجھتا ہے کہ اپنی اس حالت کی بنا پر میں نصرتِ حسین پر پچھتا رہا ہوں گا۔ شقی آگاہ ہو کہ اگر نصرتِ امام میں میرا بدن قینچیوں سے کاٹا جائے۔ میری ایک ایک رگ میں سوئیاں چبھوئی جائیں تب بھی میں نصرتِ حسین کا آرزومند رہوں گا۔ ایک جان نہیں ہلال کی ہزار جانیں فرزندِ رسول پہ قربان۔ یہ سن کر شمر نے حکم دیا کہ ہلال کا سر کاٹ لو چنانچہ اس ظالم نے فوراً اپنی تیغ سے ان کا سر جدا کر دیا۔

صاحب بحر المصائب لکھتے ہیں جب ہلال کی شہادت کی خبر ان کی زوجہ نے سنی تو سجدۂ شکر ادا کیا۔ زنانِ اہلِ حرم نے جب اس زنِ مومنہ کو پرسا دیا تو اس نے کہا بی بیو میرا شوہر خوش نصیب تھا کہ نصرتِ حسین میں اپنی جان قربان کی اے بی بیو! بجائے ہلال کے پرسے کے بہتر یہ ہے کہ ہم سب بی بیاں اپنے اپنے سر کھول کر یہ دعا کریں کہ خداوندا فرزندِ رسول کے سر سے یہ بلا ٹال دے آہ ہمارے آقا پر کیا وقت آ گیا تھا کہ غیر عورتیں اس طرح بے چین تھیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

چودہویں مجلس

تفسیر آیۂ من یشاقق الرسول و شہادت جناب قاسم علیہ السلام

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (جو رسول کو جھگڑا کر کے اذیت پہنچائے گا۔ اس کے بعد کہ ہدایت اس پر ظاہر ہو چکی ہے اور مومنین کے راستہ کے خلاف راستہ چلے گا تو ہم بھی اس کے لئے وہی پسند کریں گے جس کو وہ دوست رکھے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ میں تم اس کی وصیت کرتا ہوں شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ)

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ سرکار الٰہی سے ایک مجرم پر دو جرم عاید کئے گئے ہیں ایک بہت سنگین ہے اور دوسرا بہت ہلکا مگر سزا دونوں کی ایک ہی ہے یعنی رسول کی مخالفت کرنے اور مومنین کے راستہ کے خلاف چلنے کی سزا جہنم ہے۔ اگر یہ دونوں جرم ہم وزن ہوتے تب تو مضائقہ نہ تھا لیکن ایسی صورت میں کہ ایک کا پلہ زمین پر ہے اور دوسرے کا آسمان پر کیا یہ امر رسول کی توہین کا باعث نہ ہوگا؟ رسول معصوم ہے اور مومنین غیر معصوم پھر ان دونوں کا مخالف یکساں کیسے ہو سکتا ہے۔ جب صرف رسول ہی کی مخالفت میں جہنم کی سزا ہے تو پھر اس دوسرے جرم کے اضافہ کی ضرورت کیا باقی رہتی ہے اور اگر رہتی ہے تو پھر اس کی سزا کیا جاتی گئی۔

اگر ایک بادشاہ کا یہ قانون نافذ ہو کہ جو کوئی میرے گورنر سے بغاوت کرے گا اور جو کوئی چند بھلے مانسوں کے طریقۂ کار کے خلاف عمل کرے گا تو اسے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دوں گا۔ کیا یہ قانون مبنی بر انصاف ہوگا اور کیا اس گورنر کی پوزیشن پر حرف نہ آئیگا اگر اس اضافہ کے بغیر وہ سزا دی جا سکتی تھی تو پھر اضافہ کی ضرورت کیا تھی تو پھر اس کے لحاظ سے سزا کیا ہوئی۔ گورنر بادشاہ کا نمائندہ ہے اور چند بھلے مانس بہ حیثیت رعایا اس کے تابع فرمان پھر دونوں کی پوزیشن میں مساوات کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گورنر کی مخالفت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس کے پرائیویٹ معاملات میں پبلک کو اس کی مخالفت ہو اس مخالفت سے گورنمنٹ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ دوسری مخالفت سیاسی امور میں ہے یعنی جس قانون کو وہ نافذ کرنا چاہتا ہے کچھ سرکش لوگ مانع آتے ہیں اس صورت میں گورنمنٹ اپنے اختیارات عمل میں لائے گی کیونکہ وہ اس کا ممتاز نمائندہ ہے اس کی مخالفت عین گورنمنٹ کی مخالفت ہے۔ اسی طرح چند بھلے آدمیوں کی مخالفت کی بھی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ کچھ شریر لوگ ان کے ذاتی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں مخالفت کا اظہار کرتے ہیں دوسرے یہ کہ ان کو قانون شکنی پر آمادہ کرتے ہیں اور جس طرح وہ وفاداری کے ساتھ سرکاری قانون کا اتباع کر رہے ہیں یہ ان کے خلاف عملدرآمد کرنے پر تلے ہوئے ہیں یہاں بھی پہلی صورت میں ازروئے قانون گورنر کو ان لوگوں کے مجرم بنانے کا حق نہیں لیکن دوسری صورت میں چونکہ قانون کا تعلق ہے لہٰذا وہ ان سے ضرور تعرض کرے گا۔ اب یہ معلوم ہوا کہ دونوں جرم بظاہر جدا جدا

ہیں لیکن حقیقتاً بھلے آدمیوں کی مخالفت اور گورنر کی مخالفت قانونِ سرکار کی اہانت کے پوائنٹ پر آکر دونوں ایک ہو گئی ہیں۔ پس اسی طرح آیت میں رسول کی مخالفت اور راہ مومنین کے خلاف راہ اختیار کرنے کا جرم درحقیقت ایک ہی ہے۔ اگر یہ راستہ مومنین نے خود بنایا ہوتا تو جرم بھی جدا جدا ہوتے اور سزائیں بھی الگ الگ۔ لیکن مومنین کا راستہ چونکہ وہی ہے جو رسول کا بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا ان کے راستہ کو چھوڑنا درحقیقت رسول کے راستہ کو چھوڑنا ہے۔ اس لئے دونوں کی سزا ایک ہی قرار دی گئی۔ اگر مومنین اپنا راستہ آپ بنا لیں تو تصویر کا رخ بدل جائے گا پھر ان کی مخالفت رسول کی مخالفت ہی نہ رہے گی اور قانونِ الٰہی کا یکساں تعلق دونوں سے باقی نہ رہے گا بلکہ پھر تو ان کی مخالفت جرم ہی نہ قرار پائے گی۔ جرم کیسا بلکہ ان کی مخالفت سرکار کی عین موافقت ہو گی۔ شاید یہیں سے تولّا اور تبرّا کا مفہوم پیدا ہو گیا ہو اور دینی راستے کے دو قدم بن گئے ہوں یعنی تولّا کس سے رسول کی راہ پر چلنے والوں سے اور تبرّا کن سے اپنی راہ خود بنا لینے والوں سے۔

پس یہ خیال بالکل غلط ٹھہرا کہ مومنین جو راستہ بنا لیں وہ صراطِ مستقیم ہے بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی بتائی ہوئی جو مومنین کی راہ ہے اس کے خلاف نہیں چلنا چاہیئے۔ ورنہ جہنم اس کی سزا ہے۔ مومنین کو خود اپنا راستہ تجویز کر لینے کا حق کیوں نہیں دیا؟ اس لئے کہ بھٹکنے کا ان سے امکان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ایک دین اسلام کے بہتر فرقے کیسے بن جاتے۔ کیا کسی اسکول کے ٹیچر یا کالج کے پروفیسر کو آج تک لڑکوں پر یہ بھروسہ ہوا ہے کہ وہ اپنا کورس آپ تجویز کر کے تیار کر لیں گے۔ کیا کسی درجہ میں تیس پینتیس لڑکوں کی جماعت مل کر ایک تجربہ کار معلّم کی قائم مقام بن جائے گی۔ کیا اس اتنی بڑی جماعت سے کتاب کے غلط مطلب سمجھنے اور امتحان کی تیاری غلط طور پر کرنے کا امکان باقی نہ رہیگا۔ کیا ان کا تجویز کردہ مانیٹر استاد کی جگہ ٹھیک ٹھیک صحیح راستہ پر ان کو چلائے گا؟

پبلک روڈ جس پر رات دن پبلک چلتی ہے کیا پبلک کی بنائی ہوئی ہوتی ہے؟ بناتی سرکار ہے مگر کہلاتی پبلک روڈ ہے۔ سرکار اپنی زمین میں راستہ بنانے کی اجازت ہی نہیں دیتی کیونکہ صرف راستہ بنا دینا ہی کافی نہیں بلکہ بنانے کے بعد مسافروں کی حفاظت کا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر دن دہاڑے کسی راستہ میں مسافر لٹ جاتے ہوں تو اس کا الزام پبلک پر عائد نہیں ہوتا بلکہ سرکار پر ہوتا ہے۔ اگر درندے حملہ کرتے ہوں یا مسافروں کو پانی کی تکلیف ہوتی ہو یا جا بجا ندی نالے اترنے پڑتے ہوں تو اس کا الزام بھی گورنمنٹ ہی پر عائد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تمام ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے سرکار خود ہی کوئی سڑک بناتی ہے۔ پبلک کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر ضرور بناتی ہے لیکن پبلک سے رائے لیکر نہیں بناتی اس کے بنواتے وقت جہاں بے موقع مکان دیکھتی ہے گروا دیتی ہے کہ مسافروں کو دقت نہ رہے۔ ڈاکوؤں کی گھات کے مقامات کو اپنی نظر میں رکھتی ہے وہاں پولیس کا پہرہ بٹھاتی ہے۔

پبلک کی ڈالی ہوئی پگڈنڈیاں جیسی ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی ہوتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان پر چل کر اکثر اوقات لوگ بھٹک جاتے ہیں ہر گاؤں کے لئے ایک جداگانہ پگڈنڈی بن جانے سے مسافر چکرا جاتا ہے کہ کدھر جاؤں۔ اکثر رات کو انہی پر لٹ جاتا ہے انہی پر ٹھوکریں کھاتا ہے یہ کھائی، خندق اونچا نیچا جنگل جھاڑی سب سے ہوتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔

ان کے ہونے سے سرکاری سڑک کی قدر ہو جاتی ہے۔ پگڈنڈی کا چلنے والا مسافر جب کشادہ پختہ سڑک پر آ جاتا ہے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سرکاری سڑکوں پر رات کو روشنی کا بھی انتظام ہوتا ہے اور میل کے پتھر بھی ہدایت کے لئے نصب ہوتے ہیں تاکہ ہر مسافر کو پتہ چلتا رہے کہ

اب ایک میل آیا اب دو میل آیا اور اب بارھویں میل پر آیا۔ کناروں پر درخت ہوتے ہیں تاکہ دھوپ کے مارے اور لو کے جھلسے مسافروں کو راحت ملے پس عقلمند آدمی ایسے راستہ پر چلے گا یا پبلک کی بنائی ہوئی پگڈنڈی پر۔

سرکاری سڑکوں پر خطرہ کے مقامات پر اشارات ہوتے ہیں کہ سنبھل کر چلو۔ چوراہوں پر پولیس مین ہوتا ہے جو ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتا ہے کہ اپنا راستہ معین کرو کہیں چوراہوں پر اسٹاپ لکھا رہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ تصادم کا خوف ہے۔ یہ باتیں اور ہدایتیں بھلا پبلک پگڈنڈیوں میں کہاں۔ اگر سرکاری سپاہی ہر وقت راستوں پر موجود نہ رہیں تو لوگ دن دہاڑے دیواریں پھاند پھاند کر لوگوں کے گھروں میں گھس آئیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ راستہ مومنین کا بنایا ہوا نہیں تو لامحالہ خدا کا بنایا ہوا ہوگا پس اب واضح ہونا چاہیئے کہ خدا کا بنایا ہوا راستہ کونسا ہے سنئے قرآن اس کو بتاتا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی پر چلو اور بہت سے راستے اختیار نہ کرو ورنہ خدا کے راستہ سے جدا ہو جاؤ گے) اس آیت میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ لفظ ھذا کا مشار الیہ کیا ہے کیونکہ جب تک کوئی راستہ پہلے سے معین نہ ہو اشارہ ہو کیونکر سکتا ہے دوسرے اس کے علاوہ کچھ اور راستے بھی ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے چونکہ جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے اس لئے تین تو ضروری ہی ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ ان راستوں پر چلنے والا خدائی راستہ سے بھٹک جائے گا۔ لہٰذا اس خاص راستہ کا اور اس پر چلنے والوں کا اور ان بہت سے راستوں کا جو باعث تفرقہ ہیں تعین ہو جانا چاہیئے تاکہ سبیل مومنین مخصوص ہو جائے۔ چوتھے خدا کا راستہ سیدھا ہے ٹیڑھا نہیں۔

جب کسی چوراہے پر پہنچکر انسان کو تردد ہو کہ میں کس طرف جاؤں تو کیا کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ کسی واقف کار سے پوچھنا چاہیئے اور اگر کوئی سرکاری آدمی مل جائے اور گورنمنٹ ہاؤس سے نکلتا ہوا دکھائی دے تو اس سے بہتر بتلانے والا کون ہو سکتا ہے اگر جا رہا ہو تو اُسے ٹھہراؤ۔ اگر بھلا آدمی ہے تو خود تمہیں متردد دیکھ کر ٹھہر لے گا۔ اور اشارہ سے بتا دے گا کہ اس طرف چلے جاؤ یا کسی واقف کار رہرو کی طرف اشارہ کر دے گا کہ اس کے پیچھے ہو لو یہ تمہیں منزل مقصود تک پہنچا دے گا اور کہیں بھٹکنے نہ دے گا۔ دیکھو جس کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے اُسے خوب پہچان لینا ایسا نہ ہو کہ دو قدم چل کر اس کا پیچھا چھوڑ دو اور کسی اور کے پیچھے چل پڑو۔

خدا نے کہا ہے هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ پس دیکھو کس کے اتباع کا تم کو حکم دیا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اس سے معلوم ہوا کہ رسول تمہارے لئے واجب الاطاعت مولا اور حاکم ہیں۔ موقع ہو تو رسول سے پوچھ لو کہ جب آپ نہ ہوں تو ہم کس کے پیچھے چلیں۔ معاملہ نازک ہے خوب تحقیق کر لینا صورت دیکھنا اور انگلی سے اشارہ کرا لینا اور نام بھی پوچھ لینا تاکہ کل کو کوئی جھٹلا نہ دے۔ سنو اس آواز کو مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِىٌّ مَوْلَاهُ۔

اب لسانِ قدرت سے صراطِ مستقیم کا تعین ہو جانا چاہیئے۔ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَىَّ مُسْتَقِيْمٌ (پالنے والے تو نے مجھے گمراہی میں تو چھوڑا ہی ہے میں دنیا کی چیزوں کو ان کی نظر میں زینت دے دوں گا اور سوائے تیرے مخلص بندوں کے سب ہی کو بہکاؤں گا خدا نے کہا یہی میری طرف آنے والا سیدھا راستہ ہے)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عباد مخلصین کا راستہ سیدھا ہے اور عباد مخلصین ان سے زیادہ کون ہوں گے جنہوں نے من المہد الی اللحد سوائے خدا کے کسی بت کے سامنے سر ہی نہیں جھکایا جنہوں نے طرفۃ العین کے لئے نہ توحید میں شک کیا نہ رسالت میں خود فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (بے شک اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا بھی پس اسی کی عبادت کرو یہی صراطِ مستقیم ہے) اب اس راستے کے چلنے والوں کا تعین بھی ہو جانا چاہیئے فرماتا ہے یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (اے سید و سردار قسم ہے قرآنِ حکیم کی بے شک تو مرسلین میں سے ہے اور راہِ راست پر ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول سیدھے راستہ پر چلنے والا تھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ رسول کے بعد اس راستہ پر چلنے والا کون تھا جو ایسا ہو کہ مسلمان کو اس کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ حدیث ثقلین سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول نے قرآن کے ساتھ اہلبیت کو کر کے یہ بتا دیا کہ اگر ان سے تمسک رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور سیدھا راستہ وہی ہے جس پر چلنے والا گمراہ نہ ہو۔ ع کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست۔ مشکوٰۃ میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا وَاِنْ تُؤَمِّرُوْا عَلِیًّا یَاْخُذْ بِکُمُ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (اگر تم علی کو امیر بناؤ گے تو وہ تم کو صراطِ مستقیم پر لے جائے گا) اور بعض کتب اہلسنت میں یہ حدیث بھی نقل ہے یَا عَلِیُّ اَنْتَ الطَّرِیْقُ الْوَاضِحُ وَصِرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ (اے علی تم طریقِ واضح اور صراطِ مستقیم ہو)

قرآنِ مجید کی ہدایت اس بارے میں یوں ہے قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (اللہ کی طرف سے نور آیا ہے اور کتاب مبین آئی ہے اللہ اس نور سے ہدایت کرتا ہے اس شخص کی جو اس کی مرضی والا سلامتی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہ ہادی ان لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے۔ اور ان کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے) اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں کتاب کے ساتھ ایک نور کا رہنا ضروری ہے۔ اسی کی روشنی میں لوگ صراطِ مستقیم پر چل سکتے ہیں پس رسول کے بعد اس سے زیادہ کون کتاب مبین کے ساتھ ہونے والا مل سکتا ہے جو شریک نور رسول ہے جیسا کہ حدیث انا و علی من نور واحد سے ظاہر ہے۔

اب یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کون سے راستے ہیں جن پر چلنے کو منع کیا گیا ہے اور جن پر چلنے سے خدائی راستہ چھوٹ جاتا ہے۔ قرآن نے صحیح اور غیر صحیح دونوں راستوں کو یوں بیان کیا ہے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ پہلا گروہ انعام پانے والوں کا ہے اور دوسرا مغضوب اور گمراہ لوگوں کا۔ اب ان دونوں کو پہچان بھی لیجئے۔ انعام پانے والوں کے چار گروہ ہیں: وَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ (وہ لوگ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین میں سے) صراطِ مستقیم یا سبیلِ خدا کے چلنے والے یہی تھوڑے سے لوگ ہیں جو ان چار گروہ کے ساتھ ہیں۔ باقی تمام جمِ غفیر مغضوبین و ضالین کے ساتھ ہے۔

جن راستوں کے ادھر ادھر گہرے گہرے غار اور کھڈ ہوتے ہیں یا لوٹ مار کا خوف ہوتا ہے۔ تو چلنے والوں کی حفاظت کے لئے دونوں طرف مضبوط جنگلے لگا دیئے جاتے ہیں یا کم از کم رسے باندھ دیئے جاتے ہیں کہ لوگ ان کو پکڑ کر چل سکیں۔ اور گرنے سے محفوظ رہیں۔ رسول نے بھی

اسلام کی صراطِ مستقیم کے دونوں طرف دو مضبوط جنگلے قائم کر دیئے اور مسلمانوں کو ان کے تمسک کا حکم دے دیا ان میں سے ایک کا نام ہے کتاب اور دوسرے کا نام ہے اہلبیت یہ انتظام اس لئے تھا کہ اگر علم کے پیر کو لغزش ہو تو قرآن سنبھال لے اور اگر عمل کے پیر کو لغزش ہو تو اہلبیت سنبھال لیں۔ یہ دونوں مضبوط اور شاندار دیواریں یہاں سے لے کر حوضِ کوثر تک چلی گئی ہیں۔ حدیثِ ثقلین قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے فباءو بغضب من اللہ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس یہ دو رسیاں ہیں جن کو حدیثِ ثقلین میں کتاب خدا اور عترت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس آیت کے مفہوم پر ہم کو پھر ایک نظر ڈالنی چاہیئے جو کوئی رسول کو تکلیف پہنچائے اس کے بعد کہ اس پر ہدایت بھی ظاہر ہو چکی ہے اور پھر مومنین کی راہ کے خلاف بھی راہ چلے تو اس کی سزا جہنم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول نے اپنی حجت تمام کر دی اور وہ راستہ بتا دیا جو مخصوص مومنین کا راستہ ہے۔ مخصوص میں نے اس لئے کہا کہ الف لام تخصیص کا مومنین پر داخل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہدایت کس وقت کی گئی کیا آیت میں کوئی لفظ ایسا ہے کہ اس طرف بھی اشارہ کردے۔

ذٰلکم وصّٰکم بہ لعلکم تتقون ہ (یہ تم کو میری وصیت ہے شاید تم پرہیزگار بن جاؤ) اصطلاح میں وصیت عموماً مرتے وقت کی ہدایت کو کہتے ہیں خدا کی ذات غیر فانی ہے پس قول تو خدا کا ہے لیکن اشارہ ہے اس سے قولِ رسول یعنی حدیثِ ثقلین کے مضمون کی طرف۔

رسول ایک راستہ کا ہادی اور راہنما بنکر آیا ہے انت منذر ولکل قوم ھاد (اے رسول تم لوگوں کو عذاب آخرت سے ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے) پس کیونکر ممکن ہے کہ رسول ایک قوم کا ہادی ہو اور وہ راستہ نہ تو مومنین کو معلوم ہو اور نہ وہ اس پر چلے ہوں ضرور یہ راستہ معین ہو چکا اور مومنین اس پر چل چکے پھر یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ مراد اس آیت میں وہ راستہ ہے جو مسلمانوں نے اجماع سے تجویز کیا۔ اس صورت میں تو فرضِ رسالت پورا نہیں ہوتا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مراد اس سے دین اسلام ہے اور وہ رسول بتا گئے پس وہی مومنین کا راستہ قرار پایا لیکن اگر دینِ اسلام مراد ہے تو پھر کوئی مسلمان قابلِ دوزخ قرار نہیں پا سکتا۔ اور آنحضرت کے اس قول کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے بہتر دوزخی ہوں گے اور ایک ناجی۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام میں تہتر راہیں ہیں اور ان میں سے ایک سیدھی ہے جس کی طرف ھذا صراطی مستقیماً سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ان بہت سی راہوں میں التباس دور کرنے کے لئے صرف ایک راہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ بھٹکنے کا خوف صرف ان راہوں میں ہوتا ہے جو کئی راہیں قریب قریب ملی ہوئی جا رہی ہوں ایسے راستوں میں اکثر اوقات مسافر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے الگ تھلگ راستوں میں بہت ہی کم لوگ دھوکا کھاتے ہیں

دوسرے آیت میں غیر سبیل المومنین کہا گیا ہے نہ غیر سبیل المسلمین۔ یعنی مراد اسلام کا عام راستہ نہیں جس میں ۷۳ پگڈنڈیاں پھٹی ہوئی ہیں بلکہ وہ خاص ایمان کی شاہراہ مراد ہے جو سیدھی اللہ تک پہنچانے والی ہے۔

اب یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کسی راستہ کا رہبر کیسا ہونا چاہیئے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو بہت سی بار اس راستہ پر آیا گیا ہو۔ بچپن سے یہ راستہ جس کے پیروں کو لگا ہوا ہو۔ راستہ کے ایک ایک نشیب و فراز سے واقف ہو اور یہ راستہ اس کے پیروں کو اتنا لگ گیا ہو کہ اپنے گھر سے اٹھ کر منزل مقصود تک پلک جھپکتے پہنچ جائے اور پھر واپس آ جائے اور اگر ایسا مل جائے کہ ایک سوار

منزل بھی اس کے ہاتھ میں ہو تو کیا کہنا۔ جب یہ شفیق رہنما دنیا سے اُٹھے تو اس سے پوچھو کہ اب کس کے پیچھے چلیں وہ یقیناً کسی ایسے کے ہاتھ میں دے گا جو اسی گھر سے آرہا ہو جہاں آپ کو جانا مقصود ہے۔ بس اس سے بہتر رہنمائی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ایک سوال اس مقام پر یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ بہت سی راہیں پیدا کیونکر ہو گئیں۔ رسول اللہ تو صرف ایک ہی راستہ چھوڑ گئے تھے۔ اس کا جواب ایک مثال کے ذریعے سے دیا جاتا ہے۔ لاہور سے کلکتہ تک ایک سیدھی سڑک چلی جا رہی ہے جس کے دائیں بائیں بے شمار پگڈنڈیاں پڑی ہوئی ہیں۔ آخر یہ کیسے بنیں؟ اگر سب کے سب لاہور سے سیدھے کلکتے ہی جانے والے ہوتے تو ہرگز یہ راستے پیدا نہ ہوتے اور پکی سڑکیں پکی سڑکوں کے ساتھ نہ چلتیں۔ لیکن لاہور سے جو لوگ کلکتہ کا قصد کر کے اُٹھے تھے وہ ایک ایسے اولوالعزم رہنما کے پیچھے چل رہے تھے جو برابر ان کی ہمتیں بڑھاتا اور منزلیں مارتا چلا ہی جاتا تھا اور راستہ کے اِدھر اُدھر جو شاداب درخت اور میوہ دار باغات لگے ہوئے تھے وہ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کا موقع نہ دیتا تھا اور تفریح میں وقت گزارنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ کہتا تھا فاقے کرتے اور مصیبتیں بھرتے جس طرح بن پڑے منزل پر پہنچ جاؤ۔ وہاں دائمی راحت نصیب ہوگی۔ اگر راہ کی دلبستگیوں میں الجھ گئے تو پھر یہیں کے ہو جاؤ گے اور منزل پہنچنے کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ سب طوعاً و کرہاً لنگڑاتے لڑکھڑاتے اس کے پیچھے چلے جاتے تھے مگر دل خوش نہ تھا۔ آپس میں کہتے تھے ہم تو اسی لئے ساتھ ہوئے تھے کہ خوب پھل پھلاری کھائیں گے۔ باغوں میں گھومیں گے آس پاس کے قریوں کو لوٹیں گے لیکن افسوس کہ دل کی ایک مراد بھی بر نہ آئی۔ اتفاقاً راستہ ہی میں اس رہبر کے انتقال کا وقت آگیا۔ اس نے ایک اور رہنما کو جو بالکل اسی جیسا تھا اس گروہ کے ساتھ کر دیا۔ انہوں نے شور و غل مچایا کہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں۔ ہمیں تمہارا دیا ہدایت نامہ کافی ہے جو ہمیں حفظ یاد ہے۔ بہت تھوڑے آدمی تو اس نئے رہبر کے ساتھ لگے بقیہ باقی کترا کر اِدھر اُدھر ہو گئے اور جس کا منہ جدھر کو اٹھ گیا چل دیا۔ انہیں کے قدموں کی برکت سے اِدھر اُدھر بٹیاں اور پگڈنڈیاں بنتی چلی گئیں اور ان میں سے بعض بعض کے رہنما بن گئے۔

بعینہٖ یہی حالت اسلام کی سمجھو۔ رسول خدا کے انتقال کے بعد لوگوں نے اپنی کج رائی سے مختلف راہیں پیدا کریں۔ کچھ عرصہ تک تو رسول کا بتایا ہوا راستہ لوگوں کی نظر کے سامنے رہا۔ لیکن پچاس سال کے اندر ہی اندر اتنا تغیر پیدا ہو گیا کہ لوگوں کو صحیح اور غلط راستہ میں امتیاز مشکل ہو گیا۔ جب اسلام کی حالت ایسی ہو گئی تو حسین علیہ السلام کے دل میں ناقابلِ برداشت تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ پورے جوش کے ساتھ اُٹھے اور اپنی کل بضاعت لا کر کربلا کے میدان میں ڈال دی۔ انہوں نے روزِ عاشورا اپنے اور اپنے احباب کے خون سے حق و باطل کے راستوں کے درمیان ایک ایسا نمایاں خط کھینچ دیا کہ قیامت تک دنیا کی کوئی طاقت اس کو مٹا نہیں سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ دینِ خدا کو یزیدی بدعات سے بچانے کے لئے جس حوصلہ مندی اور غیر معمولی شجاعت سے کربلا والوں نے کام لیا اور اپنے کمالِ ایمان اور توکل علی اللہ کا بہترین مظاہرہ کرایا دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال ڈھونڈے نہیں ملتی۔ زن و مرد، جوان و پیر، بچہ اور بوڑھا سب کے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ موت کا وہ تلخ جام جس کے تصور سے لوگوں کے بدن میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔ وہ نصرتِ دین کے جوش میں اس ذوق و شوق سے پی رہے تھے گویا دودھ اور شہد کے پیالے ان کے منہ سے لگا دیئے گئے ہیں۔

منقول ہے کہ جب امامِ مظلوم کے تمام انصار میدانِ جنگ میں کام آچکے اور عزیز بھی درجہ بدرجہ شہادت پانے لگے تو جناب قاسم حاضر

خدمت ہوئے اور اذنِ کارزار طلب کیا۔ امام علیہ السّلام یتیم بھتیجے کو چھاتی سے لگا کر رونے لگے اور فرمایا اے فرزند میں تجھے کیونکر اجازت دوں تو میرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے تجھے دیکھ کر مجھے اپنے بھائی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اے فرزند تو ابھی کم سن ہے میرا دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ تجھ جیسے نازوں کے پالے خوشرو فرزند کو ان خونخوار درندوں میں تیغ و تبر کھانے کے لئے بھیج دوں۔ بیٹا! تیری جدائی سے تیری دکھیا ماں کا کلیجہ شق ہو جائے گا آہ ان کے دل میں ابھی بہت سے ارمان ہیں۔ ابھی تو ان بیچاری نے تیری جوانی کی بہار بھی نہیں دیکھی۔ یہ سنکر جناب قاسم آبدیدہ ہوئے اور خدمت امام میں عرض کی چچا جان میں آپ کو اپنے پدر بزرگوار کی روح کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھ کو شرفِ شہادت سے محروم نہ رکھئے یہ ضرور ہے کہ میرا سن ابھی کم ہے لیکن مجھ کو بھی بحمد اللہ اس بات کا فخر حاصل ہے کہ علی جیسے شجاع کا پوتا اور عباس جیسے غازی کا بھتیجا ہوں میدان میں جا کر ہاشمی شجاعت کے وہ جوہر دکھاؤں گا کہ یہ نابکار سکتہ میں رہ جائیں گے۔ ابھی چچا بھتیجے میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ در خیمہ سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ امام مظلوم اس طرف متوجہ ہوئے۔ پوچھا یہ کون روتا ہے۔ کسی نے جواب دیا حضور کی بھابی جناب اُمّ فروہ ہیں۔ حضرت یہ سنتے ہی فوراً خیمہ میں تشریف لائے اور پوچھا اے بھابی جان آپ کے اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رونے کا کیا سبب ہے۔ کہنے لگیں کیوں فرزندِ رسول کیا بیوہ کی اولاد اس قابل نہیں کہ فدیۂ دینِ خدا بن سکے۔ یا ابن رسول اللہ اگر آپ نے قاسم کو اجازتِ جنگ عطا نہ فرمائی تو روزِ حشر مجھے آپ کے پدر بزرگوار، مادر عالی وقار اور برادر والا تبار سے سخت ندامت ہوگی۔ یا ابن رسول اللہ خدا کے لئے قاسم کو نہ روکئے۔ ورنہ عرصۂ حیات میرے اوپر تنگ ہو جائے گا اور زنانِ اہلِحرم وغیرہ سے مجھے سخت ندامت ہوگی۔

دکھیا بھاوج کی یہ تقریر سنکر مظلوم امام کے دل پر غم کا آرہ چل گیا۔ دیر تک سر جھکائے زار زار روتے رہے۔ اس کے بعد خیمہ سے برآمد ہوئے اور صبر کی سل کلیجہ پر دہر کر جناب قاسم کو اجازتِ کارزار مرحمت فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے تبرکاتِ امام حسن علیہ السّلام خیمہ سے طلب فرما کر جناب قاسم کو خود اپنے ہاتھ سے آراستہ کیا۔ عمامہ امام حسن مجتبےٰ سر پر باندھا۔ زرہ بدن پر پہنائی پٹکے سے کمر کسی۔ چھوٹی سی تلوار حمائل کی جب اچھی طرح سے آراستہ کر لیا تو بھتیجے کی صورت دیکھ کر زار زار رونے لگے امام حسن علیہ السّلام کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ پھر چھاتی سے لگا کر پیار کیا اور گھوڑا طلب فرما کر خود ہی جناب قاسم کو اس پر سوار کیا اور نہایت غمناک لہجہ میں فرمایا اچھا بیٹا سدھارو خدا حافظ۔

منقول ہے کہ جنابِ قاسم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک مرتبہ امامِ مظلوم پھر بیتاب ہو کر دوڑے اور پکار پکار کر کہنے لگے اے فرزند اے جانِ عم ذرا دیر کے لئے ٹھہر جا کہ حسین ایک بار تجھے اور چھاتی سے لگالے۔ جنابِ قاسم حضرت کی یہ آواز سنکر رک گئے اور گھوڑے سے اتر کر عرض کی۔ چچا جان میں آپ کو رخصت کر آیا تھا۔ فرمایا بیٹا کیا کروں۔ میرا دل کسی طرح نہیں مانتا۔ آؤ ایک بار اور میری چھاتی سے لگو۔ جب دوبارہ جناب قاسم رخصت ہونے لگے تو حضرت نے پوچھا بیٹا قاسم موت کو کیسا پاتے ہو؟ عرض کی یا عم احلیٰ من العسل یعنی اے چچا شہد سے زیادہ شیریں پاتا ہوں۔ یہ جواب سنکر حضرت نے فرمایا بیٹا شاباش خدا تجھ کو جزائے خیر دے اس کے بعد جناب قاسم میدان میں آئے اور وہ دلیرانہ جنگ کی کہ دشمن کے ہوش اڑ گئے۔ کوفہ و شام کے کئی نامور نبرد آزماؤں کو آپ نے تہ تیغ کیا۔ جناب عباس اور حضرت علی اکبر سر دار پر نعرہ تحسین و آفرین بلند کر رہے تھے اور امام مظلوم تبسم فرماتے تھے۔ کتب مقاتل میں کشتگان جنابِ قاسم کی تعداد بیالیس تک لکھی ہے۔

پسر سعد نے جب یہ دیکھا کہ کوئی جنگجو جناب قاسم پر غالب نہیں آتا اور ازرق جیسے نامی پہلوان تک ان کی بے پناہ تلوار سے نہ بچ سکے

تو اس شقی نے حکم دیا کہ اس جوان کو چاروں طرف سے گھیر کر تلواروں میں رکھ لو۔ یہ سنتے ہی ہزاروں ناابکار لعین ایک اس بھوکے پیاسے شہزادے پر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے تیر و شمشیر اور خنجر و سناں کے وار کرنے شروع کر دیے۔ یہاں تک جناب قاسم زخموں سے چور چور ہو گئے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ فَقَطَّعُوْہُ اِرْبًا اِرْبًا (ایک ایک عضو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا) جب گھوڑے پر رک نہ سکے تو آواز دی یا عماہ ادرکنی اے چچا جان آ جیے کریں نے اپنی جان قربان کی۔ یہ صدا سنتے ہی امام مظلوم کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ حضرت عباس اور حضرت علی اکبر کو ساتھ لے کر آپ مقتل کی جانب روانہ ہوئے آہ آہ حضرت کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ جفا کار لاشۂ جناب قاسم کو پامال کر چکے تھے۔ جب حضرت وہاں پہنچے تو جناب قاسم کی لاش کو اس حال میں پایا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ایک ایک عضو چور چور ہو گیا تھا۔ آہ یہ حال دیکھ کر امام مظلوم کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ بھتیجا بھی وہ بھتیجا جو شہید ظلم و جفا بھائی کی یادگار تھا اس طرح کچلا ہوا اور خاک و خون میں بھرا ہوا بے دم خاک پر پڑا تھا بے اختیار حضرت نے اس تن پاش پاش کو چھاتی سے لگا لیا اور رو رو کر فرمانے لگے بیٹا قاسم کاش اس سے پہلے تمہارے بیکس و ستم رسیدہ چچا کو موت آ جاتی اور تم کو اس خراب حال میں نہ دیکھتا۔ بیٹا اس عالم غربت و یاس میں تم کو بھی مظلوم چچا کو نرغۂ اعدا میں چھوڑ کر چل بسے۔ اے یادگار برادر اے میری گود کے پالے مظلوم حسین کس منہ سے دکھیا ماں کے پاس جائے اور کس زبان سے تمہارے مرنے کی خبر اس غم کی ماری کو سنائے۔

آہ آہ مومنین جب حضرت نے چاہا کہ جناب قاسم کی لاش کو خیمہ میں لے جائیں۔ تو وہ جسد اطہر کسی طرح اس قابل نہ تھا کہ خاک سے اٹھ سکے۔ ایک ایک عضو جدا ہو رہا تھا۔ آخر جس طرح بنا امام مظلوم و جناب عباس اور حضرت علی اکبر اس پاش پاش جسم کو خاک سے اٹھایا اور بحال تباہ خیمہ گاہ تک پہنچے۔

آہ آہ! کس زبان سے بیان کروں کہ جب جناب قاسم کی لاش خیمہ میں آئی تو سیدانیوں کا غم سے کیا حال ہوا۔ خدا کسی ماں کو دنیا میں جوان بیٹے کی لاش اس حالت میں نہ دکھائے۔ جس حالت میں مادر جناب قاسم نے فرزند کی لاش کو دیکھا۔ اس وقت خیمۂ جناب قاسم میں ایک عجب کہرام برپا تھا۔ ہر طرف سے واقاسماہ واقاسماہ کی صدائیں آ رہی تھیں۔ اہل حرم کے نوحہ و شیون اور جناب ام فروہ کے دردناک بین سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔ فلک ستائی ماں کوکھ جلی ماں بار بار اس تن پاش پاش کو چھاتی سے لگاتی اور اپنے شہید پسر کا شانہ ہلا کر کہتی بیٹا قاسم کیسی گہری نیند سو رہے ہو۔ کہ دکھیا ماں بار بار پکارتی ہے اور نہیں چونکتے۔ آہ بیٹا میں کربلا میں لٹ گئی میرے حسرت و ارمان سب خاک میں مل گئے۔ اے میرے چاند تجھے کس کی نظر کھا گئی۔ آہ ابھی تو میرا لال پوری طرح پروان بھی نہ چڑھا تھا کہ موت نے تاک لیا۔ کاش یہ دکھیا ماں اندھی ہو جاتی اور تجھ کو یوں پامال سم اسپاں نہ دیکھتی۔ ہائے کیسے سنگدل تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے تجھ جیسے نازنین کے بدن پر گھوڑے دوڑائے۔ ہے ہے مجھے یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے کہ میرا پھولا پھلا باغ کربلا کے میدان میں یوں ظلم و ستم کی تلواروں سے کاٹا جائے گا۔

الغرض امام حسین علیہ السلام نے سب کو امر بصبر فرمایا اور دل شکستہ بھاوج کو راضی برضا رہنے کی تعلیم دے کر لاشہ جناب قاسم سے جدا کیا

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

پندرہویں مجلس

تفسیر آیہ کونوا مع الصادقین و شہادت عون و محمد پسران حضرت زینب علیہا السلام

قَالَ اللّٰہُ تبارک و تعالیٰ یَااَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُونُوا مَعَ الصَّادِقِیْنَ ﴿اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ﴾ دنیا میں ہر شے اپنے ایک مخصوص شرف سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ خصوصیت جاتی رہے تو اس کے فضل و شرف میں بھی نقصان واقع ہو جاتا ہے۔ موتی اگر اپنی آب کھو بیٹھے تو دو کوڑی کا ہے۔ جواہرات سے چمک جاتی رہے تو ان میں اور آبگینوں میں کوئی فرق نہیں۔ پھولوں سے اگر مہک اڑ جائے تو پیروں سے مَل دینے کے لائق ہیں۔ تلوار میں اگر جوہر نہیں تو توڑ کر پھینک دینے کے قابل ہے۔ اسی طرح انسان جو سرسبد گلشن عالم ہے اگر صداقت سے خالی ہو تو اس کی تمام فضیلتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ صداقت اخلاقِ انسانی کی روح ہے۔ جان نکلنے کے بعد جس طرح عزیز سے عزیز وجود خاک میں ملا دینے کے قابل بن جاتا ہے اسی طرح صداقت نکلنے کے بعد تمام اخلاق ایک جسم بے جان بن جاتے ہیں اور انسان کی وقعت نظر سے گر جاتی ہے۔

کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو اگر سچا نہیں تو اس کا وقار قائم نہیں رہ سکتا۔ کتنا ہی حاذق طبیب ہو اگر اس میں جوہر صداقت مفقود ہے تو اس کے سارے کمالات خاک میں مل جائیں گے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس لئے کہ فطرت انسانی ازل سے صداقت پسند ہے۔ اس لئے کہ ضمیر انسانی کے خمیر میں عنصر صداقت کا نمایاں حصہ ہے۔ انسان اپنی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں سے محروم ہو سکتا ہے۔ لیکن دل کی سچی آواز مرتے دم تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی زبان چاہے دن میں دو ہزار جھوٹ بولے۔ مگر ضمیر کی آواز کبھی ایک بار بھی اس کی ہمنوا نہیں بنتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ اس جسم میں جو عالم اصغر ہے دل خدا کا رسول اور پیغام بر ہے۔ اگر یہ جھوٹ بولے تو غضب آ جائے۔ ؎ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ پھر اس کی پیغام رسانی پر اعضاء و جوارح کو اطمینان کیونکر ہو سکتا ہے۔ دل اسرار الٰہیہ کا گھر ہے اور زبان اس کا دروازہ جو راز وہاں سے نکلتا ہے اسی زبان کے ذریعہ سے نکلتا ہے۔ لیکن اگر زبان لسانِ صدق نہیں تو دل اپنی اور اپنی بات کی وقعت بھی کھو بیٹھتا ہے کسی شہر کا دروازہ اگر ٹوٹا پھوٹا اور قسم قسم کی گندگی سے پُر ہو تو دیکھنے والا اس شہر کی حالت کا قیاس دروازہ ہی سے کرلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حق شناس دل اپنی زبان صداقت ترجمان رکھتے ہیں۔ بلکہ خدا سے یہ دعا مانگا کرتے ہیں وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ؀ اگر یہ آواز سچے دل سے نکلتی ہے تو باب اجابت سے ٹکرا کر پردہ غیب سے اس آواز کو کھینچ لاتی ہے وَجَعَلْنَا لَھُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا اسرار الٰہیہ بیان کرنے میں دل کی قائم مقام صحیح معنی میں زبان ہے بشرطیکہ وہ لسانِ صدق ہو۔ لیکن کبھی کبھی دیگر اعضاء بھی اس خدمت کو انجام دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کا منصب نہیں ہوتا۔ مثلاً ہاتھ انگلی سے چشم ابرو سے اشارہ کر کے ترجمانی کر دیتے ہیں لیکن اشارہ فہم حضرات جانتے ہیں کہ یہ اشارے کافی نہیں ہوتے۔ پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اسی لئے کبھی غلط

مفہوم بھی دوسروں کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور وہ کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے۔ ہاں کچھ کہہ کر اشارہ کیا جائے تو بات میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے مثلاً مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ۔

جب اعضا کے اشاروں سے بات سمجھ میں نہ آئے تو پھر زبان کو اپنا فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ اعضا کے اشاروں کے وقت اگرچہ زبان خاموشی سے خانۂ دہن میں دروازہ بند کئے گوشہ نشین رہتی ہے۔ مگر ناقص پیغام رسانی پر دل ہی دل میں بہت کڑھتی ہے اور اپنا منصب دوسرے کے قبضہ میں دیکھ کر بول اٹھنے کے لئے پہلو بدلنے لگتی ہے مگر دل جو خدا کا پیغام رساں ہے اس کو یہ کہہ کر دبا دیتا ہے کہ خاموشی ہی بہتر ہے۔ ورنہ ان کی پول کھولنے میں در پردہ ہماری توہین لازم آئے گی۔ یہ سمجھنے والے کم ہیں کہ ہم نے ان کو اپنا صحیح نمائندہ نہیں بنایا ان بیچاروں میں اتنی اہلیت و قابلیت کہاں کہ ہماری ہر بات کو بے کم و کاست صحیح صحیح الفاظ میں بیان کر دیں۔ انہیں بولنا نہیں آتا۔ بلکہ کچھ حرکتیں کرنا آتی ہیں۔ ان سے بھی ہم کام چلاتے ہیں مگر پیغام رسانی کا نہیں۔ ہمارے علم کا دروازہ زبان ہی ہے۔ غرضیکہ دل کا صحیح مفہوم اگر سمجھا ہو تو اس کے لئے مخصوص آلہ زبان ہے ممکن ہے کہ یہ خدمت تھوڑی بہت کسی اور عضو سے بھی انجام پا جائے مگر ناقص صورت میں اگر ایسا نہ ہو تو انسان و حیوان میں فرق نہ رہے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دل سے ہر آواز سچی ہی نکلتی ہے۔ تو زبان کیوں جھوٹی ترجمانی کرنے لگتی ہے؟ اس کا جواب ایک مثال سے واضح طریق پر مل سکتا ہے۔ زبان آلۂ اظہار صوت ہے جس کا اصلی کنکشن دل سے ہے اگر براہ راست وہاں سے کوئی آواز آتی ہے تو ضرور سچی ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ کنکشن کسی اور جذبہ سے ہو جاتا ہے تو آواز بدل جاتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ریلوے اسٹیشنوں پر جا بجا ٹیلیگراف سسٹم ہے اور منشا یہ ہے کہ ریلوے کے متعلق ہر قسم کی خبریں اس کے ذریعے سے بھیجی جائیں۔ پس جو خبر کسی ریلوے اسٹیشن سے بھیجی جاتی ہے وہ صحیح ہوتی ہے۔ لیکن کوئی شریر آدمی دو اسٹیشنوں کے بیچ میں ایک نیا تار لگا کر کنکشن پیدا کرے اور غلط خبریں بھیجنی شروع کر دے تو یقیناً یہ خبریں بھی پہنچنے لگیں گی۔ خبر رسانی کا آلہ خبر پہنچانے کا ذمہ دار ہے چونکہ اس قسم کا خوف ہے لہٰذا گورنمنٹ نے پورا انتظام اس بات کا کر رکھا ہے کہ سرکاری تار کا کنکشن سوائے سرکاری آفسوں کے اور کسی جگہ نہ ہونے پائے۔ زبان دل کی ترجمان ہے۔ جب اس کا تعلق دل سے ہے تو ہمیشہ سچ بولتی ہے لیکن جب شیطانی قوتیں اس کنکشن کو دل سے قطع کر کے اپنی طرف لے آتی ہیں تو پھر جھوٹی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ پس ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے جذبات پر پوری سیاست رکھتا ہو کہ ان کو کبھی اس قسم کے عمل کی جرأت ہی نہ ہو۔ اس صورت میں کبھی لہجہ صداقت میں فرق نہ آئے گا۔ اس کا دوسرا نام عصمت ہے۔ معصوم وہی ہے جو اپنی قوتوں کی پوری طرح روک تھام کرتا رہتا ہے۔ اور ایسا کوئی کام کرتا ہی نہیں جو امن انسانیت پر بد نما دھبہ ہو۔ اس کی زبان اس کے دل کی سچی ترجمان ہوتی ہے۔ سچے لوگ اپنی زبان کا تعلق کبھی جذبات سے ہونے ہی نہیں دیتے بلکہ وہ ایسی زبان ہی نہیں رکھتے جو جذبات کی آواز کو پہچانتی ہو۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝

رسول کو ضرورت ہے کہ جس طرح خود معصوم ہے۔ اسی طرح اس کی زبان یا قائم مقام بھی معصوم ہو۔ حصول علم کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ زبان سے دل کی طرف جائے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے کہ ہم علوم کو زبان سے دل کی طرف پہنچاتے ہیں۔ یعنی پڑھ کر دل پر نقش کرتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دل سے زبان پر آئے۔ یعنی دل پر نقش ہو اور زبان سے اسی کا اظہار ہو پہلے طریقے کے معلم بندے اور دوسرے کا خدا۔ یہ علم ناقص وہ کامل

یہ اکتسابی وہ وہبی۔ یہ بعد پیدائش وہ قبل پیدائش۔ یہ جھوٹا وہ سچا یہ ہو اسے لیا ہوا وہ خدا سے لیا ہوا۔ اس کا مصدر فنا اور اس کا مصدر بقا اس سے عوام بہرہ یاب اس سے انبیا فیضیاب پہلے طریقہ میں اس بات کی ضرورت ہے کہ جب تک زبان میں قوت گویائی اچھی طرح نہ آجائے تعلیم کا آغاز نہ کیا جائے لیکن دوسرے طریقہ میں چونکہ اس کی ضرورت نہیں لہذا اس کا تعلق خلقت انسانی کے ساتھ ساتھ ہے الرحمٰن عَلَّمَ القرآن خلق الانسان عَلَّمَہ البیان ہ یعنی تعلیم قرآن پہلے ہے اور خلقت انسان بعد میں اور بیان اس کے بعد پہلے طریقہ میں حصول علم کے لئے زبان کی ضرورت ہے۔ دوسرے طریقہ میں حصول علم کے لئے نہیں بلکہ بیان کے لئے زبان کا انتظار ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ جب تک وحی کو لسان صدق نہیں ملی۔ چالیس برس دل کی گہرائیوں میں جلوہ ریزی کرتی رہی۔ وحی کا مفہوم لسان صدق سے بہتر کون سمجھا سکتا ہے اور اس سے بہتر اس کی تصدیق کون کر سکتا ہے۔ رسول کا بیان ہو اور تصدیق کے لئے علی کی زبان اسی لئے رسول نے فرمایا یا علی انت تقاتل علی تاویلہ کما قاتلت علی تنزیلہ۔ بظاہر علی کا مرتبہ رسول سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر نہیں زبان کا مرتبہ دل سے بڑھ نہیں سکتا دل استاد ہے زبان شاگرد زبان کو جو ملتا ہے وہ دل سے۔ دل منزل وحی ہے اور زبان مطلع وحی دل اسرار الٰہی کا رازدار ہے اور زبان اس کی کلید بردار۔

انسان کامل کی تعریف میں افلاطون نے کہا ہے من صَدَقَ لسانہٗ وصدق جنانہٗ وصدق دماغہٗ وصدق روحہٗ اما صدق اللسان تطہیرہٗ من الکذب وتطہیر الجنان تطہیرہٗ من الریب وصدق الدماغ تطہیرہٗ من الوھم وصدق الروح تطہیرہٗ من الشرک یعنی جس کی زبان سچی ہو دل سچا ہو دماغ سچا ہو روح سچی ہو۔ زبان کی سچائی یہ ہے کہ جھوٹ سے پاک ہو دل کی سچائی یہ ہے کہ شک سے پاک ہو دماغ کی سچائی یہ ہے کہ وہم سے پاک ہو روح کی سچائی یہ ہے کہ شرک سے پاک ہو۔ یعنی جب زبان۔ دل۔ دماغ اور روح چاروں آلائشوں سے پاک ہوں تو انسان کامل بنتا ہے جس قدر یہ کمال کم ہوتا جائے گا اسی قدر انسانیت لپست ہوتی جائے گی۔ اس قول سے صداقت کا ہلکا سا خاکہ ہمارے ذہن میں آسکتا ہے۔

اب ہم کو آیت کی طرف رجوع کرنی چاہیئے۔ ایمان والوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم سچوں کے ساتھ ہو جاؤ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا صادقین سے مراد وہ سچے ہیں جن کو ہم سچا کہتے ہیں یا وہ سچے جن کو خدا سچا کہتا ہے۔ اگر ہمارے کہے ہوئے سچے مراد ہوں تو پھر کیا ہے کوئی دقت ہی نہیں دنیا میں سینکڑوں صادق علی صادق حسین اور صادقہ خاتون نام کے موجود ہیں بلکہ صادق کیسے اگر وہ کہے تو صدیق خاں صدیق احمد اور صدیقہ خاتون کے ساتھ ہو لیں۔ اگر ان نام والوں سے نسبتی رشتہ نہ ہو تو سببی رشتہ پیدا کر کے معیت حاصل کر لیں لیکن جناب وہ ہمارے کہے ہوئے کو مانتے کیوں لگا ہماری باتیں سنکر کہہ دیتا ہے یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم اگر ہم مل جل کر کوئی کام کرتے ہیں تو رحمۃ ربک خیر مما یجمعون (اللہ کی رحمت تمہارے اجماع سے بہتر ہے) کہہ کر ہماری کرائی محنت پر پانی پھیر دیتا ہے وہ ہمارے کہے ہوئے یا بنائے ہوئے صادقوں یا صدیقوں کی کیونکر عزت کرنے لگا کہہ دے گا تم احمق ہو نام رکھنے کی تو تمیز نہیں دنیا بھر کے جھوٹوں کا نام تم صادق و صدیق جو چاہتے ہو رکھ دیتے ہو برعکس نہند نام زنگی کافور۔

صداقت اصلی جس کو کہتے ہیں وہ ضمیر کی سچی آواز ہے بھلا تم اس کو کیا سمجھو اگر ہماری طرح تمہاری رسائی بھی دل کی گہرائیوں تک ہوتی

تو ضرور سچے اور جھوٹے کو صحیح معنی میں جان سکتے تم ہر بات کے متعلق کیسے جان سکتے ہو کہ دل کی طرف سے آرہی ہے یا کسی اور گوشہ سے۔ تم تو بے سوچے سمجھے جو نام چاہتے ہو رکھ دیتے ہو۔ تمہارے اوپر ہمیں بھروسہ نہیں اور تمہارے کہے ہوئے صادقوں کو ہم سچا نہیں جانتے۔ تم ایسے دریادل ہو کہ ایسے لوگوں کو صادق نہیں بلکہ صدیق کہہ دیتے ہو جو رسول ہماری ذات وحدہ لاشریک لہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ تمہارے نام نہاد تم ہی کو مبارک ہوں۔

کونوا مع الصادقین سے ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اگر ہم فرداً فرداً سچے نہیں تو نہ ہوں بہت سے مل کر تو سچے ہو سکتے ہیں پھر تو جھوٹ کا امکان نہ رہے گا۔ کیونکہ ایک گروہ کا گروہ جب ہم زبان ہو کر کوئی بات کہے یا کوئی کام کرے تو پھر گمراہی کا خوف باقی ہی نہ رہے گا لیکن یہ تجویز سب سے زیادہ احمقانہ ہے کیونکہ ناقص کا مجموعہ ہمیشہ ناقص ہی رہے گا سو اندھے مل کر سیانے کیسے اور سو جاہل مل کر عالم اور سو جھوٹے مل کر سچے کیسے ہو جائیں گے۔

کونوا مع الصادقین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایک صادق ہونا چاہیئے کیونکہ یہ حکم ہر زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ہے پس ہمارا فرض ہے کہ اس زمانہ کے صادق کو پہچان لیں۔ قرآن میں اہل صدق کو دو لفظوں سے یاد کیا گیا ہے ایک صادق دوسرے صدیق۔ صادق لوگ کون ہیں؟ قرآن بتاتا ہے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ۔ (بعض مومنین ایسے ہیں کہ انہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا پس ان میں سے بعض کی مدت حیات تو ختم ہو چکی اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنے ارادہ میں) کوئی تبدیلی نہیں کی تاکہ اللہ ان سچوں کو ان کے سچ کی جزا دے) اس آیت سے معلوم ہوا کہ سچے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدائی عہد کو پورا کیا۔ اور خدائی عہد کیا ہے؟ اس کا شریک کسی کو قرار نہ دینا اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (اے بنی آدم کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے) یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر اس عہد کو پورا کرنے والے اہلبیت رسول ہیں جنہوں نے کبھی طرفۃ العین کے لئے بھی کسی بت کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا اور شرک کو آنِ واحد کے لئے بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ پس اس سے بہتر سچا کون ہو سکتا ہے ان میں سے اور سب تو مر چکے لیکن ایک ذات (بارھویں امام علیہ السلام) باقی ہے جس کو موت کا انتظار ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں نے شک نہیں کیا اور انہوں نے راہ خدا میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ پس یہی لوگ سچے ہیں) یہ تمام صفات چونکہ بدرجہ اولیٰ اہلبیت رسول میں پائی جاتی ہیں لہٰذا تمام صادقوں کے وہ پیشرو ہوئے پس بموجب حکم آیت مسلمانوں کو ان کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ایک صادق میں خدا کے نزدیک کن کن صفات کا ہونا ضروری ہے یا بالفاظ دیگر خدا کن لوگوں کو سچا کہتا ہے قرآن سے اس کو سنئے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ

بعهدهم اذا عاهدوا والصابرين في البأساء والضراء وحين البأس اولئك الذين صدقوا واولئك هم المتقون ٥ (یہ تو کوئی نیکی ہی نیکی نہیں کہ تم مشرق و مغرب کی طرف (نماز میں) منہ کرو بلکہ نیکی اس کے لئے ہے جو اللہ روز قیامت ملائکہ کتاب خدا اور نبیوں پر ایمان لایا ہو اور خدا کی محبت میں اس نے اپنا مال ذوی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور مقروضوں کو دیا ہو۔ نماز کو قائم کیا ہو زکوٰۃ کو ادا کیا ہو اور انہوں نے جب خدا سے عہد کیا ہو تو اسے پورا کیا ہو اور وہ مصیبتوں اور سختیوں اور جنگ کے وقتوں میں صبر کرنے والے ہوں۔ بس یہی لوگ سچے اور یہی لوگ متقی ہیں) سوائے اہلبیت رسول اصحاب رسول میں اور کون ایسا تھا جو اس لمبی چوڑی فہرست پر پوری طرح عمل کرنے والا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں مذکورہ بالا صفات رکھنے والے کو صادق کہتے ہیں۔

صدق انسانوں میں دو طرح سے پایا جاتا ہے کلی اور جزئی اگر مذکورہ بالا آیت میں صدق جزئی مراد ہو تو اس سے کوئی مسلمان خالی نہیں ہو سکتا اگر بالفرض اس نے مدت العمر کوئی سچ نہ بولا ہوگا تو کم از کم لا الٰہ الا اللہ کا سچا کلمہ تو اپنی زبان پر جاری کیا ہی ہوگا پس جب اس قسم کا سچ تو ہر شخص میں پایا جاتا ہے تو پھر یہ کہنا فضول ہوگا کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ چونکہ یہ صورت باطل ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ صادقین سے مراد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے من المھد الی اللحد کبھی کوئی جھوٹ بولا ہی نہ ہو اور ایسے لوگ سوائے ہمارے ائمہ معصومین کے جن میں سے کسی نہ کسی کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے اور کوئی اس قابل ہو ہی نہیں سکتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہر زمانہ میں کون کون صادق اور صدیق رہے ہیں۔

۱۔ حضرت آدم اور ملائکہ سے کہا گیا انبئونی باسماء هؤلاء ان کنتم صادقین ٥ اگر تم سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ چونکہ حضرت آدم نے ان کے نام بتا دیئے لہذا وہ صادقین میں داخل ہیں۔

۲۔ نوح۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ اور محمد مصطفےٰ علیہم السلام واذ اخذنا من النبیین میثاقهم ومنک ومن نوح وابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ابن مریم واخذنا منهم میثاقا غلیظا لیسئل الصادقین عن صدقهم۔ (جب ہم نے انبیاء سے میثاق لیا اور اے رسول تم سے اور نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ سے عہد لیا، اور ہم نے ان سے سخت پکا عہد لیا تاکہ صادقین سے ان کے صدق کے متعلق پوچھا جائے)

۳۔ حضرت اسمٰعیل انه کان صادق الوعد (وہ وعدہ کا سچا تھا۔

صدیق کا لفظ قرآن میں خاص خاص انبیاء کے لئے ہے۔

۱۔ حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم کی شان میں ہے انه کان صدیقا نبیا

۲۔ حضرت یوسف کے بارہ میں ہے یوسف ایها الصدیق ٥

۳۔ حضرت مریم کے لئے ہے وامه صدیقة

آیۂ والذین آمنوا بالله ورسوله اولئک هم الصدیقون والشهداء عند ربهم لهم اجرهم ونورهم (جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور وہ صدیق و شہداء ہیں خدا کے لئے ان کا اجر اور نور ہے) سیوطی نے دُرِّ منثور میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس آیت میں صدیقین سے مراد حضرت علی ہیں۔

آیۂ مباہلہ نے اس کی توضیح کردی کہ صادقین کون ہیں۔ محمد و آلِ محمد کی صداقت ایک ممتاز صداقت ہے ان کی صداقت قرآن کی صداقت سے پہلے ہے کیونکہ ان کا وجود وجودِ قرآن سے پہلے ہے انہوں نے قرآن کی تصدیق کی مَنْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ (جو صدق کو لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی متقی ہیں)۔ اس کے بعد قرآن نے ان کی صداقت کی تصدیق کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی صداقت کا مداح بنکر قرآن آیا۔ یہ جو کام کرتے گئے قرآن اس کی تصدیق کرتا گیا قرآن کے نازل ہونے سے پہلے یہ وہ کر چکے تھے جس کی حکایت بعد کو قرآن نے کی ان کی صداقت اگر نزولِ قرآن سے پہلے کی نہ ہوتی تو ان کی تصدیق قرآن کے لئے کافی نہ سمجھی جاتی۔ قرآن کو ان کی تصدیق کی اس درجہ احتیاج تھی کہ جب تک مولودِ کعبہ گواہ بن کر نہ آگیا وہ سینۂ رسول سے ابھر کر زبان پر نہ آیا۔ صدیق کا مرتبہ نبی سے دوسرے نمبر پر ہے أُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۝ سے فرقِ مراتب کا پتہ چلتا ہے۔ فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ نبی اگر ایک زینہ اتر آئے تو صدیق بن جائے اور صدیق اگر ایک درجہ ابھر جائے تو نبی ہو جائے۔ غدیرِ خم میں رسول نے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچ دیا تھا خود ایک زینہ کے اوپر تھے اور علی ایک زینہ کے نیچے۔

صدیق کے لئے صادق ہونا ضروری ہے لیکن صادق کے لئے صدیق ہونا ضروری نہیں اگر صدیق (تصدیق کرنے والا) بدونِ صدق ہے تو اس کی تصدیق کی کوئی وقعت نہیں۔

کُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝ میں چودہ حرف ہیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ چودہ صادقین ہیں ہر زمانہ کے مسلمانوں کو انہی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

مقامِ صدق معمولی مقام نہیں بلکہ اس کو مقامِ محمود سے تعبیر کیا گیا ہے یا یوں کہو کہ مقامِ محمود صدق سے حاصل ہوتا ہے عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا ۝ وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا ۝ (عنقریب تمہارا رب تم کو مقامِ محمود تک پہنچا دے گا اے رسول کہو پروردگارا مجھے صدق کے داخل ہونے کی جگہ میں داخل کر اور صدق کے نکلنے کی جگہ سے نکال اور اپنی طرف سے میرے لئے ایک سلطانِ نصیر قرار دے) حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ۝ (میرے لئے ایک سچی زبان آخر لوگوں میں قرار دے) اور حضرت رسولِ خدا نے سلطانِ نصیر مانگا۔ جناب ابراہیم کی دعا بھی قبول ہوئی اور حضرت رسولِ خدا کی بھی۔ ابراہیم کی دعا کا جواب ملا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝ (ہم نے علی کو ان کے لئے سچی زبان قرار دیا) اور رسول کی دعا کے پہلے حصہ کا جواب ملا وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (اور ایمان والوں کو بشارت دے دو کہ ان کا سچا قدم ان کے رب کے نزدیک ثابت ہے) یہ دعا ہمارے رسول کی تنہا اپنے لئے نہ تھی بلکہ اور بھی شامل تھے۔ اگرچہ زبان پر نہ تھے مگر دل میں تھے جواب میں لَهُمْ کہہ کر ظاہر کر دیا گیا۔ عام مومنین اس سے مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ رسول کے درجہ میں کہاں ہیں۔ دوسرا حصہ دعا کا سلطانِ نصیر کا مانگنا تھا اس کا جواب یوں آیا وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا نَصِيرًا ۝ (جس کسی نے مظلوم کو قتل کیا تو ہم نے اس کے ولی کے لئے ایک سلطانِ نصیر کو قرار دیا) تمام مفسرینِ شیعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مظلوم سے مراد امام حسین علیہ السلام اور سلطانِ نصیر سے مراد بارہویں امام علیہ السلام ہیں۔ انشاء اللہ ظہور کے بعد وہی خونِ ناحق حسین کا بدلہ لیں گے۔

رسول کو دو باتوں کی تصدیق کی ضرورت تھی ایک رسالت دوسرے کتاب اللہ۔ کسی امر کی تصدیق کے لئے چند باتوں کی ضرورت ہے۔ اول جس چیز کی تصدیق کر رہا ہو اس سے کماحقہ واقف ہو دوسرے اس کی تصدیق موثر ہو۔ تیسرے جس واقعہ کی تصدیق کر رہا ہو اس کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو نہ کہ کانوں سے سُنا ہو۔ قرآن کی تصدیق اگر کوئی ایسا شخص کرے جو صرف رسول ہی سے سننے والا ہو تو یہ تصدیق کیونکر کارآمد ہو گی یا اگر ایک شخص نبوت کا مصدق بن کر نکلے اور اس سے پوچھا جائے کہ جب ان کو نبوت ملی تھی تو تم موجود تھے اور دعوے میں موجود تو نہ تھا صرف رسول کی زبان سے سنکر گواہی دے رہا ہوں۔ تو یہ شہادت معتبر نہ ہو گی کیونکہ عینی نہیں بلکہ سماعی ہے البتہ اگر ایسا شخص تصدیق کرے جو علم قرآن خدا کے یہاں سے سینہ میں لے کر آیا ہو اور بعد ولادت اس کو سُنا کر اس کا ثبوت دیا ہو تو اس کی تصدیق سے کون انکار کر سکتا ہے اور جو نبوت کا ایسا گواہ عینی ہو کہ اَنَا وَ عَلِیٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدٍ کے تحت میں ازل سے ساتھ رہا ہو جس نے تاجِ نبوت سر رسول پر سجا ہوا دیکھا ہو تو اس کی تصدیق سب سے پہلی التصدیق کیوں نہ ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک ایسا مصدق نہ آ گیا رسول نے نہ تو اعلان رسالت کیا نہ کتاب کو پیش کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مباہلہ کے لئے حضرت نے اپنے ساتھ صرف انہی لوگوں کو لیا جو نبوت و رسالت کے عینی گواہ تھے اگر مسلمان آیۂ کونوا مع الصادقین پر عمل کرتے اور صادقین کی پیروی چھوڑ کر کاذبین کے پیچھے نہ چل پڑتے تو ہرگز تہتر فرقوں میں نہ تقسیم ہوتے

کربلا میں حق و باطل کی جنگ تھی صدق اور کذب کی لڑائی تھی لیکن کتنے مسلمان تھے جنہوں نے باطل پرستوں کو چھوڑ کر حق پرستوں اور صداقت شعاروں کا ساتھ دیا۔ لاکھ دو لاکھ نہیں ہزار دو ہزار نہیں صرف بہتر۔ اللہ اللہ کیسے سعادت شعار اور صداقت کردار تھے۔ کربلا والے کہ جو زبان سے کہہ دیا تھا آخر وقت تک اس پر قائم رہے ان کو خدا کی وحدانیت محمد کی رسالت اور حسین کی امامت پر اس درجہ یقین کامل تھا کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کے ایمان و ایقان کے قدم کو ذرہ برابر جنبش نہ ہوئی ان کو اس بات پر پورا یقین تھا کہ ہم حق پر ہیں اور ہماری خدمات سرکارِ الٰہی میں مقبول ہوں گی۔ اس یقین میں بچے، جوان اور بوڑھے سب برابر تھے۔

صاحب مجمع المصائب لکھتے ہیں کہ روز عاشور جوانوں سے کہیں زیادہ جوش ان لڑکوں میں پایا جاتا تھا جو ابھی سنِ بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے جناب زینب کے بیٹوں کے حالات میں لکھا ہے کہ صبح سے ہتیار بدن پہ سجے مرنے پر کمریں کسے لیے شاد شاد پھر رہے تھے گویا روز عید ہے۔ بار بار چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے کہتا تھا اب تو زندگی کی ایک ایک آن ایک ایک برس معلوم ہو رہی ہے۔ جلد چل کر ماموں جان سے اجازتِ کارزار حاصل کیجیے اور ان شقاوت کرداروں کو ان کی بے ادبی اور گستاخی کا مزہ چکھایئے۔ جی میں آتا ہے کہ ابھی گھوڑا بڑھا کر ان بدبختوں پر جا پڑوں بڑا بھائی کہتا تھا دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن ابھی ماموں جان ہم کو اجازتِ کارزار مرحمت فرمائیں گے نہیں۔ ابھی تو انصار اپنی جاں بازیاں اور سرفروشیاں دکھا رہے ہیں۔ میں اس خوف سے ماموں جان سے عرض نہیں کرتا کہ شاید بزرگوں پر سبقت کرنا گستاخی پر محمول ہو۔ ادھر جوں جوں تاخیر ہو رہی ہے اماں جان کی ناراضگی کا خوف بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سنکر چھوٹے بھائی نے کہا بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے ماموں جان کی خدمت میں چل کر اپنے ارادہ کا اظہار کریں اور درخواست کریں کہ وہ بڑے ماموں جان سے ہم کو اجازتِ کارزار دلوا دیں۔ چنانچہ دونوں بچے جناب عباس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ اپنی درخواست پیش کی۔ جناب عباس بچوں کے یہ حوصلے دیکھ کر رونے لگے اور چھاتی سے لگا کر فرمایا اے شیر دلو! تمہاری جرأت و ہمت پر صد آفریں بے شک جعفر طیار کے پوتوں اور حیدر کرار کے نواسوں

کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جلدی نہ کرو۔ جب وقت آئے گا میں خود تم کو مولا کی خدمت میں پیش کر کے اجازت کا رزار دلا دوں گا۔

ابو جعفر در بندی اپنی مقتل میں لکھتے ہیں کہ جناب زینب کو بڑی کد اس کی تھی کہ جلد از جلد ان کے بیٹے درجۂ شہادت پر فائز ہو چکیں جوں جوں تاخیر ہوتی تھی جناب زینب کے چہرہ کا رنگ اڑا جاتا تھا۔ ظہر کے بعد ان کو تاب ضبط نہ رہی اور دونوں صاحبزادوں کو سامنے بلا کر ملال انگیز لہجہ میں فرمانے لگیں کیوں عون و محمد کیا میرے رات کے سمجھانے کا تم پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ہے ہے غیر تو ماموں پر سے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں اور تم بھانجے ہو کر ابھی تک بیچے بیچے پھرتے ہو آخر وہ وقت کب آئے گا کہ تم مرنے کے لئے نکلو گے۔ کیا اس کا انتظار ہے کہ ماموں اپنا گلا تہ تیغ رکھ لیں تو نکلیں۔ ہے ہے تم نے میری آنکھ اپنوں اور غیروں کے سامنے نیچی کرا دی۔

بچوں نے جو ماں کی یہ غضب انگیز تقریر سنی تو لرز گئے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کپکپاتی آواز میں کہا اے مادر گرامی بخدا اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں ہمیں تو خود ایک ایک گھڑی شاق ہو رہی ہے آپ چھوٹے ماموں جان سے دریافت فرمالیں کہ ہم نے ان کی خدمت میں اپنی یہ تمنا ظاہر کی تھی یا نہیں۔ ہم کو اپنی جان ماموں جان سے عزیز نہیں لیکن اجازت نہ ملنے سے مجبور ہیں۔

یہ سنکر جناب زینب کے چہرہ پر آثار بشاشت نمایاں ہوئے شفقت سے سروں پر ہاتھ پھیر کر فرمانے لگیں۔ شاباش تم نے اس وقت میرے رنجیدہ دل کو شاد کر دیا لیکن میرے پیارو تم اس امید میں نہ رہو کہ ماموں تم کو خود بلا کر جنگ کی اجازت دیں گے ہے ہے کون ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں اور آنکھوں کے تاروں کو بخوشی تلواروں کے تلے رکھ دے اگر سچے دل سے تم ماموں کے عاشق ہو تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر جس طرح بنے اجازت حاصل کرو۔

الغرض دونوں صاحبزادے ماں سے رخصت ہو کر امام علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت چاہنے لگے حضرت کا دل بھر آیا اور دونوں کو چھاتی سے لگا کر فرمایا آہ تمہارے یہ سن اس قابل نہیں کہ ان لاکھوں دشمنوں سے لڑنے کی اجازت دوں۔ آہ تین دن کی بھوک پیاس سے تمہاری جانوں پر یوں ہی بنی ہوئی ہے۔ پھول سے چہرے کملائے ہوئے ہیں۔ لاکھوں دشمنوں کا نرغہ ہے جو مجاہد یہاں سے جاتا ہے زندہ واپس نہیں آتا۔ ایسی حالت میں کس دل سے تمہیں اجازت کارزار دوں۔ بچوں نے سر جھکا کر عرض کی ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ دین خدا کی حمایت میں لڑنا اور راہ خدا میں جان دینا ہمارے دادا اور نانا کے گھر کا آئین ہے۔ غلام عرض نہیں کر سکتے کہ صبح سے اب تک کا وقت کس بے چینی میں گزرا ہے۔ جس قدر ہمارے جنگ کرنے میں تاخیر ہو رہی ہے اسی قدر ہماری والدۂ گرامی کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔

بچوں کی تقریر سنکر تاب ضبط نہ رہی۔ امام مظلوم دونوں کو ساتھ لئے جناب زینب کے خیمہ میں تشریف لائے اور رو رو کر فرمانے لگے اے بہن اب عون و محمد بھی ہم سے مرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ آہ حسین پر کیسا وقت آ پڑا ہے کہ اپنے عزیز و انصار کو نہ مرنے سے روکتے بنتی ہے نہ اجازت دیتے بنتی ہے۔ ان مصائب کو برداشت کرنے کے لئے کہاں سے فولاد کا دل لاؤں۔ صبح سے یہ وقت لاشے اٹھاتے اور اپنے عزیزوں کو خاک و خون میں ایڑیاں رگڑتا دیکھتے گزرا ہے۔ آہ اب یہ وقت بھی آیا کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی اب مجھ سے مرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں اے بہن ایسی حالت میں زندگی کا کیا خاک مزہ ہے۔ اے بہن اجازت دو کہ اب میں میدان میں جا کر شمر کے خنجر سے اپنا گلا کٹوا دوں تا کہ میرے دشمنوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ اور پھر ان کو کسی اور کے قتل کی آرزو باقی نہ رہے۔

یہ سنا تھا کہ جناب زینب بلبلا گئیں اور بھائی کے گلے میں باہیں ڈال کر بے اختیار دھاڑیں مار کر رونے لگیں اور کہنے لگیں ماں جائے زینب آپ پر سے قربان آپ غلاموں کے لئے اتنا کیوں آزردہ ہو رہے ہیں۔ دو کیا اگر ہزار فرزند ایسے ہوں تو زینب آپ پر سے قربان کر دے۔ بھیا! میری دلی تمنا ہے کہ راہِ خدا میں ان دونوں کو شہید دیکھوں۔ بیکس ماں جائے تیری غربت اور بیکسی پر زینب نثار یہ وقت اولاد کو عزیز رکھنے کا نہیں پنجتن پاک میں سے ایک دم آپ کا باقی ہے۔ اگر خدا نخواستہ آپ نہ ہوئے تو پھر فلک ستائی بہن کس کے سہارے سے جئے گی۔ بھیا میں آپ کو اپنے حقوق کی قسم دیتی ہوں کہ ان کو نہ روکئے۔ خدا علی اکبر کو سلامت رکھے۔ زینب کا کلیجہ ان کو دیکھ کر ٹھنڈا ہوگا

بہن کی یہ گفتگو سنکر امام مظلوم خیمہ سے باہر آئے اور عون و محمد کو اجازتِ کارزار مرحمت فرمائی۔ دونوں صاحبزادے باغ باغ ہو گئے خوشی خوشی بدن پر ہتھیار سج کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور سب کو سلام رخصت کر کے میدانِ جنگ کو روانہ ہو گئے اگرچہ سن دونوں کے کم تھے مگر جعفر کے پوتے اور علی کے نواسے تھے اپنے شیرانہ رجز سے میدانِ کارزار کو ہلا دیا۔ چھوٹے چھوٹے نیزے لے کر دونوں اس طرح دشمن کی فوج پر جا پڑے جس طرح بھوکا شیر ہرنوں کے غول پر جا پڑتا ہے۔ جتنا دشمن سامنے سے بھاگتے تھے یہ ان کے غول میں گھستے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ پسر سعد کے خیمہ کے پاس جا پہنچے وہ خوف زدہ ہو کر پشتِ خیمہ سے نکل بھاگا اگر ذرا دیر اور رک گیا ہوتا تو شیروں نے اس کا کام تمام ہی کر دیا تھا۔ اس نے خیمہ سے نکل کر اپنی فوج کو ڈانٹا کہ کیسے نامرد ہو۔ دو بچوں کو نہیں گھیر سکتے۔ ابو خالد ازدی پہلو میں کھڑا تھا۔ اس نے کہا اے پسر سعد انہیں بچہ نہ سمجھ یہ جعفر کے پوتے اور علی کے نواسے ہیں ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ ذرا آگے بڑھ کر تو دیکھ کس طرح دونوں نے خون سے زمین لال کر دی ہے اور میدانِ کربلا کو کشتوں سے پاٹ دیا ہے۔

حضرت جعفر کے دونوں شیر دشمنوں کو خاک پر گراتے زورِ یداللٰہی دکھاتے نہر کے کنارے جا پہنچے۔ آہ جب پیاسوں نے نہر کے ٹھنڈے پانی کو موجیں مارتے دیکھا تو بدن میں سنسنی پڑ گئی۔ چاہتے تو نہر میں داخل ہو کر اپنی پیاس بجھا سکتے تھے لیکن سبحان اللّٰہ کیسے وفادار و حق شناس تھے کہ یہ کہہ کر نہر سے منہ پھیر لیا۔ آہ خیموں میں چھوٹے بچے تو پیاس سے دم توڑ رہے ہوں اور ہم یہاں اپنی پیاس بجھانے لگیں ہرگز نہ ہوگا۔

کتب مقاتل میں ہے کہ جب یہ دونوں شیر فرات کی طرف سے لوٹ رہے تھے تو دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر وار پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ زخمی تو تھے ہی کہاں تک اس ٹڈی دل کا مقابلہ کرتے۔ آخر جب زخموں سے چور چور ہو کر گھوڑوں سے گرنے لگے تو آواز دی یابن رسول اللّٰہ ادرکنی۔ حضرت یہ صدا سنتے ہی مقتل کی طرف روانہ ہوئے۔ آہ آہ! جب وہاں پہنچے تو دونوں کو خاک پر مردہ پایا۔ غم کی چھری کلیجہ پر چل گئی۔ دل سینہ میں تڑپ گیا۔ دونوں کو خاک پر سے اٹھایا اور خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

جناب فضہ خیمہ کے دروازے سے دیکھ رہی تھیں جوں ہی حضرت کو لاشے لاتے ہوئے دیکھا سینہ کوٹتی زار زار روتی پیٹتی خیمہ میں آئیں اور جناب زینب سے کہنے لگیں بی بی تم لٹ گئیں۔ تمہارے بچے کام آئے۔ فرزند رسول دونوں کی لاشیں لا رہے ہیں یہ سننا تھا کہ جناب زینب نے سجدۂ شکر کیا۔

لکھا ہے کہ جب خیمہ میں لاشے لائے گئے تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ ہر طرف سینہ زنی اور نوحہ خوانی تھی۔ امام حسین علیہ السلام دکھیا بہن کو سینے سے لگائے پرسا دے رہے تھے۔ آہ اس ماں کا دل کیا کہتا ہوگا۔ جس کے دو جوان بیٹوں کی لاشیں خاک پر رکھی ہوں گی

خدا کسی ماں کو یہ وقت نہ دکھائے۔

مقتل ابواسحٰق میں ہے کہ جب عون و محمد کے لاشے خیمے میں آئے تو جناب زینب بے اختیار ان پر گر پڑیں اور پیار کرنے لگیں زینب تمہاری ان خون بھری صورتوں پر نثار تم نے میری لاج رکھ لی۔ اور اماں کی روح سے مجھے شرمندہ نہ کیا۔ بچو! اب میں تم سے خوش ہوں۔ آہ میرے پیارو تم نے دنیا کی کچھ بہار نہ دیکھی۔ ناشاد نامراد چل بسے۔ اس دکھ جلی ماں کے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ آج وہ سب خاک میں مل گئے۔ آہ میں کربلا کے بن میں لٹ گئی۔ اے میرے شیر دلے میرے بہادرو! اے میرے نازوں کے پالو۔ اٹھو دکھیا ماں کے ٹوٹے دل کو ڈھارس دو۔ آہ پھر بات جلد کر لرزتی آواز میں ماں سے کہو "اماں جان ہم موت سے نہیں ڈرتے"۔ آہ تمہاری یہ بھولی بھولی صورتیں اور پیاری پیاری باتیں میرے دل پر آرے چلاتی رہیں گی۔

الا لعنة الله على القوم الظالمين وسيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون ٥

سولھویں مجلس

تفسیر آیۂ ھوالذی ارسل رسولہ الخ بیان اسلام و فطرت اور شہادت حضرت عباس ع

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ہ

(اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو) دنیا میں ہر شخص کے لئے یہ بات قابلِ غور ہے کہ انسان کو کسی دین کا پابند ہو کر رہنا چاہیئے یا نہیں۔ آج کل لوگ دین کے نام سے حد درجہ متنفر ہیں۔ وہ کہتے ہیں دنیا میں جتنا جھگڑا ہے وہ سب اسی مذہب کا ہے۔ جب تک انسان کی گردن میں دین پرستی کا طوق پڑا ہوا ہے وہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ خیال سرعت کے ساتھ روز بروز انسانی دماغ میں پرورش پا رہا ہے اور اس بنا پر دین کے مستقبل کا تصور کر کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں جو لوگ دین کے دائرے سے باہر ہو گئے ہیں وہ بڑی قوت کے ساتھ اوروں کو بھی اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کی قوت زیادہ ہے لہٰذا حامیانِ دین کو بڑی مشکل کا سامنا ہے خاص کر اس وجہ سے کہ جو لوگ بظاہر دین کے دائرہ میں نظر آتے ہیں ان کے دل بھی دوسروں کی طرف مائل ہو چکے ہیں لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم مذہب کی ضرورت کو عقلی روشنی میں دیکھیں۔

انسانی فطرت کے کچھ مقتضیات ہیں اگر وہ ان پر عمل پیرا ہوتا ہے تو زندگی امن و امان سے گزر جاتی ہے ورنہ قسم قسم کے مفاسد پیدا ہوتے ہیں مثلاً فطری اقتضا ہے کہ انسان اپنے محسن سے دلی محبت رکھے اور اس کی عظمت کو مانے۔ کیا دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جس کو اپنے والدین سے انس و محبت نہ ہو اور ان کی بزرگی کو تسلیم نہ کرے یا مثلاً فطری اقتضا ہے کہ اپنے دشمن کو برا سمجھے اور اس سے بچنے کی تدبیر کرے یا مثلاً فطری اقتضا ہے کہ اپنی زندگی کی ضروریات کو فراہم کر کے راحت کی زندگی بسر کرے۔ یا مثلاً فطری اقتضا ہے کہ اپنی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر دوسروں سے میل کر رہے، اسی طرح بہت سی باتیں ہیں پس جب ان مقتضیات سے بچاؤ کی صورت نہیں تو عقل بتاتی ہے کہ ان کے کچھ قوانین بھی ہونے چاہئیں تاکہ طبائع کے اختلاف اور خواہشاتِ نفسانی کے اغواء سے آپس میں کوئی نزاع و فساد پیدا نہ ہو۔

یہی قوانین اگر بندے بنا دیں تو قانون ملکی و معاشرتی و تمدنی کہلاتے ہیں اور اگر خدا بنا دے تو اس کو دین یا شریعت کہتے ہیں۔ پس جو لوگ دین سے جدا رہنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مقتضیاتِ فطرت سے روگردانی کرتے ہیں۔ جھگڑے کا باعث دین نہیں بلکہ اہلِ دنیا کی اندرونی خباثتیں اور شیطانی حرکات ہیں جو دین کے پردہ میں نمایاں ہوتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب دین ان قواعد کا نام ہے جن سے انسان نکوکاروں کی سی زندگی بسر کر سکے تو ان قواعد کو بنانے والا کون ہونا چاہیئے آیا یہ بہتر ہے کہ ہم بنا لیں یا یہ کہ خدا بنائے۔ انسان چونکہ بالطبع خود غرض ہے۔ لہٰذا وہ کبھی بے لاگ قانون نہیں بنا سکتا۔ ہر بادشاہ

جب کوئی قانونِ سلطنت بناتا ہے تو اپنے حقوق کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے۔ اس صورت میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ آج تک دنیا میں کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بنا جس میں تمام بنی نوعِ انسان کے حقوق کا یکساں لحاظ رکھا گیا ہو۔ ایسا قانون تو وہی بنا سکتا ہے جو دائرہ انسانی سے بالکل الگ، سب سے بے نیاز اور قطعاً بے غرض ہو اور جو خود خالقِ کائنات ہونے کی وجہ سے تمام مقتضیاتِ فطرت سے واقف ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں بے شمار ادیان پائے جاتے ہیں اور ہر دین اس کا دعویدار ہے کہ خدا کا پسندیدہ دین وہی ہے۔ اور نجات اسی کے سائے میں ہے اور ہر دین والا اپنے مقام پر یہی سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور دوسرے باطل پر کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ہ ایسی صورت میں اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ سچا دین کونسا ہے۔ ایک شخص اگر کسی ایسے مقام پر کھڑا ہو جہاں سینکڑوں راستے چاروں طرف کو جا رہے ہوں اور کسی ایک راستہ پر اسے چلنے کا اختیار دیا جائے تو وہ سخت پریشان ہوگا کہ کونسا راستہ اختیار کرے۔

وہ کیونکر سمجھ سکتا ہے کہ کونسا راستہ سیدھا اور مختصر ہے اور کونسا ٹیڑھا اور طولانی! یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب دین میں مختلف فرقوں کو دیکھا جاتا ہے۔ یہودیوں میں اکہتر عیسائیوں میں بہتر اور اسلام میں تہتر۔ کیا یہ سب صحیح راستہ پر ہیں؟ کیا یہ سب منزلِ مقصود تک پہنچانے والے ہیں۔ ان کے درمیان اصول و فروع کا اختلاف ہرگز یہ نہیں بتاتا کہ یہ سب صحیح ہیں۔ تھیوسوفسٹ لوگ کہتے ہیں۔ ہر دین کو حق مانو۔ ایک ہی منزل تک پہنچنے کے یہ مختلف راستے ہیں لیکن کیا یہ خیال درست ہے اگر سب راستے منزلِ مقصود تک پہنچا ہی دیا کرتے تو پھر دنیا میں کوئی گمراہ ہی نہ ہوتا اور اگر بالفرض یہ سب راستے سیدھے بھی ہوں تب بھی سیدھا راستہ تو صرف ایک ہی ہوگا۔ کیونکہ دو نقطوں کے درمیان سیدھا خط تو صرف ایک ہی نکل سکتا ہے اور وہی سب سے چھوٹا خط ہوتا ہے۔ اس پاس کے تمام خطوط ٹیڑھے اور طولانی ہوتے ہیں۔ کیا ایک عقلمند آدمی کا یہ فرض نہیں کہ وہ سب سے سیدھے اور مختصر راستہ کو اختیار کرے۔ اگر ادیان میں اصولاً کوئی فرق نہیں تو وہ مختلف کیوں ہیں اور اگر فرق ہے تو سب کے سب صحیح کیونکر ہوئے۔

کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک دین والے کہیں کہ خدا ایک ہے دوسرے کہیں کہ دو ہیں تیسرے کہیں کہ تین ہیں بلکہ کہنے والے یہاں تک کہیں کہ سینکڑوں ہیں اور پھر بھی یہ سب کے سب صحیح راستہ پر ہوں۔ مقصود کسی دین سے یہ ہے کہ عبد و معبود کے درمیان رشتہ قائم ہو اور بندے اپنے معبود کی معرفت حاصل کریں لیکن ایسی صورت میں معرفت حاصل کیسے ہو سکتی ہے جبکہ معبودوں میں اس قدر اختلاف واقع ہے۔

پس اس اختلاف کی صورت میں ایک ایسے دین کا تعین ہو جانا چاہیئے جو حق ہو اور جس کی راہ کو صراطِ مستقیم کہہ سکیں اور اس پر چل کر نجات حاصل ہو سکے۔ کھری اور کھوٹی چیزیں جہاں ملی ہوئی ہوں وہاں پرکھنے کے لئے ایک معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا کھرا کھوٹا دین جانچنے کے لئے بھی ایک معیار ہونا چاہیئے اگر یہ معیار آسمانی کتابوں کو بنایا جائے تو کسی ایک کتاب کو جملہ ادیان قبول نہ کریں گے۔ دوسرے اگر کسی آسمانی کتاب سے یہ فیصلہ ممکن ہوتا تو اہلِ ادیان کے درمیان یہ اختلاف ہوتا ہی کیوں چونکہ کتابوں میں تاویل کی گنجائش ہوتی ہے ہر شخص اپنے خیال کے مطابق ایک مطلب نکال لیتا ہے پھر کیا علماء کے اقوال کو معیار بنایا جائے یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ علماء میں خود اختلاف کی کوئی حد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ مذہب کے بارہ میں بجائے عقلِ فطری کے عقلِ عادی سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلَیْھَا

وانا علیٰ آثارھم مقتدون۔ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی مذہب پر پایا ہے پس ہم انہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں)، اگر عقل فطری سے کام لیں تو فطرت سے زیادہ صحیح کوئی دوسرا معیار ہو سکتا۔ فطرت ہر انسان میں مشترک ہے اور ایک ہی صورت سے ہے پس اس کے قبول کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا لہٰذا سچا دین وہ ہے جس کے احکام فطرت کے مطابق ہوں کیونکہ خدا کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس کی طرف سے تمام آئے ہوئے احکام ایسے ہوں گے جن کو فطرتِ انسانی برداشت کر سکے پس جس دین کے اصول و فروع فطرت کی کسوٹی پر کھرے اتر جائیں اور اصولِ فطرت کے مطابق ثابت ہوں وہ سچا دین ہے باقی سب جھوٹے۔

اس وقت تک دنیا میں جتنے ادیان ہو چکے ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنے فطری ہونے کا دعویٰ نہیں کیا سوائے دینِ اسلام کے فطرۃ اللّٰہِ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ ذٰلک الدین القیم (فطرتِ الٰہیہ وہی ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے، خلقِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی یہی سچا اور سیدھا دین ہے) اسی مضمون کو حدیث میں یوں ادا کیا گیا ہے کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ (ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے یعنی اس کی فطرت اس قابل ہوتی ہے کہ احکامِ اسلام کو برداشت کر سکے لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں) یہودی ایک مدت گزرنے کے بعد ایک خاص رسم کے ماتحت اپنے بچے کو یہودیت میں داخل کرتے ہیں۔ نصاریٰ بپتسمہ دے کر نصرانی بناتے ہیں۔ ہندو جنیو پہنا کر، مجوسی ہنسلی اور سکھ کڑا وغیرہ پہنا کر اپنے دین میں داخل کرتے ہیں۔ لیکن اسلام میں ایسا کوئی عمل نہیں ہوتا اس کا بچہ پیدا ہی مسلمان ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہر بچہ مسلمان ہی پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہو یعنی فطرت کے قواعد اور اسلام کے آئین ایک ہی ہیں لہٰذا اسلام اپنے بچے کو مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ البتہ جو لوگ اپنے بچے کو اپنے دین سے خارج جانتے ہیں وہ داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ اپنے بچے کو فطری اصول سے ہٹا کر غیر فطری امور کا معتقد بناتے ہیں۔

دینِ اسلام کے فطری اور عقلی ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی شریعت کا تعلق انسان سے اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی عقل کامل ہو جائے اور فطرت اپنے کمال کی حد کو پہنچ جائے اور وہ تقلیداً نہیں بلکہ عقلاً احکامِ الٰہی کی لِم سمجھنے کے قابل بن جائے۔ مجنون اور اطفال کو اسی لئے مرفوع القلم سمجھا جاتا ہے کہ عقل کا سایہ ان پر نہیں پس جہاں عقل ہے وہاں شریعتِ اسلام ہے اور جہاں شریعتِ اسلام ہے وہاں عقل ہے اس مضمون کو زبانِ معصوم نے اس طرح ادا کیا ہے کلما حکم بہ العقل حکم بہ الشرع وکلما حکم بہ الشرع حکم بہ العقل لیکن عقل سے مراد عقلِ عادی نہیں جو خارجی اثرات سے زنگ آلود ہو جاتی ہے بلکہ مراد عقلِ فطری و اصلی ہے جو ہر بات کا بے لاگ فیصلہ کرتی ہے العقل ما عبد بہ الرحمٰن واکتسب بہ الجنان عقلِ صحیح وہی ہے جو اطاعت و فرمانبرداری خالق کو سب سے مقدم جانتی ہے اور گناہ کی طرف سبقت نہیں کرتی اسی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں کہ جب خدا نے عقلِ انسانی کو پیدا کیا تو فرمایا اقبل فاقبل ثم قال لہ ادبر فادبر (آگے بڑھ پس وہ آگے بڑھ آئی پھر کہا پیچھے ہٹ پس وہ پیچھے ہٹ گئی) چونکہ عقل کی تعریف بھی اطاعت میں سر جھکانا ہے اور اسلام کے معنی بھی اطاعت میں سر رکھنا ہیں۔ لہٰذا ہم مفہوم ہونے کی بنا پر ان دونوں کا ازل سے ساتھ ہے نہ اسلام عقل سے جدا نہ عقل اسلام سے۔ پس جس نے اسلام کو لیا اور عقل کو چھوڑا اس کا ایمان ضعیف اور جس نے عقل کو لیا اور اسلام کو چھوڑا وہ کافر ان

دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان میں سے ایک کسی حالت میں کافی نہیں۔ جو نسبت اسلام اور عقل میں ہے وہی نسبت قرآن واہلبیت میں ہے جس طرح اسلام کے محاسن بغیر عقل سمجھ میں نہیں آتے۔ اسی طرح مطالب قرآن بغیر اہلبیت واضح نہیں ہوتے۔ ایک لطیف نکتہ قابلِ غور یہ ہے کہ روزِ ولادت سے اگرچہ اسلام کا تعلق بچے سے ہو جاتا ہے لیکن جب تک عقلِ عملی پیدا نہیں ہوتی۔ شریعت جس کا تعلق عمل سے ہے بحیثیت وجوب اس سے متعلق نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ بلوغ تک اسلام پوشیدہ طور پر ہوتا ہے لیکن بعد بلوغ اس کے اعلان کا حکم بصورت وجوب ہو جاتا ہے کیونکہ عملی جدو جہد کا وقت آجاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک رسول کو قوتِ عملی حاصل نہ ہوئی اعلانِ رسالت کا حکم نہ ہوا۔ علی کے پیدا ہونے کے بعد چونکہ رسول کا بازوئے عمل قوی ہو گیا لہذا تعلیم شریعت کا کام بھی شروع کر دیا گیا جس طرح انسان کی عقل چودہ برس سے قبل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ اسی طرح جب تک اسلام کے رہنماؤں کی تعداد ۱۴ تک نہ پہنچ جائے شریعت کو کمال حاصل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اکمالِ دین کا مژدہ اس وقت تک نہ آیا جب تک غدیر میں علی کی امامت کا اعلان نہ ہو گیا کیونکہ یہیں سے رہنماؤں کے اس سلسلہ کی ابتدا تھی جو آخر میں دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دکھانے والا تھا۔ عقل انسانی چودھویں منزل پہنچ کر تمام قویٰ پر غالب آنے کی قوت حاصل کر لیتی ہے اسی طرح جب اسلام کی عقلِ عملی چودھویں منزل پر پہنچے گی تو یقیناً لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کا مصداق اسلام کو بنا دے گی۔

عام بچوں میں چونکہ ۱۴ برس کے بعد عقل کامل ہوتی ہے اس لئے شریعت کا تعلق ان سے بعد بلوغ ہوتا ہے لیکن جو مجسم عقل ہوں یا عالم امر کے بچے ہوں۔ ان سے شریعت کا تعلق روزِ ولادت ہی سے ہو جاتا ہے چنانچہ قولِ حضرت عیسیٰ اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا (میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے) اس پر شاہد ہے۔ ایسے لوگوں کی شہادت بچپن میں اس پایہ کی ہوتی ہے کہ بدھوں کی گواہی بھی اس کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے یہ قانون شریعت کو پڑھنے نہیں آتے بلکہ پڑھانے آتے ہیں۔

رسول نے وقتِ ولادت قرآن کیوں نہ سنایا اور علی نے کیوں سُنایا؟ اگر رسول سُنا دیتے تو ایک بڑا شرف خاک میں مل جاتا۔ قبلِ اعلانِ رسالت رسول جو کچھ کرتے یا کہتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ قرآن کی تعلیم تھی اس صورت میں قرآن کا مرتبہ افضل ہو جاتا اور رسول کا عمل قرآن کے پیچھے پیچھے ہوتا اور اب رسول کا عمل مقدم رہا اور قرآن اس کی تصدیق بعد میں کرتا ہوا آیا یعنی رسول کی انسانیت اس درجہ کمال پر تھی کہ قبل نزولِ وحی جو کچھ انہوں نے کیا اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ جسے بعد کو وحی رد کر دیتی اور اس کے خلاف کرنے کا حکم دیتی بلکہ اس نے ہر عملِ رسول کی تصدیق کی یعنی گویا شریعت رسول کے عمل سے بنی نہ کہ رسول کا عمل شریعت سے بنا کوئی تو بتا دے کہ رسول نے قبلِ نزولِ قرآن کوئی عمل ایسا کیا تھا جو تعلیم قرآن کے مطابق نہ ہو۔ پس قرآن درحقیقت عمل محمد کی مدح ہے اور مدح جب ہوتی ہے کہ عمل پہلے ہولے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر رسول بعد ولادت قرآن سناتے تو کوئی تصدیق کرنے والا نہ ہوتا۔ وہ خالی الذہن لوگ بھلا کیا جانتے کہ یہ کیا چیز ہے برخلاف اس کے جب علی نے سنایا تو آنحضرت نے اس کی تصدیق کی۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر رسول قرآن کو پہلے سنا دیتے تو شریعت ہوتی مگر اس پر عمل نہ ہوتا اور قانونِ الٰہی کے لئے معطل رہنا توہین کا باعث ہوتا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ چالیس برس رسول نے جو عمل کیا اور اس کے بعد قرآن نازل ہوا اور جو ہوا اس کی تصدیق کی تو یہ اس کی

دلیل تھا کہ انسان کی صحیح فطرت اور قانونِ الٰہی جداگانہ چیزیں نہیں فطرتِ صحیح وہی کرتی ہے جو قانونِ الٰہی کہتا ہے اور قانونِ الٰہی وہی کہتا ہے جو فطرتِ صحیح کرتی ہے۔ محمد و آلِ محمد نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے یعنی اگر کوئی بچہ خارجی واقعات سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے تو قانونِ اسلام کے ہر ہر قدم پر اس کی فطرت ساتھ ہوگی اور اس بات کے ثبوت میں کہ فطرتِ صحیحہ کی زبان قانونِ اسلام ہے۔ علی کا بعد ولادت قرآن سنا دینا تھا۔ اب دیکھئے کہ نبی و علی نے کیا کام کیا۔ ایک نے عمل سے دکھایا دوسرے نے زبان سے بتایا اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ فطرت اللہ میں سیاستِ الٰہیہ کا علم بھی ہے اور عمل بھی۔ انا و علی من نورٍ واحدٍ کی حدیث نے اس امر پر روشنی ڈالی کہ قدرت نے ایک نور کے دو حصے کر کے ایک حصہ سے ایک بات کا ثبوت دیا اور دوسرے سے دوسری بات کا۔ ان میں سے ہر حصہ میں علم و عمل دونوں بننے کی قوت ہے کبھی ان سے قوتِ علم کا مظاہرہ ہوتا ہے اور کبھی قوتِ عمل کا۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ دینِ اسلام کیونکر فطری اصول پر قائم ہے اور اس کے مقابل دیگر ادیان کہاں تک اس معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ اصولِ دین پانچ ہیں پہلے انہی کو جانچئے۔ انسان چونکہ تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے لہٰذا ہم اسی کی فطرت کو معیار قرار دیتے ہیں۔

انسان کا بدن چند ایسے اصول کے ماتحت کام کر رہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک بھی باطل ہو جائے تو نظامِ بدن قائم نہیں رہ سکتا۔ انسان نام ہے چند اعضا و جوارح کا جو ایک روح کے ماتحت اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں صفات کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی نام رکھ لئے جائیں لیکن حقیقتاً روح ایک ہی ہے جو تمام بدن کا مدبر ہے۔ ہمیں نام سے بحث نہیں چاہے اطبا حرارتِ عزیزی کہیں یا حکما نفسِ ناطقہ بولیں یا ڈاکٹر اس کو ہیٹ سے تعبیر کریں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس جسم کی مدبر و منتظم ایک ایسی لطیف اور غیر محسوس شے ہے جو بدن سے اپنی کیفیات و خصوصیات میں بالکل جداگانہ ہے۔ اطبا کہتے ہیں کہ جب خارجی حرارت، حرارتِ عزیزی سے مل کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اندرونی الیکٹرسٹی پر جب بیرونی الیکٹرسٹی کا زور پڑتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منتظم بدن اگر ایک سے دو ہو جائیں تو فنا و فسادِ جسم یقینی ہے۔ یہیں سے اسلام کا یہ مسلمہ مسئلہ نکلا کہ تمام عالم کا خالق ایک ہے اگر دو ہوں تو کُل میں فساد واقع ہو جائے لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۔ اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو یہ دونوں مٹ کر رہ جاتے۔ پس جو ادیان ایک خدا کے خلاف کئی خدا تسلیم کرتے ہیں وہ یقیناً فطرت کے خلاف ہیں اسی لئے وہ عقلاً باطل ہیں خواہ وہ دو کہنے والے مجوسی ہوں یا تین کہنے والے نصاریٰ یا بہ کثرت ماننے والے ستارہ پرست اور ہنود۔

توحید کا مسئلہ ایسا فطری مسئلہ تھا کہ اسلام کی تعلیم کے بعد دیگر ادیان کو اپنی کثرت پرستی پر شرم آنے لگی اور ان کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ تاویلات در کیک سے اس مسئلہ توحید کو اپنے اصول میں شامل کر لیں۔ چنانچہ نصاریٰ نے تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کے مسئلہ کو رواج دیا۔ ہنود نے نرنکار کہہ کر اپنی جان بچائی اسی طرح دیگر ادیان نے کھینچ تان کر توحید پرستی کا اعلان شروع کیا لیکن اسلام جیسی کھری اور چوکھی توحید کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ بظاہر توحید پرست بن گئے لیکن صفاتِ الٰہی وہی باقی رہیں جو توحید سے کوسوں دور ہیں صرف نام کے اشتراک سے حقیقت ایک نہیں ہو سکتی۔

ہم نے روح کے متعلق بیان کیا کہ وہ موجود ہے مگر دکھائی نہیں دیتی نہ اب نہ کسی اور وقت۔ وہ موجود ہے مگر جسم میں حلول

کئے ہوئے نہیں وہ ہر جگہ ہے اور کہیں بھی نہیں۔ رگِ گردن سے قریب اور کوسوں دور۔ وہ جسم کی طرح فانی نہیں بلکہ باقی ہے اسی فطری اصول پر اسلام نے خدا کی یہ صفات بیان کیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کسی چیز میں حلول نہیں کرتا جسم نہیں رکھتا وغیرہ وغیرہ پس جو ادیان حلول کے قائل ہیں جسم کو مانتے ہیں۔ خدا کو قابلِ دیدار جانتے ہیں وہ کہاں فطری اصول پر باقی ہیں۔ یہود کہتے ہیں اللہ عزیر میں موجود تھا۔ نصاریٰ کہتے ہیں عیسیٰ میں حلول کئے ہوئے تھا۔ ہنود کہتے ہیں کرشن میں جلوہ نما تھا۔ نصاریٰ کہتے ہیں خدا رات بھر یعقوب سے کشتی لڑتا رہا اب فرمایئے کہ یہ کیونکر فطری اصول پر قائم ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا آپ ایک ایسی ذات کو کیونکر خدا مانتے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں فرمایا میں اسی لئے تو اس کو خدا مانتا ہوں کہ وہ دکھائی نہیں دیتا اگر وہ دکھائی دے جاتا تو پھر خدا کہنے کے قابل ہی نہ ہوتا۔

اب پھر فطری حالت پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ ہم بیان کر چکے کہ مدبرِ بدن روح ہے اور روح ایک ایسا عادل حکمران ہے کہ سر سے پیر تک جتنی اس کی رعایا ہے وہ سب کی یکساں خبر رکھتا ہے اور ہر عضو کے لئے اس کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کرتا ہے۔ آنکھوں کو روشنی ناک کو رطوبت زبان کو لعاب رگوں کو خون، ہڈیوں کو مغز، دل و جگر کو خون اور گرمی اور پھیپھڑوں کو ہوا کا بندوبست کرتا ہے۔ اس کی نظر میں سر سے لے کر ناخن تک سب اعضا برابر ہیں۔ سب کی روزی رسانی اس نے اپنے ذمے لی ہے۔ سوتے جاگتے وہ سب کی حفاظت کرتا ہے۔ سونے میں ذرا مچھر بدن پر بیٹھا اور ہاتھ وہیں پہنچا۔ سرکش قوتوں کو فطری سزائیں دیتا ہے کسی خاص عضو کا لحاظ نہیں کرتا کسی کی رو رعایت سے اپنے انصاف میں خلل نہیں ڈالتا۔ اس امر پر نظر رکھتے ہوئے اسلام نے مدبرِ عالم کی صفتِ عدل کو کہ تمام صفات ثبوتیہ اور سلبیہ اس کے تحت میں داخل ہیں داخلِ اصولِ دین کیا ہے۔ پس جو ادیان خدا کو عادل نہیں مانتے وہ یقیناً اصولِ فطرت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ روح کے احکام براہِ راست اعضا تک نہیں آتے بلکہ پہلے دل پر نازل ہوتے ہیں اور دل سے دماغ تک پہنچتے ہیں اور دماغ دیگر اعضا کی طرف بھیجتا ہے۔ پس دل بدن میں بمنزلہ بادشاہ ہے اور دماغ بمنزلہ وزیر۔ دل کا کام روح کے احکام لینا ہے اور دماغ کا کام سلطنت میں عمل کرانا۔ عملِ صحیح کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے اگر دماغ کا کام صحیح نہ رہے تو افعالِ انسانی مجنونانہ حرکات بن کر رہ جاتے ہیں۔ کمالِ بدن اسی وزیر کی قابلیت پر منحصر ہے وزیر جس قدر زیادہ زیورِ علم و فہم سے آراستہ ہوگا۔ اتنے ہی فضائل زیادہ حاصل ہوں گے۔ جس طرح دل کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح دماغ کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اعضا کا تعلق حصولِ علم میں براہِ راست دماغ سے ہے۔ انسان کی جتنی صفاتِ ممدوحہ یا مذمومہ ہیں سب کا تعلق اسی دماغ سے ہے اگر یہ ٹھیک نہیں تو کچھ بھی ٹھیک نہیں۔ روح کتنے ہی احکام ان پر نازل کئے جائے لیکن انسان فطری کمالات کی طرف اس وقت تک مائل نہیں ہو سکتا جب تک وزیر ٹھیک نہ ہو۔ دماغ کا دل سے اتنا قریبی تعلق ہے کہ دل کی کوئی خدمت بغیر اس کے ابھر نہیں سکتی۔ نیز یہ کہ کسی بات کے متعلق یہ پتہ چلانا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ دل سے نکل کر آئی ہے یا دماغ سے۔ پس جو ادیان رسالت و امامت کو نہیں مانتے وہ یقیناً عملِ فطرت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اسلام نے اسی فطری قاعدہ پر نظر رکھتے ہوئے اصولِ دین میں تیسری اصل رسالت اور چوتھی امامت قرار دی۔ کیونکہ بغیر ان دونوں کے خدائی احکام بندوں تک نہیں پہنچ سکتے۔

اب رہا قیامت کا فطری ہونا۔ ہر شخص یہ فطرتاً چاہتا ہے کہ ظالم کو ظلم کی سزا اور نیک کام کرنے والے کو اس کی نیکی کی جزا ملے۔ اگر

کسی مظلوم کا انصاف نہیں ہوتا تو اس کا دل تڑپتا رہتا ہے کہ ظالم سے بدلہ لے۔ خدا اگر بروں کو عملِ بد کی سزا اور نیکوں کو عملِ خیر کی جزا نہ دے تو یقیناً ظلم ہوگا۔ دنیا جزا و سزا کا گھر نہیں بلکہ دارِ امتحان اور دارِ عمل ہے۔ پس ضروری ہے کہ ایک دن جزا و سزا کا بھی ایسا ہو کہ ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا و سزا مل سکے۔

اصولِ دین کی طرح اسلام کے تمام فروعِ دین بھی فطری ہیں۔ اگر مجلس کے طولانی ہونے کا خوف نہ ہوتا تو ایک ایک فروع کا بھی اسی طرح موافقِ فطرت ہونا بیان کیا جاتا۔

رسول کے بعد ہر زمانہ میں ایک امامِ معصوم و منصوص من اللہ ہونا اسی لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو جملہ احکامِ اسلام کا موافقِ فطرت ہونا سمجھاتا رہے اور اپنے ہر ایک عمل سے ان کو عملِ صحیح کی تعلیم دیتا رہے نیز یہ کہ جب کوئی امر اصولِ فطرت سے ہٹا ہوا دیکھے تو اس کو صحیح کرنے کی جد و جہد کرے۔ موافقِ فطرت اصول کو حلال اور خلافِ عقل و فطرت کو حرام کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے تمام ائمہ نے اپنے اپنے زمانہ میں احکامِ اسلام کی صحیح صورت باقی رکھنے کی انتہائی جد و جہد کی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جانوں تک کو قربان کر دیا ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد یہی یہ تھا کہ خدا اور رسول کی حقیقی تعلیم کو بندگانِ خدا کے سامنے پیش کریں۔ یہی ضرورت تھی جس نے کربلا کے میدان میں امام حسینؑ سے وہ عظیم الشان قربانی پیش کرائی جس کی نظیر تاریخِ عالم میں ڈھونڈی نہیں ملتی۔ بنی امیہ جن کا راس و رئیس یزید بن معاویہ تھا اسلام کی نقاب منہ پر ڈالے ہوئے احکامِ شرع کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ وہ اسلام کے دوست نما دشمن تھے۔ حالتِ کفر میں اسلام کے ہاتھوں جو ذلتیں ان کو اٹھانا پڑی تھیں۔ ان کی وجہ سے آتشِ انتقام ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی وہ مسلمان ہی اس وجہ سے ہوئے تھے کہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلیں گے۔ امام حسین علیہ السلام کی گرانقدر قربانی کا مقصد یہی تھا کہ اس نقاب کو الٹ کر ان کی بداعمالیوں کے بدنما چہرے دنیا کو دکھا دیں اور مظلومیت کی مختلف صورتیں اختیار کر کے ابنائے روزگار کو یہ بتا دیں کہ ان کو اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ امام علیہ السلام نے طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کیا بلکہ مظلومیت و روحانیت سے کیا۔ کیونکہ طاقت سے مقابلہ کرنے میں صرف افراد کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا نہ کہ اس باطل مذہب کا جو اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ دوسرے اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جاتا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہمیشہ بادشاہوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں کون پوچھتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے۔ کون تحقیق کرتا ہے کہ حق پر کون تھا لیکن مظلومیت ایک ایسی چیز ہے کہ انسانی ہمدردی خود بخود اس کی طرف کھنچتی ہے اور لوگوں کو واقعات کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ حق و باطل کے معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے پس امام علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو مجھ سے ہمدردی اور میرے واقعات سے دلچسپی پیدا ہو تاکہ وہ واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ امام علیہ السلام کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور بڑی شاندار کامیابی ہوئی بنی امیہ جس مشن کو کامیاب بنانے کی در پردہ کوششیں کر رہے تھے حسینؑ کی مظلومیت کے ہاتھوں وہ نہ صرف اہلِ روزگار کی نظروں میں ذلیل ہوا بلکہ ہمیشہ کے لئے اس کا ناپاک وجود دنیا سے مٹ گیا اور اسلام کو اس خوفناک زد سے قیامت تک کیلئے امان مل گئی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حسینؑ کو فتح ہوئی اور یزید کی شکست۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ شکست کی علامتیں یزید کی طرف تھیں نہ کہ حسینؑ کی طرف۔ دنیا جانتی ہے کہ یزید خجل شرمندہ ہوا اور اس نے اپنا گناہ ابن زیاد کے سر دھرا۔ حسینؑ کے طرفداروں اور خاندان والوں میں سے کسی ایک نے بھی کبھی اپنی ندامت کا اظہار نہ کیا۔ شکست کے بعد خود بخود انسان کی نظر نیچی ہو جاتی ہے اور وہ ان واقعات کے ذکر سے گھبرانے

لگتا ہے۔ یہ علامت بھی یزیدیوں میں پائی گئی نہ کہ حسینیوں میں۔ بحمد اللہ حسین کا ذکر آج تک فخر و مباہات کے ساتھ ہو رہا ہے۔ حسین کی حق پرستی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ عین جنگ کے موقع پر جب لوگوں میں غیر ضروری تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ ننگ و نام کا خبط دشمن کی اچھی سے اچھی بات کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ فوج یزید سے ایک شخص ٹوٹ کر ادھر آ گیا۔ لیکن اس طرف کسی نے جانا تو بڑی بات ہے۔ اس خیال کو دل میں بھی نہ آنے دیا۔ بھولے سے بھی کسی کی زبان پر یہ فقرہ نہ آیا کہ یزید کی بیعت کر لینی چاہیئے۔

امام حسین کی حقانیت کا ثبوت اس سے بہتر اور کیا ہو گا کہ آپ کی فوج میں اس زمانہ کے بہترین علماء و فضلاء زہاد و عبّاد و حفاظ و قرّا غرض ہر طبقہ کے دیندار لوگ جمع تھے اور یہی نہیں کہ فوجِ شام میں اتفاقاً گھر جانے کی وجہ سے لڑ رہے تھے نہیں بلکہ انتہائی جوش اور شوق کے ساتھ انہوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ پھر یہی نہیں تھا کہ یہ سب حسین کے عزیز تھے نہیں بہت زیادہ تعداد غیروں کی تھی اور یہ غیر ایسے تھے کہ کسی طرح جوش وفا میں اپنوں سے کم نہ تھے۔ چنانچہ زہیر ابن القین کے حالات میں ہے کہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ شمر نے جناب عباس سے تنہائی میں کچھ گفتگو کی ہے تو ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ جناب عباس اس شقی کے اغوائے اس طرف کھینچ جائیں۔ پس شب عاشور تقریباً نصف شب گزر جانے کے بعد جناب زہیر اپنے خیمہ سے نکلے اور گھوڑے پر سوار ہو کر جناب عباس کے خیمہ کے سامنے آئے اور آواز دی اے ابو الفضل العباس ذرا خیمہ سے باہر تشریف لائیے مجھے آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے۔ چنانچہ جناب عباس باہر تشریف لائے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جناب زہیر کے ساتھ چلے جب خیمہ گاہ سے کچھ دور نکل گئے تو جناب زہیر کہنے لگے اے ابو الفضل العباس میں آپ کو ایک واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ جب شہزادیٔ عالم جناب فاطمہ زہرا کا انتقال ہوا تو جناب امیر علیہ السّلام کسی طرح دوسری شادی کرنے پر تیار نہ تھے جب لوگوں نے زور دیا تو آپ نے فرمایا اچھا کسی بہادر شریف اور غیرت دار قبیلہ کی عورت تلاش کرو تا کہ اس سے جو لڑکا پیدا ہو وہ روزِ عاشورہ میرے حسین پر اپنی جان قربان کرے۔

مومنین! یہ سننا تھا کہ جناب عباس نے جوشِ شجاعت میں ایک ایسی انگڑائی لی کہ رکابوں کے تسمے ٹوٹ گئے اور فرمانے لگے سبحان اللہ اے زہیر! تم مجھے جوشِ شجاعت دلانے آئے ہو۔ اے زہیر! کیونکر ممکن ہے تم غیر تو فرزندِ رسول کے ساتھ اتنی محبت اور ہمدردی رکھو اور میں بھائی ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دوں۔ اے زہیر! لعنت ہے ایسی زندگی پر جو حسین سے جدا ہو کر دنیا میں بسر کی جائے۔ جناب زہیر یہ سنکر بشاش ہو گئے اور فرمانے لگے اے ابو الفضل میری اس گستاخی کو معاف فرمائیے میں نے جو کچھ کہا ہے محبتِ حسین میں کہا ہے مرحبا آپ کی وفاداری و جاں نثاری پر۔

مومنین! جناب عباس سے وفادار بھائی دنیا میں لوگوں کو کہاں ملتے ہیں۔ آپ کے دم سے امام مظلوم اور مخدراتِ عصمت و طہارت کو بڑی ڈھارس تھی۔ جب کبھی کوئی اہم معاملہ آ کر پڑتا تو جناب عباس کے سپرد کیا جاتا۔ جناب عباس جن کا سن کربلا میں ۳۲ یا ۳۴ سال کا تھا نہایت وجیہ اور خوبصورت جوان تھے۔ اسی وجہ سے قمرِ بنی ہاشم کہلاتے تھے۔ فن حرب و ضرب میں کوئی آپ کی مثل نہ تھا۔ آپ نے یہ سب کمالات اپنے پدر بزرگوار جناب امیر علیہ السّلام سے حاصل کئے تھے۔ کربلا میں لشکرِ حسینی کے تمام ہاشمی جوان فن سپاہگری میں حضرت عباس کے شاگرد تھے۔

آپ کی غیر معمولی شجاعت اور خداداد زور و طاقت پر اہلِ حرم کو اتنا بھروسہ تھا کہ جناب زینب فرماتی ہیں کہ جب میں اپنے گھر میں قتلِ حسین کا تذکرہ سنتی تھی تو دل میں کہا کرتی تھی جس حسین کا بھائی عباس جیسا شیر ہو کس کی طاقت ہے کہ اسے قتل کر ڈالے جس زینب کو عباس جیسے بہادر بھائی کی بہن بننے کا فخر حاصل ہو کس کی ہمت ہو گی کہ اس کے سر سے چادر چھین لے لیکن آہ آہ روزِ عاشور جب میرا شیر سا بھائی نہرِ فرات کے کنارے شہید کر ڈالا گیا تو اس وقت مجھے سب باتوں کا یقین ہو گیا۔

جناب عباس امام مظلوم کی مختصر سی فوج کے علمبردار بھی تھے۔ اور اہلِ حرم کے سقا بھی۔ منقول ہے کہ ساتویں محرم کو جب پسرِ سعد کے حکم سے نہرِ فرات پر فوج کے پہرے بیٹھ گئے اور لشکرِ حسین میں پانی جانے کی سخت ممانعت ہو گئی تو چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپنے لگے جناب سکینہ سے حضرت عباس کو بہت زیادہ انس تھا وہ نڈھال پڑی ہوئی تھیں۔ جناب عباس سے بچوں کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ چند بہادروں کے ساتھ آپ نہر پر گئے اور لڑ بھڑ کر جس طرح بن پڑا چند مشکیزے پانی کے لے آئے اور خود اپنے ہاتھ سے سب کو پانی پلایا۔ اسی وجہ سے آپ سقائے اہلِ حرم کہلاتے ہیں اور اسی لئے ساتویں محرم آپ سے مخصوص ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب عباس نے اس بارہ میں بڑی کد کی کہ کسی طرح پیاسوں تک پانی پہنچ جائے۔ چنانچہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ اور نو محرم کو جو متعدد کنوئیں لشکرگاہِ حسین میں کھودے گئے اس کے محرک جناب عباس ہی تھے اور آپ نے ان کے کھودنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ مگر آہ پیاسوں کی قسمت میں جو پانی پینا نہ تھا تو کسی ایک کنوئیں نے بھی پانی نہ دیا اور مجبوراً ان کو بند کرنا پڑا۔ روزِ عاشور بھی جناب عباس نے بہت سی خدمات انجام دیں منجملہ ان کے ایک خدمت یہ بھی تھی کہ جب میدانِ جنگ میں کوئی ناصرِ حسین کام آتا تھا اور امام علیہ السلام اس کی لاش پر جاتے تھے تو جناب عباس ضرور تشریف لے جاتے تھے۔ اور امام مظلوم کو لاشہائے شہدا اٹھانے میں مدد دیتے تھے۔ آہ! کیسا صدمہ پہنچا ہو گا جب یہ بتیس برس کا شفیق بھائی مرنے کی اجازت مانگ رہا ہو گا۔

منقول ہے کہ جب جناب عباس اجازتِ کارزار لینے کی غرض سے خدمتِ امام میں حاضر ہوئے تو امام علیہ السلام نے اپنی چھاتی سے لگا کر فرمایا۔ بھیا عباس تم ہی اس وقت بےکسی میں حسین کی زندگی کا سہارا ہو۔ آہ! تمہارے بعد میں کیونکر زندہ رہوں گا تم میری فوج کے علمدار ہو تم میرے ٹوٹے دل کی ڈھارس ہو۔ تمہاری وجہ سے اہلِ حرم کا دل قوی اور بچوں کے بےچین دلوں کو تسکین ہے۔ بھیا عباس یہ وقت ایسا نہیں کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔ جناب عباس نے عرض کی آقا اب آپ کی فوج میں سوائے اس غلام اور علی اکبر کے اور رہا ہی کون ہے اب بغیر غلام کے بھیجے چارۂ کار نہیں۔ الغرض امام علیہ السلام نے صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر جناب عباس کو اجازتِ کارزار مرحمت فرمائی۔ لکھا ہے کہ جب میدانِ جنگ میں جناب عباس کی آمد آمد ہوئی تو فوجِ یزید میں ایک گھبراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ عمر سعد گھبرایا ہوا ہر طرف پھر رہا تھا۔ اور اپنی فوج سے بتاکید کہتا تھا۔ دیکھو ہوشیار رہنا عباس بڑا بہادر سپاہی ہے۔ اگر تم نے اس پر قابو پالیا تو سمجھو کہ بس حسین پر فتح حاصل کر لی۔

الغرض جناب عباس شیرانہ ہیبت کے ساتھ میدان میں تشریف لائے اور ایک شجاعانہ رجز پڑھ کر اس قوم جفا شعار پر حملہ آور ہوئے دشمن ہر طرف بھاگے پھرتے تھے۔ لکھا ہے کہ پہلے ہی حملہ میں آپ نے ۱۲۰ ناریوں کو واصلِ جہنم کیا۔ یہاں تک کہ آپ کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگاتے نہرِ فرات میں داخل ہو گئے۔ پیاس سے آپ کا غیر حال تھا۔ ایک چلو میں پانی لے کر چاہا کہ اپنی پیاس بجھائیں کہ ننھے ننھے بچوں کی

پیاس کا خیال آگیا اپنے نفس سے خطاب کرکے فرمانے لگے۔ اے نفس وائے ہو تجھ پر کہ تو یہاں اپنی پیاس بجھانی چاہتا ہے اور وہاں چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے دم توڑ رہے ہیں اے نفس کیا شرطِ وفاداری و جاں نثاری یہی ہے۔ یہ کہکر چلّو سے پانی پھینک دیا اور سوکھی ہوئی مشکِ سکینہ بھر کر اسی طرح پیاسے کے پیاسے نہر سے نکل آئے۔

جب پسر سعد نے یہ دیکھا کہ غازی مشک بھر کر خیام حسین کی طرف لے جانے والا ہے تو ایک بار لشکر کو ڈانٹ کر کہنے لگا خبردار خیمہ حسین تک پانی نہ جانے پائے۔ چاروں طرف سے اس شیر کو گھیر لو۔ یہ سنتے ہی تمام منتشر فوج ایک جگہ جمع ہوگئی اور ہر طرف سے وار پر وار کرنے شروع کر دیئے جناب عباس شیر غضبناک کی طرح ان پر حملہ آور ہوئے۔ آخر ش تنہا کہاں تک ہزاروں کا مقابلہ کرتے زخموں سے بدن چور چور تھا۔ خون سے کپڑے تر بہ تر تھے۔ اسی حالت میں کسی ظالم نے داہنا ہاتھ آپ کا قلم کر دیا آپ نے بائیں ہاتھ میں تلوار لے کر لڑنا شروع کیا۔ آہ ایک ظالم نے موقع پاکر آپ کا بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ آہ آہ کس زبان سے کہوں کہ اس ہاتھ کے کٹتے ہی علم فوج حسینی خاک پر گر کر ٹھنڈا ہوگیا۔

مومنین جناب عباس کو اس حالت میں بھی یہی فکر تھی کہ کسی طرح پانی بچوں تک پہنچ جائے۔ چنانچہ مشک کا تسمہ دانتوں سے دبائے اپنے گھوڑے کو بڑھائے چلے جا رہے تھے کہ ظالم حرملہ نے ایک ایسا تیر مشک پر مارا کہ سارا پانی بہہ گیا۔ پانی کے بہتے ہی جناب عباس نے ایک آہ سرد کھینچی اور خیمہ گاہ تک پہنچنے کا جوش جاتا رہا۔ آہ آہ ایک ظالم نے پیچھے سے آکر ایک ایسا گرز آپ کے سر پر مارا کہ پھر آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ اور آواز دی یا ابن رسول اللہ ادرکنی۔ اس آواز کے سنتے ہی امام مظلوم نے اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے پکڑلی اور فرمایا الآن انکسر ظهری و قلت حیلتی آہ اب کمر حسین کی ٹوٹ گئی اور راہ چارہ مسدود ہوگئی۔ اس کے بعد باحال تباہ علی اکبر کو ساتھ لے کر واعباساہ واعباساہ کے نعرے مارتے ہوئے نہر فرات کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں دو مقام پر جھک کر امام مظلوم نے کوئی ایسی چیز اٹھائی کہ چھاتی سے لگا کر زار زار رونے لگے۔ حضرات آپ سمجھے یہ کیا چیز تھی یہ امام مظلوم کے قوتِ بازو جناب عباس کے کٹے ہوئے ہاتھ تھے۔ امام علیہ السلام آہ کا نعرہ مار کر فرما رہے تھے۔ عباس! میرے مظلوم برادر تیری وفاداری اور جاں نثاری کے قربان۔ آہ بھیا عباس تمہارے یہ ہاتھ میری نصرت میں قلم ہوئے۔

الغرض امام روتے پیٹتے باحالِ پریشان نہر کے کنارے پہنچے دیکھا ایک طرف تو فوج کا علم سرنگوں پڑا ہے اور دوسری طرف مشک سکینہ تیر سے چھدی ہوئی خاک پر پڑی ہے۔ آہ آہ مومنین خدا کسی بھائی کو بھائی کی یہ حالت نہ دکھائے جو امام علیہ السلام نے اپنے بھائی کی دیکھی۔ دیکھا کہ ۳۴ برس کا شیر سا بھائی دونوں ہاتھ کٹائے خون میں نہائے خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا ہے۔ آپ زار زار روتے ہوئے بھائی کے سرہانے بیٹھ گئے اور جناب عباس کا سر خاک سے اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور فرمانے لگے۔ عباس حسین تمہاری اس مظلومیت کے صدقے مظلوم اور بیکس حسین جسے تم نے پکارا تھا تمہاری یہ تباہ حالت دیکھنے کو آیا ہے۔ وفادار برادر! جاں نثار برادر! میرے پیارے عباس آنکھ کھولو اور اس سے بات کرو۔ بھیا عباس مجھے بتاؤ تمہارا کیا حال ہے۔ عرض کی مولا خدا کا شکر ہے کہ میں نے آپ کی نصرت میں شرفِ شہادت حاصل کیا۔ مولا میری آرزو تھی کہ آپ کے چہرۂ اقدس پر نظر کرکے اس دنیا سے رخصت ہوتا۔ حضرت نے پوچھا پھر کیا امر مانع ہے۔ عرض کی مولا کیونکر دیکھوں ایک آنکھ میں تیر پیوست ہے اور دوسری آنکھ میں سر کا لہو بھر گیا ہے۔ یہ سنکر امام علیہ السلام نے حضرت عباس کی آنکھ سے

خون معاف کیا۔ آہ جناب عباس نے ایک حسرت بھری نگاہ سے حضرت کی طرف دیکھا اور عرض کی مولا اگر غلام سے کوئی تقصیر ہو گئی ہو تو بحل فرمایئے۔ یہ سنکر امام حسین علیہ السلام تڑپ گئے اور بھائی سے لپٹ کر فرمانے لگے جانِ برادر ایسے کلمات کہہ کر مظلوم حسین کا دل نہ دکھاؤ۔ عباس تم جیسے وفا شعار بھائی دنیا میں کہاں ملتے ہیں۔ پھر فرمایا اے بھائی تمہارا یہ وقت آخر ہے۔ حسین مظلوم سے کچھ وصیت کرو۔ اگرچہ تھوڑی دیر بعد میں بھی اسی منزل کا مسافر بننے والا ہوں جو تم کو درپیش ہے۔ تاہم میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری آخری خواہش معلوم کروں یہ سنکر جناب عباس نے عرض کی مولا میری وصیت یہ ہے کہ آپ میری لاش کو خیمہ میں نہ لے جایئے۔ حضرت نے پوچھا کیوں؟ عرض کی مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔ آہ پیاسی بچی سے یہ وعدہ کر کے آیا تھا کہ تیرے لئے پانی لاؤں گا۔ آہ میں اس کی یہ مراد پوری نہ کر سکا۔ اور اس سے شرمندہ ہو کر دنیا سے جا رہا ہوں۔ مومنین! ایک وجہ اس کی اور بھی سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب عباس یہ جانتے تھے کہ میرے مرنے سے امام مظلوم کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ اب ان میں اتنی طاقت کہاں کہ میری لاش اٹھا کر یہاں سے خیمہ تک لے جا سکیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ جب حضرت عباس اپنی آرزو بیان کر چکے تو امام علیہ السلام نے فرمایا بھیا عباس ایک آرزو حسین کی بھی ہے۔ اس کو بھی پورا کرو۔ آج تک تم اپنے کو غلام اور مجھے آقا کہتے رہے چاہتا ہوں کہ آج آخری بار مجھے بھائی کہہ کر پکار لو۔ آہ مومنین جب جناب عباس نے امامِ مظلوم کی اس آرزو کو پورا کیا تو بھائی کہتے ہی دم نکل گیا۔ ؎ بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں۔

آہ آہ امامِ مظلوم حضرت عباس کی لاش کو وہیں چھوڑ کر باحال پریشان مشک و علم لئے خیمہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ کتب مقاتل میں ہے کہ جب جناب سکینہ نے درِ خیمہ سے علم کو آتا ہوا دیکھا تو خوش خوش خیمہ کے اندر گئیں اور بچوں کو پکار پکار کر کہنے لگیں۔ اے بچو جلد اپنے اپنے کوزے لے کر آؤ کہ میرے چچا عباس پانی لئے آ رہے ہیں۔ دیکھو وہ علم آتا نظر آ رہا ہے۔ یہ آواز سنتے ہی پیاسے بچوں کے بے جان بدنوں میں جان آ گئی۔ اور اپنے خالی کوزے لے کر درِ خیمہ پر آ کھڑے ہوئے۔ آہ مومنین اس وقت ان بچوں کے دل پر کیا گزری ہو گی جب یہ سنا ہو گا کہ سقائے اہلحرم نہر کے کنارے شہید ہو گیا۔ لکھا ہے کہ جب امام علیہ السلام علم جناب عباس جس کا پھریرا خون سے تر تھا خیمہ میں لے کر آئے تو اہلحرم میں ایک کہرام بپا ہو گیا۔ سیدانیوں نے واعباساہ واعباساہ کہہ کر سینہ زنی شروع کی۔ مومنین! جناب عباس کی شہادت معمولی شہادت نہ تھی بلکہ اس نے اہلحرم کے دل توڑ دیئے تھے اب ایک ایک بی بی کو امام علیہ السلام کی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی۔

الا لعنۃ اللّٰہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۵

سترہویں مجلس

تفسیر آیۂ الّذی رفع السّموات بغیر عمد اور شہادت حضرت علی اکبر علیہ السّلام

قال اللہ تبارک وتعالیٰ الّذی رفع السّموات بغیر عمدٍ ترونھا ثمّ استوی علی العرش وسخّر الشّمس والقمر کلٌّ یجری لِاجلٍ مسمًّی یدبّر الامر یفصّل الایات لعلّکم بلقاء ربّکم توقنون ۝ وھو الّذی مدّ الارض وجعل فیھا رواسی وانھاراً ومن کلّ الثّمرات جعل فیھا زوجین اثنین یغشی اللّیل النّھار انّ فی ذٰلک لایاتٍ لقومٍ یتفکّرون ۝ وفی الارض قطعٌ متجاورات وجنّات من اعنابٍ وزرعٌ ونخیلٌ صنوانٌ وغیر صنوانٍ یسقٰی بماءٍ واحدٍ ونفضّل بعضھا علی بعضٍ فی الاکل انّ فی ذٰلک لایاتٍ لقومٍ یعقلون ۝ (اللہ وہ ہے جس نے ان آسمانوں کو جنہیں تم دیکھتے ہو بغیر کسی ستون کے اونچا کیا پھر وہ عرش پر قابض ہوا پھر اس نے چاند اور سورج کو مسخر کیا اور ان میں سے ہر ایک کو وقتِ معین تک چلنا ہوگا۔ وہی ہر امر کی تدبیر کرتا ہے اور آیات کو جدا جدا دکھاتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کے یقین کرنے والوں میں سے بن جاؤ۔ اللہ وہ ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس پر پہاڑ بنائے اور نہریں جاری کیں اور ہر قسم کے پھل کا جوڑا پیدا کیا۔ رات کو دن ڈھانپ لیتا ہے اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں اور زمین میں پاس پاس بہت سے قطعے ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں، کھیتیاں ہیں اور خرموں کے درخت ہیں۔ یہ دو شاخوں والے بھی ہیں اور ایک شاخ والے بھی جن کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے ہم نے کھانے کے ایک پھل کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اس میں عقل والے لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں)

خداوندِ عالم نے جتنی چیزیں خلق فرمائی ہیں انسان نے ان کی نقل ضرور بنائی ہے مثلاً چاند بنایا درخت بنائے۔ انسان وحیوان جنگل اور پہاڑ سب کچھ بنا ڈالا ہے لیکن اب تک کوئی چھت ایسی نہیں بنا سکا جو بغیر ستون کے قائم ہو فتبارک اللہ احسن الخالقین ۝ سموات کے متعلق بطلیموس وغیرہ قدیم فلاسفۂ یونان کا یہ خیال تھا کہ یہ طبق در طبق ہیں اور یہ ستارے ان میں جڑے ہوئے ہیں۔ بطلیموس کے اس نظریہ کو سب سے پہلے کوپرنکس نے توڑا اور یہ ثابت کیا کہ جس کو آسمان کہتے ہو وہ کوئی چھت جیسی چیز نہیں بلکہ قدرت نے فضا میں ایک لطیف مادہ خلق فرمایا ہے جس کو ایتھر کہتے ہیں یہ ہوا سے کہیں زیادہ لطیف و شفاف ہے اسی میں تمام سیارے اس طرح دوڑے دوڑے پھرتے ہیں جیسے پانی میں جہاز یہ باہمی کشش سے قائم ہیں اور ان کی گردش کے دائرے تلے اوپر بنتے گئے ہیں۔ یہ نیلگوں رنگ جو ہم کو نظر آتا ہے یہ ہوا کا رنگ ہے۔ ایتھر ایک بے رنگ چیز ہے۔ اگر ایتھر نہ ہو تو زمین پر نہ کسی سیارے کی روشنی آسکتی ہے نہ کوئی آواز کسی کے کان تک پہنچ سکتی ہے۔ روشنی اسی ایتھر کے ذریعہ سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے۔

جب یہ نظریہ قائم ہوا تو خرق التیام کا جھگڑا ہی ختم ہوگیا۔ اب معراج ثابت کرنے میں کوئی دقت ہی نہ رہی۔ قرآن میں سموات و فلک دو لفظ استعمال ہوئے ہیں سموات سما کی جمع ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں اور اس سے مراد ستاروں کی بلندیاں ہیں اور فلک مشتق ہے

فلک سے جو چرخہ کے دم کرکو کہتے ہیں اس سے مراد سیاروں کے دائرے ہیں۔

ثمّ استوی علی العرش (پھر عرش پر غلبہ حاصل کیا) عرش کے معنی تخت کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد فلک الافلاک یا فلک نہم ہے آٹھویں آسمان کو اصطلاحِ قرآن میں کرسی کہتے ہیں۔ جدید ہیئت دانوں کی تحقیق میں بھی ستارے نو ہیں۔ سات تو پہلے سے تھے ہی یورینس و نیپچون دو ستارے بعد میں دریافت ہوئے ہیں۔ نیپچون سب سے اونچا ستارہ ہے۔ جس کی روشنی ہم تک تین ہزار سال میں پہنچتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار جدید تحقیق سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے کتنی دور ہے۔ نظام سماوی میں سب سے بڑا سیارہ یہی ہے۔ پس استوی علی العرش کے یہ معنی نہیں کہ خدا عرش پر بیٹھ گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ اس نے اتنے بڑے سیارے پر اپنی قدرت سے غلبہ حاصل کیا یعنی اس کو بھی ایک مخصوص نظام پر قائم کر دیا۔ اور دیگر سیاروں کی طرح وہ بھی اپنے مخصوص دائرہ میں چکر کھاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کا اگلا جزء ہے وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تخلیق سموات ہوئی پھر نظام عرشی قائم کیا گیا پھر شمسی و قمری نظام قائم ہوا۔ حکمائے حال کی تحقیق یہ ہے کہ نظامِ شمسی میں سورج سب سے بڑا سیارہ ہے اور سب سے پہلے اسی کا وجود ہوا ہے۔ نظامِ شمسی میں جتنے کرے ہیں وہ سب اسی کے جز ہیں۔ نیز یہ کہ سورج میں ۶۲ عناصر ہیں جن میں ہیلیم اور ہائیڈروجن خاص ہیں جتنے عناصر ان کے علاوہ ہیں وہ انہی سے مرکب ہیں بسیط اجزاء صرف یہی دو ہیں۔ دنیا کی تخلیق میں سب سے بڑا دخل انہی کو ہے اور سورج کے بنانے میں سب سے بڑا حصہ انہی کا ہے۔ عالم نورانی میں بھی ایسا ہی ہے أنا وعلي من نور واحد سے معلوم ہوا کہ وہاں بھی دو ہی جز باعثِ تخلیق عالم ہیں۔

سورج کی کرنیں اپنے میں بارہ رنگ رکھتی ہیں اور انہی سے گلزار عالم میں بہار ہے۔ پتھروں میں لعل و جواہرات درختوں میں پھل پھول اور پتے سب انہی سے ہیں جس چیز میں حسن روشنی نمو اور خوشبو بدبو وغیرہ ہے سب انہی سے ہے۔ بارشِ نور سب پر یکساں ہے لیکن ہر شے بقدر اپنی حالت کے فائدہ یا نقصان حاصل کرتی ہے۔ یہی حال آفتابِ رسالت کا ہے رسول کی صحبت سے فیضیاب ہونے والے بھی بقدر اپنی اپنی حالت کے ہوئے۔ یہی نور آفتابِ دنیا کے لئے باعثِ ضیا ہے مگر شپرہ کے لئے باعثِ زحمت۔

جب تک سورج رہتا ہے ستارے سب غائب رہتے ہیں۔ لیکن چاند کے دورہ میں تمام ستارے ایک بار چمک جاتے ہیں۔ گو چاند کی روشنی کے سامنے ان کی روشنی بالکل ماند ہے مگر پھر بھی وہ ٹمٹمائے ضرور جاتے ہیں۔ ان ستاروں میں کچھ سعد بھی کچھ نحس بھی۔ آفتابِ رسالت کی ضیا باری کے وقت سب اصحاب خاموش اور بے نور تھے جب ماہتابِ امامت کا دورہ ہوا تو چمک اٹھے ان میں سعد و نحس (مومن و منافق) دونوں طرح کے لوگ تھے اصحابی کالنجوم والی حدیث کا مفہوم غلط سمجھا گیا ہے کیونکہ ہر ستارے سے سمت کا تعین دشوار ہے۔ عام لوگوں کا تو کیا ذکر جہاز رانوں کو بھی ہر ستارہ سے سمت کا پتہ نہیں چل سکتا البتہ مخصوص ستارے جو کنسٹیلیشن کی صورت میں ہیں اور جن کو ہماری زبان میں بروج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ضرور سمتوں کے تعین میں رہنمائی کرتے ہیں۔ پس اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو از روئے روایت اصحاب سے مراد اہلبیت ہوں گے نہ کہ عام صحابہ۔

خداوند عالم نے قرآن میں جا بجا سورج کے ذکر کے ساتھ ساتھ چاند کا بھی ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق بہت ہی قریب کا ہے۔ غروب ہونے کے بعد بھی سورج کا تعلق چاند سے قطع نہیں ہوتا۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ جدا ہے لیکن ایسا نہیں وہ غیب کے پردہ میں سے برابر اپنی روشنی اس پر ڈالتا رہتا ہے۔ اسی طرح آفتابِ رسالت کا تعلق بھی ماہتابِ امامت سے قطع نہیں ہوتا۔ سورج کی کرنیں برابر ماہتاب کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں اگرچہ پس پردہ اور سیارے بھی روشنی حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن جو بات چاند کی روشنی میں ہے اور دوسروں میں کہاں۔ سب سے زیادہ نور کا حصہ اسی کے پاس ہے۔

سورج نور ہے مگر کامل نہیں۔ اگر ایک پتلا سا تنکا دھوپ میں سیدھا کھڑا کر دیا جائے تو وہ اس کو چاروں طرف سے روشن نہیں کر سکتا یعنی کسی نہ کسی طرف سایہ ضرور رہتا ہے۔ لیکن آفتابِ رسالت کا نور کامل تھا۔ اسی لئے جسمِ رسول کا سایہ نہ تھا۔

جہاں سورج اپنی ضیا باری سے بے شمار چیزوں کو خوشبودار بناتا ہے۔ وہاں بہت سی چیزیں سڑ بھی جاتی ہیں لیکن یہ قصور سورج کی روشنی کا نہیں بلکہ ان چیزوں کا ہے جن کے اندر فاسد مادہ پایا جاتا ہے بعینہٖ یہی حال تعلیم رسول کا تھا اسی سے ایک گروہ نے کمالِ ایمان کا مرتبہ حاصل کیا اور اسی سے ایک گروہ منافق و گمراہ بن گیا۔

قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے سخر لکم الشمس والقمر۔ لکم کی ضمیر کا تعلق عام لوگوں سے نہیں ہو سکتا کیونکہ عام انسانوں کی تسخیر میں نہ آفتاب ہے نہ ماہتاب بلکہ اس آیت میں جن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے وہ محمدؐ اور اہلبیتِ محمدؐ ہیں یہ جب چاہیں انگلی کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیں اور جب چاہیں ڈوبے ہوئے سورج کو لوٹا لیں۔

بہت سے سیارے آفتاب سے نور حاصل کرتے ہیں اور بعض اپنے وجود میں چاند سے کہیں زیادہ بڑے ہیں مثلاً مشتری کہ خود چار چاند اپنے ساتھ رکھتا ہے یا زحل کہ سات یا دس چاند اپنے ساتھ لئے گردش کرتا ہے لیکن خدا نے کسی جگہ سورج کے ساتھ کسی اور ستارہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ جہاں کہا ہے شمس و قمر ساتھ ساتھ کہا ہے۔ مثلاً الشمس والقمر بحسبان یا مثلاً والشمس وضحٰھا والقمر اذا تلاھا۔ قسم ہے سورج کی اور اس کی چڑھتی دھوپ کی اور قسم ہے چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آئے۔ پس معلوم ہوا کہ ان دونوں میں کوئی خاص تعلق ہے۔ تمام ستاروں میں صرف چاند ہی ایسا ہے کہ سورج کی صحیح معنی میں قائم مقامی کر سکتا ہے والقمر اذا تلاھا سے معلوم ہوا کہ سورج مقدم ہے اور چاند تالی یعنی سورج کے بعد فوراً چاند کی حکومت ہے۔ دیکھیے ادھر سورج غروب ہوا اور بلا فاصلہ چاند نکلا گویا اس کا خلیفہ بلا فصل ہے۔ پھر یہ کہ جہاں سورج غروب ہوا ہے وہیں سے چاند نے طلوع کیا ہے۔ مطلع شمس و قمر بظاہر جدا جدا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایک ہیں۔ شروع میں جہاں سورج غروب ہوتا ہے چاند وہیں سے نکلتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں صحیح صحیح رابطہ ہے اور جو سورج کا مغرب ہے وہی چاند کا مطلع ہے بلکہ کچھ دن بعد جو سورج کا مطلع ہوتا ہے وہی چاند کا مطلع بن جاتا ہے۔ یہ کمال اتحاد اور حقیقت کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔ شعب ابوطالب میں جہاں سے رسول اٹھے وہیں علی سوئے۔ شب ہجرت جہاں سے رسول گئے وہیں علی سوئے۔ شب معراج جہاں سے رسول اٹھے وہیں علی لیٹے۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ چاند کی منزل وہی ہے جو سورج کی ہے یعنی دونوں کا ایک ہی راستہ ہے۔ اسی طرح جس صراطِ مستقیم کے ہادی رسول ہیں اسی کے ہادی علی ہیں۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ سال میں ایک سورج کے قائم مقام بارہ چاند ہوتے ہیں جن کا مشرق و مغرب جن کی رفتار اور منزل جن کی

صورت اور قد جن کی ہدایت و ضیا باری بالکل ایک ہے سر مو فرق نہیں۔ آفتاب رسالت کے قائم مقام بھی بارہ ہیں جو بلحاظ عصمت و طہارت فضل و کمال ہدایت و قربت بالکل ایک ہیں سر مو فرق نہیں۔ اسی لئے تو رسول نے فرمایا ہے اولنا محمد و اوسطنا محمد و آخرنا محمد و کلنا محمد پھر یہ خصوصیت بھی غور فرمایئے کہ چاند آخر میں جا کر غائب ہو جاتا ہے گویا چاند کی آخری منزل غیبت ہے لیکن بعد غیبت ظہور بھی ضروری اس کی رجعت بھی لازمی ہے۔ تین دن ابتدائی چاند پر بھاری ہوتے ہیں گردش فلکی اسے پوری ضیا باری کا موقع نہیں دیتی اور وہ گردش گیر رہتا ہے لیکن چوتھی منزل پر پہنچ کر اس کی روشنی بڑھ جاتی ہے اور اپنے نور سے دنیا کو ضیا بار کرنے لگتا ہے اور آخر زمانہ میں اندھیرا ہو جاتا ہے کیونکہ چاند غائب ہوتا ہے اور دنیا کے لوگوں کو اس کا انتظار رہتا ہے فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔ چاند کے دوبارہ ظہور پر دنیا کے چونکہ بہت سے کام ملتوی رہتے ہیں اس لئے لوگ دعائیں مانگتے ہیں کہ جلد ظہور ہو و عجل ظہورہ قائمنا۔

چاند کی حکومت میں بہت سی سرکش قوتیں زور مارنے لگتی ہیں۔ چور دیواریں پھاند کر گھروں میں کودنے لگتے ہیں۔ موذی جانور سوراخوں سے نکل پڑتے ہیں درندے حملہ آور ہو جاتے ہیں کتے روشنی سے بغض للہی رکھنے کی بنا پر بھونکنے لگتے ہیں۔ رہزن و بٹ مار کسی جگہ جمع ہو کر کسی شریف آدمی کا گھر لوٹنے کی تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ سورج کی روشنی چونکہ بہت تیز ہوتی ہے اور ہر ایک کو پردہ فاش ہونے کا خوف لگا رہتا ہے اس لئے سب کے سب اپنی بد خواہشوں کو دبائے ادہر ادہر گوشوں میں چھپے رہتے ہیں اور اگر کسی مجبوری سے کبھی کھلے میدان میں نکل بھی آتے ہیں تو ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ چاند کی حکومت میں چونکہ تاریکئ شب کی نقاب پڑ جاتی ہے اور ہر ایک موذی کی صورت صاف نظر نہیں آتی اس لئے ایسا موقع مل جاتا ہے۔ عہد امامت میں اس تاریکی کو نفاق سمجھ لو۔ یہ بھی کس قدر لطیف نکتہ ہے کہ چاند تین روز دشمنوں کے زیر اثر رہتا ہے جس کو قمر در عقرب کہتے ہیں۔ عہد امامت پر بھی تین ہی دور بھاری تھے اس سے بھی لطیف تر بات یہ ہے کہ تمام ستاروں میں صرف چاند ہی ایسا ستارہ ہے کہ درد اور دکھ میں سورج کا شریکِ حال ہے مثلاً اگر سورج کو گرہن ہوتا ہے تو چاند کو بھی گرہن ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عبادات کا تعلق بھی چاند ہی سے ہے نہ کہ ستاروں سے۔ بارہ مہینوں کا شمار اسی سے کیا جاتا ہے۔ عبادتوں کا حساب اسی سے ہوتا ہے یہ رمضان کا مہینہ آیا یہ ذی الحجہ کا آیا۔ یہ محرم کا آیا۔ فلاں تاریخ شبِ قدر ہے فلاں تاریخ شبِ برات، آج عید ہے کل بقر عید ہے۔ اب گیارہ مہینے ختم ہوئے تو زکوٰۃ واجب ہوئی۔ اگر یہ حساب صحیح نہیں تو غیر وقتی عبادت حرام۔ اسی کا نام دین کے دائرہ میں محبتِ اہلبیت ہے۔ حق۔ بے حُبِّ اہلبیت عبادت حرام ہے۔

پس یاد رکھئے آپ کا حساب کتاب دامنِ قمر سے وابستہ ہے اگر یہ دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو خسر الدنیا و الآخرہ کا مصداق ہو جائے گا یاد رکھئے دورِ قمر کی عبادت مقبول بھی ہے موثر بھی۔ رات کی عبادت سب سے بہتر عبادت ہے۔ خاصانِ خدا رات ہی کو زیادہ عبادت کرتے ہیں معلوم ہوا کہ چاند کا دور عبادت کا دور ہے نہ کہ حکومت کا ومن اللیل فاسجد لہ و سبحہ لیلاً طویلا۔

مجلس کا عنوان جن آیات سے کیا گیا ہے اب ان کے بقیہ اجزاء پر بھی ایک نظر ڈالئے هو الذی مد الارض و جعل فیها رواسی و انهاراً۔ واللہ وہ ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اٹھائے اور چشمے بہائے، فضائے آسمانی میں جہاں بے شمار ستاروں کی گردش ہے۔ ہماری زمین ایک سرے کے دانہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یہ بھی سورج کا ایک حصہ ہے خداوند عالم نے اس کو بہت سی خصوصیات عطا فرمائی ہیں

جن کی بنا پر اس کو تمام سیاروں پر فضیلت حاصل ہے اول یہ کہ وہ خلافتِ الٰہیہ کا محل نزول ہے دوسرے اشرف المخلوقات حضرت انسان کا مسکن ہے۔ تیسرے سب سے زیادہ عبادتِ الٰہی اسی پر ہوتی ہے۔ چوتھے تمام مخلوقاتِ ارضی کی غذا اسی سے ہے پانچویں وہ امین ہے جو شئے اس میں رکھ دو وہ اس کو واپس دے دیتی ہے بلکہ ایک کا سو گنا دیتی ہے وَفِی کُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ (ہر بالی میں سو سو دانے آتے ہیں)، تراب میں اگر ایک لیکر سو دینے کی طاقت ہے تو ابوتراب میں ایک کو ہزار کر دکھانے کی ہے جس کا شاہد جناب امیر علیہ السلام کا یہ قول ہے "رسول اللہ نے ایک رات مجھے ایک ہزار باب علم کے تعلیم کئے اور ہر باب سے ہزار ہزار باب میرے اوپر اور منکشف ہو گئے"

زمین کی یہ صفتِ امانت ہی تو ہے کہ خداوند عالم نے بے شمار خزانوں کا اس کو امین بنا دیا ہے۔ امانت اخلاقِ انسانی میں بڑی ممتاز صفت ہے۔ حضرت رسولِ خدا کی چاہے کسی صفت کا کفار نے یقین نہ کیا لیکن "الامین" کہہ کر ضرور پکارا۔ کیسا امین تھا وہ رسول جس کو شہر بھی بلد الامین ملا۔ خادم بھی روح الامین ملا اور وصی بھی وصی الامین۔

چھٹے زمین حد درجہ حلیم ہے۔ جہاں چاہو کھود ڈالو وہ روکتی نہیں پھر خاکسار بھی ہے کہ لوگ پیروں سے کچلتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کہتی شاید انہی صفات کی بنا پر یہ مرتبہ اس کو حاصل ہوا ہو کہ وہ سجدہ گاہِ بشر بنی۔ شاید انہی صفات پر نظر رکھتے ہوئے علی نے اپنے کو ابو تراب کہا ہو اور شاید انہی اوصاف کی بنا پر قبلہ گاہ خلق بنے ہوں۔

اگرچہ زمین میں خدا کی بے شمار نعمتیں ہیں لیکن ان میں سے مخصوص دو ہی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اول پہاڑ دوسرے نہریں اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہاڑ اور نہریں دو چیزیں ایسی ہیں کہ حیاتِ عالم کو ان سے بہت بڑا تعلق ہے۔ بارش کا ہونا دریاؤں کا نکلنا ان سے نہروں کا بہنا اور خلق اللہ کا سیراب ہونا۔ کھیتوں میں آبپاشی انہی چیزوں سے ہے۔ پہاڑ عجائباتِ قدرت کی کان ہیں ان میں بیشمار جواہرات پائے جاتے ہیں، عمارتوں کے لئے قسم قسم کے پتھر موجود ہیں، ہر قسم کے معدنیات کا خزانہ ہے۔ برف جم کر وہاں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں قسم قسم کی جڑی بوٹیاں، انواع و اقسام کے درخت اور طرح طرح کی پھل پھلاری ہے۔ انہی سے ٹکرا کر ہوا مینھ برساتی ہے۔ یہی گرم ہوا کو ٹھنڈا بناتے ہیں۔ یہیں سے پانی کے زور میں جو پتھر چلتے ہیں وہ سنگریزے اور پھر ریت اور مٹی بنتے ہوئے دریاؤں اور دریاؤں سے سمندروں میں پہنچتے ہیں اور وہاں نئی چٹانوں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ نہ ہوں تو زمین یکساں حالت میں رہے جہاں نشیب ہو وہاں نشیب جہاں فراز ہو وہاں فراز جہاں شورہ زار ہو وہاں شورہ زار اور جہاں زرخیز ہو وہاں زرخیز زمین بنی رہے۔ اس کے علاوہ بھی قسم قسم کی خرابیاں پیدا ہوں۔

اس کے بعد خدا نے اس آیت میں پھلوں کا ذکر کیا ہے ہر قسم کے پھل میں اس نے اپنی قدرت کا کمال دکھایا ہے اُس نے پھل دو طرح کے بنائے ہیں میٹھے اور کھٹے۔ انگور میٹھے بھی ہوتے ہیں اور کھٹے بھی۔ یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ ایک ہی پودے کی شاخوں میں دونوں ذائقوں کے پھل پائے جاتے ہیں باوجودیکہ زمین ایک ہے ہوا اور فضا ایک ہے پھر بھی ایک شاخ میں میٹھا پھل ہے اور دوسری میں کھٹا۔ ایک پکا ہے دوسرا کچا ایک ہلکا ہے دوسرا بھاری ایک خوش رنگ ہے دوسرا بدرنگ۔ آخر یہ تغیر کیوں ہے؟ کوئی اس کا جواب دے۔ غور کرو جب ایک شاخ کے دو پھل ایک گود کے دو بچے ایک صدف کے دو موتی یکساں نہیں تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ایک رسول

کی محبت کے بہت سے بیٹھنے والے ایسے ہو سکتے ہیں کہ جس کی چاہو اقتدا کرو ہدایت پا جاؤ گے۔ بایہم اقتدیتم اهتدیتم

زمین اور اس کے پھلوں اور درختوں کا ذکر کرنے کے بعد خلاقِ عالم نے یغشی الیل النهار یعنی رات کو دن ڈھانپ لیتا ہے بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ دن کا وجود رات کے وجود سے پہلے ہے اور ہونا بھی اول ہی چاہیئے کیونکہ خلقتِ نور سب سے پہلے ہے۔ تاریکی نام ہے نور کے گم ہونے کا لہٰذا نور جب تک پہلے نہ مان لیا جائے۔ تاریکی کا وجود ہو کیسے سکتا ہے۔ پہلے وجودی چیز ہونی چاہیئے پھر عدمی دن اور رات زمانہ کے دو قدم ہیں۔ دن اس لئے ہے کہ انسان کسب معاش کرے اور رات اس لئے ہے کہ محنت کے بعد آرام سے سوئے اور خاص لوگ رات کی خاموشی میں اپنے معبود سے خلوت کریں۔ دن بھر کے گناہوں کی معافی مانگیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے زمین میں پاس پاس کچھ قطعات ہیں انگوروں کے باغ ہیں کھیت ہیں۔ خرمے کے درخت ہیں ایک شاخ بھی اور دو شاخ بھی جو ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں مگر ذائقہ میں ایک کو دوسرے پر فوقیت ہوتی ہے۔

زمین ایک ایسی عجیب طلسمی سطح ہے کہ اس کی نیرنگیاں عقلِ انسانی کو چکراتی رہتی ہیں ایک جگہ چند کھیت پاس پاس ہیں ایک میں انگور ہیں دوسرے میں لیمو تیسرے میں آم چوتھے میں گندم اور ان سب قطعات کو ایک ہی کنوئیں کا پانی دیا جاتا ہے ایک ہی طرح کی زمین بھی ہے ایک ہی آب و ہوا بھی ہے لیکن سب کے پھل جداگانہ سب کی صورت علیحدہ رنگ علیحدہ ذائقہ علیحدہ۔ ایک ذرا سا بیج آخر تک اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ کیا ممکن ذرا تو درخت کا کوئی حصہ اپنے تخم کے خلاف ہو جائے۔ جس کا بیج کڑوا ہے اس کا پھل ضرور کڑوا ہو گا اور جس کا تخم میٹھا ہے اس کا پھل بھی میٹھا ہو گا۔ اسی لئے تو شریف النسل اور پاک حسب کی قدر ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنے انبیاو اوصیا کو اصلابِ طاہرہ اور ارحامِ طاہرہ عطا فرمائے تاکہ تخم کا اثر ہمیشہ باقی رہے۔ جس طرح ایک زمین میں پرورش پانے سے درختوں کی حالت نہیں بدلتی اور پھلوں سے تخموں کا اثر نہیں جاتا اسی طرح ایک خاندان میں پرورش پانے سے یکساں نہیں ہوتے۔ اسی قریش خاندان سے محمد جیسا ہادی پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے ابولہب جیسا کافر۔ پس خاندانی اثر مساوات پیدا نہیں کرتا تو بھلا صحبت کیونکر مساوی اثر پیدا کر سکتی ہے ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب ایک میٹھے پھل والے درخت کی جڑ میں ایک کڑوے پھل کا بیج دبانے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور اس کی جڑیں زمین سے وہی کڑوا مادہ کھینچتی ہیں جس کا وہ اہل ہے تو بھلا رسول کی قبر کے پاس دفن ہو جانے والوں کو تخفیف عذاب کا فائدہ کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

ہر تخم کے لئے یکساں زمین کام نہیں دیتی۔ بعض کے لئے زیادہ کمائی ہوئی زمین کی ضرورت ہے بعض کے لئے معمولی اور بعض کے لئے بہت کم چنے کے لئے کوئی خاص تیاری کی ضرورت نہیں وہ موٹے موٹے ڈلوں میں ہو جاتا ہے صرف ایک بار ہل چلانا کافی ہے۔ برخلاف اس کے گیہوں کے لئے زیادہ کمانے کی ضرورت ہے۔ پان وغیرہ کے لئے اور زیادہ۔ پس جو زمینیں زیادہ کمائی جاتی ہیں ان میں بہترین چیز بنائی جاتی ہے۔ جب مادی چیزوں میں یہ حال ہے تو بھلا روحانی اور نورانی تخم معمولی زمینوں میں کیونکر نپپ سکتے ہیں۔ ان کے لئے بھی بڑی کمائی ہوئی زمین کی ضرورت ہے رسول نے کچھ زمینیں خاص طور سے ایسی تیار کیں کہ ان میں جب شریعت کا بیج ڈالا تو ایسا کھیت لہلہایا کہ ایک ایک دانہ سے ہزار ہزار دانے پیدا ہوئے۔ قرآن ان ہی کے سینوں میں جاکر پھولا۔ جنہیں آیتِ تطہیر کے چشمے سے سیراب کیا گیا تھا۔ اول ما خلق

اللہ نورِی کی آل دی گئی تھی۔ قرآن بے شک ان سینوں میں پھولا اور اتنا پھولا کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر اتنی طولانی ہو گئی کہ ایک رات ختم ہو گئی مگر وہ پوری نہ ہو سکی۔

سورج، ہوا اور بارش عام طور پر درختوں کی پرورش کرتے اور ان میں پھل پھول اگاتے ہیں لیکن ایک ہی کھیت میں ان چیزوں کا الٹا اثر پڑتا ہے۔ بعض بیج زمین میں گل سڑ جاتے ہیں۔ بعض درخت اُگتے تو ہیں مگر زیادہ بڑھتے نہیں۔ بعض بڑھتے ہیں مگر پھل پھول نہیں لاتے۔ بعض پھول پھل لاتے اور خوب بہار دکھاتے ہیں پس رسول اور قرآن بھی مثل انہی چیزوں کے ہیں۔ ان کی تعلیم سے کوئی منافق ہو جاتا ہے کوئی مستضعف، کوئی مذبذب کوئی مومنِ کامل کوئی مجسّم ایمان۔ نہ قرآن کسی کو گمراہ کرتا ہے نہ رسول بلکہ بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق اثر لیتا ہے باغبان ہمیشہ قطعاتِ زمین کی حالت دیکھ کر بیج ڈالتا ہے۔ اور جیسی مٹی کسی کھیت کی ہوتی ہے اسی کے مطابق اس پر ریاضت کرتا ہے۔ پس یہ کہنا بالکل بے سود ہے کہ اس نے معمولی زمین میں کچھ بیج کیوں نہیں ڈالا۔ یہ قصور باغبان کا نہیں بلکہ زمین کا ہے بعض کلر زمینیں ایسی بھی ہیں کہ چاہے باغبان کتنی ہی محنت کرے ان میں گھاس اور کانس کے سوا کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو بہت کم۔ بعض کھیتوں میں پودوں کے ساتھ ساتھ بکثرت گھاس بھی پھوٹ آتی ہے جو اس کا ثبوت ہوتی ہے کہ باغبان نے محنت تو بہت کی مگر زمین کی پرانی آل جڑ سے دور نہ ہو سکی چنانچہ جہاں موقع پایا اس نے اپنا رنگ دکھا دیا۔

پھر اللہ تعالےٰ نے یہ ذکر کیا ہے کہ بعض درختوں کی جڑ سے دو شاخیں پیدا ہوتی ہیں اور بعض سے ایک ہی تنا نکلتا ہے۔ دو شاخوں والے تنے بھی اسی پانی سے پرورش پاتے ہیں جس سے ایک والا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ظاہر میں دو شاخیں جدا ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک ہیں پانی ایک، زمین ایک، پھل ایک، پھول ایک، مزہ ایک۔ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا ہے النّاس من اشجار شتّی و انا و علی من شجرۃ واحدۃ (لوگ مختلف درختوں سے ہیں اور میں اور علی ایک درخت سے ہیں)، اسی کی تصدیق حدیث نور سے ہوتی ہے اَنا و علی من نورٍ واحدٍ ظاہر میں جدا مگر حقیقت میں ایک۔

شجرۃ الانبیا حضرت ابراہیم سے دو شاخیں چلیں۔ ایک حضرت اسحاق سے اور دوسری حضرت اسمٰعیل سے۔ لیکن دونوں شاخیں یکجا نہ رہ سکیں۔ ایک شاخ نے مختلف قسم کے پھل پیدا کئے جن میں میٹھے بھی تھے اور کھٹے بھی یعنی نسلِ اسحاق میں یہودی و نصاریٰ و صابئین بھی ہوئے اور مومنین و مسلمین بھی لیکن سبحان اللہ کیا کہنا نسل اسمٰعیل کا کہ اس کی شاخ نبوت میں جو حضرت محمد مصطفٰے سے چلی سب کے سب مسلمان ہی ہوئے۔ یہ اس دعا کا اثر تھا جو جناب ابراہیم و اسمٰعیل نے خانۂ کعبہ کے بناتے وقت کی تھی۔ ربّنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذرّیّتنا اُمّۃً مسلمۃً لک حضرت اسمٰعیل سے صرف ایک شاخ چلی اور آخر تک ایک ہی رہی، جہاں سے اس شاخ کو دیکھو یکساں پھل پھول اور یکساں سایہ ہے۔ لیکن نسل اسحاق میں تفرقہ ہو گیا۔ نسل اسمٰعیل میں ایک ہی شریعت اور ایک ہی قانون قیامت تک رہا۔ نسل اسحاق کو یہ بات نصیب نہ ہوئی نسلِ اسمٰعیل کی شاخ کچھ دور پہنچ کر پھر دو ہو گئی تھی لیکن قدرت کو یہ منظور نہ ہوا۔ اس نے علی و فاطمہ کو ملا کر پھر ایک کر دیا تاکہ ظاہر میں بھی دو ہونا باقی نہ رہے۔ جب یہ دونوں شاخیں ایک ہو گئیں تو پھر اس شجرِ طیبہ نے ایسا زور باندھا کہ قیامت تک کے لئے اس کی جڑ جم گئی۔ نسل اسحاق کی شاخ کچھ دن پھل پھول کر ٹھہر گئی اور حضرت عیسیٰ پر خاتمہ ہو گیا۔ لیکن شجر اسمٰعیلی نے ایسے سدا بہار پھول کھلائے محمد مصطفٰے

تک مرجھانے والے نہیں۔ اگرچہ اس کا ایک روح افزا پھل پتوں میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن اس کی بو سے عالم مہک رہا ہے۔

آہ آہ نسل اسمٰعیل کا یہ ہرا بھرا درخت کربلا میں اس بیدردی سے کاٹا گیا کہ کوئی شاخ کوئی پھل اور کوئی پھول ایسا باقی نہ رہا جس پر ظلم و ستم کا تبر نہ چلا ہو۔ آہ! اس شجر نبوت کا وہ خوش رنگ پھول جو شباب کی ہوا میں دلفریبی سے مہک رہا تھا۔ اس بیدردی سے ظلم و ستم کے پیروں تلے کچلا گیا کہ دیکھنے والے کلیجہ پکڑ کر رہ گئے۔ آہ حسین کا کڑیل جوان علی اکبر اس قابل تھا کہ ظالم اس کے پُرنور سینہ پر بھالے مار مار کر خاک پر تڑپائیں۔ واللہ یہ کلیجہ تھا حسینؑ کا یہ دل تھا اُمّ لیلیٰ کا کہ نصرت دین کے سچے جوش میں ایسے جوان بیٹے کی موت خوشی سے منظور کر لی جس کا مثل و نظیر دنیا میں نہ تھا۔

کتب تواریخ میں منقول ہے کہ جب جناب ابراہیم نے خواب میں دیکھا کہ اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل کو ذبح کر رہے ہیں تو صبح کو حضرت اسمٰعیل سے فرمایا بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں پس بتاؤ اب تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں کہا بابا جان جس امر کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اس کو ضرور بجا لائیے۔ انشاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے۔ جب بیٹے کی مرضی معلوم کر لی تو پھر جناب ہاجرہ مادر حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس آئے اور فرمایا میں اسمٰعیل کو آج ایک دوست کے یہاں دعوت میں لے جانا چاہتا ہوں تم ان کو نہلا دھلا کر آراستہ کر دو۔ یہ سنکر جناب ہاجرہ خوش خوش اٹھیں۔ اور بیٹے کو غسل دے کر نئے کپڑے پہنائے گیسوؤں میں شانہ کیا۔ خوشبو سے بدن معطر کیا اور جناب ابراہیم کی خدمت میں حاضر کیا حضرت ابراہیم نے فرمایا ایک رسّی اور چاقو بھی لاؤ۔ انہوں نے پوچھا اے خلیل دعوت میں ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے فرمایا اس لئے ساتھ لئے جاتا ہوں کہ شاید وہاں کوئی قربانی کرنا پڑے۔ یہ سنکر جناب ہاجرہ خاموش ہو گئیں اور جناب ابراہیم بیٹے کو ساتھ لے کر منیٰ کی طرف چلے۔ کچھ دور گئے تھے کہ جناب ہاجرہ پیچھے پیچھے دوڑیں اور کہنے لگیں اے خلیل خدا ذرا ٹھہریئے اپنے بچے کو کچھ ناشتہ کرا دوں۔ نہ معلوم وہاں دعوت میں کس وقت کھانا ملے اور میرا بچہ اتنی دیر بھوکا رہے۔ مومنین! اس ماں کے لئے یہ ممکن تھا کہ اپنے بھوکے بچے کو کھلا پلا کر باپ کے ساتھ کر دے۔ لیکن آہ، اُمّ لیلیٰ غریب کیا کرے جس کا اٹھارہ برس کا کڑیل جوان تین روز کا بھوکا پیاسا مرنے کے لئے میدان کو جا رہا ہے مگر اس کی ماں سے یہ ممکن نہیں کہ کھانا تو ایک طرف ایک چلّو پانی سے اس کی تشنگی بجھا سکے۔

الغرض جناب ابراہیم اپنے بیٹے کو ساتھ لئے ہوئے منیٰ میں پہنچے اور بیٹے کے ذبح کا ارادہ کیا۔ پوچھا اے بیٹا اگر تجھے کوئی وصیت کرنا ہو تو بیان کر تاکہ تیرے ذبح کے بعد میں اس کو بجا لاؤں۔ جناب اسمٰعیل نے عرض کی۔ اے پدر بزرگوار میری تین خواہشیں ہیں پہلی یہ کہ آپ میرے ہاتھ رسّی سے خوب کس کر باندھ دیجئے۔ پوچھا بیٹا یہ کس لئے۔ عرض کی اس غرض سے کہ ذبح کے وقت ذبیحہ ہاتھ پیر مارا کرتا ہے مجھے ڈر ہے کہ ایسا عمل سرزد ہونے میں کہیں خدا صابرین کی فرد سے میرا نام محو نہ کر دے۔

اور دوسری خواہش میری یہ ہے کہ آپ پسِ گردن سے مجھے ذبح کریں۔ پوچھا بیٹا یہ کیوں۔ عرض کی اس لئے کہ اگر میرا چہرہ آپ کے سامنے رہے گا تو ممکن ہے کہ شفقت پدری کی بنا پر آپ چھری چلانے سے رک جائیں اور میں اس سعادت عظمیٰ سے محروم رہ جاؤں۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ میرے ذبح ہونے کی خبر لیکا یک میری ماں سے جا کر نہ بیان کر دیں کیونکہ عورتوں کا دل اول تو یوں ہی نازک ہوتا ہے اور پھر میں تو ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس خبر کو سنتے ہی ان کا دم نکل جائے۔

حضرت ابراہیم بیٹے کی یہ باتیں سنکر رونے لگے اور فرمایا اچھا بیٹا تمہاری خواہش کے مطابق لاؤ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کس کر باندھدوں اس کے بعد جناب خلیل نے اپنے پیارے بیٹے کو لٹا لٹایا اور اپنی چھری کو پتھر پر خوب تیز کر کے پہلے تو اپنی آنکھوں پر کپڑا باندھا پھر فرمایا لو بیٹا اب یہ چھری تمہاری شہ رگ پر بیٹھتا ہوں اللہ اکبر جناب اسمٰعیل کس قدر اپنے باپ کے تابع فرمان اور مرضیٔ الٰہی کے سچے دل سے خواہاں تھے۔ عرض کی شوق سے شہ رگ پر رکھئیے۔ پھر کہنے لگے بابا جان چلائیے۔ یہ سنکر جناب ابراہیم نے چھری کو چلانا شروع کیا۔ ناگاہ دنبہ کی آواز چھری کے تلے سنائی دی گھبرا کر آنکھیں کھولیں دیکھا کہ اسمٰعیل تو پہلو میں صحیح سلامت کھڑے ہیں اور ان کی جگہ بکرا ذبح کیا ہوا پڑا ہے۔ آپ یہ دیکھ کر آزردہ ہوئے اور خیال ہوا کہ میری قربانی شاید درگاہ ایزدی میں مقبول نہیں ہوئی۔ ناگاہ خدا کی طرف سے آواز آئی۔ اے ابراہیم تم نے اپنی خواب کو سچا کر دکھایا لیکن اس کا فدیہ ہم نے ایک ذبح عظیم کو قرار دیا۔

حضرات! باپ کو اپنی اولاد سے جو محبت ہوا کرتی ہے محتاج بیان نہیں۔ خاصکر جبکہ بیٹا جوان ہو اور سعید و صالح ہو آپ نے سُنا کہ جناب خلیل باوجودیکہ مرضی خدا حاصل کرنے کے جوش میں کس شوق سے بیٹے کی قربانی کرنے بیٹھے تھے۔ لیکن پھر بھی محبت پدری کا قوی ترجذبہ نہ رُک سکا اور جناب خلیل نے اپنی آنکھوں پر کپڑا باندھ ہی لیا۔ تاکہ بیٹے کا جیتا خون اپنی آنکھوں سے بہتا ہوا نہ دیکھیں۔ لیکن اللہ اکبر کیسا صابر و شاکر تھا خلیل کربلا کہ اٹھارہ برس کا کڑیل جوان سینہ پر برچھی کھائے خون میں نہائے انتہائی کرب سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا تھا اور حسین صبر کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں کہ جب لشکر حسین میں علی اکبر کے سوا اور کوئی مجاہد باقی نہ رہا تو شہزادہ نے باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازتِ کارزار طلب کی حضرت نے ایک حسرت بھری نظر اپنے کڑیل جوان پر ڈالی اور فرمانے لگے بیٹا کوئی باپ دنیا میں ایسا ہے کہ اپنے جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دے لیکن آہ مظلوم حسین پر ایسا وقت آپڑا ہے کہ بغیر اجازت دیئے چارۂ کار نہیں۔ اچھا بیٹا تم بھی جاؤ اور اپنا داغ حسین کو دو۔ آہ حسین یہ دیکھنے کے لئے زندہ رہ گیا کہ تجھ سا مہرو فرزند مرنے کی اجازت مانگے اور وہ اس کے روکنے پر قادر نہ ہو۔ بیٹا! میں نے تو اجازت دے دی لیکن اپنی ماں اور پھوپی سے بھی تو خیمہ میں جا کر اجازت لو۔ انہوں نے تم کو اٹھارہ برس بڑے ناز سے پالا ہے۔

الغرض جناب علی اکبر خیمہ میں آئے اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ راوی کہتا ہے اس وقت خیام حسین میں ایک کہرام بپا تھا۔ بی بیاں چاروں طرف سے علی اکبر کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اور حسرت بھری نگاہوں سے رو رو کر چہرۂ علی اکبر کو دیکھ رہی تھیں۔ بالخصوص جناب زینب کا بہت غیر حال تھا بار بار بلائیں لے کر کہتی تھیں بیٹا علی اکبر کیا ہم نے اس لئے پالا تھا کہ اس عالم غربت میں جبکہ ہم چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور تمہارا مظلوم باپ بے ناصر و مددگار ہو چکا ہے تم بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دو۔ اے فرزند میں نے تجھے بڑی محنت سے بڑے چاؤ پیار سے پالا ہے کس دل سے کہوں کہ دشمنوں سے تیر و تبر اور نیزہ و خنجر کھانے کے لئے میدان میں جاؤ۔ حضرات ایک طرف تو جناب زینب کا اس غم میں غیر حال تھا اور دوسری طرف جناب ام لیلیٰ ماہی بے آب کی طرح بے چین تھیں۔ خدا کسی ماں پر یہ وقت نہ لائے کہ اس کا کڑیل جوان سامنے کھڑا مرنے کی اجازت مانگ رہا ہو۔ آہ جس ماں کے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے آج اس کی نظروں میں دنیا تیرہ و تار ہے۔ تمام حسرتیں خاک میں مل رہی

ہیں۔ ارمانوں کا خون ہو رہا ہے جوان بیٹے کو چھاتی سے لگائے زار زار رو رہی ہیں اور فرما رہی ہیں بیٹا علی اکبر! یہ دکھیا ماں تیری جدائی میں کیونکر زندہ رہے گی۔ اے فرزند میرے حالِ زار پر رحم کر اور میدان میں نہ جا میں صبح سے یہ حال دیکھ رہی ہوں کہ جو کوئی میدان میں جاتا ہے واپس نہیں آتا آہ ایسی صورت میں کس دل سے کہوں کہ میدان کو جاؤ۔ اپنے ہاتھوں یہ پیاری پیاری تصویر خاک میں نہیں ملائی جا سکتی۔ جناب علی اکبر ماں اور پھوپی سے عرض کر رہے تھے مشیت ایزدی میں کسی کا کیا زور ہے اب میرے میدان میں جائے بغیر چارۂ کار نہیں۔ دشمنوں کی طرف سے پیہم مبارز طلبی ہو رہی ہے اگر میں اس وقت ان کے مقابلہ کو نہ جاؤں گا تو یہ بے حیا بابا جان کو بے ناصر و مددگار سمجھ کر فوراً خیام پر حملہ آور ہو جائیں گے آہ سیدانیاں یہ سنکر خاموش ہو گئیں اور علی اکبر ایک ایک بی بی کو رخصت کر کے خیمہ سے برآمد ہوئے۔

امام حسین علیہ السّلام نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو سلاحِ جنگ سے آراستہ کیا۔ خود ہی گھوڑے پر سوار کیا اور جب علی اکبر رخصت ہونے لگے تو آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ پروردگارا گواہ رہنا کہ اب وہ جوان مجھ سے جُدا ہو رہا ہے جو رفتار و گفتار اور صورت و سیرت میں تیرے رسول سے بہت زیادہ مشابہ تھا جب میں تیرے نبی کی زیارت کا مشتاق ہوتا تھا تو اپنے اس فرزند کے چہرہ پر نظر کر لیا کرتا تھا۔ آج اس سے بھی محروم ہوتا ہوں۔ اس کے بعد بازوئے علی اکبر تھام کر کچھ دعائیں دم کیں اور اجازتِ کارزار مرحمت فرمائی۔

لکھا ہے کہ حضرت علی اکبر نے میدان میں آکر وہ شجاعانہ جنگ کی کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے جس طرف آپ رُخ کرتے تھے دشمنوں کو بھاگنے کے سوا بن نہ پڑتی تھی۔ تب آپ فوجِ یزید کو دُور تک بھگا چکے تو پلٹ کر پھر خدمت امام علیہ السّلام میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے یا ابت العطش قد قتلنی وثقل الحدید قد اجہدنی (بابا پیاس نے مجھے ہلاک کر ڈالا ہے اور ہتھیاروں کی گرانی نے سخت ایذا دے رکھی ہے) فہل لی الیٰ شربۃ من الماء سبیل (کیا میرے لئے ایک گھونٹ پانی کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے) حضرت یہ سنکر آبدیدہ ہوئے اور فرمایا واللہ اے فرزند مجھ پر اور حضرت رسولِ خدا اور حضرت علی مرتضیٰ اور جناب فاطمہ زہرا پر یہ بہت شاق ہے کہ تجھ جیسا فرزند ایک جرعہ آب کا سوال کرے اور حسین اسے پورا نہ کر سکے اس کے بعد آپ نے فرمایا بیٹا علی اکبر تم اپنی زبان میرے منہ میں دیدو شاید کچھ تسکین ہو جائے۔ یہ سنکر حضرت علی اکبر نے اپنی زبان حضرت کے منہ میں داخل کی لیکن فوراً ہی باہر کھینچ لی اور عرض کی یَا اَبَتِ لِسَانُکَ اَیْبَسُ مِنْ لِسَانِیْ (اے بابا آپ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ خشک ہے) آہ مومنین امام مظلوم نے یہ عمل اس لئے کیا کہ علی اکبر کو فی الجملہ یہ سمجھ کر تسکین ہو جائے کہ بوڑھے باپ کی زبان تو مجھ سے بھی زیادہ خشک پڑی ہوئی ہے اس کے بعد حضرت نے ایک انگوٹھی دیکر فرمایا۔ لو بیٹا اسے اپنے منہ میں رکھ لو اور راہِ خدا میں جہاد کرو۔ چنانچہ حضرت علی اکبر اس انگوٹھی کو منہ میں ڈال کر پھر میدان میں آ گئے۔

حمید بن مسلم راوی ہے کہ علی اکبر کے حملۂ ثانی نے فوجِ یزید میں تہلکہ بپا کر دیا تھا۔ سوار اور پیادے سپاہی اور سپہ سالار سب بدحواس تھے یہ حال دیکھ کر عمر سعد بہت گھبرایا اور سردارانِ فوج کو جمع کر کے کہنے لگا۔ نہایت شرم کا مقام ہے کہ ایک بھوکا پیاسا جوان اتنی بڑی فوج کو بھگائے بھگائے پھر رہا ہے۔ کیا تم میں کوئی جوان ایسا نہیں کہ اس بھوکے پیاسے کا سر کاٹ لائے اور یزید کی سرکار سے انعام و اکرام کا مستحق ہو۔ یہ سنکر سنان بن انس نخعی وہاں سے چلا اور موقع پا کر اس شقی نے ایک نیزہ حضرت علی اکبر کے سینے پر ایسا مارا کہ آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے آواز دی یا ابتاہ ادرکنی اے بابا میری خبر لیجئے کہ میں نے اپنی جان آپ پر سے نثار کی۔ یہ آواز سنتے ہی امام مظلوم کی نظر میں دنیا تیرہ و تار ہو گئی اور یہ فرماتے ہوئے قتل گاہ کی

جانب روانہ ہوئے یَا بُنَیَّ عَلَی الدُّنْیَا بَعْدَکَ الْعَفَا (بیٹا تیرے بعد زندگانی دُنیا پر خاک ہے) آہ آہ امام مظلوم راہ میں جا بجا ٹھوکریں کھاتے باحال پریشان جب حضرت علی اکبر کے قریب پہنچے تو اپنے کڑیل جوان کو ایسی حالت میں پایا کہ خدا کسی باپ کو بیٹے کی یہ حالت نہ دکھائے دیکھا کہ اٹھارہ برس کی کمائی خاک میں مل رہی ہے علی اکبر جیسا مہرو جوان خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا ہے۔ آپ بے اختیار زمین پر گر پڑے اور دم توڑتے بیٹے کو چھاتی سے لگا کر فرمانے لگے۔ بیٹا علی اکبر کیا حال ہے۔ عرض کی بابا جان اب یہ غلام عنقریب حضور سے جدا ہونے والا ہے۔ بابا اس وقت روئے انور میری طرف پھیر لیجئے کیونکہ سنتا ہوں کہ جوان کا دم بڑی مشکل سے نکلتا ہے میرا یہ وقت جاں کنی ہے ممکن ہے حضور سے میری یہ حالت نہ دیکھی جائے یہ سنکر امام مظلوم زار زار رونے لگے۔

بحر المصائب میں ہے کہ جناب علی اکبر علیہ السلام اس خیال سے کہ امام مظلوم میری یہ حالت دیکھ کر دنیا سے گزر نہ جائیں اس چوڑے زخم پر جو سنان بن انس ملعون کی برچھی کھانے سے سینہ پر پیدا ہو گیا تھا اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے تھے امام علیہ السلام نے کئی بار چاہا کہ علی اکبر کے ہاتھ وہاں سے ہٹا دیں لیکن انہوں نے اپنے ہاتھ ہٹائے نہیں حضرت نے پوچھا بیٹا سینہ پر ہاتھ کیوں دھرے ہو۔ عرض کی بابا میرے سینہ میں درد ہو رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا تم ہاتھ ہٹاؤ میں تمہارا سینہ دباؤں یہ کہکر حضرت نے وہاں سے علی اکبر کے ہاتھ ہٹائے۔ آہ ہاتھوں کا ہٹانا تھا کہ خون کا ایک فوارہ سینہ سے پھوٹ نکلا جس کے ساتھ ہی اس شیر جوان کا سنکا ڈھل گیا اور ایک گہری سانس لیکر حسین کی گود میں دم توڑ دیا۔ امام مظلوم اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ فرماتے ہوئے جوان پسر کی لاش سے اُٹھے آہ یہ عالم ضعیفی بہتر شہیدوں کے کلیجہ پر داغ۔ پھر صبح سے لاشے اٹھاتے یہ وقت آگیا تین دن کی بھوک اور پیاس پھر جوان بیٹے کا غم بدن میں اتنی طاقت کہاں کہ کڑیل جوان کی لاش اٹھا کر خیمہ میں لے جائیں۔ مولا سخت متردد ہیں کہ کیونکر یہ کام انجام دوں۔ ایک بار حضرت کا دل بھر آیا اور اپنے ناصروں اور دوستوں کو پکارنا شروع کیا۔ اے حبیب اے زہیر اے عباس اے قاسم اے عون و محمد میری مدد کو آؤ۔ اے میرے پیارو جوان بیٹے کی میت حسین سے نہیں سنبھلتی۔ کیونکر اسے خیمہ تک لے جاؤں آہ کوئی اس وقتِ بیکسی میں میری مدد کرنے والا نہیں۔

اس کے بعد جس طرح بن پڑا لاش علی اکبر کو خیمہ گاہ کی طرف لیکر چلے قدم قدم پر آہ کا نعرہ مارتے اور علی اکبر کو مخاطب کر کے فرماتے بیٹا کاش میں اس روز سے پہلے ہی مر جاتا۔ بیٹا علی اکبر یہ تمہارا فرض تھا کہ ہماری لاش اٹھاتے لیکن آہ کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ جوان بیٹے کی لاش بوڑھا باپ اٹھا رہا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ جب حضرت علی اکبر میدان کربلا میں دشمنوں سے جنگ کر رہے تھے تو جناب اُم لیلیٰ نے یہ انتظام کیا تھا کہ فضہ کو در خیمہ پر کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ فرزند رسول کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اگر میرے بچہ پر کوئی مصیبت آئے گی تو بہ حیثیت باپ ہونے کے مظلوم کربلا کے چہرے کا رنگ بدلے گا۔ اور ان کو پریشان دیکھ کر فضہ کے چہرے پر تغیر ظاہر ہوگا کیونکہ انہوں نے فرزند رسول کو پالا ہے۔ پس فضہ کے چہرے سے مجھے یہ پتہ چل جائے گا کہ میرا بچہ خطرے میں ہے۔ چنانچہ جب علی اکبر کی آواز سنکر امام مظلوم مقتل کی طرف روانہ ہوئے تو فضہ کے چہرے کی رنگت بدلی جس سے جناب اُم لیلیٰ گھبرائیں اور فضہ سے پوچھنے لگیں کیا بات ہے انہوں نے کہا بی بی تمہارے بچہ کی خیر نہیں معلوم ہوتی فرزند رسول گھبرائے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی جناب اُم لیلیٰ بے چین ہو گئیں اور سر کے بال کھول کر درگاہ قاضی الحاجات میں عرض کرنے لگیں۔ الٰہی میرے بچے کی خیر ہو یا اللہ میری اٹھارہ برس کی کمائی ہے تو ہی اس کو اپنی حفظ و امان میں رکھنے والا ہے۔

مقتل ابو المعالی میں ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام لاش علی اکبر کو مقتل سے لا رہے تھے تو فرط ضعف سے حضرت کا یہ حال تھا

کہ بار بار لاش کو زمین پر رکھ دیتے تھے۔ فضہ در خیمہ سے یہ حال دیکھ رہی تھیں روتی پیٹتی نکل پڑیں اور امام علیہ السلام کے پاس جاکر فرمانے لگیں۔ میرے مظلوم شہزادے فضہ تیری غربت اور بیکسی کے نثار لاؤ میں جوان بیٹے کی لاش اٹھانے میں مدد کروں۔ ہائے ہمارے امام پر کیسا وقت آگیا تھا کہ بوڑھی فضہ کے سوا کوئی اتنا نہ تھا کہ علی اکبر کی لاش اٹھانے میں مدد کرتا۔ چنانچہ فضہ کی مدد سے امام مظلوم علی اکبر کی لاش کو خیمہ میں لے کر آئے۔

صاحب اکلیل المصائب لکھتے ہیں کہ خیام حسین میں ایسا کہرام کسی شہید کی میت پر نہیں ہوا۔ جتنا علی اکبر کی لاش آنے پر ہوا ہر طرف سے واعلی اکبراہ واعلی اکبراہ واثمرۃ فوادہ کے نعرے بلند تھے۔ سیدانیوں کی جانوں پر بنی ہوئی تھی۔ ہر بی بی اپنے عزیز کا ماتم بھولی ہوئی تھی سب نے اپنے سر کھول دیئے تھے اور حسین کے کڑیل جوان پر سینہ زنی ہو رہی تھی۔ بالخصوص جناب زینب اور جناب ام لیلیٰ کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ آہ جس ماں کے دل میں علی اکبر کے چاند سے چہرے پر سہرے کی لڑیاں دیکھنے کا ارمان تھا۔ وہی دکھیا ماں آج اس چہرہ کو خاک و خون میں اٹا ہوا دیکھ رہی تھی۔ خدا کسی ماں کو جوان بیٹے کی جدائی اس طرح خاک میں ملی ہوئی نہ دکھائے جیسی گردشِ روزگار سے ام لیلیٰ نے دیکھی۔

الا لعنة اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۝

اٹھارویں مجلس

تفسیر آیۂ افمن کان علیٰ بینۃ من ربہ الخ شہادت حضرت علی اصغر علیہ السلام

قال اللہ تبارک وتعالیٰ افمن کان علیٰ بینۃ من ربہ ویتلوہ شاھد منہ ومن قبلہٖ کتاب موسیٰ اماما ورحمۃ ہ (کیا کوئی اس کی برابری ہو سکتا ہے جو اپنے رب کی طرف سے دلیل رکھتا ہو اور ایک گواہ اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہو جو اسی کا جز ہو اور اس سے پہلے کتاب موسیٰ امام و رحمت ہے)

حضرت رسول خدا کی تصدیقِ رسالت کے متعلق دو باتوں کو بیان کیا جا رہا ہے اول کتاب خدا دوسرے ایک شاہد۔

قرآن درحقیقت مدح و منقبتِ محمد ہے۔ حضرت نے جو کچھ کہا یا کیا قرآن نے دل کھول کر اس کی ثنا خوانی کی۔ یہ شرف محمد ہی کی زبان کو حاصل ہوا۔ کہ ان کی زبان کے نکلے ہوئے الفاظ قرآن بنے قرآن نے ان کی تعریف کی اور انہوں نے قرآن کی تعظیم قرآن تصدیق رسالت میں ایسا زبردست بینہ ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے کفار اس کی تردید نہ کر سکے۔ پورا قرآن تو کیا پورے دس سورے۔ دس سورے تو کیا سورہ۔ ایک سورہ تو کیا ایک آیت اس کی مثل نہ لا سکے۔ قرآن رسالتِ ختمی مرتبت کے لئے ایک ایسا زبردست بینہ ہے کہ کفار اس کو سنکر یہ کہہ اٹھے کہ یہ بشر کا کلام نہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کلام پروردگار ہیں یعنی خدا نے پورے قرآن کو انہی الفاظ میں جو ہمارے سامنے ہیں اپنی قدرت سے لوح محفوظ پر لکھ دیا تھا وہاں سے جبرئیل امین تھوڑا تھوڑا حضرت کے پاس لاتے رہے چنانچہ فرماتا ہے بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ الفاظ جبرئیل ہیں یعنی ان کے معانی خداوند عالم نے ان پر نازل کئے اور انہوں نے ان معانی کو اپنے الفاظ میں حضرت کی خدمت میں پہنچایا جیسا کہ فرماتا ہے انہ لقول رسول کریم۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کے معانی خدا کی طرف سے ہیں اور الفاظ حضرت رسولِ خدا کے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک۔ لیکن قرآن کے معجزہ ہونے اور اس کی عظمت کے لحاظ سے پہلا ہی کلام اولیٰ ہے۔ یعنی الفاظ اور معانی دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ انہ لقول رسول کریم سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت جبرئیل پر معانی کو اتارا اور انہوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ کیونکہ یہ آیت ان لوگوں کے قول کی تردید ہے جو قرآن کو شاعر یا کاہن کا کلام کہتے تھے۔ پس ان کو بتایا گیا کہ یہ کلام ایک رسول کریم (جبرئیل یا محمدؐ) کا ہے اس کے بعد صاف بتایا گیا ما ھو بقول شاعر قلیلاً ما تومنون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون چونکہ آنحضرت کی یا جبرئیل کی زبان سے دوسروں کو ملا ہے۔ اس لئے مجازاً قولِ رسولِ کریم کہا گیا۔ اسی طرح تیسرا قول نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک بھی یہ نہیں بتاتا کہ جو چیز حضرت پر اتاری گئی وہ معانی تھے بلکہ اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ جو چیز اتاری گئی وہ قرآن ہے کیونکہ پوری آیت یہ ہے۔ نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین۔

دلے رسول روح الامین نے اس کو تمہارے قلب پر اتارا تاکہ تم لوگوں کو عذاب الہی سے ڈرانے والے ہو جاؤ اور یہ قرآن کھلی ہوئی عربی زبان ہے) اس آیت میں بہ کی ضمیر سے مراد قرآن ہے اور قلب سے مراد رسول خدا اور بلسانٍ بدل ہے بہ کی ضمیر کا جس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن صاف عربی زبان میں اتارا گیا۔ جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّا اَنزَلنٰہُ قُرآنًا عَرَبِیًّا پس اس کے معنی یہ ہوئے کہ جبرئیل عربی زبان میں قرآن لے کر تم پر اترے تاکہ اس کے ذریعہ تم لوگوں کو ڈراؤ۔ دوسرے خدا نے اپنے کلام مقدس کے لئے دو لفظ استعمال کئے ایک قرآن دوسرے کتاب الفاظ و معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔

تیسرے خدا نے قرآن کو معجزہ قرار دیا ہے قُل لَّئِنِ اجتَمَعَتِ الاِنسُ وَالجِنُّ عَلٰی اَن یَّاتُوا بِمِثلِ هٰذَا القُرآنِ لَا یَاتُونَ بِمِثلِهٖ (اے رسول کہدو اگر انسان اور جن جمع ہو کر بھی یہ چاہیں کہ اس قرآن کی مثل بنا لیں تو اس کی مثال لا نہیں سکتے) چونکہ حضرت رسول خدا بھی انسان تھے لہٰذا وہ بھی اس کلام کے بنانے سے عاجز تھے۔ چوتھے حضرت فرماتے ہیں اُوتِیتُ جَوَامِعَ الکَلِمِ یعنی مجھ کو قرآن جیسا کلام دیا گیا جو اپنے تھوڑے الفاظ سے بہت سے معانی کو ادا کرتا ہے اس صورت میں کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت رسول خدا کا کلام ہے۔

قرآن اور حدیث قدسی میں یہ فرق ہے کہ قرآن کے الفاظ معجزہ قرار دیئے گئے ہیں۔ اور حدیث قدسی کے الفاظ معجزہ نہیں البتہ مفہوم خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور وحی اس کا ماخذ ہے وَمَا یَنطِقُ عَنِ الهَوٰی اِن هُوَ اِلَّا وَحیٌ یُّوحٰی اس پر شاہد ہے۔

بہر حال حضرت رسول خدا کی رسالت پر قرآن ایک روشن دلیل بن کر آیا۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی تعریف میں کہا گیا ہے لَا رَیبَ فِیهِ۔ سوال یہ ہے کہ کس کو شک نہیں۔ اگر یہ مراد ہو کہ اس کے پڑھنے والوں کو شک نہیں تو غلط ہے کیونکہ اس کے متعلق تو بہت سے لوگوں کو شک تھا چنانچہ خود فرماتا ہے اِن کُنتُم فِی رَیبٍ مِّمَّا نَزَّلنَا عَلٰی عَبدِنَا فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثلِهٖ دیگر ادیان کا کیا ذکر اکثر مسلمانوں کو شک تھا پھر یہ کیونکر صحیح ہوگا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ کتاب اللہ سے جن لوگوں کا مخصوص تعلق تھا ان کو کبھی اس میں شک ہوا ہی نہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے اِنَّمَا المُؤمِنُونَ الَّذِینَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ ثُمَّ لَم یَرتَابُوا (مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر انہوں نے شک نہ کیا) اور یہ وہی مومنین ہیں جو قرآن کے حقیقی وارث تھے اور جن کو رسول اللہ نے اس طرح قرآن کی تعلیم دی تھی جس طرح طائر اپنے بچہ کو بھراتا ہے اور جن سے وراثتِ قرآن کا صحیح معنی میں تعلق ہے۔ البتہ جو لوگ بتکلف وارث بن گئے وہ ہمیشہ شک میں پڑے رہے۔ چنانچہ خداوند عالم اس کے متعلق یوں بیان فرماتا ہے اَلَّذِینَ اُورِثُوا الکِتٰبَ مِن بَعدِهِم لَفِی شَکٍّ مِّنهُ مُرِیبٍ (جو لوگ ان کے بعد وارث بنائے گئے وہ قرآن کے متعلق ہمیشہ شک میں پڑے رہے) یہاں اُورِثُوا کا لفظ ہے یعنی بنا لئے گئے ہم نے نہیں بنایا۔

ایک سوال یہ ہے کہ قرآن کا اصلی تعلق کن لوگوں سے ہے؟ قرآن اس کا جواب یوں دیتا ہے۔ اِنَّهٗ لَقُراٰنٌ کَرِیمٌ فِی کِتٰبٍ مَّکنُونٍ لَّا یَمَسُّهٗ اِلَّا المُطَهَّرُونَ (یہ قرآن کریم ایک چھپی ہوئی کتاب کے اندر ہے جس سے نہیں تعلق رکھتے مگر پاک اور پاکیزہ لوگ) کتاب سینۂ رسول میں پوشیدہ ہے اور اس کا تعلق مطہرون سے ہے۔ کتاب اور قرآن میں یہ فرق ہے کہ اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے قلبِ رسول پر لکھ دیا وہ کتاب ہے یعنی المکتوب بین اللہ اور جو رسول نے پڑھ کر سنایا وہ قرآن کہلایا۔ پس قرآن زبان سے کان تک اور کان سے دل تک

گیا۔ اور اس کا تعلق عوام سے رہا لیکن کتاب کا تعلق چونکہ خواص سے ہے اس لئے وہ دل سے دل میں پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا تعلق کتاب اللہ یا مفہوم کتاب سے تھا رسول اللہ ان کو اپنے سینہ سے لگا کر دل کے نقش دل پر اتار دیتے تھے۔

لیکن ہر سینہ اس قابل نہ تھا کہ سینۂ رسول سے متصل ہو کر یہ الوہی فیض حاصل کر لیتا۔ اس کے لئے تو کچھ مخصوص سینے بنائے گئے تھے۔ اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ فوٹو گرافک کیمرے سے پلیٹ پر جو تصویر لی جاتی ہے وہ معمولی کاغذ پر نہیں چھپتی۔ اگر کوئی نادان آدمی معمولی کاغذ پلیٹ پر لگا کر فریم میں کس دے اور چند گھنٹے کیا اگر کئی دن متواتر بھی یہ اتصال باقی رکھے تب بھی تصویر نہ اترے گی البتہ جو کاغذ اس کے لئے مخصوص ہے مثلاً برومائٹ یا پی او پی پیپر تو تصویر اتر آئے گی۔

کتاب اللہ قلب رسول پر اتاری گئی اور زبان سے بیان کی گئی۔ پس جن کا تعلق سینہ بسینہ اور قلب بہ قلب رہا انہوں نے معانی حقیقی تک رسائی پیدا کی۔ اور جنہوں نے صرف زبان سے تعلق رکھا انہوں نے محض الفاظ لئے۔ چنانچہ انہی کو آج تک رٹتے جاتے ہیں۔ اور انہی کو شک رہا۔ کیونکہ الفاظ محتاج تاویل ہوتے ہیں۔ اور معانی حقیقی کو تاویل سے کوئی تعلق نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دل سے دل تک کن لوگوں کے پاس پہنچا بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (وہ آیات بینات ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا گیا ہے) نہ کہ جن کو پڑھایا گیا ہے۔ قرآن قلب رسول پر اترا اور وہاں سے چھلک کر زبان پر آیا۔ متلاطم سمندر میں چھلک کر آنے والے جھاگ ہوتے ہیں موتی ہمیشہ تہ میں بیٹھے رہتے ہیں ان کو تو غوطہ لگانے والے اور گہرائیوں میں در آنے والے ہی پاتے ہیں۔ پس اس بحر نور کے الفاظ جھاگ سے تھے اور موتی اس کے معانی و مطالب تھے۔ راسخون فی العلم موتیوں تک پہنچے اور عام لوگ جھاگوں تک۔ راسخ کے معنی ہی تہ میں بیٹھنے والے کے ہیں پس اہلبیت علیہم السلام ہی اس کی تہ تک بیٹھنے والے تھے۔ قرآن کا دعویٰ ہے ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین (کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو کتاب مبین کے اندر موجود نہ ہو) پس جس نے پورا قرآن حاصل کیا ہو اس کی تعریف یوں کی جائے گی وکل شیء احصینٰہ فی امام مبین (ہم نے امام مبین میں ہر شے کا احصا کر دیا) رسول کی رسالت کا حقیقی گواہ وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس علم قرآن ہو۔ کیونکہ رسالت کیا ہے عین قرآن اور قرآن کیا ہے عین رسالت اگر کسی کو علم قرآن نہیں اور وہ تصدیق رسالت کر دے تو ایسا ہی ہے کہ ایک شخص واقعہ سے بے خبر ہو اور گواہی دینے عدالت میں آ جائے خود خلاق عالم فرماتا ہے۔ قل کفیٰ باللہ شہیداً بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب (اے رسول کہدو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کو اللہ کافی ہے اور وہ ذات جس کے پاس علم کتاب ہے) اور اسی خاص گواہ کے متعلق کہا گیا ہے افمن کان علیٰ بینۃ من ربہ و یتلوہ شاھد منہ یہ گواہ رسول کے پیچھے پیچھے آیا ہے یعنی رسول مقدم اور وہ تالی ہے۔

اگر کسی حاکم کی کچہری میں آپ کو شہادت دینی ہو تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ میں نے فلاں سے اور فلاں نے فلاں سے ایسا ایسا سنا ہے اگر ایسا بیان ہو گا تو حاکم فوراً باہر نکلوا دے گا کہ سماعی شہادت کا یہاں کام نہیں۔ آنکھ سے دیکھی ہوئی گواہی دو۔ پس آنکھ سے دیکھی ہوئی گواہی وہی دے سکتا ہے جو رسول کو تاج رسالت سر پر رکھتے ہوئے دیکھ چکا ہو اور اس وقت سے رسول کے ساتھ ہو جب آدم کا خمیر ہی ہو رہا ہو۔ پس جو رسول کے نور کا جز تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ کب تاج نبوت سر پر رکھا گیا۔ اس نور کے دو جز بنانے میں یہی مصلحت تھی کہ ایک مدعی ہو

اور دوسرا شاہد یعنی ایک رسول ہو اور دوسرا اس کا گواہ۔

یہ گواہ قرآن کے ساتھ ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اگر دو گواہوں کی حیثیت برابر نہ ہو یعنی ایک نہایت بلند مرتبہ ہو اور دوسرا ادنیٰ درجہ پست تو گواہی میں سقم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اعلیٰ مرتبہ والے گواہ کی وقعت جاتی رہتی ہے۔ قرآن کے ساتھ اگر ایک جاہل شخص کو گواہی میں پیش کر دیا جاتا تو اس میں قرآن کی توہین تھی لہٰذا ایسا گواہ پیش کیا گیا جس کا مداح خود قرآن ہے بلکہ وہ قرآن سے افضل ہے یعنی وہ ناطق ہے اور قرآن صامت۔ قرآن نقشِ رسالت اور وہ نفسِ رسالت وہ مقدم اور قرآن تالی۔ یعنی اس گواہ نے جو کچھ کیا قرآن نے اس کی تصدیق کی۔ علی نے رکوع میں انگوٹھی دی قرآن نے آیۂ انما ولیکم اللہ سے اس کی تصدیق کر دی۔ اہلبیت نے روزہ رکھا قرآن نے آیۂ یوفون بالنذر سے اس کی مدح کر دی۔ بلکہ ایسا گواہ جس نے رسالت کی بھی گواہی دی اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی بھی تصدیق کی اور اس طرح کی کہ اس سے بہتر تصدیق ہو نہیں سکتی۔ یعنی پیدا ہوتے ہی تاکہ سب جان لیں کہ وہاں سے سیکھے ہوئے آ رہے ہیں۔ اگر بعد میں تصدیق کرتے تو لوگ کہہ دیتے محمدؐ نے پڑھا دیا ہے۔

دُنیا میں سیکھے ہوئے قرآن کو زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں ختم کرتے ہیں لیکن خدا کے یہاں کے اس طرح ختم کرتے ہیں کہ ایک پیر رکاب میں رکھا تو آغاز کیا اور دوسری رکاب میں دوسرا پاؤں رکھا تو ختم۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ لیکن معراج میں رسول کا جانا اور آنا ایک چشم زدن میں کیونکر سمجھ میں آجاتا ہے سو وہ معراج جسمانی تھی یہ معراج لسانی۔

گواہ جہاں تک معتبر ہو مقدمہ میں کامیابی کی زیادہ امید ہوتی ہے۔ اگر عدالت کا معتمد گواہ مل جائے تو کہنا ہی کیا ہے اور اگر سرکاری آدمی ہو تو اور بھی بہتر ہے۔ اور اگر اسی کے گھر کا ہو جہاں کا قانون ہے تو پھر نور علیٰ نور ہے۔

رسول کی رسالت کے دو گواہ تھے ایک تھا خدا کے گھر کا (قرآن) دوسرا رسولؐ کے گھر کا (علیؑ) چاہیئے تو یہ تھا کہ خدا والا خدا کے گھر اترتا اور رسول والا رسول کے گھر پیدا ہوتا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ قرآن رسول کے گھر اترا اور علی کعبہ میں پیدا ہوئے۔ شاید اس کی جہت یہ ہو کہ ان گواہوں میں ایک ناطق تھا دوسرا صامت۔ ناطق کا مرتبہ چونکہ صامت سے زیادہ ہے لہٰذا افضل کو خدا نے اپنے گھر اتارا تاکہ عبد و معبود کے درمیان فرقِ مراتب قائم رہے۔ قرآن قیامت تک قانون ہے خدا نے گوارا نہ کیا کہ رسول کے گھر میں اترا ہوا گواہ تو قیامت تک چلے اور میرے گھر والا گواہ چند سال بعد ختم ہو جائے۔ نہیں دونوں ساتھ ساتھ چلیں مگر فرائض تقسیم ہو جائیں۔ اے رسول تمہارا گھر والا علم سکھائے ہمارے گھر والا عمل بتائے۔

جن لوگوں نے کتاب اللہ کو ہدایت کے لئے کافی سمجھا۔ انہوں نے نقشِ قرآن کو تو لیا اور نفسِ قرآن کو چھوڑ دیا۔ قرآن تو درحقیقت اہلبیت اور کتاب اللہ دونوں ہی کا نام ہے یعنی علم و عمل کا پس ان میں سے ایک بھی چھوڑنے کے قابل نہیں۔

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه کی ایسی مثال ہے کہ ایک حکیم نے نسخہ لکھ کر دیا مریض نے اُسی کو چاٹنا شروع کر دیا اور جو چیزیں دافع مرض تھیں ان کی طرف توجہ بھی نہ کی یا نسخہ تو استعمال کیا لیکن پرہیز کا خیال نہ رکھا۔ آج دنیا میں طب کی ہزارہا کتابیں موجود ہیں۔ بھلا کوئی کہہ تو دے کہ میں بغیر کسی طبیب کے ان کتابوں کو پڑھ کر طبیب بن جاؤں گا۔ وہ یہ تو سمجھ سکتا ہے کہ فلاں دوا فلاں مرض کے لئے ہے۔ لیکن یہ کون بتائیگا

کہ فلاں مریض کا مزاج کیسا ہے اور اس کو وہ مرض بھی ہے یا نہیں جس کی یہ دوا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اصل مرض کو نہ سمجھنے والے کچھ کی کچھ دوا دے بیٹھے اور جب الٹا اثر ظاہر ہوا تو پھر اصلی طبیب کے پاس دوڑے آئے کہ اس کو سنبھالو۔ جب اس طبیب نے تشخیص مرض کر کے نسخہ دیا تو آخر بطور شکریہ یہ کہنا ہی پڑا لولا علی لھلک عمر۔

کس قدر احمق ہے وہ شخص جو لفافے کی خوبی دیکھ کر بھولا جاتا ہے اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ اس کے اندر جو خط رکھا ہے اس میں لکھا کیا ہے۔

کتب تفاسیر سے یہ ثابت ہے کہ قرآن کی قرأت میں اختلاف ہے۔ الفاظ میں اختلاف ہے۔ حرکات میں اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے تو دھوکا دیا نہیں کہ کہیں کچھ لکھ دیا اور کہیں کچھ اصلی معنی ایک ہی ہوتے ہیں نہ کہ دو چار پس اگر قرآن کافی ہے تو مٹانے والے ان اختلافات کو مٹا دیں۔ ناممکن ہے۔ ہاں یہ اختلاف مٹ سکتا ہے اگر خدا کا لکھا ہوا اصلی نسخہ سامنے ہو۔ اس سے مقابلہ کر کے معلوم ہو سکتا ہے کہ اصلی الفاظ کیا ہیں۔ اللہ کا لکھا ہوا کاغذوں وغیرہ پر تو ہے نہیں بلکہ سینۂ رسول پر مکتوب ہے وہاں تک نہ کسی کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے نہ آنکھ علاوہ بریں اب رسول دنیا میں موجود نہیں ایسی حالت میں کیا ہو لہذا ضرورت ہے کہ اسی کی ایک ٹرو (TRUE) کاپی یا سچی نقل دیکھی جائے اور وہ سینہ سے سینہ تک پہنچی ہوئی ہو۔ اور وہ نقل نہیں ہو سکتی مگر معصوم کے پاس جو لا یمسہ الا المطھرون کا مصداق ہو۔

قرآن کی اصل منزل غیب ہے کیونکہ قلب رسول پر اترا اور قلب پردۂ صدر میں ہے۔ اس کے بعد اس کی تمام منزلیں غیب ہی رہیں یہاں تک کہ آج بھی غائب ہی کے سینہ میں ہے۔ یہ غیب اس کو اتنا پسند ہے کہ کسی وقت غیب سے اس کا تعلق قطع ہی نہیں ہوا۔ کلام بھی اس کا ہے جو غائب ہے۔ لانے والا بھی جبرئیل غائب تھا جس مقام پر اترا (قلب رسول) عام لوگوں کی نظروں سے وہ بھی غائب تھا اب جس کے پاس ہے وہ بھی غائب ہے اور یہ ہدایت بھی انہی لوگوں کو کرتا ہے جو یومنون بالغیب کے مصداق ہیں۔ غرضکہ ہمیشہ چھپا ہی رہا تاکہ ناکسوں کا ہاتھ اس تک پہنچے ہی نہیں۔ خیال کرو وہ قرآن جس کے وہ الفاظ جن کو خطاکاروں بلکہ کافروں تک نے لکھ دیا ہے اتنے پاک ہیں کہ بے طہارت ان کو مس کرنے کا حکم نہیں تو اللہ کے قلم کا لکھا ہوا کتنا طاہر ہوگا۔ اس کو عام لوگوں کی نگاہیں بھی نہیں چھو سکتیں ہاتھ لگانا تو درکنار اس کو مس کرنے والے معمولی پاک لوگ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ایسے پاک جن کو خدا نے پاک کیا ہو۔

ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کو چھونے کے لئے تو طہارت کی ضرورت مگر رسول کو مس کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر ایک کٹورا پانی آپ کسی سے منگائیں اور اس کے ہاتھ خراب ہوں تو آپ کہیں گے بغیر دھوئے اس میں ہاتھ نہ ڈالنا۔ لیکن اگر دریا بہہ رہا ہو تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہاتھ دھو کر اس میں ڈالنا۔ کٹورے میں پانی چونکہ کم ہے لہذا وہ ذرا سی نجاست میں نجس ہو سکتا ہے اور دریا میں پانی چونکہ کثیر ہے لہذا وہ اس طرح نجس نہیں ہو سکتا۔ رسول ایک دریا ہیں اور قرآن ان کے مقابل ایک کوزہ ہے۔ دیکھا نہیں رسول کی صحبت میں ہر قسم کے لوگ بیٹھتے تھے۔ منافق، مستضعف، مومن، مولفۃ القلوب، مذبذب بلکہ کفار و مشرکین بھی آتے جاتے تھے۔ لیکن ان کے ملنے جلنے سے کوئی تغیر نہ طبع رسالت میں واقع ہوا نہ ظاہری برتاؤ میں کوئی فرق آیا۔ رفتار و گفتار و لباس وغیرہ میں تبدیلی نہ ہوئی۔ لیکن قرآن اصلی ہاتھوں سے نکل کر جوں ہی دوسرے ہاتھوں میں پہنچا کیا کیا تبدیلیاں ہو گئیں۔

قرآن صامت ہے اس کو ایک صحیح ترجمان کی ضرورت ہے تاکہ اس کے مفہوم صحیح کو بے کم وکاست ادا کر دے بتاؤ یہ ترجمان کون ہے پہلے تو رسول تھے جو ما ینطق عن الھویٰ کی بنا پر بے کم وکاست منشائے الٰہی کو بتانے والے تھے۔ ان کے بعد بھی کوئی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کلام اللہ کا صحیح ترجمان لسان اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ وہی ذات ہے جس کے متعلق حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی وَاجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْآخِرِیْنَ اور جس کے جواب میں خدا نے فرمایا تھا وجعلنا لھم لسان صدقٍ علیا پس قرآن صامت کا دوسرا ناطق نسخہ اہلبیتِ رسولؐ ہیں جن کی شان یہ ہے مَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہ یہ ہیں وہ ناطق اور صامت دو گواہ جو رسالت کی تصدیق کے لئے خدا کی طرف سے بھیجے گئے۔

یتلوہُ شاھدٌ منہُ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہد اسی رسول کا جزو ہے کوئی غیر نہیں اور وہ وہی ہو سکتا ہے جس کے متعلق رسول نے فرمایا ہو یا علی انت منی بمنزلۃ الراس من الجسد (اے علی تم کو مجھ سے وہی قربت ہے جو جسم کو سر سے ہوتی ہے) یہ وہی ذات ہے کہ جب سورۂ برأت کی تبلیغ کے لئے ابوبکر بھیجے گئے تو جبرئیل نے آکر کہا۔ لا یودیھا الا انت او رجل منک (اس کی تبلیغ نہیں کر سکتا مگر تم یا وہ شخص جو تم سے ہو) یہ گواہ تالی ہے اور رسول کے پیچھے پیچھے ہے اسی طرح جیسے آفتاب کے پیچھے پیچھے چاند (والشمس وضحٰھا والقمر اذا تلاھا (قسم ہے سورج کی اور اس چڑھتی دھوپ کی اور قسم ہے چاند کی جو اس کے پیچھے پیچھے آنے والا ہے)

زمانہ کا انقلاب بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ رسول کی رسالت کے دو گواہ تھے۔ مسلمانوں نے دونوں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کے احترام کے قطعاً خلاف تھا۔ ایک طرف قرآن کو پارہ پارہ کیا دوسری طرف اہلبیت کے گلے پر چھری چلائی۔ ایک طرف قرآن کو جلایا دوسری طرف عترت کا گھر پھونکا۔ ایک طرف قرآن کو صفین میں نیزوں پر بلند کیا۔ دوسری طرف کربلا میں عترت کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائے۔ آہ آہ رسول کی رسالت کا تیسرا گواہ کربلا میں یکہ و تنہا کھڑا ہوا یہ آواز استغاثہ بلند کر رہا تھا ھل من ناصرٍ ینصرنا و ھل من مغیث یغیثنا اور لاکھوں مسلمانوں کے مجمع میں کوئی ایک ایسا نہ تھا جس کے دل پر حسین کی یہ آواز چوٹ مارتی جن دلوں پر یہ آواز اثر کرنے والی تھی وہ سب سر کٹائے خون میں نہائے کربلا کی جلتی ریت پر پڑے ہوئے تھے پھر خیام حسین میں دو دل ایسے تھے کہ حضرت کی یہ آواز استغاثہ سنکر تڑپ گئے۔

راوی کہتا ہے جب امام علیہ السلام نے استغاثہ بلند کیا تو بیمار کربلا نے غش سے آنکھیں کھول دیں اور ایک ٹوٹا ہوا نیزہ اٹھا کر میدان کی طرف چلنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر جناب زینب دوڑیں اور ہاتھ پکڑ کر کہنے لگیں اے فرزند کہاں کا قصد ہے۔ آپ نے فرمایا اے پھوپی اماں مجھے چھوڑ دو کہ میرے بابا جان میدان میں تن تنہا ہیں اور اپنی مدد کے لئے بلا رہے ہیں۔ اب تاب ضبط نہیں میں چاہتا ہوں کہ میدان میں جا کر اپنی جان بابا کے قدموں پر نثار کر دوں۔ یہ کہہ کر خیمہ کا پردہ اٹھایا اور باہر تشریف لے آئے ناگاہ امام مظلوم کی نظر اپنے بیمار فرزند پر پڑی بے چین ہو گئے۔ وہیں سے پکار کر کہا اے زینب علی بن الحسین کو روکو یہ میرے بعد حجت خدا ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا کوئی تیر پڑ جائے اور زمانہ حجت خدا سے خالی ہو جائے۔

دوسرا اثر حضرت کے استغاثہ کا اس چھ مہینہ کی جان پر ہوا جس کی ماں کا دودھ خشک ہو گیا تھا اور جو بھوک پیاس سے مجھولے

میں نڈھال پڑا ہوا تھا۔

راوی کہتا ہے کہ جب امام علیہ السلام آوازِ استغاثہ بلند کر رہے تھے تو یکایک خیمۂ حسینی سے گریہ و بکا کی آواز بلند ہوئی۔ امام علیہ السلام اس آواز کو سنکر بے چین ہوگئے اور میدان سے خیمہ کا رُخ کیا۔ جب خیمہ کے اندر داخل ہوئے تو فرمایا اے بہن زینب یہ شور و شین کیسا ہے کیا کوئی بچہ پیاس سے ہلاک ہوگیا۔ عرض کی کوئی بچہ ہلاک تو نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی آوازِ استغاثہ سنکر علی اصغر ایسے بے چین ہوئے کہ اپنے کو جھولے سے زمین پر گرا دیا۔ یہ سنکر امام مظلوم گہوارۂ علی اصغر کے قریب تشریف لائے دیکھا کہ بچہ نڈھال پڑا ہوا ہے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں، چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ آپ نے جناب رباب سے فرمایا لاؤ اس بچہ کو اس فوج ستم شعار کے سامنے لیجاؤں شاید کوئی صاحبِ اولاد رحم کھا کر چند قطرے پانی کے اس بچے کے منہ میں ٹپکا دے۔ یہ کہکر حضرت نے بچہ کو گہوارہ سے اٹھایا اور عبا کے دامن سے ڈھک کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔

راوی کہتا ہے کہ امام علیہ السلام اس شیر خوار بچہ کو ہاتھوں میں رکھے ہوئے ایک بلند مقام پر پہنچے اور بچہ پر سے عبا کا دامن ہٹا کر اس طرح اس قوم زبوں کردار سے خطاب کیا اے قوم یہ میرا چھ مہینہ کا شیر خوار بچہ جس کی ماں کا دودھ بھی سوکھ گیا ہے پیاس سے بے حال ہے اے قوم اگر تمہارے خیال ناقص میں حسین گنہگار ہے تو اس معصوم بچے نے تمہارا کوئی گناہ نہیں کیا اے اولاد والو انصاف سے کہنا اگر تمہارا بچہ اس حال میں ہوتا تو تمہارا دل کیا کہتا۔ اس کے بعد آپ نے اصغر معصوم کا رُخ اس قوم کی طرف کر کے فرمایا۔ بیٹا علی اصغر تم بھی حجتِ خدا کے فرزند ہو۔ اپنی حجت اس قوم پر تمام کرو۔ یہ سُننا تھا کہ حضرت علی اصغر نے اپنا منہ کھول کر پیاس سے اینٹھی ہوئی زبان باہر نکال دی امام علیہ السلام نے فرمایا اولاد والو دیکھو پیاس سے اس بچہ کی کیا حالت ہے میں اس کے بہانے سے پانی نہیں مانگ رہا۔

حضرت کا یہ کلام سنتے ہی فوج یزید کے بہت سے سپاہی منہ پھیر پھیر کر رونے لگے۔ بعض نے عمر سعد سے جا کر کہا او شقی تیری سنگدلی کی انتہا ہوگئی ارے ظالم اس شیر خوار بچہ کا کیا قصور ہے کہ تو نے اس پر پانی بند کر رکھا ہے کسی کو حکم دے کہ جلد بچہ کو پانی پلائے ورنہ یہ یاد رہے کہ اب تیرے اور ہمارے درمیان تلوار چلے گی۔ فوج کی یہ حالت دیکھکر عمر سعد گھبرایا۔ اس کے پہلو میں کوفہ کا مشہور تیر انداز حرملہ بن کاہل اسدی کھڑا ہوا تھا۔ اس سے کہنے لگا کیا کھڑا دیکھتا ہے اقطع کلام الحسین (کلام حسین کو قطع کردے) یہ سنتے ہی اس ظالم نے ایک ایسا سہ شعبہ تیر کہ اگر پتھر پر مارتا تو اس میں در آتا چلہ کمان میں جوڑ کر اس زور سے حلق علی اصغر پر تاک کر مارا کہ وہ بچہ کا گلا اور حسین کا بازو توڑتا ہوا زمین میں در آیا۔ بچہ تیر کھاتے ہی حسین کے ہاتھوں پر منقلب ہوگیا اور ایک ہلکی سی سسکی لے کر جان دے دی۔ آہ اس وقت امام علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور درگاہِ باری میں عرض کی پروردگارا گواہ رہنا کہ ان ظالموں نے میرے ایسے بچے کو شہید کیا ہے جو بے گناہی میں کسی طرح ناقہ صالح سے کم نہ تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت نے حلق علی اصغر کے نیچے اپنا چلّو لگا دیا آہ آہ تین قطرے سوکھے گلے سے ٹپک کر رہ گئے۔ حضرت امام حسین نے اس خون کو آسمان کی طرف پھینکنا چاہا ادھر سے آواز آئی یا ابن رسول اللہ اس خونِ ناحق کو میری طرف نہ پھینکئے ورنہ اس غم میں ایک قطرہ پانی کا مجھ سے قیامت تک نہ برس سکے گا پھر حضرت نے چاہا کہ اس خون کو زمین کی طرف پھینک دیں ناگاہ زمین سے آواز آئی یا ابن رسول

اللہ اس خونِ ناحق کو میری طرف نہ پھینکئے ورنہ اس غم میں قیامت تک ایک دانہ غلہ کا مجھ سے نہ روئیدہ ہوگا۔ آہ آہ ایسی حالت میں امام مظلوم کیا کرتے مجبوراً اس خون کو چہرۂ اقدس پر مل لیا اور فرمایا ؎

انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں
اصغر تمہارے خوں کا ٹھکانہ کہیں نہیں

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت نے خونِ علی اصغر چہرۂ مبارک پر مل کر اس قوم جفا شعار سے فرمایا اے قوم آگاہ ہو کہ روزِ قیامت اسی طرح خون چہرے پر ملے درگاہِ ایزدی میں حاضر ہوں گا اور خدا اور رسول سے تمہارے اس ظلم کی فریاد کروں گا۔ اس کے بعد امام علیہ السلام لاشِ علی اصغر کو ہاتھوں پر رکھے ہوئے خیمہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ راوی کہتا ہے کہ قریب خیمہ گاہ کے پہنچ کر حضرت کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی چند قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ اسی عمل کی تاسی میں ہم روزِ عاشورہ جو دوسرے طریقہ کا عمل کرتے ہیں سات بار آگے بڑھتے ہیں اور سات بار پیچھے ہٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے سات بار ایسا کیا۔ مومنین اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت کو جناب رباب مادرِ علی اصغر کے سامنے جاتے شرم آتی ہوگی کیونکہ آپ یہ وعدہ کرکے لائے تھے کہ بچہ کو پانی پلا کر لاؤں گا۔ اب آپ کے قدم اس خیال سے آگے بڑھ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے کہ کیونکر اس حالت میں یہ بچہ ماں کی گود میں دوں۔ دکھیا رباب جب اپنے بچے کا گلا اس طرح چھدا دیکھے گی تو کچھ بعید نہیں کہ فرطِ غم سے ہلاک ہو جائے۔ منتخب البوالمعانی میں ہے کہ جب سے امام علیہ السلام علی اصغر کو لے کر میدان میں گئے تھے جناب رباب بمحبتِ مادری بیتاب ہو کر بار بار خیمہ کے دروازے تک جاتی تھیں اور دیکھتی تھیں کہ فرزندِ رسول بچہ کو پانی پلا کر لا رہے ہیں یا نہیں۔ اتفاق سے ایک بار جو آپ درِ خیمہ پر پہنچیں تو حضرت کو انتہائی تردد میں آگے پیچھے قدم ڈالتے دیکھا گھبرا کر آواز بلند پکاریں یابن رسول اللہ میرے بچے کا کیا حال ہے میں اس کی مفارقت میں بے چین ہوں۔ جلد اسے میری گود میں دیجئے۔ آہ رباب کی یہ گفتگو سنکر امام مظلوم بے چین ہو گئے اور خیمہ کے اندر آ کر فرمایا۔ لو رباب تمہارے بچے کی پیاس بجھ گئی۔ آہ ظالموں نے اسے تیرِ ستم کا نشانہ بنا دیا۔ مومنین اس وقت جناب رباب کے دل پر کیا گزری ہوگی جب اپنے بھولے بھالے ہنسلیوں والے بچہ کا گلا تیرِ ستم سے چھدا ہوا پایا ہوگا۔ خدا کسی ماں کو اس کے بچہ کی یہ حالت نہ دکھائے جو کربلا کی اس دکھیا ماں نے دیکھی۔

راوی کہتا ہے کہ امام مظلوم نے چاہا کہ اصغر معصوم کی لاش کو دفن کر دیں کیونکہ آپ بعلم امامت جانتے تھے کہ اشقیائے امت حضرت کی شہادت کے بعد تمام شہداء کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائیں گے آپ کو گوارا نہ ہوا کہ یہ ننھا سا بھی سب کے ساتھ نیزے پر چڑھے پس آپ لاشِ علی اصغر کو خیمہ سے لے کر باہر آئے اور ایک مقام پر تلوار سے ننھی سی قبر کھودی اور رباب کے نازوں کے پالے کو اس میں اتار کر دفن کیا ؎

پانی نہ تھا جو شاہ چھڑکتے مزار پر
آنسو ٹپک پڑے لحدِ شیر خوار پر

آہ مومنین حضرت کا یہ قصد پورا نہ ہوا۔ ظالموں نے بعد شہادت امام مظلوم علیہ السلام معصوم علی اصغر کی قبر کو کھود ڈالا اور ننھی سی میت کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھا دیا۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۝

اُنیسویں مجلس

تفسیر آیۂ یَسْئَلُونَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ الخ اور حالِ رخصت امام مظلوم از اہلِ حرم

قال اللہ تبارک وتعالےٰ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ہ (اے رسول لوگ تم سے چاندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دو وہ لوگوں کے لئے وقت بتانے والے اور حج کا وقت معین کرنے والے ہیں۔ یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں کے اندر پشت کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی اس کے لئے ہے جو پرہیزگار ہو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ سے ڈرو شاید تم فلاح پانے والے بن جاؤ)

ایک سال کا پورہ دورہ بارہ چاندوں پر ختم ہوتا ہے۔ اگر یہ چاند نہوں تو سال کے حساب میں گڑبڑی پڑجائے اور یہ پتہ ہی نہ چلے کہ کونسا کام ہم کو کس وقت انجام دینا چاہئے۔ روزہ۔ عید۔ زکوٰۃ اور حج وغیرہ سب کا حساب چاند ہی سے ہوتا ہے۔ اگر یہ بارہ چاند نہ ہوں تو عالمین کا کوئی کام صحیح وقت پر انجام نہ پاسکے اور فرائض وسنن میں ابتری واقع ہوجائے۔ ہر چاند مہینہ کا ایک دروازہ ہے اگر انسان اس دروازہ کو بھول جائے یا جان بوجھ کر ترک کردے تو پھر اس کی عبادت بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ سال کے اندر تمام عبادات داخل ہیں اور چاند کو خدا نے اس کا دروازہ بنایا ہے۔ پس جب تک دروازہ تلاش نہ کرلیا جائے سال بھر کی عبادات کا حساب ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ جس طرح خدا نے سال کے لئے بارہ چاند بنائے ہیں۔ اسی طرح رسالت کے لئے بھی بارہ دروازے بنائے گئے جن کا تعلق ان بارہ دروازوں سے نہیں سمجھو کہ رسالت کا تعلق بھی اس سے نہیں اور اگر ہے تو غلط۔

چاند سورج کا صحیح معنی میں جانشین ہے۔ ادھر سورج غروب ہوا اور چاند نکلا۔ لیکن نیا چاند کوتاہ نظر والوں کو ذرا مشکل سے نظر آتا ہے۔ تین روز تک ہلال رہتا ہے یعنی اس کی چمک کم پڑتی ہے۔ چوتھے روز اس میں کافی روشنی آجاتی ہے۔ لیکن ابتدائی تین دن وہ نظروں سے غائب نہیں رہتا۔ اس کا وجود ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ زمانہ گوشہ گیری کا ہوتا ہے اس لئے کم لوگ اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

خداوندعالم نے رات اور دن کو ان ہی دو قندیلوں سے روشن بنایا ہے دن کو آفتاب سے اور رات کو چاند سے۔ اگر چاند نہ ہوں تو ہماری راتیں بالکل تاریک ہیں اگرچہ رات کی تاریکی میں جو لوگ چراغوں سے تھوڑا بہت کام چلالیتے ہیں مگر وہ عام روشنی کہاں جو چاند سے حاصل ہوتی ہے کہ دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا جاتا ہے۔ پس خدائی روشنی اور بندوں کی روشنی میں فرق ہے۔ چراغ زیادہ سے زیادہ ایک گھر کو روشن کرسکتا ہے اور چاند تمام عالم کو روشن کرنے والا ہے۔ ہاں اگر خدا کا روشن کیا ہوا چراغ ہو تو پھر اس کی روشنی کا کیا ٹھکانہ وہ سراج منیر کہلاتا ہے اس کی روشنی سے قیامت تک کا میدان چمک اٹھتا ہے۔ سال کے بارہ چاند بھی اسی کے روشن کئے ہوئے بارہ چراغ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آفتاب کو روشنی براہِ راست خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہوں کہ ایک چراغ خدا نے خود روشن کیا

اور بارہ چراغ اس چراغ سے روشن ہوئے اور اس طرح سال کی بارہ منزلیں جگمگا گیئں اور عبادات کے تمام اوقات ان کی ضوفشانی سے منور ہو گئے۔ چاند کسی مہینہ کا کیوں نہ ہو سب کی صورت ایک، نام ایک، کام ایک، روشنی ایک، ماخذ نور ایک، ایک منزل اور ایک مطلع، ایک مقطع، ایک رفتار اسی لئے تو رسول نے فرمایا اولنا محمد واوسطنا محمد واٰخرنا محمد وکلنا محمد۔

رسولؐ سراج منیر ہیں اس اعتبار سے کہ خدا نے ان کو ہدایت خلق کے لئے روشن کیا ہے اور ہمارے ائمہ سراج ہیں اس اعتبار سے کہ ان کو رسولؐ نے روشن کیا ہے جس طرح سال کی بارہ منزلوں پر قدرت نے ایک ایک چاند کی ایک ایک قندیل ضیا فگنی کے لئے لٹکا دی ہے اسی طرح رسول نے حیات دنیا کو بارہ منزلوں پر تقسیم کر کے ایک ایک منزل پر ایک ایک شمع ہدایت روشن کر دی ہے۔

جب تک دنیا کا وجود ہے چاند کا بھی وجود ہے۔ ناممکن ہے کہ دنیا ہو اور چاند نہ ہو۔ خواہ وہ ظاہر رہے یا غائب جس طرح مادی دنیا کو چاند کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی دنیا کو ہر زمانہ میں ایک امام کی ضرورت ہے۔

رسولؐ سراج منیر بن کر دنیا میں آئے اور اس سراج منیر کے گرد بہت سے پروانے بھی جمع ہو گئے ہم کو پروانوں کی جاں نثاری سے انکار نہیں بے شک وہ شمع کے چاروں طرف طواف کرتے ہیں اور سب کے سب فدائی بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اس جاں نثاری کا تماشا کب تک ہے؟ صرف شمع کی زندگی تک ادھر وہ گل ہوئی ادھر سب رخصت اور جاں نثاری کے دعوے ختم۔ انہوں نے شمع سے کیا حاصل کیا کچھ بھی نہیں۔ رات بھر اس کے گرد گھومتے رہے لیکن اتنا نور بھی حاصل نہ کر سکے کہ اگر تاریکی میں ضرورت پڑے تو ان کو ہاتھ پر رکھ کر کسی چیز کو دیکھ سکیں۔ تاریکی میں ہم کو روشنی کی ضرورت ہے نہ کہ شمع کے جاں نثاروں کی۔ تاریکی میں میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے شمع دیجئے آپ ایک کنڈا یا اپلا میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں کہ لیجئے اس سے کام چلا لیجئے یہ بھی جلنے کی چیز ہے میں اسے یہ کہہ کر پھینک دیتا ہوں کہ میاں یہ تو ایندھن ہے اسے چولھے میں جھونکو اس سے چراغ کا کام تھوڑی نکل سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ ایک لمبا سا ڈنڈا میرے ہاتھ میں دے دیتے ہیں کہ لیجئے اس سے کام چلا لیجئے یہ تو صورت میں بالکل موم بتی جیسا ہے میں یہ کہہ کر پھینک دیتا ہوں کہ اس میں روشنی دینے کی قابلیت کہاں۔ پھر آپ ایک موم کا گولہ میرے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں کہ لیجئے اس میں تیل بھی موجود ہے یہ تو سر سے پیر تک روغن ہی روغن ہے۔ دیکھئے اس میں تو ایک رشتہ بھی ہے جو سبب نور بن سکتا ہے بلکہ چونکہ دوہرا تاگہ ہے کیا عجب ہے کہ خود ہی نور بن جائے۔ میں یہ کہہ کر پھینک دیتا ہوں کہ یہ رشتہ روشنی دینے والا نہیں، چراغ کا رشتہ اور ہوتا ہے یہ تو اون کا بٹا ہوا دھاگہ ہے جل ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد آپ ایک موم بتی میرے ہاتھ میں دیتے ہیں میں اسے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔ اور کہتا ہوں ہاں یہ ضرور کام کی چیز ہے یہ ہو بہو ویسی ہی ہے جیسی وہ پہلے جلنے والی شمع تھی، صورت اور سیرت دونوں ملتی جلتی ہیں، پس جس طرح شمع کی قائم مقامی شمع ہی کر سکتی ہے اسی طرح روحانی ہدایت بھی اسی سے متعلق ہو سکتی ہے جو رسولؐ کی سی سیرت اور خصلت رکھتا ہو۔

آفتاب اپنی شعاعیں تمام عالم پر ڈالتا ہے بے شمار ذرے، سنگریزے، آبگینے، چینی کے ٹکڑے اور در و دیوار اس سے جگمگایا کرتے ہیں وہ سر سے پیر تک نور سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا سورج کے غروب ہونے کے بعد ان میں سے کوئی ایک بھی سورج کی قائم مقامی کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ جواہرات بھی اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتے ادھر سورج غروب ہوا اور سب کی چمک ماری گئی۔ البتہ ایک چاند لیا

ہے کہ وہ صحیح معنی میں سورج کی نیابت کر سکتا ہے۔ جن منزلوں کو سورج طے کرتا ہے۔ انہی کو چاند طے کرتا ہے جہاں جہاں سورج روشنی ڈالتا ہے چاند بھی ڈالتا ہے۔ جس طرح غریبوں کے جھونپڑوں اور امیروں کے محلوں کو یکساں وہ چمکاتا ہے۔ اسی طرح چاند بھی چمکاتا ہے۔ غرض یہ کہ انتظامِ عالم میں شمس و قمر دونوں کو برابر کا تعلق ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ چاند لوگوں کے لئے وقت بتاتا اور حج کا زمانہ معین کرتا ہے۔ اگر چاند نہ ہو تو اوقات کا تعین ہی نہ ہو سکے اور یہ پتہ ہی نہ چلے کہ حج کس روز ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سارا حساب کتاب چاند سے متعلق ہے۔ جس طرح ظاہری حساب ان چاندوں سے متعلق ہے اسی طرح قیامت کا حساب کتاب بھی چاندوں کے دامن سے وابستہ ہوگا۔ ذرا اس حساب کتاب کی بھی فکر رہے۔

آگے چل کر مذکورۂ بالا آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہ نیکی نہیں ہے کہ گھروں کے اندر پشتوں کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی پرہیزگاروں کے لئے ہے اور گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ۔ احتجاج طبرسی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ پہلے حالتِ احرام میں لوگ دروازہ چھوڑ کر دیواروں سے مکانوں کے اندر داخل ہوا کرتے تھے لہٰذا خدا نے حکم دیا کہ ایسا نہ کرو دروازوں سے آیا کرو۔

جب سے انسانی تمدن کی دُنیا میں بنیاد پڑی ہے ہر مکان کے لئے دروازہ کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور اس میں چند فوائد ہیں۔ اول یہ کہ مکان دشمن کے حملے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہر کس و ناکس داخل ہو کر گھر کا بھید معلوم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ دوسرے دروازے سے مکان کی زینت ہوتی ہے۔ تیسرے ملکیت کی حد کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اکثر دروازے حدِ ملکیت پر قائم کئے جاتے ہیں۔ سوائے مالکِ مکان کے اگر دوسرا شخص کسی کی دیوار پھاند کر یا دیوار میں نقب لگا کر بدونِ اجازت گھس جائے تو وہ چور سمجھا جاتا ہے کیونکہ جب دروازہ موجود تھا تو وہ کھلم کھلا اس کے اندر کیوں نہ داخل ہوا۔ یہ حق تو صرف مالک ہی کو ہے کہ وہ جس حصۂ مکان کو چاہے توڑ کر در بنائے اور داخل ہو جائے بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی مخصوص گھر اپنے کسی مخصوص اہلبیت کے لئے بنوا دے یا اپنے گھر کی دیوار میں در بنا کر داخل کرے جیسا کہ علی کے لئے دیوارِ کعبہ شق ہوئی۔

جس طرح گھروں کے اندر داخل ہونے کے لئے دروازے بنائے جاتے ہیں اسی طرح شہروں میں داخل ہونے کے لئے بھی دروازے ہوتے ہیں۔ مکان یا شہر کا دروازہ جتنا زیادہ شاندار ہوگا اسی قدر اس گھر یا شہر کی وقعت زیادہ ہوگی۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ گھر اور در اور شہر اور باب میں ایک صحیح مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک ویرانے مکان کا جس کے دروازے چھوٹے پڑے ہوں عالیشان دروازہ بنا دیا جائے تو یہ اس دروازہ کی توہین ہوگی اور ہر شخص بنانے والے کی بے عقلی پر ہنسے گا۔ اور اگر نہایت خوشنما گھر کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ ہو تو یہ اس گھر کی توہین ہوگی اور ہر شخص اس پر ہنسے گا۔ پس معلوم ہوا کہ دروازے کے لئے بڑی مناسبت درکار ہے۔ زیادہ چھوٹا نہ ہو۔ زیادہ پست نہ ہو۔ مضبوط ہو شاندار ہو ہر قسم کا سامان اس میں داخل ہو سکتا ہو۔ اگر ان میں سے کسی بات کی بھی کمی ہے تو دروازہ ناقص ہے۔ ان ہی باتوں پر نظر رکھتے ہوئے حضرت رسولِ خدا نے فرمایا۔ انا دار الحکمۃ وعلی بابھا۔ وانا مدینۃ العلم وعلی بابھا۔ حکمت کا گھر ہو یا علم کا شہر علیؑ سے بہتر دروازہ رسولؐ کو مل نہیں سکتا تھا۔ خود امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے نحن الشعار والاصحاب نحن الخزنۃ والابواب لا تؤتی البیوت الا من ابوابھا ومن اتاھا من غیر ابوابھا سمی سارقا۔ ہم شعارِ اسلام ہیں۔ ہم اصحابِ رسولؐ ہیں ہم علوم کے خزانے اور ان کے ابواب ہیں۔ گھروں میں نہیں آتے مگر دروازوں سے اور جو کوئی دروازہ چھوڑ کر آتا ہے اس کو چور کہا جاتا ہے۔

اگر کسی شخص کا پتہ چلانا ہوتا ہے تو گھر اور دروازہ کی چیزیں پوچھی جاتی ہیں کوئی یہ نہیں کہتا کہ سقف کونسی ہے۔ دیوار کہاں ہے۔ صحن کہاں ہے۔

پرنالہ کہاں ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھر سے زیادہ دروازہ کی پرسش ہوتی ہے۔ ہر شخص یہی پوچھتا ہے کہ فلاں شہر یا فلاں گھر کا دروازہ کدھر ہے کیونکہ کسی مکان کا پتہ دروازے سے بہت آسانی کے ساتھ چل جاتا ہے۔ لوگ ہمیشہ کسی مکان کو دروازے ہی کے پتہ سے یاد رکھتے ہیں۔ مہذب دنیا میں دروازہ کا خاص طور سے احترام کیا جاتا ہے۔ قلعہ شاہی کے دروازے ہی کو دیکھ کر عام لوگوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ علماء کے دروازوں میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا جاتی ہے اور رعب علم غالب آجاتا ہے پس دروازہ کا مرتبہ بھی خاص مرتبہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد رسولؐ کی طرف جو دروازے کھلے ہوئے تھے ان سب کے بند ہونے کا حکم ہو گیا سوائے علیؑ کے دروازے کے وہ بدستور صحن مسجد کی طرف جس طرح کھلا ہوا تھا کھلا رہا۔ اور لوگوں کو مسجد کی طرف روشندان کیا سوراخ تک رکھنے کی اجازت نہ ملی جب اس پر عباس بن عبد المطلب معترض ہوئے تو حضرت نے فرمایا میں نے کسی کا دروازہ نہ بند کیا اور نہ کسی کا دروازہ کھولا بلکہ یہ جو کچھ ہوا ہے حکم خدا سے ہوا ہے۔

جب علیؑ کے لئے خانہ کعبہ میں نیا دروازہ کھل گیا تو مسجدِ رسولؐ میں جو دروازہ کھلا ہوا تھا وہ کیونکر بند ہو سکتا تھا جو خدا کا راز دار تھا۔ اس سے مسجدِ رسولؐ میں کس بات کا پردہ۔ علی خدا کے گھر کا احترام جانتے تھے اور خدا کا گھر علی کا احترام جانتا تھا۔ علی جیسے سخی کا دروازہ کبھی بند ہوا ہی نہیں۔ ہمیشہ راہ خدا میں سوال کرنے والوں کے لئے کھلا ہی رہا۔ ایسے دروازہ کو بند کرنے کا حکم کیوں دیا جاتا۔

بظاہر اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ گھروں کے اندر دروازوں سے داخل ہوا کرو۔ اور دیواریں پھاند کر نہ آیا کرو لیکن حقیقی مفہوم جو اہلبیت نے بیان کیا وہ یہ ہے کہ اگر علم حاصل کرنا ہے تو جو ابواب علم ہیں ان سے حاصل کرو اگر ان کو چھوڑ کر دوسروں سے حاصل کرو گے تو ایسا ہے جیسے چور دیوار پھاند کر گھر میں کود جائے گویا اس کا منشا یہ ہے کہ علم نبیؐ ان لوگوں سے حاصل کرو جو اہل الذکر ہیں۔ راسخون فی العلم ہیں اور مدینۂ علم نبیؐ کے باب ہیں اور چونکہ ان سب باتوں کے مصداق علیؑ ہیں لہذا جس نے علیؑ کے سوا دوسروں سے علم لیا اس نے صحیح مرکز کو چھوڑ کر غلط ماخذ کو حصول علم کا ذریعہ بنایا۔

شہر کے اندر جو چیز آتی ہے وہ دروازے سے آتی ہے اور جو باہر جاتی ہے وہ بھی دروازے ہی سے باہر جاتی ہے پس رسولؐ نے جس کو اپنے شہرِ علم کا دروازہ بنایا ہے وہ امتِ وسط ہے اسی کے متعلق قرآن میں ہے وَجَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا (ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو) امت کے اعمال جو رسول تک پہنچتے ہیں۔ وہ اسی دروازہ سے پہنچتے ہیں اور رسول کے جو احکام امت تک پہنچتے ہیں وہ اسی کے ذریعہ سے۔

قرآن جو ماخذِ علمِ رسولؐ ہے وہ قلبِ رسولؐ پر نازل ہوا پس علم کا شہر قلبِ رسولؐ ہوا۔ قلب کا دروازہ زبان ہے جو انسان کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان سے نکلتا ہے۔ پس رسولؐ نے اپنے علم کا دروازہ ایسی زبان کو بنایا جس کو لسان اللہ کا خطاب حاصل ہوا۔

دروازہ دراصل شہر کی تفصیلی حالت کا ایک اجمالی نقشہ ہوتا ہے۔ یعنی دروازہ کو دیکھتے ہی یہ پتہ چلا لیا جاتا ہے کہ اس شہر کا کیا حال ہے پس جو کچھ شہرِ علمِ نبی میں ہے وہی اس کے دروازے میں ہے۔ ایک شہر کی شان یہ ہے کہ اس میں تمام ضروریاتِ زندگی بہترین صورت میں پائی جائیں۔ نبیؐ کے علم کی شان یہ ہے وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (جو کچھ تم نہیں جانتے تھے اللہ نے اس کو تعلیم کر دیا۔ اور علیؑ کے علم کی شان یہ ہے وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (ہر شے کا احصا ہم نے امام مبین میں کر دیا ہے)

نبی شہر علم ہیں جس کی شہر پناہ عصمت و طہارت ہے اور جس طرح شہر کے اندر بہت سے گھر ہوتے ہیں اسی طرح شہر علم میں تمام انبیائے سابقین کے علوم موجود ہیں۔ اسی کی تصویر دروازہ میں پائی جاتی ہے من ینظر الی آدم فی علمہ الخ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر علم میں سامان کی وہ کثرت ہے کہ ابل کر دروازہ تک پہنچ گیا ہے۔

خدا نے سات انبیاء کو فضیلتیں خاص طور سے عطا فرمائی ہیں۔

(۱) آدمؑ کو علم اسماء دیا وَعلّم آدم الاسماء کلّھا یہی علم ملائکہ کے سجدہ کا سبب ہوا اور آدم کو ان پر فضیلت حاصل ہوئی۔

(۲) خضرؑ کو فراست دی وَعلّمناہ من لدنا علماً۔ اسی سے حضرت موسیٰ ان کے شاگرد ہوئے۔

(۳) یوسفؑ کو علم تعبیر خواب دیا وَعلّمتنی من تاویل الاحادیث۔ یہی چیز سبب حصول سلطنت ہوئی۔

(۴) داؤدؑ کو علم زرہ سازی دیا۔ وعلّمناہ صنعۃ لبوس لکم۔ یہی چیز ان کے لئے سبب ہیبت و عظمت ہوئی۔

(۵) سلیمانؑ کو علم منطق طیر دیا۔ علّمنا منطق الطیر جو سلطنت ملنے کا سبب اور بلقیس کے محکوم بنانے کا باعث ہوا۔

(۶) عیسیٰؑ کو علم توریت و انجیل دیا ویعلّمہ الکتاب والحکمۃ والتوریۃ والانجیل۔ یہی چیز حضرت مریمؑ سے زوال تہمت کا سبب بنی

(۷) اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی ویعلّمھم الکتاب والحکمۃ قرآن کی تعلیم دی الرحمٰن علّم القرآن بلکہ ہر اس چیز کی تعلیم دی جس کو وہ نہیں جانتے تھے وعلّمک مالم تکن تعلم

ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ جناب عیسیٰ کو علم کتاب پیدا ہوتے ہی دے دیا گیا اور حضرت رسولخدا کو چالیس برس بعد عطا ہوا۔ انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا (میں اللہ کا بندہ ہوں مجھ کو کتاب ملی ہے اور میں نبی بنایا گیا ہوں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت بھی ان کو بچپن میں ملی۔ اور حضرت رسولخدا کو چالیس برس بعد۔ اسی طرح حضرت یحییٰؑ کو نبوت بچپن میں ملی وآتیناہ الحکم صبیاً بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مرتبہ حضرت رسولخدا سے بڑھا ہوا تھا کیونکہ وہ حضرات بچپن میں اس قابل تھے اور حضرت چالیس برس بعد ہوئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یا حضرت یحییٰؑ کو جو کچھ ملا بعد پیدائش ملا کیونکہ انی عبد اللہ پہلے ہے اور اتانی الکتاب بعد میں عبد اللہ کا اطلاق بعد پیدائش ہی ہو سکتا ہے اسی طرح حضرت یحییٰ کے ساتھ صبیاً کا لفظ موجود ہے۔ لیکن رسولخدا کو قبل پیدائش علم کتاب عطا ہوا۔ الرحمٰن علّم القرآن خلق الانسان اس پر شاہد ہے یعنی خلقت بعد میں ہے اور علم قرآن پہلے۔ جناب عیسیٰؑ اور جناب یحییٰؑ کی نبوت بعد میں ہے اور خلقت پہلے اور جناب رسولخدا کی نبوت خلقت سے پہلے ہے۔ کنت نبیاً وآدم بین الماء والطین (میں اس وقت نبی تھا جب آدم آب و گل ہی میں تھے) چالیس برس بعد آپ کو نبوت نہیں ملی بلکہ وہ وقت اظہار نبوت کا تھا۔ قرآن کا علم بھی چالیس برس بعد نہیں دیا گیا بلکہ وہ وقت بیان کرنے کا تھا۔ پس معلوم ہوا علم پہلے تھا اور بیان بعد میں جیسا کہ آیۂ الرحمٰن علّم القرآن خلق الانسان علّمہ البیان سے ظاہر ہے۔ اگر قرآن کا علم رسولؐ کو بعد میں دیا جاتا تو ان کے پہلے اور بعد کے افعال میں کچھ فرق ہوتا۔ لیکن نہیں چالیس برس جو کچھ کیا وہ بالکل مطابق قرآن تھا۔ اس نور کے ایک جزو نے اس کی تصدیق بھی کر دی کہ علم قرآن قبل خلقت حاصل تھا جیسا کہ امیر المومنین کے بعد پیدائش قرآن سنا دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔ پس جس کے نائب کو قبل پیدائش علم قرآن حاصل تھا۔ اس کے منصب کو کیوں نہ حاصل ہوتا۔ قرآن کا نزول صرف یہ بتانے کو تھا کہ اب یہ آیت

پہنچادو اور اب یہ پہنچا دو نبیؐ کا یہ وقت تبلیغی تھا نہ کہ تعلیمی۔

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو ان کا علم حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اظہار وقت سے پہلے نہیں کیا جاتا۔ اور قوت سے فعل میں لانے کا موقع نہیں ہوتا۔ مثلاً وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون (اے رسول تم تو اس سے پہلے کتاب پڑھتے نہیں تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اس لئے کہ باطل پرستوں کو شک کرنے کا موقع نہ ملے) اگر آنحضرت کتابوں کو بظاہر لکھا پڑھا کرتے تو لوگوں کو شک کرنے کا موقع مل جاتا کہ یہ قرآن حضرت نے دوسرے ادیان کی کتابیں پڑھ کر خود ہی لکھ لیا ہے۔ لہٰذا یہ کام قدرت نے اُس نور کے دوسرے جزکے سپرد کر دیا تاکہ یہ ثبوت ہے کہ اس نور کو اس فضیلت سے محروم نہیں کیا گیا۔ نبیؐ اور علیؑ چونکہ ایک نور سے ہیں لہٰذا جو کام اُن کا ہے وہ ان کا سمجھا جاتا ہے اور جو ان کا ہے وہ اُن کا۔

صلح حدیبیہ میں صلحنامہ رسولؐ نے نہ لکھا بلکہ علیؑ نے لکھا جاھد الکفار والمنافقین کا حکم رسولؐ کو تھا۔ علیؑ نے منافقین سے لڑکر اور رسولؐ نے کفار سے لڑکر اس کو پورا کر دیا۔ شب ہجرت رسولؐ کے فرش پر سو کر رسولؐ کا کام انجام دے دیا۔

محمدؐ و آلِ محمدؐ ایسے عالم ہیں کہ ان کو خلقت آسمان و زمین کا گواہ بنایا گیا ہے۔ سورۂ کہف میں ہے واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس کان من الجن ففسق عن امر ربہ افتتخذونہ وذریتہ اولیاء من دونی وھم لکم عدو بئس للظالمین بدلا ما اشھدتھم خلق السمٰوات والارض ولا خلق انفسھم وما کنت متخذ للظالمین عضدا (جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کر لیا اور ابلیس قوم جن سے تھا۔ پس اس نے اپنے رب کے حکم کو نہ مانا۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر شیطان اور اس کی ذریت کو دوست بناؤ گے حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ خدا کے یہاں ظالموں کے لئے برا بدلا ہے ہم نے شیطان اور اس کی ذریت کو نہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت گواہ بنایا۔ اور نہ ان کے نفسوں کی پیدائش کے وقت۔ اور ہم ظالموں کے لئے مددگار قرار دینے والے نہیں) اس آیت سے معلوم ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریت پیدائش آسمان و زمین اور اپنے نفسوں کی خلقت کے وقت موجود نہ تھی۔ پس قرینہ بتاتا ہے کہ دوستانِ خدا کی کوئی جماعت خلقت آسمان و زمین کے وقت اور اپنے نفوس کی پیدائش کے موقع پر موجود ہونی چاہیئے ورنہ شیطان اور اس کی ذریت کے لئے یہ کہنا ہی عبث ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ شیطان کے ساتھ اس کی ذریت کو بھی اس صفت کی نفی میں شامل کیا گیا ہے پس جو مقرب ایزدی اور خلاصۂ کائنات اس وقت موجود ہوگا وہ بھی مع اپنی ذریت کے ہونا چاہیئے یہی وہ گروہ ہے جو عالین کہلاتا ہے۔ اسی کے متعلق سے کہا گیا تھا استکبرت ام کنت من العالین (کیا تو نے تکبر کیا یا تو عالین میں سے ہو گیا۔ اور انہی عباد مخلصین کو پیش نظر رکھ کر ابلیس نے کہا تھا ربّ بما اغویتنی لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین (پالنے والے تو نے تو مجھے گمراہی میں چھوڑا ہی ہے میں تیرے مخلص بندوں کے سوا سب ہی کو بہکاؤں گا۔) یہ عباد مخلصین محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا کون ہو سکتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو تمام مخلوقات کی خلقت کے وقت موجود تھے۔ یہی وہ خاص بندے ہیں جنہوں نے خدا کے سوا کسی غیر کے سامنے سر جھکایا ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن پر شیطان کے اغوا کا کبھی اثر ہوا ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے جان و مال راہِ خدا میں کام آئے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے دل دنیا کی انتہائی مصیبتوں میں خدا کی طرف سے نہ پھرے۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السّلام کے تمام رفقا باری باری کام آئے اور

آپ تنِ تنہا رہ گئے تو اپنا منہ آسمان کی طرف کر کے فرمایا۔

ترکتُ الخلقَ طرّاً فی ھواک ۔ وَ ایتمتُ العیالَ لکے اراک ۔
فلو قطّعتنی بالحبِّ اِرْباً لما حنّ الفؤادُ الیٰ سواک

(اے میرے معبود میں نے تمام دنیا کو تیری محبت میں چھوڑ دیا اور تیری ملاقات کے شوق میں اپنے بچوں کو یتیم بنانا منظور کر لیا پس اگر تو اپنی محبت میں میرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تب بھی میرا دل تیرے سوا دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوگا)

لکھا ہے کہ حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد بار بار دشمن کی طرف سے مبارز طلبی ہونے لگی اور طنز آ کہنا شروع کیا اے حسین اگر فوج میں کوئی اور اپنی زندگی سے سیر موجود ہو تو اس کو ہم سے لڑنے کے لئے بھیجئے ورنہ آپ خود آیئے تا کہ جلدی سے آپ کا سر کاٹ کر اطمینان سے اپنی بندھی کمریں کھولیں اور نیچے کے باجے بجانا شروع کریں۔ ان ناخدا شناس ستمگاروں کے یہ الفاظ امام علیہ السلام کے دل پر خنجر کا کام کر رہے تھے۔ آخر آپ سے ضبط نہ ہو سکا اور رخصتِ آخر کے لئے خیمہ میں تشریف لائے اور فرمایا یا زینب و یا امّ کلثوم و یا سکینہ و یا رباب علیکن منی سلام۔ پھر فرمایا السلام علیک یا فضۃ جاریۃ امی فاطمہ الزہرا اور سلام ہو میرا فضہ میری ماں فاطمہ زہرا کی کنیز پر۔ حضرت کی آواز سنتے ہی تمام بی بیاں آپ کے گرد جمع ہو گئیں اور رو رو کر پوچھنے لگیں اے فرزند رسولؐ کس ارادے سے آپ تشریف لائے ہیں فرمایا الوداع الوداع۔ الفراق الفراق یہ سنتے ہی ان بیکسوں کے دل سینوں میں ہل گئے اور خیمہ کے اندر ایک کہرام بپا ہو گیا۔ چاروں طرف سے دکھیاسیدانیاں حسین کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھیں کہ ایک چار سالہ بچی نے آ کر امام مظلوم کا دامن پکڑ لیا اور پوچھنے لگی یا ابتِ قد استسلمت للموت کیوں بابا کیا آپ نے مرنے پر کمر باندھ لی؟ فرمایا یا بنیّ کیف لا یستسلم الموت من لا ناصر لہٗ ولا معین بیٹی کیونکر موت کو وہ قبول نہ کرے جس کا کوئی معین و ناصر ہی نہ ہو۔ یہ سنکر بچی نے حسرت بھری نظر سے باپ کے چہرے کو دیکھا اور کہنے لگی۔ یا ابتِ ردّنا الیٰ قبر جدّنا اے بابا اگر یہ بات ہے تو پھر ہم کو ہمارے جد کی قبر پر پہنچا دیجئے۔ امام مظلوم نے ایک آہ سرد بھر کر فرمایا یا بنیّ لو ترک القطا لنام۔ اے نور دیدہ اگر یہ امکان میں ہوتا تو تم کو اس مصیبت میں کیوں چھوڑ تا۔ آہ یہ سنکر بابا کی دکھیا سکینہ بلبلا کر رونے لگی امام علیہ السلام نے بچی کو سینہ سے لگا لیا اور دیر تک پیار کرتے رہے۔ حضرت سکینہ کو سینہ سے لپٹائے اہل حرم کو تسلی و دلاسا دے رہے تھے۔

پھر حضرت نے جناب زینبؑ سے فرمایا کپڑوں کا بقچہ لاؤ تا کہ حسین اپنی آخری پوشاک پہن لے یہ حکم سُنکر جناب زینبؑ کپڑے لے آئیں آپ نے ایک نہایت بوسیدہ لباس نکال کر اس کو جا بجا سے چاک کیا اور پھر زیب تن فرمانے لگے۔ جناب زینب نے پوچھا اے بھائی اس میں کیا مصلحت ہے۔ فرمایا اے بہن مجھے قتل کرنے کے بعد یہ اشقیا میرے کپڑے تک اتار لیں گے۔ پس میں نے یہ لباس کہنہ اس لئے پہن لیا ہے کہ وہ لوگ اس کو پرانا سمجھ کر چھوڑ دیں گے اور میری لاش عریانی سے محفوظ رہے گی۔ جناب زینبؑ یہ کلمات سنکر اس درجہ بے چین ہوئیں کہ قریب تھا غش کھا کر گر پڑیں۔

اس کے بعد حضرت نے تبرکات کا صندوق طلب فرمایا اور اس میں سے عمامۂ رسولؐ نکال کر سر پر باندھا۔ عبائے امیر المومنینؑ زیب تن فرمائی۔ امام حسنؑ کا پٹکا کمر میں باندھا۔ اسی طرح دیگر تبرکات سے جسم مبارک کو زینت بخشی پھر اہل حرم سے فرمایا اب تم سب حسینؑ سے

رخصت ہو۔ آہ اس وقت اہلِ حرم میں جو کہرام بپا تھا اس کا بیان ناممکن ہے۔ ایک ایک بی بی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ حضرت باری باری سب کو رخصت فرماتے جاتے تھے۔ جب جناب زینبؑ سے رخصت کی باری آئی تو بہن بھائی دیر تک گلے مل کر روتے رہے پھر جناب زینبؑ نے کہا ماں جائے اس وقتِ آخر میں ایک تمنا زینب کی اور پوری کیجئے اور وہ یہ ہے کہ ذرا اپنی عبا کا تکمہ کھول دیجئے۔ حضرت نے اس خواہش کو پورا کیا۔ جناب زینب نے حضرت کے گلوئے مبارک پر بوسہ دیا۔ آپ نے اس کا سبب پوچھا۔ جناب زینبؑ نے کہا بھیا اماں جان نے مرتے وقت مجھے یہ وصیت کی تھی کہ جب میرا حسین رخصتِ آخر کے لئے خیمہ میں آئے تو میری طرف سے اُس کے گلے کے بوسے لینا۔ آہ اس کا گلا خنجرِ ظلم سے کاٹا جائے گا۔ حضرت نے فرمایا اے بہن ایک آرزو میری بھی پوری کرو۔ پوچھا وہ کیا ہے فرمایا اپنی چادر شانوں پر سے ہٹا دو جناب زینب نے فوراً حکمِ امام کی تعمیل کی حضرت نے بہن کے دونوں شانوں پر بوسے دیئے۔ جناب زینبؑ نے پوچھا ماں جائے بہن آپ پر قربان ایسا آپ نے کیوں کیا فرمایا اے بہن میری شہادت کے بعد اشقیائے امت ان شانوں میں رسی باندھیں گے۔ اے بہن میری وصیت ہے کہ بعد میرے جو مصیبت تم پر نازل ہو صبر و شکر کے ساتھ اس کو برداشت کرنا۔

اس کے بعد امامِ مظلوم جناب سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام کے خیمہ میں تشریف لائے۔ آپ اس وقت غشی کی حالت میں تھے حضرت نے شانہ ہلایا تو آپ نے غش سے آنکھیں کھولیں۔ حضرت نے فرمایا۔ بیٹا سید سجادؑ ہم تمہارے پاس رخصتِ آخر کے لئے آئے ہیں۔ اب ہماری شہادت کا وقت قریب آگیا ہے۔ بیٹا ہمارے بعد تم حجتِ خدا اور اس بیکس قافلے کے سالار ہو۔ بیٹا جو بلا سر پر آئے صبر و شکر کے ساتھ جھیل لینا۔ مومنین امام حسینؑ کا یہ کلام سُن کر بیمار کربلا کے دل پر وہ چوٹ لگی کہ قریب تھا روحِ مبارک پرواز کر جائے۔ رو رو کر عرض کرنے لگے یا ابت این ابن اخی قاسم بن الحسن و علی الاکبر و عمی ابی الفضل العباس اے بابا میرے بھائی قاسمؑ و علی اکبرؑ اور میرے چچا ابوالفضل العباسؑ کہاں گئے کہ آپ مرنے پر کمربستہ ہیں۔ حضرت نے آہ سرد بھر کر فرمایا۔ بیٹا سب قتل کر دیئے گئے۔ اب فوجِ خدا میں میرے سوا اور کوئی باقی نہیں یہاں تک کہ تمہارا شیر خوار بھائی علی اصغرؑ بھی تیرِ ستم کا نشانہ بن گیا ؎

اس واسطے کپڑے یہ مرے خوں میں بھرے ہیں
دم توڑ کے یہ سب مری گودی میں مرے ہیں

یہ سنتے ہی بیمار کربلا کو غش آگیا۔ اس وقت بیمار کربلا کے خیمہ میں ایک حشر برپا تھا۔ ہر طرف سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ آخر جب بیمار کربلا کو کچھ دیر بعد ہوش آیا تو حضرت نے اسرارِ امامت آپ کو تعلیم فرمائے اور آپ سے رخصت ہو کر میدان میں جانے کا قصد فرمایا۔ راوی کہتا ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام خیمہ سے برآمد ہونے کا قصد فرماتے تھے تو سیدانیاں آپ کا دامن پکڑ کر کہتی تھیں اے بیکسوں کے سہارے۔ اے ٹوٹے دلوں کی آس ذرا دیر ٹھہر جایئے۔ یہاں تک کہ خیمۂ امام کا پردہ سترہ بار اٹھا اور گرا آخر بمشکل تمام امام علیہ السلام خیمہ سے اس طرح برآمد ہوئے ؎

شبیرؑ برآمد ہوئے یوں خیمہ کے در سے
جس طرح نکلتا ہے جنازہ کسی گھر سے

کتبِ مقاتل میں ہے کہ حضرت کا گھوڑا در خیمہ پر کھڑا تھا۔ آہ کوئی آشنا نہ تھا کہ حضرت کی رکاب تھام کر آپ کو سوار کرا دیتا۔ اپنے وفادار و جاں نثار اصحاب کا خیال آگیا ایک بار مقتل کی طرف رُخ کر کے فرمایا اے میرے شیر دل اے میری گود کے پالو میں نے تم سب کو رکاب تھام تھام کر سوار کیا تھا۔ آؤ اب حسین کے سوار ہونے کا وقت ہے۔ اٹھو میرے شیر دل جانو میری رکاب آکر پکڑو اور مجھے گھوڑے پر سوار کر دو تاکہ تمہاری طرح

میں بھی اپنا سر کٹا کر اپنا فرض پورا کروں۔

راوی کہتا ہے میں نے دیکھا کہ یکایک خیمہ کا پردہ اٹھا اور اندر سے ایک بی بی سر سے پیر تک سیاہ برقعہ پہنے ہوئے برآمد ہوئیں اور رو رو کر کہنے لگیں۔ بیکس بھیا میں تیری غربت کے نثار۔ زینبؑ رکاب تھامتی ہے آپ سوار ہو جیئے۔ ؎

نہ آسرا تھا کوئی شاہِ کربلائی کو — بہن نے آکے کیا تھا سوار بھائی کو

الغرض امام علیہ السلام گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کی طرف چلے ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ یکایک آپ کا گھوڑا رک گیا آپ نے ذوالجناح سے مخاطب ہو کر فرمایا اے اسپ وفادار کیا اس وقتِ بیکسی میں تو بھی مظلوم حسین کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ گھوڑے نے بزبانِ حال عرض کی اے فرزندِ بتول اے سوارِ دوشِ رسولؐ میری کیا مجال کہ آپ کے حکم سے سرتابی کروں لیکن مولا ذرا میرے پیروں کو تو ملاحظہ فرمایئے اب جو امام علیہ السلام نے جھک کر دیکھا تو بالی سکینہؑ گھوڑے کے سموں سے لپٹی ہوئی کہہ رہی تھیں اے گھوڑے خدا کے لئے میرے بابا کو نہ لے جا مجھے یتیمی کی مصیبت سے بچالے صبح سے میں دیکھ رہی ہوں کہ جو کوئی میدان میں جاتا ہے واپس نہیں آتا۔ یہ حالت دیکھ کر امام علیہ السلام گھوڑے سے اتر پڑے اور سکینہ کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اور فرمایا اے بیٹی میں تو تم کو رخصت کر آیا تھا۔ اب تم پھر کیوں آئیں۔ بیٹی مرنے والوں سے اتنی محبت نہیں کیا کرتے۔ بچی رو رو کر کہنے لگی بابا کیا کروں کسی طرح میرے دل کو چین نہیں آتا۔ آپ مجھ کو اپنے ساتھ لے چلئے۔ آہ حضرت معصوم بچی کی اس بات کا کیا جواب دیں۔ چھاتی سے لگا کر فرمایا بیٹی میں دوستوں میں نہیں بلکہ اپنے جانی دشمنوں میں جا رہا ہوں تمہارا ساتھ لے جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ بیٹی اب تم خیمہ میں جاؤ اور اپنی ماں پھوپھیوں کے پاس رہو۔ میری شہادت کا وقت قریب اب قریب آلگا ہے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ اس کے بعد حضرت نے اس بچی کو رخصت کر کے خیمہ میں بھیجا اور خود میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۰

بیسویں مجلس

تفسیر آیۂ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الخ اور حالِ شہادت امام مظلوم علیہ السّلام

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْھُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ ○ (پھر ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کرلیا ہے اور ہمارے بندوں میں بعض تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں) خداوند عالم نے اپنی مخلوقات کو مختلف جنسوں میں اور جنسوں کو مختلف نوعوں میں اور نوعوں کو صنفوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر صنفوں میں بعض افراد کو بعض سے ممتاز بنایا ہے۔ وہ اس اختلاف میں اپنی کمالِ قدرت کا اظہار کرتا ہے۔ سمندروں میں جو پانی موجزن ہے وہ اس درجہ کھاری اور بدمزہ ہے کہ اگر کوئی پی لے تو قے ہو جائے اور بیمار پڑ جائے۔ لیکن یہی پانی جب سورج کی گرمی سے بھاپ بن کر اوپر جاتا ہے تو وہاں دستِ قدرت ایک ہلکا سا چھینٹا دے کر جو نیچے گراتا ہے تو ذائقہ اور تاثیر دونوں بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھاری سے شیریں بد ذائقہ سے خوش ذائقہ اور مضر سے مفید بن جاتا ہے۔ پہلے جس پانی سے کھیتیاں جل جاتی تھیں اب اسی سے لہلہا رہی ہیں پہلے جس کو پی کر متلی ہوتی تھی۔ اب اسی کو پی کر دل خوش ہوتا ہے۔ بظاہر پانی وہی ہے۔ لیکن ایک ذرا تبدیلی میں یعنی نیچے سے اوپر جانے میں کیا سے کیا ہو گیا۔

پھر اسی پانی کے قطرہ کو جب کسی صدف کے منہ میں ڈال دیا تو وہاں موتی بن گیا پہلے سیال تھا اب منجمد ہے پہلے شفاف تھا اب منور ہے پہلے قطرہ تھا اب گوہر ہے۔ ایک ذرا سا مقام بدلا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اب پانی کے قطرے سے اور اس سے کوئی نسبت ہی نہ رہی گو اصل پانی کا قطرہ ہی ہے اور صورت بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن خصائص میں زمین آسمان کا بل ہو گیا۔

وہ گرم ہوائیں جو لو بن کر بدن کو جھلس رہی تھیں دستِ قدرت نے ذرا جوان کو پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرا دیا تو اب وہ نسیم کہلانے لگیں۔ اب ان سے کلیاں کھلتی ہیں۔ دل و دماغ کو راحت پہنچتی ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ دیکھو ایک ذرا سی تبدیلی نے کیا سے کیا بنا دیا۔

ان بدصورت اور بھنگم چٹانوں کے اندر جنہیں کوئی کوڑی کو نہیں پوچھتا سورج سے نکلنے والی کرنوں کو ذرا سی مروڑ جو دستِ قدرت نے دی تو بیش قیمت جواہرات بن گئے۔ ہرنوں کے معمولی خون کو جو ناف میں لا کر جمایا تو مشکِ نافہ بن گیا۔ درختوں کی جڑیں جو پانی کھینچ رہی تھیں جب پھلوں تک پہنچتے پہنچتے ایسا شہد بن کر ٹپکنے لگا کہ زبان چٹخارے بھرنے لگی۔ چیز ایک ہی ہے ذرا سے تغیر میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔

بنی نوعِ انسان میں سے جب کسی کے دل میں وحی کا نور اتار دیا تو وہ صورت میں تو ضرور بشر رہا لیکن سیرت میں خدا سے جا ملا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اب اس کی صنف ہی ایک جداگانہ صنف بن گئی۔ اللہ رے وحی تیری شان کیا کایا پلٹ دی۔ آدمی کی بات اللہ کی بات ہو گئی آدمی کی زبان اللہ کی زبان ہو گئی۔ آدمی کا کلام اللہ کا کلام ہو گیا۔ آدمی کا کام اللہ کا کام کہلانے لگا۔ آدمی کے ہاتھ اللہ کے ہاتھ ہو گئے۔

وہ بے نیاز ذات جو کبھی کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ بندوں سے ملتی جلتی نہیں، صورت والی نہیں، مکان و زمان والی نہیں وحی نے اس کی باتیں ہمیں سنوا دیں۔ اس کے احکام ہم تک پہنچا دیئے۔ اس کی مرضی سے واقف کار بنا دیا۔ ہم ہی جیسا ایک انسان اس وحی کی بدولت اتنا بلند مرتبہ پا گیا کہ اس میں ممکن ہو کر بھی وجوب کی شان جھلکنے لگی ؎

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل — سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را

یہی وحی جب قلبِ رسولؐ پر لکھی گئی تو کتاب اللہ کہلائی۔ جب زبانِ رسولؐ پر آئی تو قرآن اور کلام اللہ کے نام سے موسوم ہوئی سبحان اللہ کیا دریائے نور میں دھلی ہوئی اور بحرِ عصمت و طہارت میں غوطہ کھائی ہوئی وہ زبان تھی جس پر چڑھے ہوئے الفاظ بھی ایسے پاک و پاکیزہ ہوئے کہ بے طہارت ان کا چھونا بھی جائز نہ ہوا۔ اور کیسا پاک و پاکیزہ وہ دل تھا جس کے نقوش کی اتنی حفاظت کی گئی کہ جب ان کا ٹھپہ اتارا گیا تو بلحاظ احتیاط سینہ سے سینہ ملا کر دل سے دل پر تا کہ کسی نامحرم کی آنکھ دیکھ نہ سکے۔ کسی غیر کا کان سن نہ سکے بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتو العلم (بلکہ وہ آیات بینات ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا گیا ہے) الفاظ عام لوگوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت قرار پائے اور مفہوم خاص لوگوں کے لئے قلزم ہدایت بنا۔ اس کا تعلق ظاہری طہارت سے اس کا تعلق باطنی طہارت سے۔ وہ زبانی باتیں یہ دلی راز وہ ہوا سے کانوں تک پہنچنے والی باتیں یہ محبت سے دل میں بیٹھنے والی باتیں۔ ان کا تعلق عام بندوں سے ان کا تعلق خاص بندوں سے۔ وہ نقوش کے اندر محفوظ یہ نفوس کے اندر مستور ان میں ریب کی گنجائش ان کنتم فی ریب یہاں یقین میں رسوخ ثم لم یرتابو وہ محکم و متشابہ دونوں یہ سب محکم۔ اس کے حافظ بندے اس کا حافظ خدا۔ یہ خلافِ تنزیل وہ موافقِ تنزیل۔

اب ذرا آیۂ مذکورۃ الصدر پر نظر ڈالئے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا الخ ہم نے کتاب کا وارث بنایا۔ یعنی کتاب کے وارث بنانے والے ہم ہیں تم نہیں۔ کیونکہ کتاب ہماری ہے تمہاری نہیں جس کی ملکیت ہوتی ہے اسی کو مالک بنانے کا حق بھی ہوتا ہے ہماری چیز کے وارث بنانے والے تم کون۔ کتاب تمہاری ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے نہ کہ ملکیت بنانے کو۔ کسی چیز کا وارث اس کا متصرف حاکم اور صاحب اختیار ہوتا ہے۔ اگر تم کتاب کے وارث بن جاؤ تو اس صورت میں تم حاکم و متصرف قرار پاتے ہو اور ہماری کتاب تمہاری محکوم بنتی ہے۔ تم کو اس پر ہر طرح کا اختیار ہو جاتا ہے کہ جو چاہو تغیر کرو جس طرح چاہو پڑھو۔ جس آیت کو چاہو رکھو۔ آخر یہ اختیار تم کو کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ مالک ہم ہیں چیز ہماری ہے اور بڑی گرانقدر چیز ہے۔ قیامت تک کے لئے قانون ہے۔ ہمارا کلام ہے۔ ذرا سی بات بگڑ جائے تو عمر بھر کے لئے ہماری ذات موردِ الزام ہو۔ تمہاری زبانوں پر عصمت کا پہرہ دار نہیں بیٹھا۔ تمہارے دلوں کو طہارت کے پانی سے دھویا نہیں گیا۔ تم کو ایسی گرانقدر امانت کا امانت دار بنایا کیسے جا سکتا ہے۔ یہ کام ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم ایسے کو وارث بنائیں گے جو اس کا اہل ہو۔ جو مطالبِ قرآن کو اپنے سینہ میں رکھنے کے قابل ہو اور یہ کتاب جن کا ستائش نامہ ہو جن کے ہر قول و فعل پر ہم کو اعتماد ہو جن کی بات ہماری بات ہو اور جن کا فعل ہمارا فعل ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا قانون نسب میں چلتا ہے سبب میں نہیں چلتا۔ وارث خدا کا بنایا ہوا ہوتا ہے نہ کہ ہر وہ شخص جو مدعیِ وراثت ہو۔ اگر کسی شخص کی وراثت کا مقدمہ جج کی کچہری میں ہو اور ایک شخص جا کر یہ کہہ دے کہ جناب میں اس مال کا وارث ہوں کیونکہ متوفی کا میں خسر

ہوں تو جج اس کو مجنون سمجھ کر اپنی کچہری سے نکلوا دے گا۔ سببی رشتہ کا تو ذکر ہی کیا صلبی رشتہ میں بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ عاق تو نہیں ہے۔ پس خیال کیجئے۔ جب مالی وراثت میں ایسے امور کا خیال کیا جاتا ہے تو بھلا وراثتِ کتاب نا اہلوں، نافرمانوں اور غیر متعلق لوگوں تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اگر عملہ کی غلطی سے کوئی داخلِ خارج ایسے شخص کے نام سے ہو جاتا ہے جو حقیقی وارث نہ ہو تو پردہ فاش ہونے پر اس کا نام سرکاری رجسٹر سے کٹ جاتا ہے اور حقیقی وارث کا نام چڑھ جاتا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا واقعہ سورت برائت کا سمجھ لیجئے۔

اگر دھوکے سے کوئی شخص حقِ غیر پر تصرف کرکے اپنی ملکیت کا اظہار کر بیٹھتا ہے تو یہ معاملہ چلتا نہیں بہت جلد لوگوں پر حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ فرض کیجئے ایک چور کسی کے مکان سے رات کو ایک بکس چرا کر چلا۔ سپاہی نے ٹوک کر پوچھا۔ تم کون ہو۔ اس نے کہا میں ایک مسافر ہوں ریل پر جا رہا ہوں۔ سپاہی کو اس کی گھبراہٹ سے کچھ شبہ ہوا۔ پوچھا یہ بکس کس کا ہے۔ اس نے جواب دیا میرا ہے۔ سپاہی نے کہا ذرا اس کی کنجی تو مجھے دکھاؤ۔ وہ بولا کنجی تو میرے پاس نہیں۔ جلدی میں گھر بھول آیا۔ سپاہی نے کہا اچھا بتاؤ اس کے اندر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے ٹھیک طور سے خبر نہیں۔ یہ سنتے ہی وہ اس کو یہ کہہ کر گرفتار کر لیتا ہے کہ تو چور ہے۔ اتفاقاً اس بکس کا مالک بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ وہ کڑک کر کہتا ہے کہ یہ بکس میرا ہے۔ یہ کنجیاں موجود ہیں۔ اس میں میرے فلاں فلاں کپڑے ہیں جو فلاں فلاں موقع پر میں نے بنائے تھے۔ اس میں کچھ وہ خلعت بھی ہیں جو مجھے انعام میں ملے تھے۔ دیکھو یہ تطہیر کی ردا ہے یہ انما ولیکم اللہ کا سرپیچ ہے۔ یہ یوفون بالنذر کی عبا ہے۔ اس طرح اور بہت سی چیزیں ہیں۔ کہو تو میں ہر لباس کو پہن کر دکھا دوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک میرے بدن پر موزوں ہے اور خاص میرے ہی قد و قامت کے لحاظ سے ان سب کو تیار کیا گیا ہے۔ ان لباسوں کے علاوہ اس بکس میں میرے نام کے بہت سے سرٹیفکیٹ بھی ہیں یہ دیکھو کل شئی احصیناہ فی امام مبین ۝ میرے علم کی سند ہے کانھم بنیان موصوص میری شجاعت کی سند ہے اولی الامر منکم میری حکومت کی سند ہے بلغ ما انزل الیک میری خلافت کی سند ہے انفسنا وانفسکم میری قربت کی سند ہے یحبھم ویحبونہ میری محبت کی سند ہے یؤثرون علی انفسھم میری سخاوت کی سند ہے۔ اسی طرح بے شمار سندیں ہیں۔ مجھ سے تم اس بکس کے اندر کی ایک ایک چیز کا حال پوچھ لو۔ یہ سنتے ہی وہ سپاہی سمجھ جاتا ہے کہ اس بکس کا مالک یہی ہے کیونکہ جو کچھ اس بکس کے اندر ہے اس کا صحیح صحیح علم اسی کے پاس ہے۔

مال کی وراثت اہل و نا اہل، ہوشیار و دیوانہ سب کو پہنچ جاتی ہے کیونکہ خدا نے نسل میں ہونے کا اتنا حق رکھا ہے لیکن علمی وراثت میں نا اہلوں کا کوئی حصہ نہیں۔ نسل کا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اگر صاحبِ وحی سے بلحاظ کمالِ نفسانی اتنا قریبی تعلق رکھتا ہو کہ وحی کی آواز سن لیتا ہو، صاحبِ وحی کا نفسِ ناطقہ کہلاتا ہو تو پھر نسلی تعلق اس رشتہ کو زیادہ قوی بنا دیتا ہے۔

خدا نے اپنی کتاب کی وراثت کا تعلق اپنے برگزیدہ بندوں سے رکھا ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ عام لوگوں کا اس وراثت سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا جمع کر لینا اور بات ہے اور خدا کی طرف سے وارثِ کتاب بننا اور بات ہے۔ جو لوگ اصطفائے الٰہی میں آ گئے ہیں وہی اس منصبِ جلیلہ کے مستحق ہو سکتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جن کو خاطی بندوں نے اپنے میں سے انتخاب کر لیا ہو۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خدا نے کن کن لوگوں کا اصطفا کیا ہے۔ فرماتا ہے ان اللہ اصطفٰی آدم و نوحاً و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین (اللہ نے چن لیا آدمؑ و نوحؑ کو اور اولاد ابراہیمؑ اور اولاد عمران کو تمام عالموں پر) مفسرین علماء میں سے کسی نے آج تک اس بات پر روشنی نہ ڈالی کہ

یہ اصطفا کس معیار پر ہوا کہ حضرت ابراہیم سے پہلے کے صرف دو نبی اس معیار پر پورے اتر سکے حالانکہ وہ ابنیائے اولوالعزم میں سے نہیں ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم جیسا نبی بھی اس معیار پر پورا نہ اترا۔ تعجب ہے ان کی اولاد تو حلقۂ اصطفا میں داخل ہو اور وہ خود نہ ہوں۔ نہایت غور طلب بات ہے۔

سنئے یہ اصطفا دو جہت سے ہوا۔ ابتدائے نبوت بتانے کو اور انتہائے نبوت بتلانے کو اس بنا پر آدمؑ اور اولاد ابراہیمؑ کا اصطفا عمل میں آیا کیونکہ آدمؑ سے نبوت کی ابتدا ہوئی اور اولاد ابراہیمؑ پر انتہا۔ دوسری جہت شریعت کی ابتدا و انتہا۔ کتاب خدا کی ہدایت کا آغاز اور انجام بتانے کے لئے ہے چنانچہ شریعتِ الہیہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے ہوئی یعنی یہی سب سے پہلا وہ ہادی ہے جس نے کتاب خدا ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے بندگانِ خدا کو شریعت کی تعلیم دی اور اس کی انتہا آلِ عمران یعنی اولادِ ابوطالب پر ہوگی۔ ابوطالب کی نسل سے خدا کی بارہویں حجت یعنی ہمارے بارہویں امام علیہ السّلام بہ حیثیت وارثِ کتاب اللہ دنیا کے آخر وقت تک دین محمدی کی تعلیم دیں گے۔ اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ وراثت قرآن کے لئے خدا نے اولادِ ابوطالب کا انتخاب کیا ہے۔

جو لوگ آلِ عمران سے مراد جناب موسیٰ اور ان کی ذریت سے لیتے ہیں۔ وہ ذرا مہربانی کر کے سمجھائیں تو کہ آل ابراہیمؑ کے کہنے کے بعد آلِ عمران کہنے کی ضرورت کیا باقی رہتی ہے۔ کیا حضرت موسیٰ اولاد ابراہیم میں داخل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آلِ عمران یعنی اولاد ابوطالب بھی آلِ ابراہیم میں داخل ہے لیکن علیحدہ سے ذکر کرنے کی ضرورت یہ تھی کہ اولادِ ابراہیم دو نسلوں میں منقسم ہے ایک نسل اسحاقی ہے دوسری اسمٰعیلی۔ پہلی نسل کی ہدایت اور شریعت جناب عیسیٰ پر ختم ہو گئی اور دوسری نسل کا سلسلہ چونکہ بہ صلب ابوطالب قیامت تک چلنے والا تھا لہذا نسلی افتراق کرنے اور التباس کو دور کرنے کے لئے آلِ عمران کہنا نہایت ضروری ہے۔ جو اس امر کو تسلیم نہیں کرتے ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا کہ پھر وہ اس آیت کے متعلق اصطفا کا کوئی دوسرا معیار پیش کر سکیں۔

اصطفائے الہی کے معیار پر صحیح اترنے کے لئے کم سے کم دو صفتیں تو ہونی چاہئیں۔ اول علم میں کمال دوسرے جسم میں زور چنانچہ طالوت کا اصطفا اسی بنا پر ہوا تھا۔ ان اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم۔ اللہ نے طالوت کا تم پر اصطفا کر لیا اور علم اور جسم میں اس کی طاقت کو بڑھا دیا۔ سب جانتے ہیں کہ طالوت کو محض اسی لئے بادشاہت ملی کہ علم اور جسمانی زور میں وہ سب سے بڑھا ہوا تھا جب کسی قوم کا بادشاہ بنانے میں خدا ان باتوں کا لحاظ رکھتا ہے تو کیا وارثانِ کتاب میں ان سے زیادہ صفات نہ دیکھے گا۔ اگر یہاں علم اور جسم ہے تو وہاں عصمت وطہارت کا اور اضافہ ہوگا۔

خدا نے اپنے بندوں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں ایک ظالم النفسہ دوسرے میانہ رو اور تیسرے سابق الخیرات۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تین قسم کے آدمیوں میں سے کونسی صنف وارثِ کتاب بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے ظالم تو وارث ہو نہیں سکتا۔ اب رہے میانہ رو تو وہ بھی وارث نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان سے بہتر صنف موجود ہے۔ اگر ایک شخص کو سفر کرنا ہو اور اس سے کہا جائے بیل گاڑی بھی حاضر ہے گھوڑا بھی موجود ہے اور موٹر کار بھی آپ جس میں چاہیے سفر کیجئے تو وہ شخص یقیناً موٹر کار ہی کو پسند کرے گا۔ اگرچہ دوسری سواریوں سے منزل تک پہنچنا ممکن ہے مگر چونکہ آرام بھی موٹر میں زیادہ ہے اور تیز روی بھی ہے لہذا موٹر ہی کو ترجیح دی جائے گی پس سابق بالخیرات کے ہوتے

یہ نیچے کے گروہ والے کیونکر وارث کتاب بن سکتے ہیں۔

ایک بار مامون رشید نے اپنے دربار کے عالم یحییٰ بن اکثم سے پوچھا جس روز حضرت رسولِ خدا نے اعلان رسالت کیا تھا سب سے
بڑی نیکی کیا تھی۔ اس نے کہا آپ کی رسالت کی تصدیق۔ مامون نے کہا پھر اس عملِ خیر کی طرف سبقت کس نے کی۔ اُس نے جواب دیا علیؑ نے
لیکن چونکہ وہ کم سِن تھے۔ اس لئے ان کا سبقت کرنا امر رسالت کے لئے کافی نہ تھا۔ البتہ ابوبکر کی تصدیق کافی تھی کیونکہ وہ کبیر السن تھے۔ اسی
وجہ سے ان کو صدیق کا لقب دیا گیا۔ مامون نے کہا یحییٰ یہ تو بتاؤ علی نے جو تصدیقِ رسالت کی تو خود بخود کی یا رسولؐ نے ان کو دعوت دی تھی۔ یحییٰ
نے کہا دعوت دی تھی۔ اُس نے کہا اچھا اب یہ بتاؤ کہ رسولؐ نے اپنی طرف سے دعوت دی تھی یا بحکمِ خدا۔ یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ اپنی طرف سے ایسا
کیا تھا کیونکہ موافق آیۂ وما ینطق عن الھویٰ الخ رسولؐ اپنی خواہشِ نفسانی سے تو بولتے ہی نہ تھے پس لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ خدا کے حکم سے یہ دعوت
دی گئی تھی۔ یحییٰ ذرا سوچ کر بتاؤ کیا خدا اپنے رسولؐ کو ایک ایسے شخص کی دعوت کا حکم دے سکتا تھا۔ جو عند الشرع مکلف نہ ہو اور اس کی تصدیق
کسی شمار و قطار میں نہ ہو۔ یہ سنتے ہی یحییٰ کو پسینہ آگیا اور خاموش سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ مامون نے کہا اے یحییٰ تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند عالم نے علیؑ
کے نفس کو بچپن میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جو اوروں کو جوانی اور بڑھاپے میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اس حکایت سے یہ نتیجہ نکلا کہ سابق بالخیرات امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام ہیں پس وہی کتاب اللہ کے وارث ہیں۔
وارثِ کتاب وہی شخص ہو سکتا ہے جو کتاب اللہ کا پورا علم اپنے سینہ میں رکھتا ہو۔ اگر ایک شخص اپنے کو گھر کا مالک کہے لیکن اسے یہ خبر
نہ ہو کہ اس کے اندر کیا کیا سامان ہے اور کس کس مصرف اور کس کس قیمت کا ہے۔ کب خریدا گیا اور کس ضرورت سے خریدا گیا۔ تو ایسا شخص برائے
نام اس گھر کا مالک یا وارث کہا جا سکتا ہے۔ وارثِ کتاب صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی شان میں ہو من عندہ علم الکتاب
کتاب اللہ قیامت تک کے لئے ایک قانونی کتاب ہے اور کسی قانون کا وارث وہی شخص کہا جا سکتا ہے جو اس قانون کا صحیح معنی
میں سمجھنے والا ہو۔ آج سرکاری قانون ہر شخص کے ہاتھ میں ہے لیکن کسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس کا وارث ہوں۔ بڑے بڑے بیرسٹر اور وکلا
عدالت میں جاتے ہیں لیکن جج کی رائے کے سامنے ان کی رائے نہیں چلتی۔ اور جج کی رائے کو ہائی کورٹ توڑ دیتا ہے اور ہائی کورٹ کی رائے
پریوی کونسل توڑ دیتی ہے۔ لیکن پریوی کونسل کے فیصلہ کا پھر اپیل نہیں کیونکہ اب معاملہ ایسے لوگوں تک پہنچ جاتا ہے جو سرکار کی طرف سے اس
قانون کے صحیح معنی میں سمجھنے والے قرار دیئے گئے ہیں۔ پس اصلی مالک اور وارث قانون کے وہی لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کتاب اللہ
کے وارث نہیں بن سکتے مگر وہی جو خدا کی طرف سے معین کئے گئے ہوں اور ان کا فیصلہ ہر حال میں ناطق ہو اور ایسے لوگ وہی ہو سکتے ہیں جن کے
پاس پوری کتاب کا علم ہو۔ حضرت سلیمانؑ کے وزیر جناب آصف برخیا کتابِ خدا کا تھوڑا سا علم رکھتے تھے مگر اس سے بھی ان میں اتنی طاقت
تھی کہ چشم زدن میں بلقیس کو مع تخت حاضر کر دیا۔ پس جس کے پاس کتابِ خدا کا پورا علم ہو اس کی طاقت کی کیا انتہا ہوگی وہ کائنات کی ہر شے
کو اپنے قابو میں رکھنے والا ہوگا۔ انتہا یہ ہے کہ فرشتے تک اس کی خدمت کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

حضرت رسولِ خدا جو مورثِ کتاب اللہ ہیں اُس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھے جب تک وراثتِ کتاب کا بندوبست قیامت
تک کے لئے نہیں کر دیا۔ آپ نے اپنے اہلبیتؑ کو اسی لئے قرآن کے ساتھ کیا کہ وہ قرآن کے صحیح معنی میں عالم تھے۔ آپ نے کھلے لفظوں

میں فرما دیا تھا علی مع القرآن والقرآن مع علیؑ (علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے) دنیا نے بار بار امتحان کر کے اس کو جانچ بھی لیا کہ علیؑ سے بہتر علمِ قرآن رکھنے والا بعد رسولؐ کوئی نہ تھا۔ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے زمانہ میں جب کوئی مشکل قضیہ آپڑتا تھا تو حضرت علیؑ ہی کی طرف رجوع کی جاتی تھی اور آپ ہر معاملہ کو بآسانی قرآن سے حل کر دیتے تھے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ رسولؐ نے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے دو چیزیں چھوڑی تھیں۔ ایک قرآن دوسرے اہلبیتؑ اور یہ بھی فرما دیا تھا کہ ان دونوں کا ساتھ ایسا چولی دامن کا ہے کہ حوضِ کوثر پر یہ میرے پاس ساتھ ہی ساتھ آئیں گی۔ اس سے قبل ان کو ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں ہوتا۔ للہ اللہ رسولؐ تو یہ اہتمام بلیغ فرمائیں کہ قیامت کا بندوبست کریں اور مسلمانوں کو یہ کد ہو کہ آنحضرتؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی اگر اس علم کی مخالفت نہ کی تو بات کیا ہوئی۔ شاید ہی کسی قوم نے اپنے رسولؐ کی مخالفت اس شان سے کی ہو جتنی مسلمانوں نے اپنے رسولؐ سے کی۔ گویا انہوں نے اپنے مقام پر یہ طے کر لیا تھا کہ کفار و مشرکین تک سے محبت و ہمدردی کا برتاؤ کر لیں گے مگر عترتِ رسولؐ سے نہ کریں گے۔ ادنے سے ادنے آدمی کی بات کان لگا کر سن لیں گے مگر ان کی نہ سنیں گے۔ چنانچہ رسولؐ کے مرتے ہی اس تجویز پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ ابتداءً ڈھکی چھپی مخالفتوں سے ان کے جان و مال و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا رہا۔ آخر ۶۱ھ کے محرم میں وہ سب پردے چاک ہو گئے اور کھلم کھلا اولادِ رسولؐ کی گردنوں کو تلواروں سے کاٹا جانے لگا۔

پنجتنِ پاک میں سے تین ہستیوں کا خاتمہ تو پہلے ہی کیا جا چکا تھا اب صرف ایک دم حسینؑ کا باقی رہ گیا تھا سو ان کو بھی ظالموں نے مہمان بلا کر کربلا میں گھیر لیا۔ اور کوئی امکانی ظلم اٹھا کر نہ رکھا صبح عاشور سے بازارِ موت گرم تھا اور امامِ مظلوم کے رفقا باری باری درجۂ شہادت پر فائز ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی قریب آگیا کہ رسولؐ کا پارۂ جگر علیؑ و فاطمہؑ کا نورِ نظر تن تنہا میدانِ کربلا میں رہ گیا۔

منقول ہے کہ جب امامِ مظلوم اہلِ حرم کو رخصت کر کے میدانِ جنگ میں تشریف لائے تو اپنی بیکسی و تنہائی پر دل بھر آیا ؎

نہ لشکرے نہ سپاہے نہ کثرت الناسے ۔۔۔ نہ قاسمےؑ نہ علی اکبرےؑ نہ عباسےؑ

اس وقت آپ نے اس طرح استغاثہ فرمایا ھل من ناصرٍ ینصرنا ھل من مغیثٍ یغیثنا ہے کوئی مددگار کہ اس وقتِ بیکسی میں ہماری مدد کرے۔ ہے کوئی فریادرس جو اس وقتِ مصیبت میں ہماری فریاد کو پہنچے۔ آہ حضرت کی اس آوازِ استغاثہ سے زمین و آسمان ہل گئے ملاءِ اعلیٰ میں شور مچ گیا۔ آہ ان لاکھوں خون کے پیاسوں میں کون ایسا تھا کہ سیدِ مظلوم کی مدد کو آتا۔

لکھا ہے کہ اسی حالتِ بیکسی میں آپ کی نگاہ مقتلِ شہدا پر جا پڑی۔ ایک بار بے چین ہو کر لاشہائے شہدا سے یوں خطاب فرمانے لگے۔

یا حبیب بن مظاھر یا زھیر بن القین یا مسلم بن عوسجہ یا قاسم بن الحسن یا ابا الفضل العباس یا علی ن الاکبر یا ابطال الصفا ویا فرسان الھیجا مالی انادیکم فلا تجیبونی وادعوکم فلا تسمعونی ھل انتم نیام ام لیقظون اوزالت مودتکم عن امامکم فلا تنصرونہٗ قوموا ایھا الکرام وادفعوا عن حرم الرسول الطغاۃ اللئام (اے حبیبؓ بن مظاہر اے زہیر بن قینؓ اے مسلم بن عوسجہؓ اے قاسمؑ اے عباسؑ اے علی اکبرؑ اے بیشۂ شجاعت کے شیرو۔ اے میرے جنگجو جوانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ میں پکارتا ہوں اور تم جواب نہیں دیتے۔ میں تم کو اپنی نصرت کے لئے بلاتا ہوں اور تم میری مدد نہیں کرتے۔ اے میرے بہادرو تم سو رہے ہو۔ تمہارے دلوں سے اپنے امام کی محبت نکل گئی کہ تم اس کی

مدد نہیں کرتے۔ اے نیک طینت مددگارو کھڑے ہو جاؤ اور حرمِ رسولؐ سے ان سرکش کمینوں کو ہٹا دو، حضرت اس دردبھری آواز کو سنتے ہی لاشہائے شہدا کانپ گئے اور ان کے خلعتہائے بریدہ سے آواز آئی۔ اے فرزندِ رسولؐ آپ کی بیکسی کے قربان کیا کریں موت نے ہمیں مجبور کر دیا ورنہ ایک جان کیا ہزار جانیں آپ پر سے نثار کرنے کو تیار ہیں۔

اس کے بعد آپ اس قومِ جفاکار کے سامنے تشریف لائے اور بغرض اتمامِ حجت فرمایا اے قوم میں تمہارے نبی کا نواسا ہوں تم کیوں میرے درپے قتل ہو۔ کیا میں نے کوئی نیا دین ایجاد کیا ہے؟ میں نے کسی کی شریعت کو بدلا ہے؟ کیا میں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے؟ کیا میں نے کسی کا مال چھینا ہے کہ تم میرے خون کے پیاسے بن رہے ہو۔ اے قوم کیا میرے سر پر یہ عمامہ تمہارے رسولؐ کا نہیں کیا میرے بدن پر یہ لباس تمہارے رسولؐ کا نہیں۔ کیا میں وہی حسین نہیں ہوں جس کو تمہارے رسولؐ نے اپنا فرزند کہا۔ جس کے لئے روزِ عید آنحضرتؐ ناقہ بنے۔ جس کے لب و دہن کے بوسے لیتے تھے۔ کیا میں وہی حسین نہیں ہوں جس کی شان میں تمہارے رسول نے فرمایا ہے حسین منی وانا من الحسین اے اہلِ کوفہ و شام تمہیں کیا ہو گیا کہ جس نبی کا کلمہ پڑھتے ہو اسی کے نواسے کے قتل پر کمر بستہ ہو۔ اے بے غیرتو تم نے مجھے مہمان بلا کر چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آب و دانہ مجھ پر بند کر دیا۔ میرے ننھے ننھے بچے بھوک اور پیاس سے بلک رہے ہیں اور تم چین سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہو۔ آہ تم نے میرے بھرے خاندان کی صفائی کر دی۔ میرے تمام انصار و احباب گوسفندانِ قربانی کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا۔ اس پر بھی تمہاری آتشِ عداوت نہ بجھی اور اب مجھ بے گناہ کے قتل پر آمادہ ہو۔ اے ظالمو! عذابِ آخرت سے ڈرو کہ وہ بہت سخت عذاب ہو گا۔ وہ وقت قریب ہے کہ عذابِ الٰہی کے شعلے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیں۔

یہ سنکر اس بے حیا قوم نے جواب دیا اے حسین یہ وقت فضائل بیان کرنے اور نصیحت کرنے کا نہیں بلکہ ہم سے جنگ کرنے کا ہے اگر لڑنے کی تاب نہیں تو یزید بن معاویہ کی بیعت منظور کر لو ورنہ اپنے قتل کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

یہ سنکر امام علیہ السلام لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور فرمایا اے بے حیا قوم میں جنگ کرنے سے عاجز نہیں جو کچھ کہا تھا بغرض اتمامِ حجت کہہ رہا تھا۔ اچھا اب علیؑ کے بیٹے کی شمشیر زنی کا تماشا دیکھو۔

اس کے بعد آپ نے ذوالفقارِ حیدرِ کرار کو نیام سے نکالا اور شیرانہ رجز پڑھتے ہوئے اس قومِ زبوں کردار پر حملہ آور ہوئے۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے۔ میں نے نہ آنکھوں سے دیکھا اور نہ کانوں سے سُنا کہ کوئی ایسا شخص کہ جس کے عزیز، بوڑھے، جوان اور بچے اس کی آنکھوں کے سامنے مارے گئے ہوں، تین دن کا بھوکا پیاسا ہو۔ بدن اس کا زخموں سے چور چور ہو اور پھر حسینؑ کی طرح اتنی بہادری سے لڑا ہو۔ ایک تنِ تنہا کے حملے نے دشمن کی فوج میں وہ ہل چل ڈال دی تھی کہ گھبراہٹ میں سپاہی کے اوپر سپاہی گر رہا تھا جس طرف حضرت رُخ کرتے تھے دشمن اُس طرح بھاگتے تھے کانھم جراد منتشر۔ گویا ہوا کے زور سے ٹڈیاں پریشان ہو رہی ہیں۔ صاحب بحر البکا لکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کا تیسرا حملہ اس زور کا تھا کہ فوج پیچھے ہٹتے ہٹتے کوفہ کے دروازہ کے اندر داخل ہو گئی تھی اور بے شمار سپاہی گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل گئے۔ ہر طرف سے الامان الامان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب حضرت نے ان عاقبت برباد وں کی یہ حالت دیکھی تو گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور ایک مقام پر کھڑے ہو کر ان کے انتشار کا تماشہ دیکھنے لگے۔ ناگاہ مابین زمین و آسمان ایک آواز پیدا ہوئی۔ اے حسین اب کب تک لڑے جاؤ گے۔ تمہارے

وعدہ کا وقت قریب آ لگا۔

یہ صدا سنتے ہی حضرت نے ذوالفقار آبدار کو نیام میں کر لیا اور لقائے الٰہی کے شوق میں اپنی شہادت کی گھڑیاں گننے لگے۔ فوجِ یزید نے جب حضرت کو ایک مقام پر ٹھہرا ہوا پایا اور ذوالفقار کو ہاتھ میں نہ دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ اب حسینؑ جنگ کرتے کرتے تھک گئے ہیں سب بھاگے ہوئے سپاہی پھر جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے گھیر کر حملہ پر حملہ اور وار پر وار شروع کر دیا۔ آہ ایک مظلوم بھوکے پیاسے کو تیز بدن خون کے پیاسے گھیرے ہوئے تھے۔ آپ کا تمام بدن زخموں سے چور چور تھا کپڑے خون سے تر بتر تھے۔ کمزوری سے غش پر غش آ رہے اور پیاس کی شدت سے زبان تر نہ رہی تھی۔ آہ کون تھا کہ اس حالتِ بیکسی و بے لبسی میں اس امامِ غریب پر رحم کھاتا۔ اسی حالت میں ایک بار پھر حضرت نے آوازِ استغاثہ بلند کی هل من ناصر ینصرنا هل من مغیث یغیثنا اس آواز کے بلند ہوتے ہی ملاء علیٰ میں قیامت برپا ہو گئی۔ جبرئیل امین نے درگاہِ الٰہی میں عرض کی پالنے والے مجھ سے اپنے پیارے حسینؑ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ یہ وہی حسینؑ تو ہے جس کے لئے میں جنت کے میوے لے کر جاتا تھا جس کے گہوارے کو ہلاتا تھا۔ پالنے والے مجھے اجازت دے کہ میں اس وقتِ بیکسی میں اپنے حسینؑ کی مدد کروں۔ جنابِ قدرت سے آواز آئی اے جبرئیل اگر میرا حسینؑ تمہاری مدد قبول کرے تو ضرور اس کی مدد کرو۔ یہ سنتے ہی جبرئیل امین نے نہایت بے چینی کے ساتھ اپنے مقام سے پرواز کی اور کربلا میں پہنچ کر امامِ غریب کے سر پر اپنے پروں کا سایہ کر لیا۔ تاکہ پیارے نبی زادے کو شدتِ آفتاب میں کچھ سکون حاصل ہو۔

لکھا ہے جب امام علیہ السلام کو یکایک سایہ کی وجہ سے کچھ خنکی محسوس ہوئی تو آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا اے سایہ کرنے والی مخلوق تو کون ہے کہ اس وقتِ بیکسی میں تجھ کو میری مدد کا خیال ہے۔ آواز آئی اے مظلوم حسینؑ میں تیرا خادم جبرئیل ہوں۔ اجازت دے تو ابھی تیرے ان تمام دشمنوں کا خاتمہ کر دوں۔ حضرت نے فرمایا اے جبرئیل مجھے یہ منظور نہیں میں لقائے الٰہی کا مشتاق ہوں۔ یہ وقت میرے صبر کے امتحان کا ہے۔ بس ہٹ جاؤ جبرئیل یہ وقت امتحان کا ہے۔

الغرض جبرئیل مایوس ہو کر واپس گئے اور ہمارے مظلوم امام اپنا سر کٹانے کے لئے تیار ہوئے۔ آپ نے اپنا عمامہ اور دیگر تبرکات گھوڑے کی زین سے باندھے اور گھوڑے سے فرمایا اے اسپِ وفادار جب تیرا سوار زین سے زمین پر آ جائے تو یہ سب چیزیں بحفاظت تمام اہلِ حرم تک پہنچا دینا۔

آہ آہ کس زبان سے عرض کیا جائے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس قومِ جفا کار نے یکایک چاروں طرف سے تیروں کی بارش شروع کر دی اور قریب آ کر نیزہ پر نیزہ مارنے لگے۔ یہاں تک کہ ہمارے مظلوم آقا سے گھوڑے پر نہ ٹھہرا گیا اور آپ رضاً بقضائہٖ و تسلیماً لامرہٖ کہتے ہوئے زمین پر تشریف لے آئے۔ آہ آہ مومنین حضرت کے جسمِ مبارک پر اتنے تیر پیوست تھے۔ جیسے ساہی کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت کا جسمِ مبارک زمین سے متصل نہ ہو سکا اور تیروں پر معلق رہا۔

منقول ہے کہ جب حضرت گھوڑے سے گرے تو پسرِ سعد نے سردارانِ لشکر سے کہا جلد حسینؑ کا سر کاٹ کر اس قصہ کو ختم کرو لیکن کسی سردار کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سخت کام کو انجام دے۔ آخر شمر لعین اس بات پر آمادہ ہوا کہ بھوکے پیاسے نبی زادے کا گلا کاٹ کر زمین و آسمان کو ہلا دے۔ چنانچہ وہ شقی خنجر بکف اس نشیب کی طرف روانہ ہوا جہاں امام مظلوم گرے پڑے تھے۔ یہ وقت عصر کا تھا۔ حضرت اسی تباہ حالت

میں اشاروں سے نمازِ عصر ادا فرما رہے تھے کہ شمر ملعون وہاں پہنچا اور بے محابا آنحضرت کے سینۂ مبارک پر چڑھ بیٹھا۔

لکھا ہے کہ جب حضرت گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے تھے تو جناب زینب بے تابانہ خیمہ سے نکل پڑی تھیں اور واحسیناہ واحسیناہ کے نعرے مارتی ہوئی اس ٹیلہ پر پہنچ گئی تھیں جو تلِ زینبیہ کے نام سے مشہور ہے اور وہاں سے فریاد کر رہی تھیں۔ اے ظالمو میرے مظلوم بھائی پر رحم کرو۔ جب آپ نے دیکھا کہ شمر بد انجام خنجر بکف حضرت کی طرف آ رہا ہے تو آپ بلبلا گئیں اور انتہائی بے چینی میں ابن سعد کو مخاطب کر کے فرمانے لگیں۔ یا ابن سعد قطع اللہ رحمک اخی ابو عبد اللہ یقتل وانت تنظر۔ اے ابن سعد خدا تیری نسل کو قطع کرے میرے بھائی ابو عبد اللہ قتل ہو رہے ہیں اور تو دیکھ رہا ہے۔ آہ آہ مومنین جناب زینب فریاد ہی کرتی رہیں اور وہاں شمر ملعون نے بوسہ گاہِ نبیؐ پر خنجر پھیر دیا جس سے زمین کربلا میں زلزلہ آگیا۔ سورج کو گہن لگ گیا۔ سیاہ آندھیاں چلنے لگیں ہر طرف سے اَلا قتل الحسین بکربلا الا ذبح الحسین بکربلا کی صدائیں گونجنے لگیں۔ خوشی کے باجے بجنے لگے۔ لکھا ہے کہ جب حلق امام پر خنجر چل رہا تھا تو تین خاص باتیں لوگوں نے دیکھیں ایک چیز اوپر سے نیچے کو آئی ایک چیز نیچے سے اوپر کو گئی۔ ایک چیز چاروں طرف گھومنے لگی۔ جو چیز اوپر سے نیچے کو آئی وہ جبرئیل فرشتہ تھا جو چیز نیچے سے اوپر کو گئی وہ امام حسین علیہ السلام کا سر تھا جو خولی لعین نے اپنے نیزے پر چڑھا لیا۔ اور جو چاروں طرف گھومی وہ حسینؑ کی دکھیا بہن تھی جو اپنے بھائی کی لاش کے گرد انتہائی بے چینی سے گھوم رہی تھی اور کلیجہ ہاتھوں سے پکڑے فریاد کر رہی تھی۔ وامحمداہ واعلیاہ ہائے میں کربلا کے بن میں لٹ گئی۔ ہائے میری ماں کا پھلا پھولا باغ پردیس میں اجڑ گیا۔ اے میرے مظلوم برادر کاش یہ ستم رسیدہ بہن اس سے پہلے اندھی ہو جاتی اور آپ کو اس حالت میں نہ دیکھتی۔ آہ خدا کسی بہن کو بھائی کی یہ حالت نہ دکھائے۔ جو ہماری شہزادی جناب زینبؑ نے اپنے بھائی کی دیکھی بار بار غش کھا کھا کر خاک پر گرتی تھیں۔ یہاں تک کہ جناب فضہ نے آکر سنبھالا۔ اور خیمہ میں واپس لے گئیں۔

لکھا ہے کہ بعد شہادتِ امام مظلوم ذو الجناح کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی وہ بے زبان اس طرح سیسیہ پر سیسیہ کرتا تھا جس طرح کوئی زن پسر مردہ پر بلبلا بلبلا کر روتی اور آہ و نالہ کرتی ہے۔ پہلے وہ خاک پر گر کر تڑپا۔ پھر خونِ حسینؑ سے اپنی پیشانی کو رنگین کیا۔ اور خیمہ گاہ کی جانب روانہ ہوا جب دشمنوں نے یہ دیکھا تو بہت سے نابکار گھوڑے کو پکڑنے کے لئے بڑھے۔ گھوڑے نے غضبناک ہو کر پہلے تو سیسیہ کیا پھر ان کو اپنی ٹاپوں سے مار مار کر خاک پر گرانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آٹھ اشقیا فی النار ہوئے جب گھوڑے کے غیظ و غضب کا یہ حال دیکھا تو دشمنوں نے اس کے سامنے سے بھاگنا شروع کیا۔ اب ذو الجناح نے پھر خیمہ کا رخ کیا۔ سیدانیاں درِ خیمہ پر جمع تھیں اور واحسیناہ وامظلوماہ کے نعروں سے زمین و آسمان ہلا رہی تھیں۔ ناگاہ گھوڑا اس شان سے نمودار ہوا۔ باگیں کٹی ہوئیں زین ڈھیلا ہوا۔ بدن خون سے تر بتر۔ جسم پر بے شمار تیر پیوست۔ جوں ہی اس شان سے قریب آیا۔ سیدانیوں نے اپنے حلقہ میں لے کر سینہ زنی شروع کی۔ آہ اس وقت کا حال کیونکر بیان ہو۔ دل پھٹتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ایک ایک بی بی گھوڑے سے لپٹی دلخراش بین کر رہی تھی۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۰

اکیسویں مجلس

تفسیر آیہ ما کان محمد الخ در حال پامالی لاشہائے شہدا و تاراجی خیام

قال اللہ تبارک و تعالیٰ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شئی علیما۔ (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے) یہ آیت زید بن حارثہ سے متعلق ہے حضرتؐ نے ان کو متبنیٰ کر لیا تھا اور لوگ ابن رسول اللہ کہتے تھے۔ کفار نے اس پر طعنہ زنی کی کہ ہم پر تو رسولؐ متبنےٰ بنانے پر معترض ہیں لیکن خود زید کو متبنےٰ بنا لیا۔ اس قول کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی۔ چونکہ آنحضرت قاسم و ابراہیم اور طیب و طاہر چار لڑکوں کے باپ تھے۔ اس لئے آیت کا مفہوم بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ادنے تامل سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ آیت میں من رجالکم ہے اور حضرت کی اولاد رجال کی حد تک پہنچی نہیں تھی۔ علاوہ بریں اسی لفظ من رجالکم سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں نہ یہ کہ اپنے بیٹوں کے بھی باپ نہیں۔

اس پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ آنحضرت کسی کے باپ نہیں تو حسنؑ و حسینؑ کے باپ کیونکر ہو گئے۔ جواب یہ ہے کہ باپ ہونے کی نفی غیر لوگوں سے متعلق ہے نہ کہ اپنی اولاد کے۔ دوسرے حضرت رسولِ خداؐ میں دو جنبے پائے جاتے تھے ایک بشریت کا دوسرے رسالت کا۔ جس طرح بشریت اپنے کچھ رشتہ دار رکھتی ہے اسی طرح رسالت بھی اپنے تعلقات رکھتی ہے۔ بشری اولاد اور ہے اور رسالت کی اولاد اور ہے ابنائے محمدؐ اور ہیں ابنائے رسالت اور ہیں۔ نسائے محمدؐ اور ہیں اور نسائے رسالت اور ہیں۔ نفس محمدؐ اور ہے اور نفس رسالت اور ہے۔ اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا ما کان الرسول ابا احد من رجالکم تو ضرور حسنینؑ اولادِ رسولؐ ہونے سے خارج ہو جاتے لیکن آیت میں لفظ محمدؐ ہے جس سے مراد بشریت ہے نہ کہ رسالت پس اگر بشری اعتبار سے حسنینؑ فرزند نہیں تو رسالت کے اعتبار سے تو ہیں۔ چونکہ رسالت کا مرتبہ بشریت سے مافوق ہے لہٰذا حسنینؑ کا مرتبہ صلبی اولاد سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت نے اپنے صلبی فرزند ابراہیم کو حسینؑ پر قربان کر دیا۔

اگر قطعاً ابنیت کی نسبت رسولِ خدا کی طرف ہو ہی نہ سکتی تو آیہ مباہلہ میں ندع ابناءنا و ابناءکم کیوں ہوتا۔ چونکہ مباہلہ کا تعلق رسالت سے تھا نہ کہ ذاتِ محمدؐ سے اس لئے وہاں صلبی اولاد کو لے جانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ابنائے رسالت کو لے جانے کی تھی۔ اگر معمولی رشتہ داروں کا معاملہ ہوتا تو نسائنا کے تحت میں حضرتؐ اپنی ازواج کو لے کر جاتے نہ کہ سیدہؑ کو۔ اس کے علاوہ حضرت کی مشہور حدیث ہے ان اللہ جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ وجعل ذریتی فی صلب علی بن ابی طالب (اللہ نے ہر نبی کی ذریت کو اس کے صلب میں قرار دیا ہے اور میری ذریت کو صلب علی ابن ابی طالب میں) حضرت رسولِ خداؐ اپنی امت کے شرعی باپ ہیں نہ کہ اصلی اسی بنا پر حضرتؐ کی ازواج امہات المومنین ہیں نہ کہ اصلی مائیں۔ پس خدا کا یہ کہنا کہ محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں یہ معنی رکھتا ہے کہ زید بن حارثہ کو جو رسولؐ نے متبنےٰ کر لیا ہے تو اس کے یہ معنی

نہیں ہوگئے کہ وہ رسولؐ کا حقیقی بیٹا ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب حضرتؐ نے زید کو خرید لیا اور اس کے باپ حارثہ کو پتہ چلا تو وہ آیا اور حضرت ابو طالبؓ سے درخواست کی کہ میرا بیٹا مجھے دلوا دیجئے۔ حضرت ابو طالبؓ نے سفارش کی تو آنحضرتؐ نے زید کو آزاد کر دیا مگر وہ اپنے باپ کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوا۔ اس وقت حارثہ نے غصہ میں کہا۔ لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے اس کو اپنی فرزندی سے علیحدہ کر دیا۔ یہ سنکر زید بہت شکستہ دل ہوئے ان کی دلجوئی کیلئے حضرتؐ نے ان کو اپنا متبنےٰ کر لیا۔ یہ تبنیت کفار کی تبنیت کے مانند نہ تھی کیونکہ وہ متبنیٰ کو صلبی اولاد میں داخل کر لیتے تھے یہاں تک کہ اس کو میراث میں بھی شریک کر لیتے تھے اور اپنے قریب تر عزیزوں سے اس کی شادی نہ کرتے تھے۔ پس جب تبنیت نے زید میں کوئی استحقاق وراثت پیدا نہ کیا تو بھلا دوسرے سببی رشتوں تک اس کا اثر کیا پہنچ سکتا ہے۔

ولٰکن رسول اللہ کا جملہ بتا رہا ہے کہ محمدؐ سے جو تعلق عام لوگوں کو ہے وہ رسولؐ اور امت کا تعلق ہے نہ کہ باپ اور بیٹے کا۔ یہ تعلق اگر ہے تو کچھ مخصوص ہستیوں کے لئے ہے نہ کہ عام لوگوں کے لئے۔ کفار حضرتؐ کو ابتر ہونے کا طعنہ اس لئے دیتے تھے کہ حضرتؐ کی اولادِ ذکور میں سے کوئی نہ تھا لیکن سورہ انا اعطیناک الکوثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کفار کے اس طعنہ کو قبول نہیں کیا اور ان کے جواب میں رسولؐ کی دل شکنی مٹانے کو کہہ دیا گیا کہ خدا نے تم کو کثیر اولاد دی ہے۔

کوثر کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ کسی نے حوضِ کوثر مراد لی ہے۔ کسی نے خیر کثیر۔ لیکن شانِ نزول اور سیاق یہ بتاتا ہے کہ مراد اس سے کثیر اولاد ہے۔ جیسا کہ شرح مسلم میں بھی ہے۔ یہی وجہ ہے حضرتؐ کی اولاد یعنی سادات ہر مقام پر موجود ہے۔ پس جب تک حسنینؑ کو اولادِ رسولؐ نہ مانا جائے یہ طعنہ حضرتؐ سے دفعہ نہیں ہوتا۔

بے شک رسولؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن ان کے باپ ضرور ہیں جن کو ابنائے رسالت بننے کا شرف حاصل ہے چونکہ حضرت علیؑ کا شرف اور فضیلت حضرت رسولؐ خدا سے جدا نہیں بلکہ شریک نور ہونے کی جہت سے دونوں کی فضیلتیں ایک ہیں لہذا ان کی اولاد رسولؐ کی اولاد ہے جس طرح جاھد الکفار والمنافقین کی آیت میں رسولؐ کو منافقین سے جہاد کا حکم ہوا تھا۔ لیکن رسولؐ کسی منافق سے نہیں لڑے۔ ہاں علیؑ نے اس حکم کو پورا کر دیا۔ اسی طرح شہادتِ جلی کا مرتبہ حضرت رسولِ خداؐ کو حاصل نہ تھا وہ حسینؑ نے پورا کر دیا۔ جیسا کہ شاہ صاحب کی سر الشہادتین میں مذکور ہے۔

جس طرح حضرت ہارونؑ سے نسل جناب موسیٰ چلی۔ اسی طرح حضرت علیؑ سے نسل حضرت محمد مصطفےٰؐ چلی۔ چونکہ عرب کے لوگ بیٹیوں کو ورثہ سے محروم کر دیتے تھے اور ان کو اپنی نسل میں شمار ہی نہ کرتے تھے لہذا خداوند عالم نے اس رسم کو توڑنے کے لئے اپنے رسولؐ کے تمام ورثہ کا مالک بنایا اور اس کی اولاد کو رسولؐ کی اولاد گردانا۔ اگر رسولؐ کی اولادِ ذکور میں سے کوئی باقی رہتا تو یقیناً لوگ رسولؐ کی بیٹی کو بھی رسم جاہلیت کی بناء پر محروم الارث قرار دے دیتے کیا یہ کوئی تعجب کی بات ہے؟ جب اولاد ذکور نہ ہونے کی حالت میں سیدہ کو محروم کر دیا گیا تو اس صورت میں تو بدرجۂ اولیٰ ہر جہت سے محروم کر دی جاتیں۔ البتہ جہت محرومی بدل جاتی اب اور جہت تھی جب اور جہت ہو جاتی۔ اسی جاہلیت کی قدیم رسم نے ابوبکر کو مجبور کیا کہ وہ حدیث نحن معاشر الانبیاء کو گھڑ لیں۔ اسلامی قانون کے مطابق محروم تو کیا نہ جا سکتا تھا اور عرب کی عصبیت اور

کا زمانہ رسوم کا لوگوں میں دوڑا ہوا خون شریک وراثت کرنے کی اجازت بھی نہ دیتا تھا۔ لہٰذا ایک حدیث ایسی بنا لی کہ کام چل جائے۔ اور رسم جاہلیت کی طرف لوگوں کا خیال نہ جائے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن میں ورث سلیمانُ داؤد (سلیمان داؤد کے وارث ہوئے) کے ہوتے اور یرثنی و یرث من آل یعقوب (جناب زکریاؑ نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ایک لڑکا عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کا بھی) کے قرآن میں پائے جاتے ہوئے بھی جناب سیدۂ کو حضرت رسولخداؐ کے ورثہ سے کیوں محروم کیا۔

آیہ یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین صریحی حکم ہے جس میں رسولؐ اور تمام امت داخل ہے تاوقتیکہ رسولؐ کا استثنا کسی خاص آیت سے نہ ہو۔ یہ حکم رسولؐ کے لئے باقی رہے گا کہتے ہیں کہ مراد پہلی دو آیتوں میں وراثت علمی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں حضرت زکریاؑ کی دعا کے الفاظ یہ تھے (انی خفت الموالی من ورائی وکانت امراتی عاقرا فھب لی من لدنک ولیا یرثنی و یرث من آل یعقوب (میں اپنے بعد میں رہنے والے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بی بی بانجھ ہے پس تو مجھے اپنی طرف سے ایک ولی عطا کر جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کا بھی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی چچازاد اولاد کے ولی بن جانے سے ڈرتے تھے۔ اور علم نبوت چونکہ تقسیم ہونے کی چیز نہیں لہٰذا اس میں خوف کیسا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک نبی کو اپنے مال کی محبت کیوں تھی کہ وہ دوسروں کو دینا ہی نہیں چاہتے تھے تو اس کی جہت یہ نہ تھی بلکہ خوف اس کا تھا کہ وہ لوگ فساد میں اس کو صرف کریں گے اور انفاق فی سبیل اللہ سے ہٹ کر برے کاموں میں صرف کریں گے کیونکہ ان کی عادتوں اور طریقوں سے تیقن تھا۔ لفظ میراث لغت اور شریعت میں اسی مال پر عموماً بولا جاتا ہے جو مورث سے وارث کی طرف منتقل ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص فلاں کا وارث ہوا تو ذہن فوراً میراثِ مال ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے نہ کہ علم وغیرہ کی طرف۔ پس ظاہر کلام سے اور حقیقی معنی سے عدول نہیں کیا جا سکتا جب تک کوئی قوی قرینہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ حضرت زکریاؑ کی دعا میں یہ لفظ بھی موجود ہے واجعلہ رب رضیا پس اگر اس آیت میں میراثِ مال مراد نہ ہو بلکہ علم مراد ہو تو اس شرط کے کوئی معنی نہیں رہتے اور یہ لغو قرار پاتی ہے کیونکہ نبی کے قائم مقام کے لئے رضا سب سے پہلی چیز ہے اس کے مانگنے کی ضرورت ہی نہ تھی یہ تو ایسا ہی کہنا ہے جیسے کوئی دعا مانگے۔ خدایا ہماری طرف ایک نبی کو بھیج جو سچا اور صاحب عقل و شعور ہو۔ پس جب وہاں وراثتِ مال ثابت ہے تو ہمارے نبی کے یہاں کیوں ثابت نہیں کیا۔ حضرت کی حالت میراث میں انبیائے سابقین سے جدا تھی۔

تعجب ہے رسول اللہ کی بیٹی تو ایک وضعی حدیث کی بنا پر میراث سے محروم کر دی جائے لیکن نبیؐ کی بی بی اپنا حصہ پائے اور بجائے ۹/۱ کے کل پر تصرف کرے جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔ ؎

لک التسع من الثمن وفی کل تصرفت تبغلت تجملت ولو عشت تفیلت

یعنی آٹھویں حصہ میں تمہارا نواں حصہ تھا اور تم نے تصرف سب پر کر لیا۔ خچر پر تم چڑھیں اونٹ پر تم چڑھیں اور اگر کچھ دن اور زندہ رہتیں تو ہاتھی پر بھی ضرور چڑھتیں۔

مذکورہ بالا آیت میں آنحضرتؐ کی ایک صفت خاتم النبیین بھی بیان کی گئی ہے کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو آنحضرت کو خاتم الانبیاء

نہیں ملتے۔ تعلیم کا عام قاعدہ ہے کہ ابتدائی لڑکوں کو پڑھانے کے لئے معمولی لیاقت کا معلم مقرر ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں درجہ بڑھتا جاتا ہے معلم بھی اسی قابلیت کا رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب تعلیم ختم ہو جاتی ہے تو عمل ہمیشہ کے لئے باقی رہتا ہے۔ بس یہی حال انبیاء کا ہے پہلے لوگ جس طرح عرفانِ الٰہی اور تمدن و معاشرت میں تدریجی ترقی کرتے رہے ویسے ہی ان کی ہدایت کے لئے معلم بھی آتے رہے جب تعلیم کا آخری درجہ آیا تو خداوند عالم نے اس کا لحاظ کرکے ایسا نبی بھیجا جو ہر لحاظ سے اکمل و یگانہ تھا اور کسی قسم کا کوئی نقصان اس میں نہ تھا بلکہ تمام انبیائے سابقین کی خصوصیات کا حامل تھا جب وہ اپنی تعلیم کو مکمل کر چکا تو آیۂ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہو گئی۔ پس اگر کسی نبی کی ضرورت باقی ہے تو کمال دین ایک بے معنی چیز ہے۔ اگر اس دین کی یہ صفت ہے لیظھرہ علی الدین کلہ تو کسی اور نبی کا ہونا بالکل عبث۔ پس کسی نئے نبی کی ضرورت کو تسلیم کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ دینِ اسلام ناقص ہے۔ قرآن مکمل قانون نہیں اور اگر قرآن مکمل نہیں تو پھر تبیانا لکل شیٔ ولا رطب ولا یابس اور ھدی للعالمین جیسی آیات بے معنی ہیں۔

اگر کوئی نیا نبی حضرتؐ کے بعد اور آیا یا آنے والا ہے تو اس کے متعلق یہ سوال کیا جائے گا کہ وہ کیا کام کرے گا۔ اگر اسی شریعت کا معلم ہو گا اور اسی دین کا چلانے والا ہو گا۔ تو دین کو اس کی ضرورت کیا۔ کتاب مکمل دین مکمل اور نبی کی تعلیم ختم۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح اور مرسلین کے بعد انبیاء آئے اور اسی شریعت کی تعلیم دیتے رہے۔ اسی طرح نیا نبی اس دین کی تعلیم دے گا تو یہ بھی صحیح نہیں۔ انبیاء کی ضرورت دو رسولوں کے درمیان ہوتی ہے۔ انبیاء در حقیقت اوصیائے مرسلین ہوتے ہیں۔ جب کوئی نیا قانون اور نیا رسول آنے والا ہی نہیں اور اب زمانہ فترت نہیں تو پھر انبیا کی حاجت نہیں۔ صرف اوصیا کی ضرورت ہے اور وہ بنا بر احادیثِ رسولؐ معین ہو چکے۔ دنیا کا فرض ہے کہ ان اوصیا کی معرفت حاصل کرے اور بمصداق آیہ اطیعوا اللہ الخ رسولؐ کی طرح ان کی اطاعت کو بھی فرض سمجھے اور علمِ دین سے جو حاصل کرنا ہو انہی سے حاصل کرے ان میں سے کسی ایک کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے کیونکہ زمانہ کبھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ امام مظلوم نے کربلا میں امام زین العابدینؑ علیہ السلام کو مرنے کی اجازت نہ دی۔ آپ نے بے چین ہو ہو کر کئی بار خیمہ سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن امام مظلوم نے اس خیال سے باہر نہ آنے دیا کہ مبادا کوئی تیر آپ کے لگ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیمار امامؑ نے بحالتِ بیماری وہ وہ تکالیف کربلا میں اٹھائیں کہ ان کے تصور سے کلیجہ لرز جاتا ہے۔ بعد شہادت امامِ مظلوم تو آپ کے مصائب کی انتہا ہی نہ رہی۔ آہ اشقیائے امت نے اہلِ حرم کو ایذا پہنچانے اور ہتک حرمت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اسلام کی ہر تعلیم کو ان کے مقابل فراموش کر دیا۔

اسلام نے میت کا احترام اتنا ملحوظ رکھا ہے کہ بدن سے لباس کھینچنے کی اجازت نہیں دی۔ یعنی اگر کسی میت کا لباس تنگ ہو اور غسل کے وقت آسانی سے نہ اتر سکے تو حکم شرعیہ یہ ہے کہ اس کو چاک کر کے اتارو چاقو یا قینچی سے نہ کاٹو۔ آہ آہ عام مسلمانوں کی میت کے لئے تو یہ حکم ہو اور اولادِ رسولؐ کی لاشوں کے ساتھ اشقیائے امت یہ سلوک کریں کہ گھوڑوں کی نعل بندی کرا کے ان کو اس طرح پامال کیا جائے کہ کسی جسم کا کوئی عضو سالم نہ رہے۔ آہ رسول کا ہر ایک عضو کاٹ کر سارا خاندان تباہ کر کے بوڑھے، جوان اور بچے تہِ تیغ کر کے بیکسوں کی لاشوں کو پامال کر کے بھی ان ستم ایجادوں کو چین نہ آیا اور ان دکھیا اور بیکس بی بیوں کو لوٹنے کے لئے جن کے سر پر کسی والی و وارث کا سایہ نہ تھا اور حرم

قزاقوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور لوٹنا شروع کیا۔ ان غریبوں کے پاس چند بزرگانِ دین کے تبرکات کے سوا اور تھا ہی کیا جس کو لوٹا جاتا۔ مگر ان ظالموں کو چونکہ ناموس نبیؐ کی تنگ کرنا اور مظلوموں کو ہر طرح سے ستانا منظور تھا۔ اس لئے جو کچھ ان کے ہاتھ لگا لے بھاگے۔ یہاں تک کہ کسی بی بی کے سر پر ظالموں نے چادر تک نہ چھوڑی۔ پیروں میں سے نعلین تک نکال کر لے بھاگے۔ انتہا یہ ہے کہ ان ملاعین نے وہ کھال بھی بیمار کے نیچے سے نکال لی جس پر بیمار کربلا غش کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ کاش وہ ظالم اسی پر بس کرتے انہوں نے تو یہ غضب ڈھایا کہ اہل حرم کو لوٹنے کے بعد خیموں میں آگ لگا دی۔

آہ آہ، اس وقت اہلِ حرم کی مصیبت کا حال کیونکر بیان کیا جائے۔ سر و پا برہنہ تمام بچے اور بی بیاں پریشان پھر رہے تھے۔ رو رو کر فریاد کرتے تھے۔ مگر کوئی ان بیکسوں پر رحم کھانے والا اور ان کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ آہ نبیؐ کی نواسیاں اور علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں بالوں سے منہ چھپائے انتہائی بدحواسی میں وامحمداہ اور واعلیاہ کے دردانگیز نعرے مار رہی تھیں۔ آہ کہاں تھے اب قاسمؑ و علی اکبرؑ۔ عباسؑ علمدار اور عونؑ و محمدؑ جیسے شیر کہ اپنی ماں بہنوں اور پھپھیوں کو ظالموں کے اس ظلم سے بچاتے۔ کہاں تھے امام مظلوم کہ اپنے کنبہ کو اس تنگ سے محفوظ رکھتے۔ آہ وہ سب تو سر کٹائے خون میں نہائے قتل گاہ میں پڑے تھے۔

خدا کسی دشمن پر ایسا سخت وقت نہ لائے جیسا ان غریب الوطن سیدانیوں پر آ پڑا تھا۔ لکھا ہے کہ جب ایک خیمہ میں آگ لگتی تھی تو سیدانیاں باحالِ تباہ اس سے نکل کر دوسرے خیمہ میں جاتی تھیں اور جب دوسرے میں آگ لگتی تھی تو تیسرے میں پہنچتی تھیں۔ آہ جب صرف ایک خیمہ بیمار کربلا کا باقی رہ گیا تو جناب زینبؑ بے تابانہ حضرت کے پاس پہنچیں اور فرمایا بیٹا اب تم امام وقت اور حجتِ خدا ہو بتاؤ ہمارے لئے کیا حکم ہے صرف یہی ایک خیمہ باقی رہ گیا ہے۔ اس صورت میں سر برہنہ باہر نکل پڑیں یا جل کر مر جائیں۔ حضرت نے فرمایا جس حالت میں ہو باہر نکل جاؤ اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

راوی کہتا ہے جب خیام حسینؑ میں آگ لگ رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ ایک بی بی ایک ایسے خیمہ کے اندر جس کے قریب آگ پہنچ چکی تھی بار بار بے تابانہ آتی جاتی تھی۔ میں نے قریب جا کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس خیمہ میں تمہارا کوئی بہت ہی قیمتی مال ہے جس کو بچانے کے لئے تم اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہی ہو۔ انہوں نے رو کر جواب دیا اے شیخ ہم آوارہ وطن غریبوں کے پاس مال کہاں البتہ اس خیمہ میں میرا بیمار بھتیجا غش میں پڑا ہوا ہے۔ اس کو بچانے کے لئے بار بار اس کے اندر جاتی ہوں۔ اے شخص ہم ناموس نبیؐ ہیں اگر ہو سکے تو اتنا احسان ہم پر کر کہ اس بیمار کو اس کے اندر سے نکال دے۔ راوی کہتا ہے یہ سنتے ہی میرا دل بے چین ہو گیا اور میں اس خیمہ کے اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک نحیف و نزار جوان خاک پر غش میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے یہ حال دیکھ کر بڑا ہی ترس آیا اور جس طرح بنا اس کو باہر نکال لایا۔

حمید بن مسلم فوج یزید کا پرچہ نویس راوی ہے کہ جب خیام حسینؑ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کم سن بچہ کو مقتل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس کے کرتے میں پیچھے سے آگ لگی ہوئی تھی مجھے اس کی حالت پر رحم آگیا۔ دوڑا ہوا اس کے پیچھے اس خیال سے گیا کہ اس کے کرتے کی آگ بجھا دوں۔ جونہی اس نے میرے قدم کی آواز سنی گھبرا کر کہنے لگا۔ اے شیخ تو کس ارادے سے آ رہا ہے۔ میں نے کہا صاحبزادے تمہارے کرتے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس کو بجھا دوں۔ یہ سنکر اس نے کہا اے شیخ ہم ناموس رسولؐ ہیں۔ ہم کو جل جانا گوارا ہے مگر نامحرم کا

ہاتھ اپنے بدن کو لگا منظور نہیں۔ میں نے پوچھا تم کون ہو۔ اس نے کہا میں سکینہ بنت الحسینؑ ہوں۔

اے شیخ اگر تجھ کو میرے حال زار پر رحم آیا ہے تو اتنا سلوک میرے ساتھ کر کہ مجھے نجف کا راستہ بتا دے۔ میں نے کہا اے صاحبزادی وہاں جا کر کیا کرو گی۔ بچی نے رو کر کہا۔ میں اس ظلم و ستم کی اپنے جد سے فریاد کروں گی۔

ابھی میں اس یتیم و کم سن بچی سے یہی گفتگو کر رہا تھا کہ ایک طرف سے خولی ملعون خنجر ہاتھ میں لئے دوڑا ہوا آیا اور اس معصوم بچی کے دونوں گوشوارے کان چیر کر اتار لے گیا۔ بچی کے کانوں سے خون کی ٹلّی چھوٹ پڑی اور وہ وا ابتاہ کا نعرہ مار کر بیہوش زمین پر گر پڑی۔

ہائے اس گھر کی لڑکیاں کیسی بدنصیب تھیں کہ باپ کے عطیوں سے بجائے خوشی کے ان کو غم ہی نصیب ہوا۔ سیدہؑ کے باپ نے فدک بخشا تھا۔ وہ دشمنوں نے ان سے چھین لیا۔ سکینہؑ کے باپ نے عیدی میں دو گوشوارے دیئے تھے وہ کربلا میں چھن گئے

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۰

بائیسویں مجلس

تفسیر آیہ یا ایھا النبی انا ارسلناک اور ذکر شام غریباں

قَالَ اللّٰہُ تبارک وتعالیٰ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب)

اے نبی ہم نے تم کو شاہد و مبشر و نذیر بنا کر بھیجا اور اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا بنایا اور تم کو سراجِ منیر بنایا۔ ہر ایک نبی کو خدا نے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔ مثلاً یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ۔ یا نوح اھبط بسلام منا۔ فنادینٰہ ان یا ابراھیم۔ یا زکریا انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ۔ یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ۔ لیکن ذاتِ جناب سرور انبیا کا یہ احترام مقصود ہے کہ کسی جگہ یا محمدؐ کہہ کر نہیں پکارا۔ انتہائی محبت میں عاشق اپنے محبوب کو بلحاظ اس کی صفات کے پکارا کرتا ہے یہی صورت یہاں بھی ہے جو دھج پیاری معلوم ہوئی خدا نے اپنے رسولؐ کو اسی نام سے پکار دیا۔ رسولؐ نے کمبل اوڑھا اُسے یہ شان پیاری معلوم ہوئی بس پکار لیا یا ایھا المزمل اے میرے کملی والے۔ رسولؐ نے چادر اوڑھی اُسے یہی دھج پیاری معلوم ہوئی بس فرمایا یا ایھا المدثر اے میرے چادر پوش۔ رسولؐ کی سیادت کی شان پسند آئی اس نے پکار لیا یٰسین اے سردار۔ طہارت کی شان پسند آئی۔ پکار لیا طٰہٰ اے طیب و طاہر۔ عشق مجازی میں جب محبت کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو پھر عاشق اپنے معشوق کے قدموں کی خاک کی قسم کھانے لگتا ہے۔ خدا نے اپنے محبوب کو اس خصوصیت سے بھی محروم نہ رکھا اور فرما دیا لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد اے میرے حبیب اس شہر کی قسم جس میں تو چلتا پھرتا ہو۔ اللہ اکبر! انسانیت کا یہ کمال حدِ عقل و فہم سے باہر ہے۔

اس آیت میں خدا نے یا ایھا النبی کہہ کر خطاب فرمایا ہے رسولؐ کہہ کر نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نبوت رسالت سے مقدم ہے رسالت کا پودا اسی سرزمین پر اگا ہے۔ کیسی پُرعظمت یہ رسالت تھی۔ جس کی کاشت کے لئے خلقتِ آدمؑ سے ہزاروں برس پہلے نبوت کی زمین پیدا کی گئی جو ختم رسالت کے پودے کو اچھی طرح لہلہا سکے۔

حکیم نیشا غورث کہتا ہے کہ تمام دنیا دائرۃ الوجود کے تحت میں اپنے کمالات حاصل کر رہی ہے۔ یعنی ہر شے جہاں سے شروع ہوتی ہے جب اسی حد پر اپنی ارتقائی منزلیں طے کر کے پہنچ جاتی ہے تو اس کو کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ درمیان کی تمام منزلیں نقصان کی منزلیں کہلاتی ہیں۔ ان کی ضرورت صرف حصولِ کمال کے لئے ہوتی ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ جو دانہ زمین میں بویا جاتا ہے جب تک وہی دانہ پیدا نہیں ہوتا درخت اپنے کمال کو نہیں پہنچتا۔ جب ویسا ہی دانہ آیا اور کمال کی منزل ختم ہوئی۔ شروع سے آخر تک تخم کا اثر باقی رہنا بہت ضروری ہے۔ ہر شاخ و ہر برگ سے اس تخم کا اثر نمایاں ہونا چاہیئے۔ اب اس مسئلے کے تحت میں ہم نبوت ختم الانبیاء کو دیکھنا چاہتے ہیں آپ کی نبوت ہدایت کا ایک تخم تھی جب آخر میں وہی نبوت آگئی تو کمال نبوت ختم ہو گیا۔ چونکہ تخم کا اثر ارتقائی منزلوں میں باقی رہنا ضروری تھا لہٰذا نور نبوت محمدیؐ ہر ایک نبی کے ساتھ رہا۔

یا ایھا النبی کے خطاب کے بعد کہا گیا انا ارسلناک ہم نے تجھے رسولؐ بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کو درجۂ نبوت پہلے ملا اور درجۂ رسالت بعد میں۔ چنانچہ حضرتؐ نے خود فرمایا ہے کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین (میں اس وقت نبی تھا جب آدم آب و گل میں تھے۔)

اس کے بعد فرماتا ہے ہم نے تم کو شاہد بنا کر بھیجا ہے۔ شاہد کسی واقعہ کے گواہ کو کہتے ہیں۔ رسولؐ نہ صرف اپنی امت پر گواہ ہیں جیسا کہ آیۂ انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً سے ظاہر ہے بلکہ تمام عالم پر گواہ ہیں اور ایسے گواہ ہیں کہ ہر شے کی خلقت ان کے سامنے ہوئی ہے بلکہ خود اپنے نفس پر بھی گواہ ہیں افتتخذونہٗ وذریتہٗ اولیاء من دونی وھم لکم عدو بئس للظالمین بدلاً ما اشھدتھم خلق السموات والارض ولا خلق انفسھم (کیا تم مجھ کو چھوڑ کر شیطان اور اس کی ذریت کو اپنا دوست بناؤ گے حالانکہ وہ تو تمہارے دشمن ہیں اور ظالموں کو بہت برا بدلہ ملتا ہے۔ ہم نے شیطان اور اس کی ذریت کو نہ زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت گواہ بنایا نہ ان کے نفسوں کی پیدائش کے وقت) اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان اور اس کی ذریت نہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت موجود تھی اور نہ اپنے نفسوں کی پیدائش کے وقت۔ پس کچھ لوگ ضرور ایسے ہونے چاہئیں جو آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت موجود ہوں۔ ورنہ شیطان اور اس کی ذریت کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ پس جب محمدؐ و آل محمدؐ اپنے نفوس کی خلقت پر بھی گواہ تھے تو ان کا علم خلقت سے پہلے ہوا۔ اسی کی تصدیق ہوتی ہے آیۂ الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان سے آدمؑ کو علم بعد خلقت دیا گیا اور محمدؐ و آل محمدؐ کو قبل خلقت۔

جو ذات آسمان و زمین اور خلقت نفوس کے وقت بہ حیثیت گواہ موجود ہو وہی اس قابل ہے کہ تمام عالموں کا نبی ہو اول ما خلق اللہ نوری سے واضح ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خدا نے نور محمدی پیدا کیا اور پھر اس سے دیگر چیزوں کی خلقت ہوئی پس باعث ایجاد عالم یہی ہوئے لولاک لما خلقت الافلاک سے یہ امر اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

رسولؐ عالم نور میں شاہد علی الخلق تھے۔ یعنی اُن کی خلقت و فطرت کے شاہد تھے۔ اس کے بعد ہر زمانہ میں لوگوں کے شاہد بنے۔ ہر نبی کی پیشانی میں نور محمدیؐ اسی لئے امانت رکھا گیا کہ آپ ہر زمانہ کے شاہد رہیں۔

دوسری صفت حضرتؐ کی یہ ہے کہ آپ بشیر و نذیر ہیں یہ صفت ہر نبی کے لئے ہوتی ہے کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بدی سے بچانے اور نیکی کی طرف شوق دلانے کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ کسی سزا سے ڈرایا جائے اور کسی اجر کی امید دلائی جائے۔

تیسری صفت بیان کی گئی ہے داعیاً الی اللہ باذنہ یعنی بت پرستی وغیرہ کی وجہ سے جو بندوں نے اللہ سے اپنا تعلق قطع کر لیا ہو رسولؐ اس کو قائم کر دیں اور لوگوں کو مخلوق کی پرستش کی طرف سے ہٹا کر خالق کی طرف لائیں۔ اس رسولؐ کی دعوت کے متعلق یہ بات خاص طور سے بیان کرنی ہے کہ آپ تمام احکام عقلی اور فطری روشنی میں پیش کرتے تھے۔ تقلیداً کوئی بات کسی سے منوانی نہیں چاہتے جیسا کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے ادعو الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی میں تم کو بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میرا اتباع کرنے والا بھی ایسا ہی داعی ہے

باذنہ کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ جو دعوت الی اللہ اللہ کے اذن سے ہوتی ہے وہ صحیح ہے اور بدون اذن غلط ہے۔

سراجاً منیراً یہ آنحضرت ﷺ کی مخصوص صفت ہے۔ تمام دنیا جب عدم کی تاریکی میں تھی اس وقت سب سے پہلے یہی سراج منیر ضوفشاں ہوا۔ یہ وہ سراج منیر ہے جو اللہ کا روشن کیا ہوا ہے اور جس کے نور کا اجالا عرش سے فرش تک ہے۔

ارسطو نے کہا ہے کہ مبدء اول سے جو شے نکلتی ہے وہ درجۂ کمال پر فائز ہوتی ہے کیونکہ کامل ذات نہ بسبب ہر نقصان سے بری ہونے کے اپنی مخلوق میں نقصان کو روا نہیں رکھتی۔ اس صورت میں خالق و مخلوق کے درمیان اس جہت سے مساوات نہیں ہو سکتی کہ ذات واجب کا کمال اور ہے اور ذاتِ ممکن کا اور۔ واجب کامل ہے۔ پس وہ امکانی دائرہ میں بھی کمال کو دوست رکھتا ہے اور سب سے پہلے جس چیز کو خلق کرتا ہے وہ کامل بالذات ہوتی ہے۔ اس کے بعد جس قدر خلقت آگے بڑھتی جاتی ہے ایک کے مقابل دوسرے کو بالنسبت نقصان پہنچتا جاتا ہے اور اس طرح کائنات کی ہر صفت میں بے شمار مدارج متفاوتہ قائم ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک کسی مخلوق میں نقصان نظر آئے سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بالاتر ضرور کوئی ایسی مخلوق ہے جس میں یہ نقصان نہ ہوگا۔ اس طرح تلاش کرتے کرتے ایک ذات ایسی مل جائے گی جو نقصان سے محفوظ ہو۔ مثلاً روشنی کے تعلق پر غور کرو۔ سب سے چھوٹی چیز خاک کا وہ ذرہ ہے جو چمک سے محروم ہے۔ پھر وہ ذرہ ہے جس میں چمک تو ہے لیکن اس کے وجود سے آگے نہیں بڑھتی اور اس کا نور اطراف میں نہیں پھیلتا۔ اس کے بعد جواہرات ہیں مثلاً لعل اور الماس کو دیکھو۔ ان کی ضیا باری اطراف میں بھی ہوتی ہے مگر بہت دھیمی۔ اب چراغ کو دیکھو کہ اس کی روشنی جواہرات سے زیادہ دوڑ جاتی ہے اور چیزوں کو زیادہ صاف دکھاتی ہے لیکن بہت محدود ہے۔ اس کے بعد چاند کی روشنی ہے کہ ساری دنیا پر پھیلتی ہے۔ لیکن تاریکی کا دھبہ اس کے دامن پر بھی ہے۔ اس کے بعد سورج کا نمبر آتا ہے۔ روشنی یہاں آکر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ پس روشنی میں اکمل فرد آفتاب ہے اور سب سے زیادہ ناقص ذرہ اور ان دونوں کے درمیان بہت سے افراد مدارج مختلفہ رکھتے ہیں۔

ارسطو نے روشنی کا مرکز آفتاب کو قرار دیا ہے لیکن اس بات پر غور نہیں کیا کہ سورج میں بھی نقصان پایا جاتا ہے باوجودیکہ وہ روشنی کا سب سے بڑا گولا ہے۔ لیکن اس کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ ایک تیلی سی سینک کو جو دھوپ میں کھڑی کر دی جائے اس کے تمام اطراف کو روشن کر سکے۔ علاوہ بریں جدید آلات سے یہ دریافت ہوا ہے کہ سورج کے اندر بہت بڑا حصہ ایسی گیسوں کا بھی شامل ہے جو نہایت تاریک دھوئیں کی صورت میں ہیں اور کسی وقت بھی اطراف و جوانب کی شعلہ فشانی اس کو روشن و منور نہیں بنا سکتی۔ یہ تاریک گیسیں اس عظیم الشان کرہ پر داغوں کی صورت میں ایک طرف سے دوسری طرف کو جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ سورج کے وجود میں تاریکی کا بہت بڑا حصہ شامل ہے لہذا اس میں نقصان موجود ہے۔ پس ارسطو کے بیان کئے قاعدے کے مطابق ایک اور ایسا نورانی وجود ہونا چاہیئے جو اس تاریکی کے عیب سے بالکل پاک و صاف ہو۔ اور وہ وجود محمدی ﷺ ہے جو اول مخلوق ہے اور جس میں کوئی نقصان نہیں۔ سورج کی گیسوں نے اس کے اندر تاریکی پیدا کر دی ہے۔ لیکن وجود محمدی ﷺ میں تاریکی کا نام نہیں نہ ظاہر میں تاریکی ہے کیونکہ سایہ نہیں نہ باطن میں تاریکی ہے کیونکہ طہارت الٰہیہ نے ہر تاریکی کو دور کر دیا ہے اور الم نشرح لک صدرک نے تمام قوائے باطنیہ کو روشن و منور بنا دیا ہے۔ اسی لئے حضرت کو سراج منیر کہا گیا ہے۔

ایک پارسی میگزین سنہ ۳۲ء میں زردشت کے جو حالات شائع کئے گئے تھے اس میں زردشت کے بہت سے اقوال بھی درج تھے۔

ان میں ایک قول یہ بھی تھا۔

"آگ دنیا کی تمام روشنیوں کا مرکز ہے معمولی آگ تمام مادی چیزوں کو روشن بناتی ہے اور اندرونی آگ قلب انسانی کو روشن بناتی ہے چونکہ ظاہراً اور باطناً یہی چیز باعث ہدایت خلق ہے لہٰذا نور مطلق کی سب سے بڑی جلوہ گاہ یہی ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان عرفان الٰہی کے منازل بہت آسانی سے طے کر سکتا ہے۔ انسان پر آگ کی پرستش واجب ہے۔"

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشت نے آگ کی پرستش کو اس لئے واجب قرار دیا ہے کہ وہ خدا کی بہترین جلوہ گاہ ہے اور تمام دنیا میں روشنی اسی کے دم سے ہے ہم زردشت سے دریافت کرتے ہیں کہ دنیا میں کونسی شے ہے جس میں خدا کی قدرت کا جلوہ نہیں۔ ہر ذرہ ہر برگ و بار اس کی معرفت کا بہترین درس دینے والا ہے۔ کیا آگ کی طرح پانی اور ہوا سے تمام دنیا کی حاجت براری نہیں ہوتی۔ آگ بیشک تمام روشنیوں کا مرکز ہے لیکن نہایت بے عقل اور بدتمیز ہے اُسے نہ فائدہ پہنچانے کی خبر نہ نقصان پہنچانے کی اطلاع اس سے زیادہ بے خبری کیا ہوگی

اگر صد سال گبر آتش فروزد   چو یک دم اندر اں افتد بسوزد

ایک ظالم ایک مظلوم کا گھر آگ سے پھونک دیتا ہے اور آگ ایسی بے بس ہے کہ قطعاً اپنے کو اس جرم کی شرکت سے نہیں بچا سکتی۔ کیا خدا ایسی بے عقل بے خبر اور بے حس چیز میں حلول کر کے ہدایت کا نور پھیلا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کار آمد ذات کیا اس کو اپنی ہدایت کے لئے آلۂ کار بنانے کو نہیں ملتی؟ آگ کو پانی بجھا دیتا ہے وہ روک نہیں سکتی۔ جب آگ بجھتی ہے تو جو ذات اس میں حلول کئے ہوئے ہے وہ خود فنا ہو گی آگ کو ہوا اڑا سکتی ہے۔ مٹی دبا سکتی ہے۔ خدا کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ وہ ایسی کمزور ذات کو آلۂ کار بنائے۔ جب آگ میں قوائے عقلیہ اور حسیہ نہیں تو یقیناً مخلوق میں اس کا مرتبہ انسان سے پست ہے جس میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ پس کیا وجہ کہ افضل کو چھوڑ کر انقص کو آلۂ کار بنایا جائے انسانوں میں خدا اُس نور کامل کو ہدایت کے لئے منتخب نہ فرمائے جو کسی کے بجھائے بجھ سکے اور نہ کسی کے دبائے دب سکے ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد   اگر کس پف زند ریشش بسوزد

وہ آگ کی طرح پانی سے بجھنے والا نہ ہو بلکہ اس کی شان یہ ہو یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ المشرکون۔ (لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونک مار کر بجھا دیں اور اللہ اس نور کا تمام کرنے والا ہے چاہے یہ مشرکوں کو ناگوار ہی گزرے) یہ ہے وہ نور تام اور نور کامل جس کو خدا ہدایت خلق کے لئے خاص کرتا ہے۔ اس سے آگ بیچاری کو کیا نسبت وہ نار ہے یہ نور ہے۔ یہ مختار ہے وہ مجبور ہے۔ وہ بے عقل یہ عقل کل اور معلم حکمت آگ کا مبدا آفتاب اور اس نور کا مبدا اللہ نور السموات والارض

آنحضرت کی ذات کو سراج منیر سے تشبیہ دی گئی ہے اس میں چند باتیں خاص طور سے قابل غور ہیں۔

(۱) چراغ امیر و غریب سب کی حاجت براری اور رہنمائی کرتا ہے۔ جس طرح ایک بادشاہ کا گھر اس سے روشن ہوتا ہے اسی طرح ایک غریب بڑھیا کا جھونپڑا بھی منور ہوتا ہے۔ رسولؐ کی بھی یہی شان ہے وہ رحمۃ للعالمین بن کر اس دنیا میں آئے۔ امیر و غریب سب سے ان کا یکساں تعلق ہے۔ اگر دنیا کے بڑے بڑے ذی مرتبہ لوگ حضرتؐ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے ہیں تو فقرائے صفہ بھی برکات صحبت سے مالا مال ہوتے ہیں جن کے جسموں سے پسینے کی سڑاہند آتی تھی۔ آپ کی رسالت امیر و غریب سب کے لئے تھی اور آپ کی نظر میں دنیا کی تمام

مخلوق یکساں تھی۔

(۲) چراغ کی روشنی میں دوست اور دشمن۔ نیک و بد اور مفید و مضر کی پہچان ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرتؐ کی وجہ سے خدا کے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز حاصل ہوئی اور نیک و بد کا پتہ چلا۔

(۳) ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن کرو لیکن اس کی ضو فشانی میں کچھ کمی نہیں آتی۔ حضرتؐ ایسے سراج منیر ہیں کہ قبل خلقت آپ سے ایک لاکھ چوبیس ہزار شمعیں روشن ہوئیں۔ یہ سب شمعیں ایسی تھیں کہ عصمت کا فانوس ان پر لگا ہوا تھا۔

(۴) چراغ کی روشنی سے جس طرح دوست فائدہ اٹھا سکتے ہیں اسی طرح دشمن بھی۔ حضرتؐ کی ذات سے بھی جس طرح دوستوں کو فائدہ پہنچتا تھا اسی طرح دشمنوں کو بھی۔

(۵) چراغ روشن ہوتے ہی بہت سے پتنگے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان جاں نثاروں کے پیچھے اور بھی بہت سے کیڑے مکوڑے آجاتے ہیں جو بعض اوقات سخت تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔ چھپکلیاں وغیرہ اس لئے نہیں آتیں کہ روشنی حاصل کریں بلکہ اس لئے کہ بیچارے پروانوں کو اپنی غذا بنائیں۔ ٹڈے ہر طرف چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں۔ وہ شمع کے جاں نثار نہیں بلکہ فضا کو نورانی دیکھ کر کسی شکار کی جستجو میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں

(۶) شمع سے اپنی آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے جو آشوب سے پاک ہوں کیونکہ آشوب زدہ آنکھ کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جلد سے جلد روشنی سامنے سے ہٹ جائے۔ یہی حال حضرتؐ کا تھا کہ منافقوں اور کافروں کی یہ دلی تمنا تھی کہ دنیا آپ کے وجود سے جلد از جلد خالی ہو جائے۔

(۷) شمع کے گرد جو پتنگے ہوتے ہیں وہ شمع کے گل ہوتے ہی اپنے اپنے مقام پر واپس چلے جاتے ہیں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اس کے قدموں پر جان نثار کئے پڑے رہتے ہیں یہی حال رسولؐ کا تھا۔ بعض ایسے تھے کہ رسولؐ کے مرتے ہی اپنے آبائی دین کی طرف پلٹ گئے اور بعض ایسے تھے کہ ہمیشہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔

(۸) سراج منیر کی ضیا باری کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اس کی کرنوں کا آخری حصہ دامنِ قیامت پر اپنی روشنی ڈال رہا ہے۔

(۹) اس سراج منیر سے بارہ کرنیں پھوٹیں جو بلحاظ چمک دمک اور بلحاظ قد و قامت ہو بہو ایک تھیں ان سب پر عصمت و طہارت کا فانوس چڑھا ہوا تھا۔ آہ آہ اس شمع منیر کی تیسری کرن پر کربلا میں ظلم و ستم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ آہ یہ ہدایت کے نورانی پیکر جن خیموں کے اندر تھے۔ ظالموں نے ان کو جلا کر خاک کر دیا۔ آہ بہتر شہیدوں کی سوگوار بی بیاں باحالِ تباہ سر کھلے خاک پر بیٹھی تھیں اور کوئی ان بیکسوں کا تسلی دینے والا نہ تھا۔ اگر کسی گھر سے ایک جنازہ نکل جاتا ہے تو اس گھر والوں کا غم سے کیا حال ہوتا ہے اور یہاں تو ایک دو نہیں بہتر جنازے ایک دن ایک گھر سے نکلے تھے۔ بھرا گھر خالی ہو گیا تھا۔ جس گھر میں صبح تک بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کی چہل پہل تھی۔ آج شام کو وہاں چند خاک نشین بی بیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

منقول ہے کہ جب ذریت رسولؐ کو دشمنانِ دین اچھی طرح لوٹ چکے اور خیام جل کر خاک ہو چکے تو لٹی ہوئی بی بیاں آہ کعبہ ہوئی بی بیاں

بے والی و وارث بن کر خاک کے اوپر بیٹھ گئیں اور ایک جلی ہوئی قنات کھڑی کر کے پردہ کر لیا۔ اب جناب زینبؑ نے سب بچوں کو جمع کر کے جانچنا شروع کیا معلوم ہوا کہ جناب سکینہؑ اور کئی بچے غائب ہیں۔ جناب امّ کلثومؑ سے فرمانے لگیں کہ بہن بچے غائب ہیں کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اور تم تلاش کرنے کو نکلیں۔ الغرض دونوں بہنیں رات کی تاریکی میں بچوں کو ڈھونڈنے کے لئے نکل پڑیں۔ آہ دخترانِ فاطمہ پر کیا وقت آپڑا تھا کہ سر ننگے مقتلِ شہدا میں ہر طرف بچوں کو پکارتی پھرتی تھیں۔ یہ وہی دخترانِ علیؑ و فاطمہؑ ہیں کہ جب مدینہ سے روانہ ہوئی تھیں تو ان کی سواری کے لئے کیا کیا اہتمام ہوئے تھے آہ اب کہاں تھے قاسمؑ و علی اکبرؑ۔ عباسؑ اور حسینؑ کہ ان کے پردے کا انتظام کریں آہ پردیس میں یہ پہلی رات تھی کہ زینبؑ و امّ کلثومؑ باحالِ تباہ میدان میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھیں۔ ایک طرف جو نگاہ گئی تو دیکھا کہ سکینہؑ ایک لاش سے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی ہیں۔ جناب زینبؑ نے قریب جا کر پوچھا بیٹی یہ کس کی لاش سے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی ہو۔ رو رو کر کہنے لگیں اے پھوپی اماں یہ لاش میرے بابا جان کی ہے۔ پوچھا بیٹی لاش کی پہچان دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک سر سے دوسرے لباس سے۔ اس لاش کے تن پر نہ سر ہے نہ لباس تم نے ایسی حالت میں کیونکر پہچان لیا۔ بچی نے جواب دیا جب خیام میں آگ لگ رہی تھی تو میں مقتل کی طرف بھاگی اور ہر طرف پکارتی پھرتی تھی۔ بابا آپ کہاں ہیں میری خبر لیجئے۔ ناگاہ اس نشیب کی طرف سے مجھے یہ آواز سنائی دی یَا بُنَیَّ اِلَیَّ اِلَیَّ اے بیٹی ادہر آ کہ میں یہاں سر کٹائے پڑا ہوں۔ جب میں اس لاش کے قریب پہنچی تو اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پس میں سمجھ گئی کہ یہ لاش میرے بابا جان ہی کی ہے۔

اس کے بعد جناب زینبؑ و امّ کلثومؑ اور بچوں کو تلاش کرنے کے لئے چلیں۔ ایک جھاڑی کے قریب دیکھا کہ دو بچے گلے میں باہیں ڈالے پڑے ہیں۔ جناب زینبؑ نے شانہ ہلا کر جگانا چاہا۔ مگر آہ کون جاگتا۔ دونوں کی روح پرواز کر چکی تھی۔ آہ جب ان کو جدا کر کے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے چاند سے سینوں پر گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشان ہیں ہائے اولادِ رسولؐ کس بیدردی سے پامالِ سُمِ اسپاں کی گئی۔

لکھا ہے کہ کربلا میں جب شامِ غریباں نمودار ہوئی تو شکستہ دل بی بیوں نے اپنے وارثوں کو یاد کر کے رونا شروع کیا۔ آہ کل رات تک کتنے جوان اور بوڑھے حفاظت کے لئے تیار تھے۔ لیکن آج ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ اے بی بیو کل کی بات ہے کہ ہماری حفاظت کے لئے حبیب ابنِ مظاہرؓ۔ زہیر قینؓ موجود تھے۔ مسلم بن عوسجہؓ موجود تھے۔ قاسمؑ و علی اکبرؑ موجود تھے عباسؑ علمدار موجود تھے۔ انتہا یہ ہے کہ خود میرے بھائی حسینؑ موجود تھے۔ لیکن آج کی رات دنیا ان سب سے خالی ہے۔ پس اب زینب کا یہ فریضہ ہے کہ آج کی رات تم سب کے گرد طلایہ پھرے کیونکہ میرے ماں جائے حسینؑ نے تم سب کو میرے سپرد کیا ہے۔ یہ سنکر سب بی بیاں رونے لگیں اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں اے ثانیٔ زہراؑ کیونکر ممکن ہے کہ ہماری موجودگی میں آپ اس خدمت کو انجام دیں۔ لیکن جناب زینبؑ کسی طرح راضی نہ ہوئیں اور ایک ٹوٹا ہوا نیزہ لے کر طلایہ پھرنے لگیں۔ ناگاہ ایک روشنی آپ کو نظر آئی۔ سمجھیں کہ ظالم لوٹنے کو آرہے ہیں۔ جب وہ روشنی قریب ہوئی تو آپ نے فرمایا اے ظالمو ہم کہیں بھاگ نہ جائیں گے۔ صبح کو جتنا چاہنا ہم کو لوٹ لینا۔ اس وقت ہمارے بچے روتے روتے سو گئے ہیں۔ لیکن وہ روشنی برابر قریب ہوتی چلی آرہی تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو ایک عورت سر پر کوئی شے رکھے مشعل کی روشنی میں چلی آرہی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خاک پر بیٹھ گئیں۔ جب وہ عورت قریب آئی تو جناب زینبؑ نے

پوچھا۔ اے بی بی تم کون ہو۔ اس نے کہا اے بی بی میں زوجۂ حُرؓ بن یزید ریاحی ہوں۔ یہ سُننا تھا کہ جناب زینبؑ نے حُرؓ کا پرسا دینا شروع کیا زوجۂ حُرؓ نے کہا اے بی بی میرا فرض تھا کہ پہلے میں آپ کو بہتّر شہیدوں کا پرسا دیتی۔ یہ اولادِ رسولؐ کا اخلاق ہے کہ میں بولنے بھی پائی کہ آپ پہلے سے مجھے میرے شوہر کا پُرسا دینے لگیں۔ اے بی بی میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت عمر سعد کی فوج کے کچھ لوگ اس شقی کے پاس آکر کہنے لگے اے ظالم ہم نے تیرے کہنے سے اولادِ رسولؐ کے گلے تہِ تیغ کر دیئے جو تیرا منشا تھا پورا ہو گیا اب تجھ کو لازم ہے کہ جلد از جلد ان دُکھیا عورتوں اور یتیم بچوں کو جن کا سارا کنبہ ہمارے ہاتھوں قتل ہوا ہے اور جو تین دن سے بھوک اور پیاس کے مارے تڑپ رہے ہیں کچھ کھانا اور پانی بھیج۔ اگر اب بھی تو نے اس طرف توجہ نہ کی تو پھر ہمارے اور تیرے درمیان وہ تلوار چلے گی کہ دنیا تماشا دیکھے گی۔ یہ سنکر اس شقی نے کہا میں کب منع کرتا ہوں کسی سے کہو تھوڑا سا بُھنا ہوا اناج اور ایک مشکیزہ پانی کا ان کے پاس لے جائے۔ انہوں نے کہا اے پسر سعد یہ ذریتِ رسولؐ ہے۔ وہ بھوک پیاس سے مرجانا گوارا کرلیں گی لیکن کسی نامحرم کے ہاتھ سے آب و دانہ کا لینا گوارا نہ کریں گی۔ اگر تجھے بھیجنا ہے تو کسی عورت کے ہاتھ بھیج۔ پس اس شقی نے لشکر کی تمام عورتوں کو جمع کیا اور اس مسئلہ کو ان کے سامنے رکھا۔ لیکن ان سب نے انکار کر دیا۔ کسی نے کہا اے امیر کیا منہ لے کر جاؤں۔ میرے شوہر نے حسینؑ کے کڑیل جوان کے سینہ پر برچھی ماری ہے۔ کوئی کہتی تھی میرے شوہر نے حسینؑ کے بتیس برس کے بھائی کے بازو کاٹے ہیں۔ کوئی کہتی تھی میرے بیٹے نے حسینؑ کے ششماہے بچے کے گلے پر تیر مارا ہے۔ غرض کہ جب کوئی عورت یہاں آنے پر تیار نہ ہوئی تو سب نے یہ تجویز کی کہ زوجۂ حُرؓ کو بھیجنا چاہیئے کیونکہ حُرؓ نے حسینؑ کے ساتھ احسان کیا ہے۔ پس اس بنا پر میں یہ غلہ بریاں اور یہ پانی کا مشکیزہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ یہ سُننا تھا کہ جناب زینبؑ کا دل بھر آیا۔ مقتل کی طرف منہ کر کے کہنے لگیں۔ میرے غیرت دار بھیا۔ میرے مظلوم ماں جائے۔ پسر سعد کے یہاں سے آپ کی حاضری آئی ہے۔ آہ زینبؑ کیونکر اس کو حلق سے اتارے۔ کاش مجھے موت آجاتی اور یہ وقت نہ دیکھتی۔ اس کے بعد زوجۂ حُرؓ سے فرمایا۔ اے بی بی یہ پانی کس کے لئے لائی ہو۔ کون اب اس کو پیئے۔ آہ اس گھر کے بچے، جوان اور بوڑھے سب اس پانی کو ترستے چلے گئے۔ یہاں تک کہ چھ ماہ کا شیر خوار بچہ بھی تا دمِ مرگ ایک قطرۂ آب نہ پاسکا۔ اب اس پانی کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ پھٹتا ہے۔ اس آب و دانہ کو واپس لے جاؤ۔ اب ہم میں سے کسی کو نہ بھوک ہے نہ پیاس۔ ہمارے لئے غم کھانے کو اور آنسو پینے کو بہت کافی ہیں۔ زوجۂ حُرؓ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی اے بی بی اگرچہ آپ کے رنج و غم کی کوئی انتہا نہیں لیکن کھانا پینا ایسی چیز نہیں کہ چھوٹ سکے۔ یہ ننھے ننھے بچے جو غش میں پڑے ہوئے ہیں اگر چند گھنٹے اور آب و غذا نہ پائیں گے تو فرطِ ضعف سے ہلاک ہو جائیں گے۔

الغرض زوجۂ حُرؓ نے باصرار تمام ان چیزوں کو وہاں رکھ دیا اور واپس گئی۔ اس کے جانے کے بعد جناب زینبؑ نے سب بی بیوں سے کہا جب یہ پانی آگیا ہے تو ان پیاسے بچوں کو غش سے چونکا کر پلاؤ ورنہ یہ ہلاک ہو جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے جناب سکینہؑ کو شانہ ہلا کر جگایا اور کہا لو بیٹی پانی پیو۔ تمہارا پیاس سے غیر حال ہے۔ بچی نے یہ سُنکر چاروں طرف گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگی جو اس پانی کو لائے ہیں میں انہی کے ہاتھ سے پیوں گی۔ یہ سنتے ہی اہلِ حرم کا دل ہل گیا۔ جناب زینبؑ نے رو کر فرمایا اے بیٹی تیرا خیال کہاں ہے۔ یہ پانی تیرے چچا عباسؑ نہیں لائے بلکہ فوج یزید کی طرف سے آیا ہے۔ یہ سنکر اس بچی نے پانی پینے سے

انکار کر دیا۔ لیکن جب جناب زینبؑ نے زیادہ زور دیا تو سکینہؑ نے پوچھا سب سے پہلے آپ مجھے کیوں پلا رہی ہیں۔ فرمایا اے بیٹی تو سب سے چھوٹی ہے یہ سنتے ہی سکینہؑ پانی کا کوزہ لے کر مقتل کی طرف چلیں۔ پوچھا بیٹی کہاں جاتی ہو۔ کہنے لگیں مجھ سے چھوٹا میرا ننھا بھیا علی اصغرؑ ہے۔ اس کو پلانے جاتی ہوں۔ جناب زینبؑ نے رو رو کر فرمایا اے نور دیدہ اب علی اصغرؑ کہاں ہیں کہ تم ان کی پیاس بجھاؤ وہ تو پہلے ہی تیر ستم سے شہید ہو گئے۔

آہ مومنین کس زبان سے عرض کروں کہ اہل حرم نے یہ وحشت ناک رات کیونکر بسر کی۔ تمام رات سیدانیاں خاک پر بیٹھی اپنے اپنے وارثوں پر نوحہ و ماتم کرتی رہیں۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ٥

تیئسویں مجلس

تفسیر آیہ ھُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً الخ درحال روانگی اہل حرم از کربلا

ھو الذی انزل من السماء ماء لکم منہ شراب ومنہ شجر فیہ تسیمون ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون ۔ (اللہ وہ ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے مینہ برسایا جسے تم پیتے ہو اور اسی سے درخت اُگے ہیں۔ اس پانی سے تمہارے لئے کھیتیاں اُگتی ہیں زیتون، کھجور اور انگوروں کے درخت اور ہر قسم کی پھل پھلاری پیدا ہوتی ہے اور غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں)

دنیا میں خداوند عالم نے جتنی چیزیں خلق فرمائی ہیں ان میں ہر ایک کو فعلی اور انفعالی دو قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو دنیا میں کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ جس میں فعلی قوت زیادہ ہے اس کو اس چیز پر حاکم و متصرف بنایا ہے۔ جس میں فعلی قوت کم اور انفعالی قوت زیادہ ہے۔ زمین میں فعلی قوت سب سے کم ہے اور انفعالی قوت زیادہ ہے اسی لئے تمام قوتوں کا اس پر عمل ہوتا رہتا ہے۔ پانی میں چونکہ بہ نسبت زمین کے فعلی قوت زیادہ ہے۔ اس لئے اس کو زمین پر حاکم و متصرف بنایا گیا ہے۔ زمین پر وہ جہاں چاہتا ہے حاکمانہ شان سے بہتا ہے زمین اس کو روک نہیں سکتی۔ ہوا میں بہ نسبت پانی کے زیادہ فعلی قوت ہے۔ اس لئے اس کو پانی پر حاکم بنایا ہے۔ جہاں چاہتی ہے پانی کو اڑا کر لے جاتی ہے ہوا پر آگ کو حکومت دی ہے۔ اسی طرح جمادات پر نباتات کو فوقیت دی ہے اور نباتات پر حیوانات کو اور حیوانات پر انسان کو۔ فطرت نے ایک قاعدہ یہ بھی رکھا ہے کہ جس پر جس کو حاکم بنایا ہے۔ ماتحت چیزوں کو اس کی غذا بنا دیا ہے۔ جمادات نباتات کا رزق ہے۔ نباتات حیوانات کا اور انسان چونکہ سب پر حاکم و متصرف ہے لہٰذا اس کی غذا ان تینوں ماتحت چیزوں کو قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ انسان کا چوتھا درجہ ہے اور تین ماتحت چیزوں پر حاکم و متصرف ہے۔

بہرحال ہوا چونکہ پانی پر متصرف ہے اس لئے اس کو زمین سے اٹھا کر اوپر لے جاتی ہے۔ ہوا کی طاقت کا اندازہ تو کرو کروڑوں من پانی کس آسانی سے اپنے دامن میں بھر لیتی ہے اور پھر کس طرح اس کو روئی کی مانند دھنک کر ادھر سے ادھر اڑاتی پھرتی ہے۔ دیانتدار اتنی بڑی کہ ایک قطرہ ضائع نہیں ہونے دیتی۔ متصرف اتنی بڑی کہ پانی کو جس صورت میں چاہے تبدیل کر دے۔ اولا بنا دے یا پالا شبنم بنا دے یا برف۔ موسلا دھار رو گرا دے یا ننھی ننھی بوندوں کی پھوار برسا دے۔ جہاں اپنے دامن کو جو ململ اور تن زیب سے زیادہ باریک ہے ذرا نچوڑ دیتی ہے چھما چھم مینہ کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ اس کی قدرت کا کرشمہ دیکھو ذرا سی دیر میں جل تھل بھر جاتے ہیں خشکی میں تری آجاتی ہے۔ ہزار سقوں سے جو کام برسوں میں نہ ہو پاتا وہ ابر کا سقا منٹوں میں انجام دے دیتا ہے۔ ندی نالے بہہ نکلتے ہیں۔ دشت و دریا پانی سے بھر جاتے ہیں جہاں ذرا دیر پہلے خاک اڑتی تھی وہاں کشتیاں چل نکلتی ہیں۔ وہی پانی جو دریاؤں میں موجیں مار رہا تھا۔ سمندروں میں تلاطم برپا کر رہا تھا

کس طرح اوپر کو کھنچا چلا جاتا ہے۔ دستِ قدرت نے ذرا سا اچھال جو دیا تو صورت، سیرت اور خصوصیت سب ہی تو بدل گئے جو پانی پہلے تلخ اور کھاری تھا۔ اب شیریں بن گیا۔ جو پہلے زمین کی چھاتی چیر رہا تھا اب چپ چاپ ہوا میں اڑا اڑا پھر رہا ہے اور دم نہیں مارتا۔ پہلے کچھ اور تاثیر تھی اب کچھ اور ہے۔ قطروں کے موتی ہیں کہ ہوا کی لڑیوں میں گندھے چلے آ رہے ہیں ذرا سی حرکت میں رشتہ غیر محسوس ٹوٹا تو ایک ایک لڑی سے ہزاروں موتی بکھر گئے اور ایک مینہ کا اچھالا ہزار مرضوں کی دوا بن گیا۔ پیاسوں کے لئے آبِ شیریں ہے۔ کھیتوں میں اس سے سبزہ لہلہاتا ہے۔ درختوں میں برگ و بار پیدا ہوتے ہیں۔ مویشیوں کو رزق ملتا ہے۔ باغوں میں پھل پکتے اور پھلواریاں مہکتی ہیں۔ ہزاروں قسم کے تخم جو خاک میں ملے پڑے تھے۔ ایک چھالے نے وہ دمِ عیسیٰ کا کام کیا کہ سب جی اٹھے۔ قسم قسم کے پودے زمین کی چھاتی چیرتے خاک کی نقاب الٹتے باہر آ گئے بارش نے کیا سحر کر دیا کہ اب زمین کے اندر رہنا ناگوار ہے۔ کس نے ان کے کان میں پھونک دیا کہ اب عدم کے پردے کو چاک کرنے کا وقت ہے قوتِ نامیہ نے ذرا خدا کے دانوں سے سر نکال کر جو اپنا ابھار دکھایا تو گزوں اونچے درخت کھڑے ہو کر اپنی شاندار چھتریاں پھیلانے لگے۔ ابھی جو چیز پانی بن کر زمین پر بہہ رہی تھی دو روز میں سبزہ کا روپ بھر کر نکل آئی۔ ابھی جو چیز سبزہ تھی وہی جانوروں کے پیٹ میں دودھ بن گئی سبحان اللہ عظیم الشان ہے

یہ سلیقہ کہاں نیچر کو ہے گلکاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

خالص پانی میں دانہ ڈالو تو دانہ گل سڑ کر رہ جائے۔ سوکھی مٹی میں دباؤ تو نہ اُگے۔ لیکن جب پانی اور زمین دونوں مل جائیں اور مل جل کر اپنی کوشش کریں تو پھر بہار آ جائے زمین اس وقت تک دانوں کو چھپائے رہتی ہے۔ جب تک اس کا معین و مددگار نہ آ جائے۔ ادھر وہ آیا اور کایا پلٹ ہوئی۔

یہ بھی خدا کی قدرت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب پانی سمندروں میں موجزن تھا تو اس وقت اس میں نہ رعد کی سی گرج تھی اور نہ بجلی کی سی چمک۔ لیکن اوپر جاتے ہی اس کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ کالی گھٹاؤں کے دامن میں آگ لگ گئی۔ یہی پانی جب برسا تو زیتون کا درخت پیدا ہو گیا یہ اسی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی قدرت ہے کہ زیتون کی جڑیں جو پانی کھینچتی ہیں اس کو اپنے تخم کی تاثیر سے روغن کی صورت میں تبدیل کرتی جاتی ہیں۔ دیکھو ذرا سی تبدیلی میں پانی روغن بن گیا اور کیسا اچھا اور کار آمد روغن کہ اگر کھاؤ تو خوش ذائقہ جلاؤ تو چمکتا۔ پھر ایک دو نہیں سینکڑوں امراض کی دوا۔

اب کھجور کے درخت کو دیکھو کیسی سخت گٹھلی سے پیدا ہوا ہے۔ یہ اسی کی شان ہے کہ پانی کے چھینٹے دے دے کر پتھر کو موم بناتا ہے اور اس سے ایک عجیب و غریب قسم کا درخت اگاتا ہے۔ اس گرم ریگستان میں جہاں رسیلے پھل کی نشوونما نہیں ہوتی۔ یہ درخت پیدا ہو کر لوگوں کا سرمایہ حیات بنتا ہے۔

انسان خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلائے گا۔ اس آیت کے بعد دور تک خدا نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ذرا دیکھو انگور کی بیل کس قدر نازک ہے اور اس کے خوشے کس قدر بھاری ہیں۔ وہی پانی جب انگور کی جڑ میں پہنچتا ہے تو انگور کے پیالے شربت سے بھر دیتا ہے اسی طرح قسم قسم کے پھل جن کے رنگ و بو اور ذائقے مختلف ہوتے ہیں۔ اپنی قدرت کاملہ سے اسی پانی سے پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد اور نعمتوں کا ذکر فرماتا ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر کر دیا ہے۔ یعنی ان کی طاقت نہیں کہ اپنے دوائرے سے نکل جائیں رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا آنا ضروری ہے۔ اگر دن ہوتا اور رات نہ ہوتی تو آدمی کام کرتے کرتے مر جاتا۔ اور اگر رات ہی ہوتی اور دن نہ ہوتا تو سوتے سوتے اکتا جاتا اور معطل رہ کر اپنے اعضاء و جوارح کی چستی کھو بیٹھتا۔ رات کی قدر دن سے ہو رہی ہے اور دن کی رات سے۔

اس نے رات اور دن کا نظام برقرار رکھنے کے لئے سورج اور چاند کو ہمارے لئے مسخر کیا۔ کیا ممکن کہ یہ اپنے معینہ حساب سے ذرا آگے پیچھے ہو جائیں۔ پھر ستاروں کو مسخر کیا کہ وہ رات کو چمک کر باعثِ ہدایت ہوں پھر زمین سے مختلف رنگ پیدا کئے۔ ایک ہی زمین ہے ایک ہی پانی لیکن اس سے قسم قسم کے کی نباتات روئیدہ ہو رہی ہیں۔ زمین کو چھلنی بنایا ہے کہ چیز چھن چھن کر اس میں جا رہی ہے اور ہر جز اپنے ماخذ میں شامل ہوتا چلا جاتا ہے۔

پھر اس نے دریاؤں کو مسخر کیا۔ یہ عظیم الشان سمندر جن کی وسعت دیکھ کر آدمی کے حواس جاتے رہتے ہیں اس کو ہمارے لئے مسخر کر دیا تاکہ بحری سفر میں آسانی ہو۔ پھر اس میں قسم قسم کی مچھلیاں پیدا کر دیں کہ آدمی ان کا گوشت کھا کر خوش ہو۔ پھر ان میں سے موتی اور مونگے نکالے کہ زیور کے طور پر انسان استعمال کرے۔ پانی کی سطح کو اس قابل بنایا کہ جہاز اور کشتیاں اس کو چیرتی پھاڑتی ادھر سے ادھر چلی جائیں اور لوگ اپنی روزی کمانے اور خدا کی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے آسانی سے سفر کر سکیں۔ پھر زمین پر جا بجا پہاڑ نصب کر دیئے تاکہ زمین ان کے وزن سے دبی رہے اور ادھر ادھر کو جھک نہ سکے۔ پھر جا بجا زمین میں نہریں اور راستے بنائے تاکہ لوگ چل سکیں۔

یہ سب کام اس لئے ہو رہے ہیں کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اپنی زندگی اطمینان سے بسر کر سکے اور اپنے معبود کی معرفت حاصل کرے۔ چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے لہذا تمام چیزوں میں اس کو شریک کیا ہے۔ یعنی جو خصوصیات تمام مخلوق میں پائی جاتی ہیں وہ سب انسان میں بھی موجود ہیں۔ آنسوؤں کی بارش بھی موجود ہے۔ بالوں کی نباتات بھی۔ چربی کا زیتون بھی۔ درختِ خرما کا سا سیدھا قد بھی۔ آنکھوں کے چاند اور سورج بھی۔ بالوں کی سیاہی رات ہے تو چہرہ کی روشنی دن ہے۔ خون کا سمندر بھی موجیں مار رہا ہے۔ رگوں کی نہریں بھی ہیں۔ نسوں کے راستے بھی ہیں۔ ہڈیوں کے پہاڑ بھی ہیں۔ اور ان سب سے زائد بات یہ ہے کہ صاحبِ عقل و فہم بھی ہے اور یہ خدا کی ایسی خاص نعمت ہے کہ کسی اور مخلوق کو اس میں حصہ نہیں ملا۔

لیکن عقل کی صحیح تعریف کیا ہے مَا عُبِدَ بِهِ الرَّحْمٰنُ وَاكْتُسِبَ بِهِ الْجِنَانُ (جس سے خدا کی عبادت کی جائے اور جنت کو حاصل کیا جائے)، اگر خدا کی عبادت نہیں کی جاتی اور حصول جنت کا سامان فراہم نہیں کیا جاتا تو سمجھو یہ خصوصیت برطرف ہو گئی اور وہ اشرفیت کے درجہ سے گر گیا۔ کیونکہ اور خصوصیات تو دیگر مخلوق میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ پس جو شخص صاحب عقل سلیم ہے وہ معرفتِ معبود اپنی عقل کا پہلا کام سمجھتا ہے امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں اوّل الدین معرفتہٗ۔ دین میں سب سے پہلی چیز خدا کی معرفت ہے لیکن انسان کی عقل پر پتھر پڑے ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو اپنی معرفت کا ذریعہ قرار دیا تھا وہ انہی کو خدا سمجھ بیٹھا۔ دنیا میں ایسی کونسی چیز ہے۔ جس پر انسان کو خدا کا دھوکہ نہیں ہوا۔ اور اس کی پرستش نہیں کی۔ اس گمراہی کو دور کرنے کے لئے خدا نے اپنی حجت کو یوں تمام کیا کہ ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجا تاکہ وہ حقیقی معبود کی معرفت کرائیں۔ لیکن انسان مادیت کی محبت میں پھنس کر خدا سے ایسا غافل ہوا کہ انبیاء کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا گوارا نہ کیا

اور بجائے ان کی قدر کرنے کے ان کو طرح طرح سے اذیت پہنچانا اور قتل کرنا پسند کیا۔ اس ناشکری پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوئے مگر ان پھر بھی در چو نکا۔ باوجودیکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آ چکے۔ لیکن انسان اب بھی خدا کی معرفت سے کوسوں دور ہے۔

بہر حال خدا نے اس معرفت کا پہلا بندوبست کیا۔ اس بازارِ معرفت کے پہلے سجانے والے آدم علیہ السلام تھے۔ جنہوں نے سطح زمین پر معنویت کی دکان آراستہ کی اور تعلیم اسماء اور توحید و نبوت وغیرہ کا سودا اس میں بھرا۔ اس وقت دنیا میں تھوڑے سے لوگ تھے اور بازارِ معرفت میں صرف ایک اکیلی دکان تھی۔ لہذا جس کو جو لینا ہوتا تھا وہیں آتا تھا۔ اور چونکہ گاہکوں کو خدائی سودے پر لگانا مقصود تھا لہذا ہر جنس بلا قیمت دی جا رہی تھی۔ چونکہ خریداروں اور ضرورت مندوں کی تعداد کم تھی لہذا دکان میں مال بھی تھوڑا ہی سا تھا اور پبلک کی ضروریات کے لحاظ سے سیدھا سادہ بھی۔

جناب آدم علیہ السلام کے بعد یہ دکانِ ایمان سلسلہ بسلسلہ حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچی۔ یہاں اس نے ایک نئی صورت اختیار کرلی یعنی وقتی مصلحت کی بناء پر یہ دکان ایک بہت بڑی کشتی میں سجائی گئی اور خریداروں کو کشتی میں بلا کر ایک ایک مال دکھایا گیا اب بہ نسبت پہلے کے سامان بہت بڑھ گیا تھا۔ لوگ آ آ کر پوچھتے تھے اس مال کی قیمت کیا ہے؟ جناب نوحؑ جواب دیتے تھے مفت۔ وہ کہتے تھے آپ کچھ اپنا ہی حق المحنت لے لیجئے۔ وہ فرماتے تھے اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن میں اپنی مزدوری خدا سے لوں گا۔

حضرت نوحؑ کے بعد یہ اسلامی سودا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا۔ اب تک کوئی مستقل دکان نہ تھی جہاں موقع ہوا خدائی کارپردازوں نے اپنا سامان رکھا اور بیچنے لگے۔ لیکن حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی مدد سے ایک چھوٹی سی دکان بنالی اور اس کا نام کعبہ رکھا۔ جس کے سائن بورڈ پر لکھا ہوا تھا مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ پھر حکم ہوا اے ابراہیم تمام دنیا کے خریداروں کو آواز دے کر بلاؤ تاکہ وہ یہاں آ کر سامانِ نجات خریدیں۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (لوگوں کو حج کے لئے بلاؤ) چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے پکارا اور قدرت نے ان کی آواز دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا دی۔ یہاں تک کہ جو بچے رحم مادر یا جو نطفہ صلب پدر میں تھے۔ انہوں نے بھی اس آواز کو سن لیا۔ چنانچہ جنہوں نے اس آواز پر لبیک کہہ دیا۔ ان کو حج نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد اس بازارِ معرفت میں بہت سی دکانیں کھل گئیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک مقام پر سینکڑوں خردہ فروش سامانِ نجات فروخت کرتے نظر آنے لگے۔ دنیا کے حریص بندوں نے جب اسلامی سودے پر خلق اللہ کا ہجوم زیادہ دیکھا تو دلوں میں حسد کی آگ بھڑکی اور مقابلہ میں انہوں نے بھی بہت سی دکانیں کھول لیں جن میں سارا سامان امیٹیشن یا نقلی تھا۔ یہ سب ابلیسی اسٹور کے خردہ فروش تھے۔ انہوں نے دھوکہ دینے کے لئے بہت سے سامان اسلامی سودے سے ملتے جلتے بنا رکھے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سی چیزوں کے نام بھی وہی رکھ لئے تھے۔ کج فہم اور ناواقف حال لوگ صاف دھوکہ کھا جاتے تھے۔ خدائی کارپردازوں کو یہ بات ناگوار ہوتی۔ وہ بے محابا ٹوک دیتے۔ اس پر شیطانی ایجنٹ بگڑ جاتے اور ان بے گناہ خدا پرستوں کو قتل کر ڈالتے وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ۔ یہاں تک کہ ستر ستر نبیوں کو قتل کر کے اپنی اپنی دکانیں کھولتے۔

رفتہ رفتہ ایک مدت دراز کے بعد یہ اسلامی دکان سرزمین مکہ پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ کی زیر نگرانی کھولی گئی۔ اب

اس کے سامان کی کیا انتہا تھی۔ قیامت تک کے انسانوں کو بلحاظ تمدن و معاشرت و تدبیر منزل و عبادت و ریاضت و سیاست خواہ علمی ہو یا عملی جتنے سامانوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب اس دکان میں موجود تھا۔ پچھلے زمانوں میں جو جو سامان لوگوں کی وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے آ چکے تھے وہ سب بھی اس دکان میں موجود تھے۔ غرضکہ ہر طرح سے اب یہ دکان معرفت مکمل تھی۔ اب یہ دکان نہ تھی بلکہ متاع دنیا و آخرت کا ایک پورا شہر تھا اَنَا مَدِینَۃُ العِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا۔ اس دکان کا ہر سودا موافق اس قاعدہ اور قانون کے فروخت ہوتا تھا جو خدا کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ چونکہ اس کے بعد قیامت تک اب کوئی دکان کھلنے والی نہ تھی لہٰذا ہر سامان جانچ جانچ کر دیا گیا تھا اور ہر حیثیت سے مکمل کر دیا گیا تھا الیوم اکملت لکم دینکم۔ اس کی تکمیل کا یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ قیامت تک اس متاع کے بیچنے والے بھی معین کر دیئے گئے اور ان کی تعداد بھی بارہ مقرر ہو گئی۔ یہ سب کے سب عصمت پوش حقیقت نیوش اور صداقت کوش تھے۔ خدا و رسولؐ کو ان کی دیانت پر پورا بھروسہ تھا۔ یہ کسی خریدار کو اصلی کی جگہ نقلی چیز دینے والے نہ تھے۔ ان کو دکان کے ایک ایک سودے سے پوری پوری واقفیت تھی۔ ان سے دھوکہ کھانے یا دھوکہ دینے کا امکان ہی نہ تھا۔

جب سرزمین عرب پر یہ دکان کھلی تو حسب دستور قدیم پہلے تو ضرورت مندوں کو مفت سودا گیا۔ لیکن پھر خدا کی طرف سے ایک قیمت مقرر ہوئی۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی۔ یہ قیمت ایسی تھی کہ ہر شخص اس کو آسانی سے ادا کر سکتا تھا۔ لیکن اس پر بھی بہت سے مفت خوروں نے ناک بھوں چڑھائی اور اپنے مقام پر یہ طے کر لیا کہ ہرگز اس قیمت کو ادا نہ کریں گے بلکہ یہ بھی طے کیا کہ جس طرح ازمنۂ سابقہ میں اس دکان کے مقابل دوسری دکانیں نقلی اور مصنوعی سودے کی لگائی گئی تھیں ہم بھی لگائیں گے اور جس طرح ہم سے پہلے لوگوں نے اس خدائی دکان کے محافظوں کو قتل کیا ہے ہم بھی قتل کریں گے۔ چنانچہ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس اسکیم پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ پہلے ڈھکی چھپی مخالفتیں رہیں۔ لیکن چند ہی سال بعد یہ للّٰہی بغض اتنا بڑھا کہ ان خدائی کارپردازوں کے قتل پر کھلم کھلا کمر بستہ ہو گئے۔

آہ ان ظالموں کو کیسی سخت عداوت تھی کہ کربلا میں رسولؐ کا سارا خاندان چند گھنٹے کے اندر انتہائی بیدردی سے کاٹ کر رکھ دیا اور وہ وہ وحشیانہ مظالم کئے کہ ان کے تصور سے کلیجہ کانپتا ہے۔ کافر و مشرک کے ساتھ بھی وہ ظلم روا نہیں رکھے جاتے جو ان نام نہاد مسلمانوں نے اپنے نبیؐ کی ذریت سے کئے۔

منقول ہے کہ گیارہویں محرم کو پسر سعد نے حکم دیا کہ اس کی فوج کے تمام نجس لاشے دفن کر دیئے جائیں۔ ایک سردار نے پوچھا حسینؑ اور ان کے اصحاب کے لاشوں کے متعلق کیا حکم ہے۔ اس شقی نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ ان سب لاشوں کو یوں ہی بے غسل و کفن خاک پر پڑا چھوڑ دو۔ چنانچہ صبح سے سہ پہر تک وہ نجس لاشے دفن ہوتے رہے۔ جب ایک ایک لاش دفن ہو گئی تو پسر سعد نے اہل حرم کی گرفتاری اور کوفہ کی روانگی کا حکم دیا۔ اب تھوڑا سا حال ان ستم رسیدہ آفت دیدہ بی بیوں کا بھی سن لیجئے جو صبح سے سہ پہر تک یوں ہی بغیر کسی سایہ کے سر و پا برہنہ جلتی بلتی ریت پر بیٹھی رہی تھیں۔ دن بھر ان غریبوں اور بیکسوں کے سروں پر وہ تیز دھوپ پڑتی رہی جو دماغوں کو کھولا دینے والی تھی۔ آہ بہتر شہیدوں کی سوگوار بی بیوں کے دلوں پر بجائے تسلی اور دلاسے کے یہ ظلم و ستم کے پہاڑ گرائے جا رہے تھے۔ بیچاریاں باحال تباہ خاک پر بیٹھی تھیں کہ یکایک شمر اور خولی فوج کا ایک دستہ لئے ہوئے وہاں پہنچے۔ اور سب بی بیوں کی مشکیں باندھ کر اور بیمار کربلا کو طوق و سلاسل میں مقید کر کے لشکرگاہ عمر سعد کی طرف لے گئے اور وہاں

سے برہنہ پشت اونٹوں پر سوار کرکے جن پر نہ کجاوہ تھا اور نہ عماری کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آہ اس وقت اہلِ حرم کی بیقراری اور گریہ وزاری کا کیا حال بیان کیا جائے۔ مقتلِ شہدا ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس غم سے ان کے کلیجے پھٹے جاتے تھے کہ وہ اپنے عزیزوں اور جگر پاروں کی لاشوں کو یوں ہی بے کفن و دفن چھوڑے جا رہے تھے۔ ایک ایک بی بی فرطِ رنج و غم سے ہلاکت کے قریب پہنچ گئی تھی۔ آہ ان بیکسوں کو برہنہ پشت اونٹوں پر اول تو بیٹھنے کی عادت نہ تھی، پھر ضعف کا غلبہ، اسیری کی حالت، نامحرموں کا سامنا، بندھے ہوئے ہاتھ۔ ایک ایک کو قدم قدم پر غش آ رہا تھا بار بار اونٹوں پر سے گر پڑتی تھیں اس پر وہ اشقیا تازیانوں کی مار دیتے تھے۔ الغرض قریب شام یہ قافلہ مقتلِ حسینؑ سے گزرتا ہوا کوفہ کی طرف روانہ ہوا، ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ یکایک جس نیزے پر امام مظلوم کا سر تھا چلنے سے رک گیا ہر چند لوگوں نے زور لگایا مگر سر انور نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ شمر بیمار کربلا کے پاس آیا اور کہنے لگا اے علی بن الحسینؑ کیا وجہ ہے کہ تمہارے باپ کا سر آگے نہیں بڑھتا۔ حضرت نے فرمایا او شقی اس کی وجہ یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن سکینہؑ اونٹ سے گر گئی ہے جب تک وہ ہم سے نہ مل جائے گی بابا جان کا سر ہرگز آگے نہ بڑھے گا۔

یہ سنکر شمر غصہ میں بھرا ہوا مقتلِ شہدا کی طرف پلٹا اور بچی کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ آہ وہ دیکھا اس وقت لاشِ حسینؑ سے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی تھی۔ بابا آپ چین سے یہاں پڑے سو رہے ہیں اور دشمن ہمیں قید کر کے لئے جا رہے ہیں اے بابا ظالموں نے ہمارے خیموں میں آگ لگا دی مگر آپ نے خبر نہ لی۔ ہم کو ایسا لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی آپ نے پھر بھی ہماری خبر نہ لی۔ آہ ظالموں نے کان چیر کر میرے بندے اتار لئے۔ دیکھئے میرا کرتا خون سے بھرا ہوا ہے۔ آہ بابا آپ کے سینہ پر سونے والی سکینہؑ تمام رات خاک پر پڑی رہی اور آپ نے اس کی بات نہ پوچھی۔ بابا جان مجھے بتائیے کہ آپ اپنی پیاری سکینہ سے کیوں ناراض ہو گئے۔ آہ! آہ! امومنین ابھی وہ بیکس بچی اپنے باپ سے پوری داستانِ غم بھی نہ کہہ پائی تھی کہ شمر شقی وہاں آ پہنچا۔ غصہ میں بھرا ہوا تو تھا ہی پہلے زور سے بچی کے پھول سے رخساروں پر ایسے طمانچے مارے کہ وہ بلبلا گئی۔ پھر ننھے سے بازو کو زور سے پکڑ کر لاشِ حسینؑ سے جدا کیا اور کشاں کشاں قافلہ کی طرف لے چلا۔ سکینہؑ آہ نادان سکینہؑ مڑ مڑ کر باپ کی لاش کی طرف دیکھتی جاتی تھیں اور بلبلا کر فریاد کر رہی تھیں بابا مجھے اس ظالم سے بچا لیجئے۔ افسوس اس یتیم بچی کے حالِ زار پر اس سنگدل کو ذرا رحم نہ آیا اور اسی طرح کھینچتا ہوا قافلہ تک لے گیا اور اونٹ پر بٹھا کر وہاں سے کوچ کیا۔

لکھا ہے کہ جب فوجِ یزید کربلا سے روانہ ہو گئی تو قبیلہ بنی اسد کے کچھ لوگ وہاں پہنچے دیکھا کہ لاشہائے شہدا یوں ہی بے غسل و کفن خاک پر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر ان کے دل سینوں میں ہل گئے اور اپنے قبیلہ سے جا کر اس کا ذکر کیا۔ جب عورتوں نے یہ بات سنی تو بے چین ہو گئیں اور اپنے مردوں سے بعد در کہنے لگیں کیا غضب کی بات ہے اولادِ رسولؐ کے لاشے یوں بے گور و کفن پڑے رہیں اور ہم اپنے گھروں میں چین سے بیٹھے رہیں۔ ان کے مردوں نے کہا ہم یہ کام کیونکر انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ابنِ زیاد بدنہاد کو اس کا پتہ چل گیا تو ہم سب کو قتل کرا دے گا۔ اور ہمارے املاک ضبط کر کے گھر بار لوٹ لے گا جب ان دیندار عورتوں نے یہ دیکھا کہ مردوں پر بزدلی غالب ہے تو انہوں نے کہا۔ اگر تم پر ابنِ زیاد کا خوف غالب ہے تو یہ ہماری چادریں تم اوڑھو اور اپنی تلوار ہم کو دو۔ ہم خود جا کر نواسۂ رسولؐ کی لاش کو دفن کریں گے۔ خاک ہے اس مسلمانی پر کہ نبی زادہ بے گور و کفن پڑا رہے۔ جب ان لوگوں نے اپنی عورتوں میں یہ غیر معمولی جوش دیکھا تو ان کو شرم آئی اور اپنی کمریں کس کر لاشہائے شہدا کے دفن کے لئے وہاں سے روانہ ہوئے اور کربلا میں پہنچ کر ہر ایک شہید کی لاش کو سپردِ خاک کیا۔ الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۵

چوبیسویں مجلس

تفسیر آیۂ قل کفی باللّٰہ شہیداً و احوال ورود اہلِ حرم در کوفہ اور روایت اُمِّ حبیبہ

قَالَ اللّٰہُ تبارک و تعالیٰ قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَهِیْدًا بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ (اے رسولؐ کہدو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کو اللہ کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم کتاب ہے)

رسولؐ کی رسالت پر دو گواہ ایک اللہ اور ایک مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰب۔ گواہوں کے درمیان ہمیشہ ایک تناسب ہوا کرتا ہے پس اللہ کے ساتھ گواہی دینے والا کوئی معمولی شخص نہ ہونا چاہیئے بلکہ ایسا تو ہو کہ اگر خدا نہ ہو تو خدائی کا اس پر گمان تو ہوتا ہو۔ اللہ نہ ہو مگر نفس اللہ تو ہو۔ لسان اللہ تو ہو۔ جنب اللہ تو ہو۔ ید اللہ تو ہو۔ خدا نے اپنی رسالت کا گواہ اپنے ساتھ ایسے شخص کو بنایا ہے کہ اگر بزم قدس میں بیٹھے تو وجہ اللہ نظر آئے۔ بزم ملک میں ہو تو استاد جبرئیل کہلائے۔ محفلِ رسول میں بیٹھے تو مجسم ایمان لقب پائے۔ اگر وحدانیت کی گواہی کی ضرورت ہو تو اسے اولو العلم کے خطاب سے بلایا جائے۔ شَهِدَ اللّٰہُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِکَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور ملائکہ اور علم والے اس کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ عادل ہے) اور جب رسالت کی گواہی کی ضرورت ہوئی تو اس کو مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰب کہہ کر بلایا گیا۔ اگر رسولؐ کو مدد کی ضرورت ہو تو اس کو صالح المومنین کہہ کر بتایا جائے اور جب مباہلہ کا موقع ہو تو وہی نفسِ رسول بلایا جائے۔ جب مومنین کے ولی شمار کرائے جائیں تو اس کو وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ رٰکِعُوْنَ کی صفات سے بیان کیا جائے۔ جب مُطاعِ خلق بیان ہوں تو اس کو اُولی الامر کا لقب دیا جائے۔

اب بیان یہ کرنا ہے کہ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰب سے کون مراد ہے۔ آیۂ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا تعلق قلب سے ہوتا ہے نہ کہ زبان سے۔ مفہوم شئے ایک پوشیدہ چیز ہے جس کے اظہار کے لئے الفاظ کی علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔ جو لوگ الفاظ کو مفہوم اور حقیقی علم سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بھلا علم سینہ سے سینہ میں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ آنکھوں سے آنکھوں میں علم کیسے پہنچ جاتا ہے۔ حواس خمسہ سے جو علم ہم کو حاصل ہوتا ہے وہ براہِ راست قلب سے تعلق رکھتا ہے جب اظہار کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم الفاظ کی علامتوں سے اس علم کو دوسروں پر ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ایک لذیذ شئے کو چکھا تو اس کی صفت ان الفاظ میں بیان کی کہ وہ میٹھا ہے یا کھٹا لیکن شیرینی یا ترشی کا جو اصلی لطف ہمارے قلب کو حاصل ہوا تھا وہ ان الفاظ میں پوری طرح ادا نہیں ہو سکا۔ صرف یہ سرسری اظہار اس لطف کا کیا گیا ہے۔ حقیقی ذائقہ سے وہی شخص باخبر ہو سکتا ہے جس نے اس شئے کو کھایا ہو۔ آنکھوں سے بہت سے مناظر دیکھ کر جو لطف ہم حاصل کرتے ہیں وہ الفاظ میں پوری طرح بیان نہیں ہوتے۔ الفاظ ایک مجمل نشان ہوتے ہیں اُس تفصیل کا جو ہم کو کسی چیز کے دیکھنے۔ سننے۔ سونگھنے۔ چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اجمال تفصیل کی صورت اسی وقت اختیار کر سکتا ہے۔ جب ہمارے الفاظ سننے والے نے بھی وہ منظر دیکھا ہو پس

الفاظ قرآن ان ہی سینوں میں جا کر پھیل سکتے ہیں جو معانی و مفاہیم قرآن کے پہلے سے عالم ہوں۔

الفاظ بدل سکتے ہیں، کم و بیش ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم نہیں بدل سکتا۔ میں ایک بات کو سو زبانوں میں ادا کر سکتا ہوں۔ الفاظ ضرور بدل جائیں گے۔ مگر مفہوم وہی ایک رہے گا۔ پس معلوم ہوا کہ الفاظ میں تغیر و تبدل ممکن ہے لیکن مفہوم سے جس کا تعلق قلب سے ہے اس میں تغیر ممکن نہیں الفاظ میں سہو و نسیان ہو سکتا ہے۔ لیکن مفہوم میں اس کی گنجائش نہیں۔ الفاظ میں شک و شبہ ہو سکتا ہے لیکن مفہوم میں یہ صورت نہیں ہو سکتی پس معلوم ہوا اصل شے علم یا مفہوم ہے۔ جب تک یہ باقی ہے حقیقت باقی ہے۔ الفاظ میں تاویل کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ مگر مفہوم میں یہ دروازہ بند ہے کیونکہ مفہوم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور الفاظ کے معنی سینکڑوں۔ الفاظ جتنی زبانوں میں منتقل ہوتے رہیں گے اتنا ہی ان میں تغیر ہونے کا اندیشہ بڑھتا جائے گا اور معنی کے پہلو بدلتے رہیں گے اور ہر شخص اپنی فہم و دانش کے مطابق ان کا مطلب جدا جدا بیان کرتا رہے گا۔ لیکن قائل کا مفہوم ان کا ساتھ نہ دے گا۔ قائل کا اصلی مفہوم وہی سمجھ سکتا ہے جس کو قائل نے خود بتایا ہو۔ یا سننے والے نے اس سے پوچھا ہو۔

جو چیز دل پر نقش ہوتی ہے وہ نہ مٹتی ہے نہ بدلتی ہے۔ لیکن جو زبان تک محدود رہتی ہے وہ بہت جلد کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ جھوٹی بات غلط ہونے کی وجہ سے دل پر نقش نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹا آدمی خود ہی اپنے کلام کی تردید کر دیتا ہے۔ لیکن سچا آدمی ہزار بار ایک بات کو کہتا ہے۔ اور ان ہی الفاظ میں کہتا ہے کیونکہ وہ بات اس کے دل پر نقش ہو چکی ہوتی ہے۔

پس علم قرآن جن کے سینوں میں ہے وہ الفاظ قرآن کا ہمیشہ وہی صحیح مفہوم مراد لیتے ہیں جو ان کے دل پر نقش ہے۔ ان کی زبان اور بیان مفہوم اور منطوق ایک ہوتے ہیں البتہ جو اصلی مفہوم سے بے خبر ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ الفاظ کتاب کا تعلق ہر خاص و عام سے ممکن ہے۔ لیکن مفہوم یا معنی کا تعلق مخصوص لوگوں ہی سے ہے۔ چونکہ عام لوگ مفہوم کتاب کے امانتدار بننے کی اہلیت نہیں رکھتے لہذا ان کو صرف الفاظ کا امانتدار بنایا جاتا ہے۔

ایک دسترخوان پر بے شمار لذیذ کھانے چنے ہوئے ہیں اور مختلف مزاجوں کے لوگ بیٹھے کھا رہے ہیں۔ اگرچہ ظاہری لذت سب کو حاصل ہو رہی ہے لیکن باطنی اثر سے فیضیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ بیماروں کو تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے غرضکہ ہر شخص اپنی صحت اور مزاج کے لحاظ سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ یہی حال قرآن کی تعلیم کا ہے۔ جیسی کسی کی عقل ہے۔ جیسا کسی کا ایمان ہے ویسی ہی اس کی ہدایت ہے۔

حکیم بیماروں کو نسخہ لکھ کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بیمار نسخہ ہی کو دوا سمجھ کر چاٹنے لگے اور کہہ دے کہ بس یہی مجھے کافی ہے تو وہ کس قدر احمق سمجھا جائے گا۔ یا ایک بیمار دوائیں تو استعمال کرے لیکن مجوزہ ترکیب سے نہ کرے تو بھی فائدہ نہ ہو گا۔ یا مجوزہ ترکیب سے بھی کرے لیکن پرہیز نہ کرے تو بھی فائدہ نہ ہو گا۔

اگر کوئی شخص کتاب میں نسخہ لکھا ہوا دیکھ کر استعمال کرنے لگے تو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے۔ صرف نسخہ مفید نہیں بلکہ حکیم سے پہلے تشخیص مرض کرانا ضروری ہے۔ پھر ان ادویات کی تاثیر معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر بلحاظ اوزان ان کو اپنے مزاج کے موافق بنوانا ضروری ہے۔ کتاب میں نسخہ بالکل صحیح لکھا ہے لیکن چونکہ مریض اس کا استعمال غلط کرتا ہے لہذا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ پس اس صورت میں قصور بعض

کا ہے نہ طبیب یا نسخہ کا۔ یہی حال قرآن کا ہے۔ اسی سے لوگ ہدایت پاتے ہیں، اور اسی سے ضلالت میں پڑ جاتے ہیں۔ پس اسی کتاب کے محض الفاظ کافی نہیں۔ تا وقتیکہ مفہوم کتاب تک رسائی نہ ہو۔

ادویات کے اثرات و کیفیات کا علم مریضوں کی حالت کے لحاظ سے طبیب کے سینہ میں ہوتا ہے۔ اگر اثر صحیح کا علم ہے تو دوا کبھی نقصان نہیں دے سکتی۔ ایک دوا کے متعلق یہ تو علم ہے کہ وہ مقوی قلب ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ وہ جگر میں حرارت بھی بڑھاتی ہے۔ پس اگر ایک ایسا شخص اسے استعمال کرے جس کے قلب میں حرارت موجود ہے تو یقیناً نقصان ہو جائے گا۔ طبیب اس کا لحاظ کر کے دوا دے گا۔

جن کے سینوں میں کتاب اللہ کا اصلی مفہوم ہے وہی الفاظ کی صحیح تاویل جانتے ہیں۔ قرآن ان کے سینوں کو روشن کئے ہوئے ہے اور ان کے سینوں میں اسی طرح پھیلتا ہے۔ جیسے زرخیز زمین میں ایک درخت لہلہاتا اور پھول پھل لاتا ہے۔ شورہ زاروں میں یہ توقع عبث ہے۔ وہاں تو بیج بھی مارا جاتا ہے۔ جن کے سینوں میں مفہوم کتاب ہے انہیں اس بات پر قدرت ہے کہ تمام قرآن کا مفہوم ایک سورۂ فاتحہ میں کھینچ کر لے آئیں اور تمام سورۂ فاتحہ کا ایک بسم اللہ میں اور تمام بسم اللہ کا ایک بائے بسم اللہ میں اور اس کا ایک نقطہ میں۔ یہی طرح ایک نقطہ کو پھیلائیں تو اس پورے قرآن کا مفہوم بیان کر دیں۔ صرف الفاظ جاننے والوں میں یہ قدرت کہاں۔

قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ وہ بڑھے تو پوری کتاب بن جائے اور سمٹے تو ایک نقطہ میں آ جائے۔ لیکن یہ بات عام لوگوں سے متعلق نہیں بلکہ صرف وہی لوگ ایسا کر کے دکھا سکتے ہیں جن کے سینوں میں علم کتاب ہے۔

ایک نقطہ میں پوری کتاب کس طرح سما گئی۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک چھوٹے سے دانے کے اندر برگد کا کتنا بڑا درخت چھپا ہوتا ہے لیکن ہماری طاقت سے باہر ہے کہ اس کو کسی آلہ سے باہر کھینچ کر نکال لیں۔ البتہ قوت نامیہ جب چاہے اس کو شگافتہ کر کے اس میں سے برگد کا درخت پیدا کر دے اور پھر اس درخت کی تمام ہئیت کو اکٹھا کر کے ایک دانہ میں جمع کر دے۔

جب انسان میں یہ قدرت ہے کہ ایک الف سے تمام حروف تہجی پیدا کرے تو کیا جن کو علم الکتاب دیا ہے وہ ایک نقطہ کو پھیلا کر پوری کتاب کا علم بیان نہیں کر سکتے؟ دیکھو کس طرح ایک حرف سے اٹھائیس حرف پیدا ہوئے ہیں۔ الف کے عدد میں ایک سو گیارہ (۱۱۱) یعنی ایک اکائی۔ ایک دہائی۔ ایک سیکڑہ۔ اکائی سے الف بنا دہائی سے ی اور سیکڑے سے ق۔ اب اسی عدد کو دوگنا۔ تگنا اور چوگنا وغیرہ کرتے چلے جاؤ۔ صورت اس کی یہ ہوگی۔

۱۱۱	۲۲۲	۳۳۳	۴۴۴	۵۵۵	۶۶۶	۷۷۷	۸۸۸	۹۹۹
ا-ی-ق	ب-ک-ر	ج-ل-ش	د-م-ت	ہ-ن-ث	و-س-خ	ز-ع-ذ	ح-ف-ض	ط-ص-ظ

ایک غ باقی رہا اس کے ایک ہزار عدد ہوتے ہیں۔ چونکہ الف اور الف بمعنی ایک ہزار میں تجنیس خطی ہے لہذا یہ بھی داخل۔

قرآن کی صفت یہ ہے تبیاناً لکل شیٔ یعنی اس میں ہر شے کا بیان ہے۔ پس جس کے پاس کتاب کا علم ہو اس کی شان بھی یہ ہونی چاہیئے کہ جو بات بھی اس سے دریافت کی جائے وہ فوراً اس کا صحیح جواب دے اور یہ شان سوائے رسولؐ اور اولادِ رسولؐ کے دوسروں میں نہیں پائی جاتی علمک ما لم تکن تعلم و کل شیٔ احصیناہ فی امام مبین سے ظاہر ہے کہ رسولؐ اور وصیٔ رسولؐ ہر شے کا علم رکھتے تھے

قرآن رسولؐ کو لفظ بہ لفظ پڑھایا نہیں گیا بلکہ خدا نے اس کو رسولؐ کے دل پر اتارا ہے نزّلہٗ علیٰ قلبک سے واضح ہے۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر ہے عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (ان کو شدید القویٰ (جبرئیل) نے تعلیم دی) ان دونوں آیتوں میں تطابق کیونکر ہو۔ جواب اس کا یہ ہے کہ قرآن تو خدا نے قلبِ رسولؐ پر پہلے نقش کر دیا تھا، پھر جبرئیل نے آ کر یہ بتایا کہ فلاں آیت فلاں کی شان میں ہے اور فلاں آیت اس وقت سناؤ اور فلاں اُس وقت۔ پس جبرئیل حقیقتِ قرآن کے سکھلانے والے نہیں بلکہ محلِ آیات کے بتانے والے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو جب نماز کی تعلیم دینی چاہتے ہیں تو پہلے سورے اور اذکارِ تشہد و قعود و سجود یاد کرا دیتے ہیں۔ پھر جب نماز کے لئے کھڑا کرتے ہیں تو بتاتے جاتے ہیں کہ اب یہ پڑھو اور اب یہ پڑھو۔ پس اب تین صورتیں ہوئیں ایک عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبلِ خلقت اس انسانِ کامل کو علم دیا گیا دوسرے نزّلہٗ علیٰ قلبک۔ یعنی پیدائش کے بعد دل پر اتارا گیا۔ تیسرے عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی مطلب ان تینوں آیتوں کا مجموعہ یہ ہوا کہ قبلِ پیدائش عالمِ نور میں حقیقتِ قرآن کی تعلیم ہوئی۔ بعدِ پیدائش قلب پر اس حقیقتِ قرآن کی کتابت کی گئی اور بعدِ بعثت اُس حقیقت و کتابت کو الفاظی صورت میں لانے کے لئے محل و موقع بتایا گیا۔ پس علمِ قرآن کا تعلق تین چیزوں سے ہے۔ ایک حقیقت۔ دوسرے کتابت۔ تیسرے الفاظ۔ حقیقت کا علم خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ کتابت کا علم اُسی کو حاصل ہوتا ہے جو پہلے سے رسم الخط کو جانتا ہو۔ الفاظ سے عام لوگوں کو سننکر فائدہ حاصل ہوتا ہے پس مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَابِ ایسا شخص ہونا چاہیئے جو حقیقتِ قرآن کی تعلیم بھی پا چکا ہو۔ کتابت سے بھی واقف ہو اور تعلیم کے محل سے بھی آگاہ ہو۔

حضرت علی علیہ السلام میں یہ سب جہتیں موجود تھیں بمصداق انا و علی من نورٍ واحد اس نورِ رسالت کے شریک تھے جب قبلِ خلقت حقیقتِ قرآن کی تعلیم ہو رہی تھی۔ پھر جب قلبِ رسولؐ پر کتابت ہوئی تو اسی کتاب کا صحیح عکس رسولؐ نے علیؑ کے سینہ پر اتار دیا بَلْ هُوَ آیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ یہاں اوتوا العلم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ بینات سینوں میں بعد کو آئی ہیں پہلے ان کو علم دیا ہے پھر جب جبرئیل نے محل کی تعلیم دی تو اُسی طرح علیؑ کو تعلیم دے دی عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ زَقًّا زَقًّا۔

رسولؐ اللہ میں اور علیؑ میں یہ فرق ہے کہ رسولؐ نے خدا سے براہِ راست دو تعلیمیں حاصل کیں۔ ایک بصورتِ حقیقت دوسری بصورتِ کتابت اور ایک تعلیم جبرئیل سے حاصل کی یعنی محلِ بیانِ آیات اور علیؑ نے ایک تعلیم خدا سے حاصل کی دو تعلیمیں رسولؐ سے یعنی حقیقتِ قرآن کی تعلیم عالمِ نور میں خدا سے پائی۔ اور کتابتِ حقیقت اور محلِ نزول کی رسولؐ سے۔ اسی لئے حضرت کا مرتبہ رسولؐ کے مقابل شاگرد کا ہوا۔ لیکن جبرئیل کے مقابل استاد کا کیونکہ حقیقتِ قرآن کا علم اور کتابِ حقیقت کا علم علیؑ کو جبرئیل سے زیادہ حاصل تھا۔

ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جبرئیل رسولؐ کے تو اُستاد تھے اور علیؑ کے شاگرد اس صورت میں علیؑ کا مرتبہ رسولؐ سے بڑھ گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت علیؑ استادِ جبرئیل تھے اس وقت رسولؐ بھی استادِ جبرئیل تھے یعنی عالمِ نور میں۔ اس وقت نورِ رسالت بزبانِ ولایت معلمِ جبرئیل بن رہا تھا اور جبرئیل نے جو تعلیم رسولؐ کو دی وہ عالمِ مادی میں تھی۔ نورِ رسالت ہی نے درحقیقت اس قابل بنایا کہ وہ تعلیم ربانی لانے کے قابل بنے اگر تعلیمِ رسولؐ وہاں جبرئیل کو نہ ہوتی تو جبرئیل یہاں تعلیم دینے کے قابل نہ ہوتے۔ نورِ رسولؐ کے دو حصے تھے۔ دو کام ان سے متعلق ہوئے نورِ رسالت وجہِ خلقتِ جبرئیل بنا اور نورِ امامت وجہِ تعلیمِ جبرئیل۔

مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَابِ کا مصداق اللہ کے ساتھ گواہ بنا ہے۔ اللہ کا علم عین ذات ہے تو جو اس کے ساتھ گواہ ہو اس کا علم اگر عین ذات نہ ہو تو داخلِ ذات تو ہو۔ یعنی حدوث نہ ہو لیکن جب سے ذات حادث ہو جب ہی سے علم بھی حادث ہو۔ ورنہ وہ ذات کی گواہی کیونکر دے سکتا ہے جس کو علمِ نبوت خلقتِ آدمؑ سے ہزار سال قبل مل چکا ہو۔

قرآن کے تین نام ہیں۔ اول نور دوسرے کتاب۔ تیسرے ذکر یا قرآن۔ یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ وہ بحالت نور تھا۔ دوسرا ایسا وقت تھا کہ وہ قلمِ قدرت سے مکتوب بنا۔ تیسرا ایسا وقت آیا کہ وہ زبانِ رسولؐ سے ذکر یا قرآن بنا۔ پس حقیقت کا تعلق نور سے ہے۔ کتابت کا قلب سے ذکر کا زبان سے۔ جب تک بصورتِ حقیقت عالمِ نور میں رہا تمام انبیاء و اوصیاء و ملائکہ کی تعلیم ہوئی۔ جب تک بصورتِ کتابت رہا علیؑ کو تعلیم دیتا رہا۔ جب بصورتِ ذکر آیا تعلیم عام ہو گئی پس مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَابِ وہی ذات ہو سکتی ہے جس کا تعلق کتاب کی ہر حالت میں رہا ہو۔ رسول اللہؐ نے کتاب کے ساتھ اہلبیت کو کیا ہے قرآن کے ساتھ نہیں فرمایا یعنی مفہوم کے ساتھ کیا ہے نہ کہ الفاظ کے ساتھ۔ کیونکہ الفاظ کی صورت بدل سکتی ہے۔ مفہوم کی صورت نہیں بدل سکتی۔ الفاظ کا تعلق عام لوگوں کی زبان سے ہے اور مفہوم کا تعلق خاص لوگوں کے سینوں سے

کتاب اللہ کا حقیقی علم انہی لوگوں کے سینوں میں ہے جن کا تعارف رسولؐ نے اہلبیت کے نام سے کرایا۔ ان کو قرآن کے ساتھ کر کے مسلمانوں کی ہدایت کا قیامت تک کے لئے پورا پورا بندوبست کر دیا تھا لیکن افسوس مسلمانوں نے رسولؐ کی تعلیم پر عمل نہ کیا اور جس عترت کی عزت اور اتباع کا حکم دیا گیا تھا اس کے ستانے اور ذلیل و حقیر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ غضب خدا کا کہاں بازار کوفہ و شام اور کہاں رسولؐ کی اولاد۔ ترک و دیلم کے قیدیوں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو ان ایمان فروش اور عاقبت برباد مسلمانوں نے آلِ رسولؐ کے ساتھ روا رکھا۔ آہ آہ جس کوفہ میں اب سے چند سال قبل یہی زینبؑ و کلثومؑ شہزادیاں کہلاتی تھیں۔ آج اسی کوفہ میں وہ انتہائی ذلت کے ساتھ تشہیر کی جا رہی ہیں۔

صاحب سیرۃ الائمہ لکھتے ہیں کہ ایک بار رؤسا و اعیانِ کوفہ نے امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہماری عورتوں کی یہ دلی خواہش ہے کہ اپنی شہزادیوں کی قدمبوسی حاصل کریں کیا ان کی یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا میں اندر جا کر زینبؑ و کلثومؑ سے ذکر کرتا ہوں چنانچہ آپ بیت الشرف میں تشریف لائے اور اہلِ کوفہ کا پیغام پہنچایا۔ دونوں شہزادیوں نے عرض کی وہ رؤسا شہر کی بی بیاں ہیں اور ہمارے لباس بوسیدہ ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو بلاتے شرم آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر میں کوئی سامانِ آسائش و آرائش بھی نہیں حضرت نے فرمایا اس کی پروا نہ کرو ہم کو ان چیزوں سے تعلق نہیں۔ الغرض آپ نے اعیانِ کوفہ کی اس درخواست کو منظور فرما لیا۔ وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس گئے اور اپنی عورتوں سے کہا۔ امیر المومنینؑ نے ہماری درخواست کو منظور فرما لیا ہے لیکن تم کو چاہیے کہ بہت سیدھے سادے لباس میں بغیر زیور کے وہاں جاؤ تاکہ ہماری شہزادیاں محجوب نہ ہوں۔ چنانچہ وہ عورتیں اسی شان سے آئیں پہلے جناب زینبؑ و ام کلثومؑ کے قدم چومے پھر اس بوریے پر بیٹھنے کی اجازت چاہی جس پر شہزادیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جناب زینبؑ نے اپنی چادر بچھا کر کہا آپ لوگ اس پر بیٹھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں اے دخترِ علیؑ ہماری کیا تاب کہ اس مقدس چادر پر اپنے قدم رکھ سکیں۔ کیوں مومنین جن زینبؑ و ام کلثومؑ کا یہ اعزاز تھا آہ آج وہ بندیانِ ترک و دیلم کی طرح برہنہ سر در بدر پھرائی جا رہی ہیں اور ایک منادی آگے آگے ندا کرتا جاتا ہے اے اہلِ کوفہ یہ دختران علیؑ و فاطمہؑ سر برہنہ اونٹوں پر سوار ہیں۔ ان کا تماشہ دیکھو سہ

شامیاں بستند بازو زینبؑ و کلثومؑ را
اے فلک آں ابتدا ایں انتہائے اہلِ بیت

منقول ہے کہ جب یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ میں داخل ہوا تو تماشائیوں کا ہر طرف ہجوم تھا۔ ہر سمت کوٹھوں پر عورتیں نئے نئے لباس پہنے زیورات سے آراستہ تماشا دیکھنے کے لئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ آہ اس مجمع عام میں نبی زادیاں برہنہ پشت اونٹوں پر سوار بے مقنعہ و چادر اس طرح جا رہی تھیں کہ ان کے ہاتھ پسِ گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ سوائے بالوں کے اور کوئی سامان منہ چھپانے کا نہ تھا۔ آہ خدا دشمن پر یہ وقت نہ ڈالے جو ان غریب الوطن اور بے والی و وارث ستم رسیدہ سیدانیوں پر آ پڑا تھا۔

لکھا ہے جب یہ قافلہ بازار کوفہ میں پہنچا تو وہاں تماشائیوں کا زیادہ ہجوم تھا کچھ لوگ اہل حرم کی تباہ حالی پر رو بھی رہے تھے۔ جناب زینب کو تابِ ضبط نہ رہی ان سے خطاب کر کے فرمانے لگیں۔ اے اہل کوفہ۔ اے مکر و غدر کے پتلو! تم کتنے بے حیا اور بے غیرت ہو کہ جس رسول کا کلمہ پڑھتے ہو اسی کے نواسے کو قتل کرتے ہو۔ اور پھر اس کے ناموس کو مقید کر کے انتہائی ذلت کے ساتھ کوچہ و بازار میں تشہیر کرتے ہو اور سب ظلم و ستم کرنے کے بعد ہماری مصیبت پر آنسو بہاتے ہو۔ اے ایمان فروشو اے مکارو! تم کو کیا خبر کہ تم نے کس کا جگر چاک کر دیا۔ کس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ کس کا پھولا پھلا باغ ویران کر دیا۔ یہ کس کی ناموس ہے جس کو تم اس طرح تشہیر کر رہے ہو۔ اے غدارو یہ تمہارے نبی کی آل ہے۔ جس پر تم نے یہ ظلم و ستم ڈھائے ہیں۔ اے ظالمو! عنقریب خدا کا عذاب تم پر مسلط ہونے والا ہے۔ جناب زینبؑ کی اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنا سر جھکا کر زار زار رونے لگے۔ بشر نے یہ حال دیکھ کر حکم دیا کہ اونٹوں کو بڑھاؤ۔

لکھا ہے کہ جب اسیرانِ اہل حرم کوفہ کے کوچہ و بازار سے گزر رہے تھے تو سرہائے شہدا آگے آگے نیزوں پر جا رہے تھے اور اہل حرم کے اونٹ ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ اتفاقاً ایک موقع پر خولی اس نیزہ کو جس پر امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک نصب تھا قریب ناقہ جناب زینبؑ کے لے آیا۔ آہ! آہ! جونہی جناب زینب کی نگاہ حضرت کے سر پر پڑی بے چین ہو گئیں اور سر مبارک سے خطاب کر کے فرمانے لگیں۔

یَا ہِلَالاً لَمَّا اسْتَتَمَّ کَمَالاً — غَالَہٗ خَسْفُہٗ فَاَبْدَا غُرُوبَا
اخی یا اخی فاطمۃ الصغیرۃ — کلمہا فکاد قلبہا ان یذوبا

اے میری ماں کے چاند ابھی تو تو کمال کو بھی نہ پہنچا تھا کہ غروب ہو گیا۔ اے میرے مظلوم بھیا! ذرا فاطمہ صغرا سے تو کچھ بول لیجئے۔ قریب ہے کہ آپ کی جدائی میں اس کا کلیجہ پھٹ جائے۔ اس کے بعد آپ نے انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنا سر چوب محمل پر دے پٹکا جس سے پیشانی مبارک شق ہو گئی۔

مومنین اس وقت زنانِ اہل حرم کی مصیبت کا حال کیونکر بیان کیا جائے چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے پیاسے جب اپنی ماؤں سے کھانا پانی مانگتے تھے تو ان کے کلیجے اس غم میں شق ہوئے جاتے تھے۔ زنانِ کوفہ جب صدقے کے خرمے اور روٹیاں ان پر پھینکتی تھیں تو وہ جلدی سے منہ میں رکھ لیتے تھے۔ ان کی مائیں منہ سے نکال لیتی تھیں۔ اے زنانِ کوفہ خدا جلد تم کو بھی اسی مصیبت میں گرفتار کرے۔ ارے ہم عترتِ رسولؐ ہیں۔ صدقہ ہم پر حرام ہے اے بدبختو تمہارے مردوں نے ہمارے مردوں کو قتل کیا اور اب تم ہم پر صدقہ پھینک پھینک کر ہمارے دکھے دل کو اور زیادہ دکھا رہی ہو خدا جلد تم پر اپنا عذاب نازل کرے

منقول ہے کہ جناب زینب کا اونٹ ایک ایسے کوٹھے کے قریب پہنچا جس پر بہت سی تماشائی عورتیں جمع تھیں۔ ایک ضعیفہ نے جناب سکینہؑ کو بھوک اور پیاس سے نڈھال دیکھ کر جناب زینبؑ سے پوچھا بی بی تمہاری یہ بچی کچھ بیمار ہے؟ آپ نے فرمایا بیمار تو نہیں ہے لیکن باپ کی جدائی کے غم میں اور بھوک پیاس کے صدمے سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ وہ ضعیفہ اہل دل تھی رحم آ گیا۔ دوڑی ہوئی گئی اور کھانا لیکر آئی اور کہنے لگی بی بی یہ کھانا اور پانی حاضر

ہے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا ہم کو اس کی حاجت نہیں۔ یہ بچی ایسے خاندان کی نہیں کہ تنہا کھالے جب تک ہم سب اسیروں کو یہ ظالم کھانا نہ دیں گے ہم میں سے کوئی تنہا نہیں کھا سکتا۔ جب اس ضعیفہ کے اصرار پر بھی جناب زینبؑ نے وہ کھانا لینا منظور نہ کیا تو اس نے کہا۔ اچھا میری حاجت ہے آپ اس کو ضرور پورا کر دیجئے۔ پوچھا وہ کیا ہے۔ اس نے کہا سنتی ہوں کہ یتیم کی دُعا درگاہِ الٰہی میں بہت قبول ہوتی ہے۔ چاہتی ہوں کہ بچی میرے لئے دو دعائیں کر دے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا بیان کرو کیا حاجتیں ہیں اگر خلافِ شرع نہ ہوں گی تو میری بچی ضرور ان کے لئے دُعا کر دے گی۔ اُس نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا میرے بچوں کو اس طرح یتیم نہ کرے جس طرح یہ بچی یتیم ہوئی ہے۔ دوسری حاجت میری یہ ہے کہ خدا جلد مجھے مدینہ منورہ پہنچائے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا اے بی بی مدینہ منورہ میں تمہارا کیا کام ہے۔ اس نے کہا دُنیا میں بس وہی تو ایک جگہ ہے جہاں جانے کی اہلِ ایمان کو خواہش رہتی ہے۔ پوچھا مدینہ میں تم کس غرض سے جانا چاہتی ہو۔ اس نے عرض کی میں وہاں اپنی شہزادی جناب زینبؑ کی زیارت کروں گی۔ اپنے سیّد و مولا امام حسینؑ کے قدم چوموں گی۔ یہ سُننا تھا کہ جناب زینبؑ کے دل پر چھری چل گئی۔ چہرے پر سے بال ہٹا کر جو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ آپ کی آزاد کردہ کنیز اُمّ حبیبہ ہے آپ نے سر جھکا کر پوچھا اے کنیز خدا اگر تو زینبؑ کو دیکھے گی تو پہچان لے گی۔ اس نے کہا بھلا کیونکر اس بی بی کو نہ پہچانوں گی جس کی خدمت میں برسوں رہی ہوں۔ اب جناب زینبؑ کو تاب ضبط نہ رہی۔ چہرے سے بال ہٹا کر فرمایا۔ اے اُمّ حبیبہ تو نے کہاں پہچانا انا زینب میں ہی تو زینبؑ ہوں۔ میں ہی تو زینبؑ ہوں۔ جوں ہی اُمّ حبیبہ نے غور سے دیکھا پہچان گئی۔ سر و سینہ کوٹ کر بولی۔ ہائے دخترِ زہراؑ اور بلوائے عام ہائے میری شہزادی اور یوں کھلے سر اونٹ پر سوار۔ ارے لوگو یہ کیا انقلاب دُنیا میں آ گیا اے آسمان تو کیوں نہیں گر پڑتا۔ اے زمین تو کیوں نہیں شق ہو جاتی۔ ہے ہے نبیؐ کا کنبہ اور اس مصیبت میں گرفتار ہے ہے مجھے یہ خبر نہ تھی کہ یہ میری شہزادیاں قید کر کے لائی جا رہی ہیں پھر جناب زینبؑ سے مخاطب ہو کر بولی اے میری شہزادی میں تیری غربت اور بیکسی کے نثار مجھے یہ تو بتاؤ میرے سیّد و مولا امام حسینؑ کہاں ہیں۔ ابوالفضل العباسؑ قمر بنی ہاشم کہاں ہیں؟ شبیہ پیغمبر علی اکبرؑ کہاں ہیں کہ دشمنوں نے اس طرح اہلِ حرم کی تذلیل و توہین کا موقع پا لیا۔ جناب زینبؑ نے ایک آہِ سرد دلِ پُر درد سے کھینچی اور فرمایا اے ام حبیبہ کس کو پوچھتی ہے قتیل الحسین بکربلا ذبیح الحسین بکربلا اے ام حبیبہ کس کس کا نام لوں روزِ عاشور صبح سے لے کر شام تک بھرے گھر کی صفائی ہو گئی۔ ایک دن میں بہتر جنازے ہمارے گھر سے نکل گئے۔ آہ پنجتن پاک کا خاتمہ ہو گیا۔ زینبؑ بے والی و وارث ہو کر اعدائے دین کے ہاتھوں میں قید ہو گئی۔ اے اُمّ حبیبہ اگر تجھ سے ہو سکے تو چند چادریں ہم بیکسوں کو لا دے تاکہ ہم اپنے بدن چھپا لیں۔ آہ ہم پر نامحرموں کی نگاہیں پڑ رہی ہیں اور ہم شرم سے زمین میں گڑھے جاتے ہیں

جناب زینبؑ سے یہ سُن کر اُمّ حبیبہ روتی پیٹتی اپنے گھر پہنچی اور چند چادریں لا کر اسیر سیدانیوں کو دیں۔ آہ مومنین شمر نے جو دیکھا کہ اسیروں کو چادریں دی گئی ہیں تو اس نے نیزہ بردار سپاہیوں کو حکم دیا کہ نیزوں کی نوکوں سے ان سب چادروں کو اتار لو۔ آہ کیسے سنگدل اور بے رحم تھے وہ لوگ کہ غصہ میں آ کر نیزوں کی انیاں ان بیکسوں کے جسموں میں چبھونے لگے۔ یہاں تک کہ تکلیف سے بے چین ہو کر ان سب نے اپنی اپنی چادریں پھینک دیں۔

أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ۝

پچیسویں مجلس

تفسیر آیۂ واللہ انزل من السماء ماءً و روایت عبداللہ بن عفیفؓ و مسلمؓ و زید بن ارقمؓ

قَالَ اللہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اللہُ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِھَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (اللہ وہ ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا اور اسی کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں نشانی موجود ہے اور بے شک تمہارے لئے چوپاؤں میں عبرت موجود ہے۔ ہم ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون وغیرہ ہے اس سے الگ کر کے تازہ تازہ دودھ تم کو پلاتے ہیں۔ جو پینے والوں کو بہت ہی گوارا ہوتا ہے اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم نشہ کی چیزیں بھی بنا لیا کرتے ہو اور اچھی روزی بھی۔ بے شک سمجھنے والوں کے لئے اسی میں نشانی موجود ہے اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں گھر بنالے اور درختوں میں اور ان کے اونچے اونچے چھتوں میں جو لوگ بنا لیتے ہیں پھر ہر پھل میں سے رس کھا اور اپنے پروردگار کے راستوں میں عجز و انکسار کے ساتھ چلی جا۔ اس مکھی کے پیٹ سے ایک شربت رنگ برنگ کا نکلتا ہے۔ بے شک غور و فکر کرنے والوں کے لئے اسی میں ایک نشانی موجود ہے)

زمین قدرتِ خدا کا بہترین مظہر ہے۔ بظاہر اس میں آثارِ حیات نہیں پائے جاتے۔ لیکن غور کی نظر سے دیکھو تو ایک جاندار میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں اس میں بھی موجود ہیں۔ سورج بمنزلہ حرارت غریزی کے کام کر رہا ہے۔ ہوائیں اس کا سانس ہیں۔ سمندر اس کا قلب ہے جہاں سے ہر طرف پانی کھنچتا رہتا ہے۔ دریا بڑی بڑی رگیں ہیں اور نہریں چھوٹی چھوٹی نسیں ہیں۔ پہاڑ ہڈیاں ہیں تو نباتات بال قوتِ نامیہ بمنزلہ روح ہے۔ آتش فشاں پہاڑ بمنزلہ جگر اس کے طبقات بمنزلہ معدہ۔ چاند اور سورج دو آنکھیں ہیں۔ زلزلہ اس کی حرکت ہے غار اس کے بدن کے مسامات ہیں اس کو موت بھی ہے اور حیات بھی۔ امراض بھی ہیں اور شفا بھی۔ اس آیت میں خداوند عالم نے یہ خبر دی ہے کہ جب زمین مر جاتی ہے تو ہم اس کو آسمان سے پانی برسا کر زندہ کر دیتے ہیں۔ زندگی کی علامت یہ ہے کہ اس کے اندر قوتِ نامیہ جوش مارتی ہے اور جو لکھوکھا تخم اس کے اندر امانت رکھے ہوئے ہوتے ہیں، پانی برستے ہی وہ خود بخود پھوٹ نکلتے ہیں کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور کیسے آئے۔ ہوا اپنے دامنوں میں یہ موتی بھر بھر کر لاتی ہے اور زمین کے خزانوں میں امانت رکھتی جاتی ہے۔ کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی کہ کس زمین کے سینہ میں کیا چیزیں چھپی ہوئی ہیں لیکن جوں ہی پانی کا ایک جھالا آتا ہے۔ ان سب خزانوں پر سے پردہ ہٹ جاتا ہے سبزہ

لہلہانے لگتا ہے۔ پودے بڑھنے لگتے ہیں۔ شاخیں چٹکنے لگتی ہیں پھول کھلنے لگتے ہیں۔ پھل آنے لگتے ہیں۔ پانی کی رَو نے بات کہتے ایک طلسم خانہ کھول دیا۔

یہ قوتِ نامیہ کی تیزی ہے۔ ایک چھوٹے سے قطعہ زمین میں ہزاروں قسم کے بیج پھوٹ رہے ہیں کیا ممکن ہے کہ ذرا چوک جائے اور ایک کا پھل پھول دوسرے کو دے دے۔ ہر دانہ سے نکلا ہوا پودا ہے اور جس بیج سے جیسا پودا مخصوص ہے شروع سے آخر تک ویسا ہی چلا آرہا ہے۔ اسی کا پھول اسی کا پھل۔ وہی رنگ وہی روپ ذرا چوک نہیں۔ ذرا بھول نہیں۔ نہ ذائقہ میں فرق نہ قد میں اختلاف۔ ہر ایک دانہ کی تفصیلی کیفیت اس کو معلوم ہے۔ اور یہ ایک ایسا علم ہے کہ کبھی اس میں بھول کر بھی غلطی واقع نہیں ہوتی۔ کہیں تک کبھی نیم کے درخت میں انگور نہ پھلے انگور کی بیل میں نبولیاں نہ آئیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ قوتِ نامیہ کے پردے میں کوئی حکمتِ مطلقہ اپنی صنعت کو نہیں دکھا رہی۔ جو زمین ایک مدت سے مردہ پڑی تھی پانی نے اس کے اندر جاتے ہی وہ روح پھونک دی کہ اب کوئی طاقت اس کی بڑھتی قوت کو روک نہیں سکتی۔ بھرتے دامن کو خالی نہیں کر سکتی۔

ذرا دیکھنا نباتات میں جاکر اس پانی نے کیا کیا رنگ بدلے۔ کھجور میں شیرہ بن کر رہا۔ انگور سے رس بن کر ٹپکا۔ کسی احمق نے شراب بناکر حلال کو حرام بنایا۔ معزز کو مسکر قرار دیا۔ کسی نے فطری حالت میں کھاکر رزقِ حسن حاصل کیا۔

یہی پانی جب پھولوں اور پھلوں میں رس بن کر کھیل رہا تھا تو نحل یعنی شہد کی مکھی کو وحی ہو رہی تھی کہ اس کو جاکر چوس۔ ہم اپنی قدرت سے تیرے پیٹ میں اس کو شہد بنادیں گے اور تجھ کو یہ اعزاز بخشیں گے کہ تیرے منہ کی قے اور معدے کا لعاب انسان کی بہترین غذا قرار پائے گا۔ اس سے سینکڑوں قسم کی مٹھائیاں تیار ہوں گی۔ ہزاروں بیماریوں کو شفا ہوگی۔

اس وحی کے مضمون سے خبردار ہوتے ہی خدا کی چھوٹی سی مخلوق بے چین ہو کر خوشبودار اور میٹھے پھل پھول سونگھنے کو نکل پڑی کہیں سے موم اور کہیں سے رس لے کر اڑی تو پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں جابجا اپنی چھالیں لٹکادیں اور ان میں وہ عجیب و غریب گھر بنائے کہ ہندسی عقل ان کو دیکھ کر چکرا گیا۔ پیمانہ اور پرکار سے وہ زاویے اور قاعے نہیں بن سکتے جو اس نے اپنے ناچیز ہاتھ پیروں سے بناکر رکھ دیئے۔

اب ذرا اس کے انتظامات کو دیکھو۔ سینکڑوں مسدس اضلاع کے گھر بنائے پھر گھروں میں جانے کے ہر طرف سے راستے بنائے۔ کیا ممکن ہے کہ کسی گھر کے کسی گوشہ میں، پستی و بلندی میں بال برابر تو فرق آجائے۔ موم کا گھر تھا۔ مگر آندھیاں اٹھ اٹھ کر اور تیز ہوائیں چل چل کر رہ گئیں مگر وہ نہ ٹوٹا۔ سورج گرما گرما کر رہ گیا مگر وہ نہ پگھلا۔ مینہ برس برس کر رہ گیا مگر وہ نہ بہا۔ اس کی قدرت دیکھو موم جیسی نرم اور نازک چیز کو چٹانوں جیسا ثبات و قرار حاصل ہو گیا۔ شاخ میں وہ بندش دی کہ شہد کا سیروں وزن لٹکا مگر وہ نہ ٹوٹی ہزاروں مکھیاں اس میں رہیں مگر اس کو جنبش نہ ہوئی بغیر بادشاہ کے چونکہ اتنے بڑے تمدن کا انتظام ممکن نہ تھا لہٰذا خدا کی طرف سے ان پر ایک بادشاہ مقرر ہوا جس کو یعسوب کہتے ہیں یہ بلحاظ جسم اور بلحاظ فہم و فراست ان سب پر فوقیت رکھتا ہے چونکہ مکھیوں پر خدا کی طرف سے اس کی اطاعت کرنا فرض کی گئی ہے لہٰذا وہ سب اس کے حکم کو بے چون و چرا مانتی ہیں اور کبھی ایسا نہیں کرتیں کہ اس کے مرنے کے بعد اجماع کرکے اپنے میں سے کسی کو بادشاہ بنالیں بلکہ اسی کے خاندان میں سے ان ہی صفات کے رکھنے والے کو جانشین اور اپنا پیشوا مان لیتے ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے چھوٹے چھوٹے کیڑے

ملکوٹے تو اس بارہ میں اتنے محتاط اور حضرت انسان لمستنغ کج فہم کہ اپنی ہدایت کے لئے بجائے کسی منصوص من اللہ کو امام ماننے کے اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو انتخاب کر کے اپنا پیشوا بنا لیتے ہیں جس کو ان صفات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جو خدا کے معین کردہ امام میں ہوا کرتی ہیں

امیر المومنین علیہ السلام کا ایک لقب یعسوب الدین بھی ہے یعنی آپ کا مرتبہ جماعت مسلمین میں وہی ہے جو شہد کی مکھیوں میں یعسوب کا جس طرح یعسوب کی اطاعت شہد کی مکھیوں پر فرض ہے اسی طرح امیر المومنین علیہ السلام کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہے جس طرح یعسوب النحل کو اللہ نے جسمانی طاقت اور علم و فہم میں تمام مکھیوں پر فضیلت دی ہے اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کا مقابلہ بھی کوئی زور بازو اور علم و فہم میں نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے خدا اور رسولؐ نے آپ کو تمام مسلمانوں پر امیر بنایا تھا عہد رسالت کی کوئی مشہور جنگ ایسی نہ تھی جو علی کے زور بازو سے فتح نہ ہوئی ہو۔ علی علیہ السلام نے نہ کبھی کسی لڑائی میں فرار کیا اور نہ کسی سریہ میں آپ کسی سردار کے ماتحت بن کر نکلے برخلاف اور لوگوں کے کہ وہ کبھی امیر تھے تو کبھی مامور اس کی وجہ یہ تھی کہ سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے اور کسی کی شجاعت اور پر خلوص نصرت دین پر آپ کو کافی بھروسہ نہ تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام کے علم اور شجاعت کے متعلق چند باتیں اس مجلس میں بیان کرتی ہیں۔ علم کے متعلق تو بالاختصار اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن میں آپ کے علم کی تعریفیں یوں کی گئی ہے۔ (۱) من عندہٗ علم الکتاب (۲) کل شیءٍ احصینٰہ فی امامٍ مبین (۳) بل ھو اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (۴) وما یعلم تاویلہٗ الا اللہ والراسخون فی العلم۔ اور حضرت رسول خدا نے ارشاد فرمایا: انا مدینۃ العلم وعلی بابھا۔

اب رہی امیر المومنین علیہ السلام کی شجاعت اس کے بالتفصیل بیان کرنے کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ صرف چند واقعات بالاختصار بیان کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۱) شب ہجرت آپ نے وہ حیرت انگیز شجاعت دکھائی جس کی نظیر صفحات تاریخ میں ڈھونڈی نہیں ملتی۔ جتنی زیادہ خوفناک یہ رات تھی۔ اسی قدر آپ زیادہ اطمینان سے سوئے۔

(۲) جنگ بدر میں آپ نے وہ حیرت انگیز شجاعت دکھائی کہ دشمن کے ہوش اڑ گئے اس جنگ میں ستر کفار و مشرکین مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہوئے تھے ان میں اس تعداد میں سے نصف یعنی ۳۵ صرف علی علیہ السلام نے قتل کئے تھے

(۳) جنگ اُحد میں تو اسلام کو فتح ہی آپ کی بدولت ہوئی۔ اس جنگ میں آپ نے وہ غیر معمولی بہادری دکھائی کہ دشمن کی فتح یک بیک شکست سے بدل گئی اور اس کی مدح میں مابین زمین و آسمان یہ صدا بلند ہوئی۔ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔ یہ کوئی معمولی معرکہ نہ تھا مشرکین اپنی پوری طاقت سے کام لے رہے تھے اور مسلمانوں کو کچھ ایسی بدحواسی نے آگھیرا تھا کہ بڑے بڑے مدعیان شجاعت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ بعض تو ایسے خوفزدہ ہوئے کہ پہاڑ پر جا چڑھے۔ دشمنوں نے حضرت رسول خدا کو چاروں طرف سے گھیر کر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے دو دندان مبارک بھی شہید ہو گئے۔ اگر اس وقت نازک میں حضرت علی علیہ السلام مدد نہ کرتے اور خون کے پیاسے دشمنوں کو آنحضرتؐ کے پاس سے مار کر نہ ہٹاتے تو اس روز مشرکین شمع ہدایت کو ضرور گل کر دیتے۔

(۴) جنگِ خندق میں تو امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے زورِ بازو سے وہ بے نظیر خدمت اسلام کی کی کہ حضرت رسولِ خدا کو یہ فرمانا پڑا ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ (علیؑ کی وہ ضربت جو خندق میں عمرو بن عبدود کے سر پر پڑی تھی وہ دونوں جہان کی عبادت سے بہتر ہے) یہی وہ لڑائی تھی کہ جب حضرت علی علیہ السلام عرب کے مایۂ ناز پہلوان عمرو بن عبدود کے مقابلہ کو نکلے تو حضرت رسولِ خدا نے فرمایا بَرَزَ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ اِلَى الْكُفْرِ كُلِّهٖ (آج پورا پورا ایمان پورے پورے کفر کے مقابل جا رہا ہے) اللہ اکبر جس شخص کو زبانِ رسولؐ کل ایمان کہے اس کو مسلمان چوتھے درجہ پر لے آئیں اور ایسے لوگوں کو مقدم کر دیں جنہوں نے نصرتِ اسلام میں کبھی کافروں پر تلوار ہی نہ اٹھائی تھی اور جو میدانِ جنگ میں کبھی جم کر لڑے ہی نہ تھے۔

(۵) حنین کا معرکہ بھی علیؑ کے زورِ بازو سے سر ہوا باوجودیکہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن جب دشمن کی زد پر آئے تو اپنا میدان چھوڑ کر بھاگے کہ رسولؐ پکارتے رہ گئے مگر انہوں نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ اگر علی علیہ السلام نہ ہوتے تو مسلمانوں کو وہ شکستِ فاش ہوتی کہ مدت العمر منہ دکھانے کو جگہ نہ ہوتی۔

(۶) جنگِ خیبر کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ انیس روز متواتر اسلام کے تمام نامی گرامی سردار باری باری کفار کے مقابل زور آزما ہوئے۔ لیکن ہر ایک سردار کو سوائے بھاگنے کے بن ہی نہ پڑی۔ آخر کار جب حضرت رسولِ خدا دق ہو گئے تو آپ نے فرمایا کل میں اپنا نشان ایسے شخص کو دوں گا جو کرار غیر فرار ہو علاوہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ دوسرے روز جب حضرت نے اپنا علم نصرتِ شیم حضرت علی کو عطا فرمایا تو آپ نے پہلے ہی روز اس معرکہ کو سر کر لیا۔ حضرت کی عدیم المثال شجاعت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوگا۔ کہ رسولؐ نے کرار غیر فرار فرمایا۔

چونکہ حضرت علیہ السلام کی تلوار سے کافروں کے بہت سے خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے اس لئے ان بہت سے نام نہاد مسلمانوں کو جن کے بزرگ علیؑ کی تلوار سے مقتول ہوئے تھے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی طرف سے ناقابلِ بیان عداوت تھی۔ خاص کر بنی امیہ اور ان میں بھی خاص کر اولادِ ابو سفیان کو جو بدر و احد کے کفار مقتولوں کا انتقام لینے کو تلی بیٹھی تھی۔ یہ عداوت صرف حضرت علی علیہ السلام کی ذات ہی تک محدود نہ تھی بلکہ جب تک بنی امیہ کا اقتدار دنیا میں باقی رہا یہ بدبخت اولادِ علیؑ کے گلے اپنی تلواروں سے کاٹتے رہے۔ اسی منحوس خاندان کے دو بدنام ترین شقی یزید اور ابن زیاد تھے۔ ابنِ زیاد ولد الحرام کو اولادِ علیؑ سے اتنی سخت عداوت تھی کہ جب کوئی سید یا ان کا دوست مرتا تھا تو یہ ملعون الحمد للہ کہہ کر مسکرایا کرتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام کے قتل کی خبر اس شقی کو کوفہ میں پہنچی تو پہلے اس نے سجدۂ شکر کیا۔ پھر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو حکم دیا کہ دار الامارہ کو اس طرح سجائیں جس طرح عید کے موقع پر سجایا جاتا ہے اور اربابِ نشاط کو حکم دیا کہ رقص و سرود کے لئے آراستہ ہوں۔ ع

کیا قہر تھا کہ عید تھی قتلِ حسینؑ کی

دوسرے روز جب یہ خبر پہنچی کہ اہلِ حرم کو اسیر کر کے کوفہ میں لا رہے ہیں تو اس شقی نے تمام شہر کی آئینہ بندی کا حکم اور اعلان کیا کہ سب لوگ جامع مسجد میں جمع ہوں۔ مجھے کچھ ضروری باتیں بیان کرنا ہیں۔

لکھا ہے کہ عبد اللہ بن عفیف ازدی جناب امیر علیہ السلام کے ایک بڑے کامل الایمان صحابی تھے ان کی ایک آنکھ جنگِ جمل میں جاتی رہی

تھی اور دوسری جنگ صفین میں۔ جب سے نابینا ہوئے تھے شب و روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے عبادتِ خدا کیا کرتے تھے۔ جب کوفہ میں اسیرانِ اہلِ حرم کے ورود کی دھوم مچی اور ابن زیاد کا اعلان ہوا تو یہ بہت گھبرائے کہ یکایک ایسا کیا امر حادث ہوا کہ شہر بھی سج رہا ہے اور اعیانِ کوفہ کو بھی بلایا جا رہا ہے۔ باوجودیکہ نابینا تھے لیکن یہ بھی مسجد میں پہنچے۔ ابن زیاد نے خطبہ پڑھنے کے بعد کہا ایہا الناس تم کو مبارک ہو کہ ہم نے کربلا میں حسینؑ ابن علیؑ کی مہم کو بخیر و خوبی سر کر لیا ہے۔ اب ان کی عورتیں اسیر ہو کر کوفہ میں آ رہی ہیں تم سب کو چاہیئے کہ اس خوشی میں پوری طرح حصہ لو اور اپنے اپنے گھروں کو اسی طرح سجاؤ جس طرح عید کے موقع پر آراستہ کیا کرتے ہو۔

یہ سننا تھا کہ عبداللہ بن عفیفؓ بے چین ہو گئے اور غصہ سے تھر تھر کانپنے لگے۔ کھڑے ہو کر فرمایا۔ او شقی تجھ پر لعنتِ خدا ہو۔ تو نبیؐ کے نواسہ کو قتل کر کے پھر اس کی خوشی منا رہا ہے۔ او ملعون تیرا قتل واجب ہے یہ کہہ کر تلوار سونت لی اور اس شقی کے قتل کے ارادہ سے آگے بڑھے۔ اگر ابن زیاد کے غلام اور ارکانِ سلطنت بیچ میں حائل نہ ہو جاتے تو عبداللہؓ نے اس کا کام تمام ہی کر دیا تھا۔ ابنِ زیاد پر کچھ ایسا خوف غالب ہوا کہ فوراً منبر سے اتر کر بھاگ نکلا۔ اس کے غلام جناب عبداللہ پر حملہ آور ہوئے یہ دیکھ کر ان کے قبیلے کے لوگ دوڑ پڑے اور ان کو وہاں سے بچا کر نکال لے گئے

جب یہ گھر پہنچے تو اپنی لڑکی سے جس کا سن دس بارہ سال کا تھا اور جس کی ماں مر چکی تھی فرمانے لگے اے نورِ دیدہ اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ تیرا باپ ہمیشہ کے لئے تجھ سے جدا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نے تمام واقعہ بیان کیا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ جناب عبداللہ سمجھ گئے کہ میری گرفتاری کے لئے لشکرِ ابن زیاد آ پہنچا۔ پس آپ گھر سے نکل کر صحن میں آئے اور بیٹی سے فرمانے لگے اے جانِ پدر جب دشمن گھر میں گھس آئیں اور میں ان پر حملہ کروں تو تو بتاتی جانا کہ وہ میری داہنی طرف ہیں یا بائیں طرف چند منٹ نہ گزرے تھے کہ ابنِ زیاد کے سپاہی گھر میں گھس آئے۔ جناب عبداللہ تلوار کھینچ کر ان کی طرف لپکے۔ لڑکی بتاتی جاتی تھی کہ بابا داہنی طرف حملہ کیجئے۔ اب بائیں طرف کیجئے۔ چنانچہ یہ جمل و صفین کے معرکے جھیلا ہوا سپاہی شیر کی طرح ان پر ہر طرف حملہ کر رہا تھا یہاں تک کہ چند اشقیا کو مار کر زمین پر ڈال دیا۔ آخر بیچارے کہاں تک لڑتے اول تو ضعیفی پھر نابینا۔ ایک شقی نے موقع پا کر ایسی تلوار سر پر ماری کہ جناب عبداللہ بیہوش ہو کر فوراً زمین پر گر پڑے آہ ان ظالموں نے فوراً تلواروں کے تلے دھر لیا اور دم بھر میں اس عاشقِ اہلبیتؑ کے ٹکڑے کر ڈالے۔ مومنین ذرا تصور کیجئے اس بچی کے دل پر کیا گزری ہو گی جب اپنے بوڑھے باپ کو اس طرح خاک و خون میں تڑپتے اور دم توڑتے دیکھا ہو گا۔ منقول ہے کہ ان ظالموں نے جناب عبداللہ کو شہید کرنے کے بعد اس یتیم بچی کو گرفتار کر لیا۔

آہ مومنین مجھے اس وقت ایک یتیم بچی اور یاد آگئی۔ وہ حضرت مسلم بن عقیلؑ کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ لکھا ہے کہ جب اہلِ حرم کا لٹا ہوا قافلہ کوفہ کے اس دروازے کے قریب پہنچا جہاں مسلم بن عقیلؑ کا سرِ مبارک لٹکا ہوا تھا تو اس بچی نے اپنی ماں سے لپٹ کر کہا۔ اے مادرِ گرامی میں اپنے بابا جان کی یاد بہت زیادہ اپنے دل میں پا رہی ہوں اور ان کی بو بھی میرے دماغ میں بس رہی ہے۔ شاید میرے بابا جان مجھ سے قریب ہیں خدا کے لئے مجھے ان سے جلد ملاؤ۔ بچی کا یہ کلام سنکر سیدانیوں کے دل پر چھری سی چل گئی اور وا مسلماہ وا مسلماہ کے نعرے مارنے لگیں صاحب بحار الانوار لکھتے ہیں کہ جب امامِ مظلوم کا سر قریب سرِ مسلمؑ کے پہنچا تو دونوں سروں کے لبوں کو جنبش ہونے لگی۔ آہ مومنین اس وقت غالباً ہمارے مظلوم آقا نے جناب مسلم سے فرمایا ہو گا بیٹے بھائی اگر ان ظالموں نے تمہارا سر دروازے پر لٹکایا ہے تو ہمارا سر بھی کربلا سے یہاں تک نیزہ پر چڑھا کر لائے ہیں

منقول ہے کہ زید بن ارقمؓ صحابی رسولؐ اس وقت کوٹھے پر کھڑے تھے جب اہل حرم اونٹوں پر سوار دربار ابن زیاد کی طرف جا رہے تھے زید کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جب ان کی نظر اسیرانِ حرم پر پڑی تو ایک آہ سرد کھینچ کر ایک بی بی سے پوچھا تم کون لوگ ہو تمہارے وارثوں میں کوئی باقی ہے یا نہیں فاشارت الی علی ابن الحسینؑ ان بی بی نے بیمار کربلا کے اونٹ کی طرف اشارہ کیا جب امام زین العابدین علیہ السلام کا اونٹ زیدؓ کے قریب آیا تو انہوں نے حضرت سے پوچھا من ای قبیلۃ انتم اے بیکس قیدیو تم کس قوم و قبیلے سے ہو؟ حضرت نے ایک آہ سرد کھینچ کر فرمایا اقرءت القرآن کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ قال نعم انہوں نے کہا ہاں پڑھا ہے قال فما قرءت فی بنی اسرائیل وات ذا القربٰی حقہ حضرت نے فرمایا تم نے سورۂ بنی اسرائیل میں یہ آیت بھی پڑھی ہے وات ذا القربٰی حقہ رسولؐ کے ذوی القربٰی کو ان کا حق دو قال زید وانتم للقرابۃ التی امر اللہ ان یوتی حقہ زید نے کہا کیا تم ہی وہ لوگ ہو جن کے حق ادا کرنے کا خدا نے ہم کو حکم دیا ہے حضرت نے فرمایا۔ ہاں ہم وہی ہیں۔ زید نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے۔ حضرت نے یہ سنکر اپنا سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں فرمایا میں علی بن الحسینؑ ہوں۔ یہ سننا تھا کہ زیدؓ تڑپ گئے اور پوچھنے لگے این این سیدی و مولائی ابو عبد اللہ الحسینؑ میرے سید و مولا حضرت ابو عبد اللہ الحسینؑ کہاں ہیں حضرت نے فرمایا اے زیدؓ فرزند رسولؐ کربلا میں تین دن کے بھوکے پیاسے قتل کر دیئے گئے۔ یہ کیا سامنے نیزۂ طویل پر ان کا سر جا رہا ہے ہم سب ان کی شہادت کے بعد قید کر لئے گئے۔ یہ سننا تھا کہ زیدؓ نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور سر امام حسینؑ کے پاس جا کر کہنے لگے السلام علیک یا ابا عبد اللہ حضرت نے جواب میں فرمایا وعلیک السلام یا زیدؓ۔ زید کہتے ہیں میں زار زار رو رہا تھا اور حسرت سے سر حسینؑ کو تک رہا تھا۔ ناگاہ میں نے دیکھا کہ حضرت کے لب ہائے مبارک جنبش میں آئے۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت حسینؑ اپنے قاتلوں کو بددعا کر رہے ہوں گے لیکن جب کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا آپ سورۂ کہف کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ میں نے کہا بے شک حسینؑ آپ کا قصہ اصحاب کہف کے قصہ سے زیادہ عجیب ہے۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ٭

چھبیسویں مجلس

تفسیر آیہ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ و داخلہ اہل حرم در دربار ابن زیاد علیہ اللعن

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ الخ (جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے تو یہ کہتے جاتے تھے۔ اے ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول کر بیشک تو بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ پالنے والے ہم دونوں کو اپنا مسلمان بندہ بنائے رکھنا)

یہ دعا جناب ابراہیمؑ کی زبان پر اس وقت آئی تھی جب انہوں نے خانہ کعبہ کی عمارت بنانی شروع کی تھی۔ دونوں باپ بیٹے دل میں بہت خوش تھے کہ ہم خالق کائنات کا گھر بنا رہے ہیں۔ کام کی عظمت سمجھتے ہوئے اس کی اجرت پانے کی بھی دل میں امنگ تھی جانتے تھے کہ جواد و کریم کی سرکار ہے منہ مانگی مراد ملے گی۔ نبی و رسول روپیہ پیسے کے لالچی ہوتے نہیں کہ سونے چاندی کے پہاڑ مانگ لیتے وہ تو ایسی چیز مانگا کرتے ہیں جس سے خدا پرستوں کا بھلا ہو۔ ذرا دیکھنا اپنی محنت کی اجرت حضرت ابراہیمؑ نے کس کس شان سے مانگی ہے۔ واللہ روح ایمانی وجد کرتی ہے اور معرفت جوش میں اگر سر دھنے لگتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ خدائی کام بھی کرتے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بارگاہِ الٰہی میں اپنی درخواستیں بھی پیش کرتے جاتے تھے ذرا ان درخواستوں کا مضمون توجہ سے سنئے تو لطف آئے۔

(۱) پہلی درخواست۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ (پالنے والے ہم دونوں باپ بیٹوں کو بھی فعلیت اسلام پر باقی رکھنا اور ہماری ذریت کو بھی امت مسلمہ بنائے رکھنا) پہلے ذرا درخواست کا مطلب سمجھ لیجئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اسلام بلاواسطہ تھا یعنی خدا نے ان سے کہا۔ اَسْلِمْ (اسلام لاؤ) قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (کہا میں تمام عالموں کے پالنے والے پر اسلام لے آیا) پس حضرت ابراہیمؑ چاہتے یہ ہیں کہ میری اولاد بھی اسی طرح بلاواسطہ اسلام رکھنے والی ہو یعنی وہ خدا کے مسلمان کئے ہوئے دنیا میں آئے ہوں۔ یہ درخواست جب منشی قضا و قدر کے ہاتھ میں پہنچی تو سرکارِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اچھا اسے فائل میں لگا دو جب موقع ہوگا جواب دے دیا جائے گا۔

(۲) دوسری درخواست۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ (پالنے والے اسی امت مسلمہ میں

سے ایک ایسے رسول کو بھیج جو انہی لوگوں میں سے ہو تاکہ وہ تیری آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بنا دے) مطلب اس درخواست کا یہ ہے کہ وہ رسول امتِ مسلمہ کے درمیان مبعوث ہو کر ہدایت کرے کفار کے درمیان مبعوث نہ ہو یعنی اس رسول کی بعثت سے پہلے وہ امتِ مسلمہ موجود ہونی چاہیئے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ رسول میں جو صفات حضرت ابراہیمؑ نے مانگی ہیں ان کو لفظ بلفظ یاد رکھیئے تاکہ جواب میں لطف آئے۔

منشی تقضاو قدر نے یہ درخواست بھی سرکارِ الہیٰ میں پیش کی۔ حکم ہوا اسے بھی فائل میں لگادو۔ وقت پر دیکھا جائے گا۔

(۳) تیسری درخواست:۔

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ (مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچالے) یعنی میری ذریت جو امتِ مسلمہ کے نام سے موسوم ہو کبھی آن واحد کے لئے اپنا سر کسی بُت کے سامنے نہ جھکائے۔ اس درخواست کو بھی فائل میں لگانے کا حکم ہو گیا۔

(۴) چوتھی درخواست:۔

وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ (آخر زمانہ میں مجھے ایک سچی زبان بھی دینا) یعنی جب کچھ جھوٹے آپ کو صادق اور صدیق کہلانے لگیں تو میری اولاد میں سے کچھ لوگ ایسے پیدا کرنا جو لسانِ صدق کہے جانے کے قابل ہوں۔ یہ درخواست بھی فائل ہو گئی۔

(۵) پانچویں درخواست:۔

وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ (اور اپنے اس گھر کے اہل کو ثمرات کا رزق بھی دینا) ثمرات سے اہلِ ظاہر تو پھل پھلاری ہی مراد لیتے ہیں لیکن ایک ایسے جلیل القدر نبی کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ آم، امرود اور سیب کے لئے اللہ کی سرکار میں درخواست دے بلکہ ثمرات سے آپ کی مراد ثمرات فواد یعنی اولاد ہے۔ حکم ہوا اس کو بھی فائل میں لگادو۔

(۶) چھٹی درخواست

وَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (اور لوگوں کے دل اس گھر کے وارثوں کی طرف مائل کر دینا) یہ درخواست بھی حسبِ دستور فائل ہو گئی۔

اب سنئے جناب ابراہیمؑ جب خانۂ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جوادِ مطلق خدا کو یہ پسند نہ آیا کہ ابراہیمؑ کی ساری مزدوری اُدھاری رہے اور یہ یوں ہی ہاتھ جھاڑتے گھر کو چلے جائیں۔ کچھ تو ان کو اس وقت بھی ملنا چاہیئے۔ فرشتہ نقد اجرت لے کر آیا اور اس طرح پیغام پہنچایا اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (اے ابراہیمؑ میں تم کو لوگوں کا امام بنا رہا ہوں) یہ سُننا تھا کہ جلدی سے حضرت ابراہیمؑ نے ساتویں درخواست اور تیار کی۔

(۷) ساتویں درخواست:۔

وَمِن ذُرِّيَّتِي (اور میری اولاد میں سے بھی امام بنائے گا) حضرت ابراہیمؑ کو سرکارِ الہیٰ سے کئی عہدے ملے۔ عبد ہوئے۔ نبی ہوئے۔ رسول ہوئے۔ خلیل ہوئے۔ مگر کسی وقت اولاد یاد نہ آئی لیکن جب امام بننے لگے تو فوراً اولاد یاد آ گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو گی کہ نگاہِ خلیل غیب کے

پردوں سے یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ سب عہدے کچھ دن بعد ختم ہو جائیں گے۔ البتہ امامت ایسا عہدہ ہے کہ اس کا سلسلہ قیامت تک جانے والا ہے پس سوچا کہ ایسی چیز خدا سے کیوں نہ مانگو جو ہمیشہ دنیا میں میری اولاد کے اندر باقی رہے۔

اب سنئے ایک مدت گزرنے کے بعد سرکار رب العالمین نے منشی قضا و قدر کو حکم دیا کہ ذرا وہ فائل تو لاؤ جس میں ابراہیمؑ کی درخواستیں نتھی ہیں اور سلسلہ وار ایک ایک کو پڑھتے جاؤ اور میرا حکم ہر ایک پر لکھتے جاؤ۔

منشی تقدیر نے وہ فائل نکال کر عرض کی پہلی درخواست ہے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ حکم ہوا اس پر لکھ دو۔

(سورۂ قصص) الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ يُؤْمِنُونَ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ (ان کو ہم نے کتاب پہلے ہی دے دی ہے وہ اس پر ایمان لانے والے ہیں۔ جب ان پر کتاب پڑھی گئی تو کہنے لگے۔ ہم تو اس پر ایمان لا بھی چکے۔ یہ ہمارے رب کی طرف سے بالکل سچی چیز ہے اور ہم تو پہلے ہی سے مسلمان تھے) دیکھا آپ نے جناب ابراہیمؑ اپنی ذریت کے لئے بلا واسطہ اسلام مانگ رہے تھے۔ خدا نے ان کی ذریت کا وہی قول نقل کر دیا جس سے ان کا بلا واسطہ اسلام ثابت ہوا اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت علیؑ بعد پیدائش قرآن سنا کیسے دیتے اگر مسلمان ہی پیدا نہ ہوتے تو کعبہ میں دوران آنکھیں کیوں اس خیال سے بند رکھتے کہ پہلی نظر بتوں پر نہ پڑے۔

اس کے بعد منشی قضا و قدر نے دوسری درخواست پڑھنی شروع کی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ حکم ہوا اس پر لکھ دو اور ابراہیم کو منہ مانگی مراد دے دو۔ ذرا الفاظ کو ملاتے جانا۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (اللہ وہ ہے جس نے مکہ والوں میں ایک رسول کو ان ہی میں سے پیدا کیا تاکہ اس کی آیات کو ان پر تلاوت کرے۔ اور ان کے نفسوں کو پاک و پاکیزہ بنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے) کیا خدا نے اتنا ہی دیا جتنا حضرت ابراہیمؑ نے مانگا تھا؟ سخی کی شان سے یہ بعید ہے کہ سائل کو اتنا ہی دے جتنی اس کی احتیاج ہو۔ سخی تو ہمیشہ بڑھا کر دیتا ہے۔ غور کیجئے الفاظ کے ذرا سے تغیر میں بخشش کتنی زیادہ ہو گئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ رسول ایسا ہو جو آیات کی تلاوت کرے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ پھر ان کے نفوس پاک کرے خدا نے يُزَكِّيهِمْ کا لفظ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ سے پہلے ذکر کر کے یہ بتایا کہ اے ابراہیمؑ وہ تمہاری ذریت ایسی ہو گی کہ اس کا تزکیہ نفس کتاب و حکمت کی تعلیم سے پہلے ہو چکا ہو گا اللہ اکبر اس صورت میں ذریت ابراہیمی کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت رسول خداؐ اور حضرت علیؑ نے قبل نزول قرآن جو عمل کئے وہ بالکل تعلیم الٰہی کے مطابق تھے

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ بعثت رسول کے وقت وہ امت مسلمہ موجود ہونی چاہیئے جس کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی یعنی ایسی امت جس کا اسلام بلا واسطہ ہو۔ کم از کم اگر ایک آدمی بھی ایسا موجود ہو تو امت کا اطلاق ہو جائے گا کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایک پر بھی امت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ كَانَ إِبْرَاهِيمُ أُمَّةً قَانِتًا (ابراہیم ایک امت قانت تھے) قرآن کی آیت ہے یہی وجہ تھی کہ جب تک علیؑ پیدا نہ ہوئے رسولؐ نے اپنی بعثت کا اعلان نہ کیا۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ اس امت مسلمہ کو خانۂ کعبہ سے کیا نسبت تھی جب

حضرت ابراہیمؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اس وقت یہ امت یاد آ رہی تھی وہ بعلم نبوت جانتے تھے کہ اس گھر میں وہی شخص پیدا ہوگا جو امت مسلمہ کا مصداق ہوگا اور جس کے درمیان رسولؐ اپنی بعثت کا اعلان کرے گا اور رسولؐ اسی امت مسلمہ کے خاندان سے ہوگا انہی کا جزو ہوگا۔ پھر یہ کہ رسولؐ کتاب و حکمت کی تعلیم بالذات انہی کو دینے کے لئے مبعوث ہوگا۔ اور انہی کے نفوس کا بالذات تزکیہ کرے گا کیونکہ ان کو عملِ رسالت کا ایک نمونہ بنانا ہوگا۔ رسولؐ درحقیقت اہلبیتؑ کی تعلیم کے لئے بالذات آیا تھا اور ان کے صدقے میں تمام دنیا کی تعلیم کے لئے۔ یہی وجہ تھی کہ عملِ رسولؐ کا نمونہ اہلبیت ہی بنے نہ کہ عام لوگ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر دعائے ابراہیم میں کوئی وزن نہیں رہتا۔

الغرض اس کے بعد منشئ قضا و قدر نے تیسری درخواست پیش کی۔ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی سے بچالے) حکم ہوا اس پر لکھ دو۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا دیکھا آپ نے اس میں اہلبیتؑ کا لفظ کیا مزہ دے رہا ہے جو ابراہیمؑ کے دل میں تھا۔ وہ قدرت کی زبان پر ہے۔ بیت اللہ کے بنانے وقت دعا کی تھی قدرت نے اہلبیت کا لفظ ذکر کرکے بتا دیا کہ اس گھر کے مالک کون ہیں پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ بخشش سوال سے کتنی زیادہ بڑھ گئی۔

جناب ابراہیمؑ نے صرف یہ چاہا تھا کہ اس گھر والے بتوں کی عبادت نہ کریں۔ خدا نے کہا نہیں اے ابراہیمؑ میں اس گھر والوں کو ایسا بناؤں گا کہ دنیا کی کوئی نجاست خواہ ظاہری ہو یا باطنی چھوٹی ہو یا بڑی ان کے قریب ہی نہ پھٹکے۔

اس کے بعد چوتھی درخواست پیش ہوئی وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ۔ حکم ہوا اس پر لکھ دو وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (ہم نے علیؑ کو ان کے لئے سچی زبان قرار دیا) دیکھا یہاں اس گھر کے اہل کا نام بھی ذکر کر دیا تاکہ شک و شبہ کا کوئی موقع ہی نہ رہے۔ جناب ابراہیمؑ نے مصلحتاً نام ذکر نہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے کھلم کھلا بیان کر دیا۔ اگر کوئی زبان دراز کہے کہ علی کے معنی لمبی زبان کے ہیں تو خدا اس کی زبان قطع کرے وہ جھوٹا ہے لمبی زبان صفت پسندیدہ نہیں بلکہ صفت مذموم ہے۔

اب حضرت ابراہیمؑ کی پانچویں درخواست پیش ہوئی۔ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔ حکم ہوا اس پر لکھ دو اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (اے رسولؐ ہم نے تم کو کثرت سے اولاد دی) حضرت ابراہیمؑ کا منشا یہ تھا کہ کعبہ والوں کی اولاد بہ کثرت ہو تاکہ دنیا ان سے خالی نہ رہے۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی۔ اولادِ رسولؐ یعنی سید بحمد اللہ ہر جگہ موجود ہیں۔ چونکہ جناب ابراہیمؑ یہ جانتے تھے کہ اولادِ رسولؐ یا اس کے اہلبیتؑ کو بُری طرح تلواروں سے کاٹا جائے گا۔ زہر دے دے کر مارا جائے گا۔ لہٰذا آپ نے دعا کی کہ یہ نسل بکثرت دنیا میں باقی رہے۔ خدا نے اپنے رسولؐ کو بشارت دے دی کہ تمہاری نسل بکثرت ہوگی۔

اس کے بعد چھٹی درخواست پیش ہوئی۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ۔ حکم ہوا اس پر لکھ دو۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (اے رسولؐ کہہ دو میں کوئی اجر رسالت نہیں چاہتا۔ مگر یہ کہ میرے ذوی القربیٰ سے محبت کرو) دیکھا آپ نے بخشش سوال سے کتنی بڑھی ہوئی ہے۔ جناب ابراہیمؑ نے یہ دعا کی تھی کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے۔ خدا نے کہا اے ابراہیمؑ گھبراؤ مت تو یہی کہ ان کی محبت لوگوں پر واجب نہ کر دی ہو۔ جناب ابراہیمؑ جانتے تھے کہ اہلبیتؑ کے دشمن بکثرت ہوں گے اسی لئے یہ دعا کی خدا نے ویسا ہی حکم اس پر لکھا یعنی محبتِ اہلبیتؑ کو تمام مسلمانوں پر واجب کر دیا تاکہ محبت نہ کرنے والوں کو اس جرم میں دوزخ کا کندہ بنائے فی القربیٰ

کا انتظار بتا رہا ہے کہ یہ لوگ وہی ہیں جن میں سے رسول مبعوث ہوا ہے اور جو بمنزلہ اس کے جزو کے ہیں۔

اس کے بعد ساتویں درخواست کا نمبر آیا وَمِنْ ذُرِّيَّتِي (اور میری ذریت میں سے بھی امام بنانے کا حکم ہو) اس پر لکھ دو لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (میرے عہد کو ظالم نہیں پا سکتے) جناب ابراہیمؑ کا یہ سوال اس لئے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ جب یہ اُمت مسلمہ دنیا میں ہوگی تو کچھ ظالم لوگ ایسے امامت کریں گے پس آپ لسانِ قدرت سے اُن کے متعلق نفی کا حکم سنوانا چاہتے تھے۔ جناب قدرت نے کھلم کھلا کہہ دیا کہ ظالم تک یہ چیز نہیں پہنچ سکتی۔ اے ابراہیمؑ تمہاری اولاد میں امام ہوں گے اور سب معصوم ہوں گے ظالموں سے اس عہد کا تعلق نہ ہوگا۔ اگر ظالم امام ہوں تو وہ بندوں کے بنائے ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد دریائے رحمتِ الٰہی جوش میں آیا اور حکم ہوا کہ جتنی ہماری رحمتیں اور برکتیں ہیں سب ہمارے خلیل کے دونوں بیٹوں پر بحصہ مساوی تقسیم کر دو تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ رہے۔ اب ذرا دیکھنا کیسی کامل تقسیم ہوتی ہے۔

(۱) نبوت میں دونوں بھائیوں کی اولاد شریک ہے۔ فرق اتنا ہے کہ نسل اسحٰقؑ میں بہت سے نبی گزرے اور نسل اسمٰعیلؑ میں صرف ایک۔ بظاہر ایک کا پلہ ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ختم نبوت کا باٹ چڑھا کر دونوں پلے برابر کر دیئے۔ ان سب کا زمانہ نبوت بحیثیت مجموعی اتنا طولانی نہیں جتنا ختم الانبیا کی نبوت کا ہے۔ بظاہر تقسیم مساوی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن بڑے بھائی کا حق چونکہ زیادہ ہے۔ لہذا اولاد اسمٰعیلؑ کو یہ شرف بخشا گیا۔

(۲) آسمانی کتابیں بھی دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیں ایک طرف انبیاء و مرسلین زیادہ تھے لہذا ان کو تین کتابیں دیں۔ ادھر صرف ایک تھے لہذا ایک کتاب دی۔ اگر یہ تقسیم مساوی نہ ہوتی ہو تو قرآن کے ساتھ ناسخ کا لفظ اور شامل کر دو وزن بڑھ جائے گا۔

(۳) خدا کے دو گھر ہیں ایک بیت المقدس دوسرے کعبہ ان میں سے ایک اولاد اسحٰقؑ کو دے دیا دوسرا اولادِ اسمٰعیلؑ کو۔ لیکن فرق اتنا رہا کہ ایک کی اولاد کو باقاعدہ قبضہ دلا دیا۔ دوسرے کو اس سے محروم رکھا۔ شاید یہ اس لئے ہو کہ کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسمٰعیلؑ شریک تھے یا یہ کہ بڑے بھائی کی اولاد کو یہ امتیاز خصوصی بخشا گیا ہے۔

(۴) دو ہتھیار تھے۔ ایک عصا۔ دوسری ذوالفقار ان میں سے ایک چیز ایک بھائی کی اولاد کو دے دی دوسری دوسرے بھائی کی اولاد کو۔ حضرت موسیٰؑ صاحبِ عصا بن گئے اور حضرت علیؑ صاحبِ ذوالفقار۔

(۵) امامت کا عہدہ دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

(۶) کتابِ خدا کے محافظ دونوں سلسلوں میں بارہ بارہ قرار پائے۔

(۷) ایک معصوم بی بی نساء عالمین پر فضیلت کے لئے اس سلسلہ میں سے لی یعنی جناب مریمؑ۔ ایک اس سلسلہ میں برگزیدہ کی یعنی فاطمہ زہراؑ۔

(۸) ایک بی بی کی وہاں طہارت کی يَا مَرْيَمُ إِنَّ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ایک بی بی کو نسل اسمٰعیلؑ میں ظاہر جایا إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ بڑے بھائی کی نسل کو یہ امتیاز دیا گیا کہ جناب

سیدہ کی طہارت کو تطہیر الٰہی کر کامل بنا دیا یعنی یہ طہارت متعدی الی الغیر ہو گئی اور ایک نہیں ان کی نسل میں گیارہ معصوم ہوئے۔

(۹) سلسلۂ اسحاقی کی آخری حجت لڑکی کی اولاد کو قرار دیا یعنی حضرت مریمؑ کے فرزند حضرت عیسیٰؑ اس سلسلہ کی آخری حجت ہوئے سلسلۂ اسمٰعیلی میں بھی یہی طریقہ ملحوظ رکھا یہاں بھی آخری حجت (قائم آلِ محمدؐ) لڑکی ہی کی اولاد سے ہیں۔

(۱۰) اس سلسلہ کی آخری حجت یعنی حضرت عیسیٰؑ کو ایک مدت کے لئے زندہ رکھا۔ اسی طرح دوسرے سلسلہ کی آخری حجت کو بھی ایک وقتِ خاص تک زندہ رکھا ہے۔

(۱۱) ایک سلسلہ کی آخری حجت کو آسمان پر پوشیدہ کیا تھا دوسرے سلسلہ کی آخری حجت کو زمین پر پوشیدہ کر دیا۔

(۱۲) کتاب کائنات بند ہوتے وقت دو گواہوں کی ضرورت ہو گی لہٰذا ایک گواہ ایک نسل کا محفوظ رکھا اور دوسرا دوسری نسل کا۔ ان کو آسمان پر اس لئے بلایا کہ یہ زمانہ حضرت رسولِ خداؐ کی رسالت اور اولاد ابوتراب کی امامت کا تھا۔ اگر عیسیٰؑ زمین پر ہوتے تو معطل بن کر رہتے اور نبی کے لئے معطل ہونا اس کی شان نبوت کے خلاف ہے لہٰذا ان کو آسمان پر جگہ دی اور ابوتراب کے پوتے کو زمین پر قیامت میں یہ دونوں جمع ہو جائیں گے۔ امامت حق حضرت حجتؑ کا ہے کیونکہ بڑے بھائی کی اولاد ہیں۔ اسی لئے حضرت عیسیٰؑ نماز میں ان کی اقتدا کریں گے۔

(۱۳) ایک بچہ نسلِ اسحاقؑ میں ایسا پیدا کیا جس کی مدتِ حمل چھ ماہ تھی یعنی جناب یحییٰ بن زکریا۔ تو ایک بچہ نسلِ اسمٰعیل میں بھی ایسا پیدا کیا یعنی حسینؑ بن علیؑ۔

(۱۴) اسمٰعیل کے تابعین کا لقب اگر اس سلسلہ میں شیعہ رکھا گیا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ہے ھٰذا مِنْ شِيعَتِهٖ وَھٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ تو اس سلسلہ میں بھی یہی لقب مخصوص کیا گیا۔

(۱۵) ایک فضائی سواری وہاں عطا کی گئی جو بساطِ سلیمان کہلائی۔ ایک خاص سواری یہاں بخشی گئی جو براق کہلائی۔

(۱۶) ایک بی بی وہاں اپنے شوہر کے وصی سے لڑی اور اس کے نفاق کا پردہ چاک ہوا۔ یعنی صفورا زوجہ موسیٰؑ جس نے حضرت یوشع بن نون سے محاربہ کیا۔ ایک بی بی یہاں بھی اپنے شوہر کے وصی سے لڑی اور حمیرا کہلائی۔

(۱۷) ایک دریا اُس نسل سے مخصوص کیا گیا یعنی نیل۔ ایک دریا اس نسل سے مخصوص کیا گیا یعنی دریائے فرات۔

(۱۸) ایک پہاڑ اس نسل سے متعلق کیا گیا یعنی طور۔ ایک اس نسل سے مخصوص۔ یعنی کوہ حرا۔

(۱۹) ایک پتھر وہاں خانۂ خدا سے مخصوص ہوا یعنی صخرہ ایک یہاں مخصوص ہوا یعنی حجرِ اسود

(۲۰) وہاں موسیٰؑ نے سانپوں پر اپنا اعجاز دکھایا یہاں علیؑ نے اژدھے پر۔

(۲۱) وہاں موسیٰؑ کو طور پر معراج ہوئی۔ یہاں محمد مصطفےٰؐ کو عرش پر۔

(۲۲) وہاں جنت کے میوے مریمؑ کے لئے آئے یہاں فاطمہ زہراؑ کے لئے۔

(۲۳) وہاں گہوارہ میں عیسیٰؑ سے کلام کرایا یہاں آغوشِ مادر میں علیؑ سے۔

(۲۴) وہاں موسیٰ ؑ کے میقات پر جاتے ہی ساری قوم گمراہ ہو کر گوسالہ پرست ہو گئی تو یہاں حضرت رسول خدا ؐ کے مرتے ہی لوگ اجماع پرست بن کر گمراہ ہو گئے۔ وہاں اس موقع پر جناب ہارون کو ہادیٔ قوم بنایا تھا تو یہاں حضرت علی ؑ کو بنایا۔

(۲۵) وہاں جناب ہارون ؑ وصی موسیٰ ؑ کی اولاد جناب موسیٰ کی اولاد سمجھی گئی تو یہاں حضرت علی ؑ کی اولاد حضرت رسول خدا ؐ کی اولاد قرار دی گئی۔

(۲۶) وہاں حضرت عیسیٰ پر لوگوں کو خدا ہونے کا گمان ہوا تو یہاں علی مرتضیٰ پر۔

(۲۷) اس سلسلے کے شہید مظلوم حضرت یحییٰ بن زکریا ہیں اور اس سلسلے کے حسین بن علی ؑ۔

(۲۸) وہاں بنی اسرائیل کو ظلم فرعون سے جلاوطن ہونا پڑا تھا تو یہاں حسین ؑ اور اصحاب حسین ؑ کو ظلم یزید سے گھر چھوڑنا پڑا۔ وہاں ان کی مظلومیت نے فتح حاصل کی تھی یہاں ان کی مظلومیت نے۔

(۲۹) وہاں ایک قوم کو حضرت یحییٰ ؑ کے ماتم میں رلایا یہاں حسین ؑ کے غم میں۔

(۳۰) وہاں جناب یحییٰ کا خون برسوں زمین سے ابلا، یہاں حسین ؑ بن علی ؑ کا خون آج تک جوش مار رہا ہے۔ معتبر کتب تواریخ و مقاتل میں ہے کہ برسوں سرزمین کربلا کی یہ حالت رہی کہ جو پتھر وہاں سے اکھاڑا جاتا تھا اس کے نیچے سے تازہ خون جوش مارتا ہوا نکلتا تھا بے شک یہ خون ناحق ایسا نہ تھا کہ زمین جلتے اس کو دبا سکتے یا سورج کی گرمی اس کو سکھا سکتی۔ عبداللہ حضرمی ناقل ہے کہ جب اسیران اہل حرم کا قافلہ کوفہ میں پہنچا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ جب سرہائے شہدا میرے قریب آئے تو میری نظر اس نیزہ طویل پر گئی جس پر سر حسین ؑ نصب تھا واللہ میں نے دیکھا کہ گلوئے مبارک اسی طرح تازہ خون دے رہا ہے جس طرح مقتول کا گلا قتل کے بعد دیتا ہے۔

منقول ہے کہ جب جناب زینب ؑ کو یہ معلوم ہوا کہ اب یہ اشقیا ہم کو دربار پسر زیاد میں لے جانے والے ہیں تو آپ کو بڑی غیرت آئی جناب فضہ کو بلا کر فرمایا تم شمر کے پاس جاؤ اور اس سے میری جانب سے کہو۔ اے شمر ہم ناموس رسول ؐ ہیں ہم کو کھلے سر دربار پسر زیاد میں جلتے شرم آتی ہے اگر تو ابن زیاد کے سامنے پیش ہی کرنا چاہتا ہے تو ایک ایک چادر ہم بیکسوں کو دے دے تاکہ ہم اپنا بدن اس سے چھپا لیں اور اگر یہ صورت تجھے منظور نہ ہو تو کم از کم اتنا ہی کر کہ ہمارے ہاتھ رسی سے کھلوا دے تاکہ ہم اپنے چہرے اپنے ہاتھوں سے چھپا سکیں۔ جناب فضہ جب شمر کے سامنے پہنچیں تو اس شقی نے اپنا منہ داہنی طرف پھیر لیا۔ یہ داہنی طرف آئیں تو اس نے اپنا منہ بائیں طرف موڑ لیا۔ اس شقی کی بے التفاتی دیکھ کر جناب فضہ کو غصہ آ گیا۔ آپ نے فرمایا او شمر کیا تو نے مجھے کوئی معمولی عورت سمجھا ہے میں جناب فاطمہ زہرا ؑ کی کنیز خاص فضہ ہوں لہٰذا اگر میری شہزادی نے مجھے حکم نہ دیا ہوتا تو میں ہرگز تیرے سامنے نہ آتی۔ یہ سنکر شمر کو کچھ غیرت سی آئی کہنے لگا کیا کہنا چاہتی ہو۔ انہوں نے فرمایا میری شہزادی جناب زینب ؑ نے تجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ ہم عترت رسول ؐ ہیں ہمیں نامحرموں کے سامنے کھلے سر دربار میں جاتے شرم آتی ہے۔ اگر تو ہم کو دربار میں لے جانا ہی چاہتا ہے تو اتنا سلوک ہم بیکسوں کے ساتھ کر کہ ایک ایک چادر منہ چھپانے کے لئے دے دے۔ شمر نے کہا زینب ؑ کی یہ درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔ جناب فضہ نے کہا اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم سے کم ہم اسیروں کے ہاتھ ہی کھلوا دے تاکہ اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیں۔ شمر نے غضبناک ہو کر کہا زینب ؑ سے کہہ دو کہ اب وہ کوفہ کی شہزادی نہیں بلکہ ابن زیاد کی قیدی ہیں جس طرح

ہم چاہیں گے لے جائیں گے۔ جناب فضہ مایوس ہو کر واپس گئیں اور شمر کی گفتگو جناب زینبؑ سے بیان کی۔ شیرِ خدا کی بیٹی کو یہ سنکر جلال آگیا فرمانے لگیں۔ زینبؑ تو اس صورت سے ہرگز پسرِ زیاد کے دربار میں نہ جائے گی۔ شمر سے کہہ دو جو کچھ اسے کرنا ہے کرے۔ مومنین جب شمر کو یہ معلوم ہوا کہ زینبؑ کسی طرح دربار میں جانے کو راضی نہیں تو وہ تازیانہ لے کر بیمار کربلا کے پاس آیا اور کہنے لگا اے علی ابن الحسینؑ اپنی پھوپی سے کہو کہ وہ دربار پسرِ زیاد میں چلیں ورنہ میں تم کو اس تازیانہ سے سخت اذیت پہنچاؤں گا۔ آہ آہ یہ سُنکر بیمار کربلا طوق وزنجیر سنبھالے جناب زینبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی اے پھوپی اماں آپ کیوں دربار پسرِ زیاد میں نہیں چلتیں۔ شمر مجھے تازیانہ سے اذیت دینی چاہتا ہے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹا سید سجاد مجھ سے تو یہ ہرگز نہ ہوگا کہ کھلے منہ دربار پسرِ زیاد میں چلی جاؤں۔ آخر میں بھی فاطمہؑ کی بیٹی ہوں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جناب زینبؑ کی نظر اس نیزۂ طویل پر جا پڑی جس کے اوپر سرِ حسینؑ نصب تھا۔ دیکھا کہ حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں رو رو کر کہنے لگیں مظلوم برادر بہن تیری غربت اور بیکسی کے نثار اس وقت رونے کا سبب کیا ہے علی اکبرؑ کی یاد نے رُلایا یا برابر کے بھائی عباس کی یاد نے۔ آہ آہ مومنین سید الشہداء کے لبِ مبارک سے آواز آئی اے بہن زینبؑ میری محنت کو ضائع نہ کرو اور جس طرح یہ اشقیا تمہیں لے جانا چاہتے ہیں چلی جاؤ۔ یہ سُننا تھا کہ جناب زینبؑ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں اور امام زین العابدین علیہ السلام سے فرمایا بیٹا زینبؑ اب دربار میں جانے کے لئے تیار ہے شمر سے کہہ دو جس طرح چاہے اب مجھے دربار میں لیجائے

مومنین اب تھوڑا سا حال دربار ابنِ زیاد کا بھی سُن لیجئے۔ اس شقی نے حکم بھیجا تھا کہ جب تک دربار کو آراستہ نہ کر لوں اسیر ان کو یہاں نہ لایا جائے۔ چنانچہ شمر نے تشہیر کے بعد دربار پسرِ زیاد کے قریب ہی ایک مقام پر اہلِ حرم کو اتار دیا تھا جب یہ خبر آئی کہ دربار آراستہ ہو گیا تو شمر نے تمام قیدیوں کو دربار میں چلنے کا حکم دیا۔ آہ آہ اس وقت اہلِ حرم کے دل پر کیا گزر رہی تھی اس کا بیان دشوار ہے شرم سے سب کے سر جھکے ہوئے تھے اور فرطِ حیا سے ایک ایک قدم اٹھانا دشوار تھا۔ آہ اس وقت ابن زیاد کا دربار کئی سو کرسی نشینوں سے بھرا ہوا تھا اور بہت سے زریں کمر غلام چاروں طرف ایستادہ تھے امام علیہ السلام کا سرِ انور ایک طشت میں اس شقی کے سامنے رکھا ہوا تھا اور وہ بار بار اپنی چھڑی دندانِ مبارک پر مار کر مسکراتا تھا۔ زید بن ارقم صحابی رسولؐ بھی اس وقت دربار میں موجود تھے ان سے اس شقی کی گستاخی نہ دیکھی گئی رو کر کہنے لگے اے پسرِ زیاد اپنی چھڑی ان ہونٹوں پر سے ہٹا لے واللہ میں نے حضرت رسولِ خداؐ کو دیکھا ہے کہ لب ہائے حسینؑ کو اس طرح چوستے تھے جیسے کوئی شخص رطب تازہ کو چوستا ہے۔ ابن زیاد کو یہ سُنکر غصہ آگیا کہنے لگا اے دشمنِ خدا اگر بڑھاپے سے تیری عقل ضائع نہ ہو گئی ہوتی تو ابھی تیرے سر کو تن سے جدا کر دیتا۔

منقول ہے کہ ابنِ زیاد اہلبیت کو اسیر دیکھ کر بڑی خوشی کے ساتھ کہنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے تم کو ذلیل و خوار کیا۔ قتل کیا۔ اور تمہارے جھوٹ کو تم پر ظاہر کیا۔ جناب زینبؑ سے ضبط نہ ہو سکا۔ فرمانے لگیں او شقی تو جھوٹا ہے۔ اللہ اپنے نکوکار بندوں کو کبھی ذلیل نہیں کرتا۔ اس شقی نے غضبناک ہو کر شمر سے پوچھا یہ کون بی بی ہے کہ میرے سامنے اس بے باکی سے بول رہی ہے۔ شمر نے کہا یہ حسینؑ کی بڑی بہن زینبؑ ہیں۔ ابنِ زیاد نے حکم دیا کہ زینبؑ کو قتل کر دیا جائے۔ عمرو بن حُریث کو یہ سنکر غصہ آگیا اُس نے کھڑے ہو کر کہا! اے پسرِ زیاد تو کس قدر بے غیرت ہے اب تیری جرأت یہاں تک بڑھ گئی کہ عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے لگا۔ خدا کی قسم اگر تو نے دخترِ علیؑ

کو قتل کرایا تو ابھی دربار میں خون کی ندی بہہ جائے گی۔ عمرو بن حریث کے بگڑے تیور دیکھ کر ابنِ زیاد ڈر گیا اور جناب زینبؑ کے قتل سے باز رہا۔

اس کے بعد اس نے امام زین العابدین علیہ السّلام کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کون ہے؟ کسی نے کہا علیؑ بن الحسینؑ۔ اس نے کہا علیؑ بن الحسینؑ کو خدا نے ابھی تک قتل نہیں کیا۔ حضرت نے نہایت نحیف آواز میں فرمایا اے پسرِ زیاد میرا ایک جوان بھائی تھا جس کا نام علیؑ بن الحسینؑ تھا تیرے لشکر نے ان کو قتل کر ڈالا۔ وہ بولا میرے لشکر نے نہیں بلکہ خدا نے اس کو قتل کیا۔ حضرت نے فرمایا اے شقی تو جھوٹا ہے۔ خدا تجھ پر لعنت کرے۔ پسرِ زیاد کو غصہ آ گیا حکم دیا کہ اس کو باہر لے جا کر قتل کر ڈالو۔ مومنین یہ سنتے ہی جناب زینبؑ بے چین ہو گئیں۔ اور فرمایا او ظالم ہمارا سارا گھر تہِ تیغ کرنے کے بعد بھی تجھے چین نہ آیا یہ کہہ کر بیمار کربلا سے لپٹ گئیں اور کہا میں اس کو ہرگز نہ چھوڑوں گی۔ اگر تو اس کو قتل ہی کرنا چاہتا ہے تو اس سے پہلے مجھے قتل کرا دے ہمارے وارثوں میں اس کے سوا کوئی باقی نہیں جناب زینبؑ کی یہ تقریر سن کر بہت درباری بگڑ گئے اور ابنِ زیاد خائف ہو کر حضرت کے قتل سے باز رہا۔ اس کے بعد پسرِ زیاد نے اسیروں کو قید خانے میں بھیجنے کا حکم دیا۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ٥

ستائیسویں مجلس

تفسیر آیۂ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ الخ وحال ورودِ اہلِ حرم بشام

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (ہم نے تمہاری طرف ایک رسول کو اسی طرح تمہارے اوپر گواہ بنا کر بھیجا جیسے فرعون کی طرف ایک رسول کو گواہ بنا کر بھیجا تھا)۔ اس آیت میں حضرت رسولِ خدا کی تشبیہ جناب موسیٰؑ سے بلحاظ ذات نہیں بلکہ بلحاظ صفات ہے یعنی پورا جملہ تشبیہ پورے جملے کی ہے۔ وجوہ تشبیہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) جس طرح جناب موسیٰؑ صاحب کتاب و شریعت ہیں اسی طرح آنحضرتؐ بھی صاحب کتاب و شریعت ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت منسوخ ہو گئی اور آنحضرت کی شریعت قیامت تک چلنے والی ہے۔

(۲) جناب موسیٰؑ کے وصی حضرت یوشعؑ بن نون تھے۔ ان سے جناب موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کی بی بی نے جن کا لقب صفورا تھا (زرد رنگ والی) جنگ کی۔ حضرت رسولِ خدا کی ایک بی بی تھی جس کا نام حمیرا تھا آپ کے انتقال کے بعد آپ کے وصی حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) حضرت موسیٰؑ کے بارہ قائم مقام ہوئے جو اثنا عشر نقیب کہلائے۔ حضرت رسولِ خداؐ کے بھی بارہ قائم مقام ہوئے جو ائمہ اثنا عشر کہلائے

(۴) حضرت موسیٰ کی امت شیعہ کہلائی۔ چنانچہ قرآن میں ہے وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَکَزَهٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ۔ اسی طرح حضرت رسولِ خدا کی امت بھی شیعہ کہلانی چاہیئے نہ کہ سنی۔ یہ لفظ تو قرآن میں کہیں آیا ہی نہیں

(۵) حضرت موسیٰؑ کے تین دشمن تھے۔ فرعون، ہامان اور قارون لہٰذا حضرت کے بھی تین ہی دشمن ہونے چاہئیں۔ اگر حضرت موسیٰؑ ان کی طرف بھیجے گئے تھے تو حضرت رسولِ خدا ان تین کی طرف۔ فرعون ظالم تھا۔ اس نے خاندان حضرت موسیٰؑ کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا تھا۔ ہامان بڑا غضبیارہ تھا اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے گھروں کو آگ لگا دی تھی۔ قارون اتنا مالدار تھا کہ قرآن میں ہے کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں طاقت والے گروہ پر بھی گراں تھیں۔ پس اس سے زیادہ غنی اور کون ہو گا۔ اگرچہ حضرت رسولِ خدا کے زمانہ میں ان ناموں کے لوگ تو نہ تھے مگر ان صفات کے ضرور تھے اور مقصود اظہار صفات ہی ہے جس طرح ایک رسولؐ کی تشبیہ دوسرے رسولؑ سے صفات میں ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کی تشبیہ بھی صفات ہی میں ہے جس طرف یہ دونوں رسولؑ بھیجے گئے۔ فرعون سے مراد صفتاً کیا ہے یہی نا کہ جو کسی امر کا اہل نہ ہو اور اس کا دعوے کرے۔ مثلاً کوئی علم والا نہ ہو اور علم کا دعوے کرے تو وہی فرعون ہے۔ امام نہ ہو مگر امام ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ بھی فرعون ہے کیونکہ فرعون اسی وجہ سے فرعون کہلایا کہ وہ خدائی کا مدعی تھا یعنی جو صفت اس میں نہ تھی اس کا مدعی تھا

لیکن جس طرح فرعون کے دعویٰ خدائی کرنے سے خدا کی خدائی باطل نہ ہوئی اسی طرح فرعون امت محمدیؐ کے حکمراں ہونے سے علیؑ کی خلافت نہ گئی۔

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب علی شیرِ خدا اور غازی خیبر کشا تھے تو مدعیانِ باطل سے مقابلہ کیوں نہ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ علیؑ کی طاقت خدائی طاقت سے زیادہ نہ تھی۔ فرعون مدعی الوہیت تھا لیکن خدا نے طرح دی کیونکہ وہ ہر وقت اس کو ہلاک کرنے کی قدرت رکھتا تھا اُسے جلدی کیا تھی۔ دوسرے خدا یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے اس دعویٰ باطل سے میرا کچھ بگڑ نہیں سکتا۔ میری خدائی میں فرق نہیں آسکتا۔ بڑی ذاتیں چھوٹوں کی سزا کی طرف مائل نہیں ہوا کرتیں۔ کوئی پوری ٹکر کا مقابلہ ہو تو مزہ بھی آتا ہے فرعون بندہ تھا خدا کا اس کا مقابلہ کیا۔ اس کی گردن ہر وقت خدا کے ہاتھ میں تھی پس وہ کیوں جلدی کرتا۔ اگر کوئی کہے عذاب کیا تو کہ فرعون کو رود نیل میں غرق کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ عذاب خدائی مقابلہ کی بنا پر نہ تھا بلکہ اپنے رسول حضرت موسیٰؑ کی نافرمانی کی بنا پر تھا چنانچہ فرماتا ہے فَعَصیٰ فرعونُ الرسولَ فَاَخَذنٰہُ اَخذاً وَبِیلاً (فرعون نے ہمارے رسول کی نافرمانی کی پس ہم نے سخت عذاب میں اُسے پکڑ لیا) پس اسی پر قیاس کرو حضرت علیؑ کے مقابلہ کا جو لوگ کفار کے مقابل ہمیشہ بھاگتے رہے ہوں ان کا مار بھگانا علیؑ کے نزدیک کون بڑی بات تھی۔ علیؑ وہی تو تھے جنہوں نے تنہا احد خندق و خیبر جیسے معرکوں کو سر کیا تھا۔ پس ان کے نزدیک ایسے لوگوں سے جنگ کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چونکہ وقتی مصلحت اس کی مقتضی نہ تھی لہذا خاموش ہو رہے۔ علیؑ کے شجاعانہ جذبات کو عام لوگوں کے وحشیانہ جذبات پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔ علیؑ وہ ہیں کہ جب وقت اور مصلحت مقتضی نہیں ہوتی تو دشمن کے سینہ پر سے اُتر آتے ہیں۔ جب لوگ سبب پوچھتے ہیں تو جواب میں فرماتے ہیں۔ اس نے میری طرف لعابِ دہن پھینکا۔ میں اس کے سینہ سے جدا ہو گیا تاکہ اس کے قتل میں میرا نفس شامل نہ ہو۔ پس جو علیؑ اتنی اتنی باتوں پر نظر رکھتا ہو اگر اس نے کسی بڑی دینی مصلحت کی وجہ سے اپنے ان دشمنوں کا مقابلہ نہ کیا تو کیا محل اعتراض ہے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی اب ہم کو پھر اصلی مطلب کی طرف رجوع کرنی چاہیئے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے دشمن فرعون کا تعین ہو گیا ہے اسی طرح اس فرعون کا تعین بھی ہو جانا چاہیئے جس کی طرف حضرت رسولخداؐ بھیجے گئے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ صرف فرعون کی طرف مبعوث نہ ہوئے تھے بلکہ تمام قوم کی طرف تھے پھر خدا نے یہ کیوں فرمایا کَمَا اَرسَلنَا اِلیٰ فِرعَونَ رَسُولاً یا دوسرے مقام پر ہے فَاذهَبَا اِلیٰ فِرعَونَ اِنَّہٗ طَغیٰ (اے موسیٰؑ و ہارون تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ کافر اور بھی تھے۔ مگر فرعون سب سے زیادہ کافر تھا۔ اس کی سی خصوصیت اوروں میں نہ تھی کیونکہ اور خود کافر تھے اور فرعون کافر بھی تھا اور کافر گر بھی۔ اور ساجد تھے اور فرعون مسجود بنا ہوا تھا اور دوسروں کو خدا کہتے تھے اور فرعون اپنے کو۔ پس اسی طرح اگرچہ حضرت رسولخداؐ تمام قوم کی طرف آئے تھے مگر یہاں بھی فرعون جیسا ایک کافر گر ہونا چاہیئے۔ اس شخص کا تعین کیونکر ہو۔ حضرت موسیٰؑ کے مقابل تین شخص تھے۔ فرعون و ہامان و قارون اور کفر کی وجہ سے یہ عدو موسیٰؑ تھے لیکن یہ کفر ان میں تھا کہاں آیا سر میں تھا یا پیروں میں۔ سر میں تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ محل کفر نہیں ہو سکتا۔ فرعون باوجودیکہ مدعی خدائی تھا لیکن جب اپنے دماغ سے پوچھتا ہوگا تو خود اس کا دماغ بتاتا ہوگا کہ تو خدا نہیں کیونکہ دماغ حقیقت کو چھپاتا نہیں۔ پھر کیا یہ کفر پیروں میں تھا۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ پیر وہی تھے جو بحالت طفلی حضرت موسیٰؑ کے پیچھے پیچھے راستہ پر چلے تھے۔ پھر یہ کفر کہاں چھپا ہوا تھا۔ خداوند عالم فرماتا ہے فِی قُلُوبِهِم مَرَض

پس جب دل میں تھا تو ان سب کا دل نکال لو فرعون عہد رسالت پتہ چل جائے گا۔

اب قابلِ غور یہ ہے کہ ان سب کا نام تو قرآن میں ہے لیکن اس کا کیوں نہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کا ماننے والا دنیا میں اب کوئی باقی نہیں اس لئے ان کا ذکر کرنے میں کسی مفسدہ کا اندیشہ نہیں برخلاف اس شخص کے کہ اس کے ماننے والے دنیا میں ہیں۔

ایک تشبیہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت رسولِ خداؐ میں یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ کے تابعین کا مذہب تقیہ تھا۔ چنانچہ مومنِ آلِ فرعون جس کا شمار صدیقین اولین میں ہے اور جو نبوت جناب موسیٰ کا مصدق اول تھا تقیہ پر عامل تھا چنانچہ قرآن میں یکتم ایمانہٗ اس کی صفت بیان کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے مصدق اول اور صدیق اکبر حضرت علی علیہ السلام کا مذہب بھی تقیہ تھا۔

سنی حضرات شیعوں کو رافضی کہتے ہیں یہ لفظ سب سے پہلے ان لوگوں پر بولا گیا تھا جو فرعون کو چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ سے آملے تھے پس معلوم ہوا جس طرح تابعین حضرت موسیٰؑ رافضی کہلاتے تھے اسی طرح تابعین حضرت رسولِ خداؐ رافضی کہلائے۔

جناب موسیٰ نے شرحِ صدر کے لئے دعا کی خدا نے ان کے سینہ کو کشادہ کر دیا۔ اسی طرح حضرت رسولِ خداؐ کا شرحِ صدر ہوا لیکن فرق یہ ہے کہ وہاں خواہش جناب موسیٰؑ تھی ربِّ اشرح لی صدری اور یہاں بدونِ خواہش خدا نے یہ فضیلت عطا کی چنانچہ فرماتا ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اے رسولؐ کیا ہم نے تمہارے سینہ کو کشادہ نہیں کیا۔

جب جناب موسیٰ طور پر توریت لینے گئے تو اپنے بھائی جناب ہارونؑ کو اپنا قائم مقام بنا گئے قوم نے ان سے غداری کی اور سامری کے اغوا سے خدا پرستی چھوڑ کر گوسالہ پرست بن گئے۔ جناب ہارون نے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر ان پر اثر نہ ہوا بجائے ان کی نصیحت پر عمل کرنے کے ان کے جانی دشمن ہو گئے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ واپس آئے تو جناب ہارونؑ نے اس طرح شکایت کی یَابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِیْ (میرے ماں جائے اس قوم نے مجھے کمزور بنا دیا کہ قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں)۔ یہی حالت یہاں بھی ہوئی حضرت رسولِ خداؐ کے انتقال کے بعد لوگ آپ کے وصی و جانشین سے پھر گئے اور بجائے منصوص من اللہ خلیفہ کے اجماعی خلیفہ کے پیرو بن گئے۔ وہاں جناب ہارونؑ اور ان کی اولاد کو کمزور بنایا تھا اور ان کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ یہاں حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے خون کے پیاسے بن گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے تمام ائمہ کے قتل کی بنیاد سقیفہ ہی میں رکھی گئی تھی۔ بالخصوص کربلا کا واقعہ ہائلہ تو اس اجماع پرستی کا نتیجہ تھا ہی۔ اسی بناء پر کسی شاعر نے کہا ہے ؎ کشتہ شد حسینؑ اندر سقیفہ

افسوس جن لوگوں کی محبت خدا نے مسلمانوں پر واجب کی تھی جن کی اطاعت و پیروی کا حکم دیا تھا بدبخت مسلمانوں نے ان پر وہ وحشیانہ مظالم روا رکھے جو سخت سے سخت دشمن پر بھی نہیں کئے جاتے دنیا میں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ دشمن کے قتل کے بعد آدمی کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے اور اس کے انتقامی جذبات دب جاتے ہیں لیکن وہ لوگ کیسے شقاوت کردار تھے جن کو رسولؐ کے بھرے گھر کی صفائی کر لینے کے بعد بھی چین نہ آیا اور مردوں کے بعد ان دکھیا عورتوں کے ستانے پر کمر باندھی جن کا دنیا میں کوئی والی و وارث نہ تھا۔ آہ! رسولؐ کی نواسیاں اور علیؑ و فاطمہ کی بیٹیاں سر ننگے بلوائے عام میں پھرائی جا رہی تھیں اور کسی کے دل پر چوٹ نہ لگتی تھی۔

لکھا ہے کہ جب اہلِ حرم کا لٹا ہوا قافلہ دمشق پہنچا تو جناب ام کلثوم نے شمر کو بلا کر کہا کہ یہ شہر دمشق ہے۔ یہاں تماشائیوں کا بہت

زیادہ ہجوم ہوگا۔ لہذا یا تو ہمیں چادریں دے یا کسی ایسے دروازے سے لے چل۔ جہاں لوگوں کا ہجوم کم ہو۔ اور اگر ان میں سے ایک بات بھی منظور ہو تو کم سے کم اتنا ہی کر کہ شہیدوں کے سر ہمارے اونٹوں سے آگے کر دے کہ تماشائی ان کو دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ہم کو دیکھنے کا انہیں موقع نہ ملے۔ آہ شمر ایسا غیرت دار کہاں تھا کہ امام زادی کی درخواست منظور کر لیتا۔ اس نے یہ غضب ڈھایا کہ باب الساعات ہی کی طرف نکال کے لے چلا۔ جب یہ قافلہ مسجد جامع کے قریب پہنچا تو ایک شامی نے یہ سمجھ کر کہ یہ کفار ہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تم کو ہلاک کیا اور فتنہ کی جڑ کو اکھاڑ ڈالا۔ امام زین العابدین علیہ السّلام بڑے صبر سے اس کا گستاخانہ کلام سنتے رہے۔ جب وہ کہہ چکا تو آپ نے فرمایا اے شخص تو نے قرآن پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہاں پڑھا ہے فرمایا یہ آیت بھی پڑھی ہے قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ اس نے کہا ہاں پڑھی ہے۔ فرمایا اور یہ آیت بھی پڑھی ہے وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ اس نے کہا پڑھی ہے۔ فرمایا اور یہ آیت بھی پڑھی ہے إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ اس نے کہا یہ بھی پڑھی ہے۔ فرمایا اے بھائی یہ سب آیتیں ہماری ہی شان میں ہیں ہم ہی وہ اہلبیت ہیں جن کو خدا نے ہر برائی سے پاک کیا ہے۔

یہ سنکر وہ شامی گھبرا گیا اور اپنے ہاتھ اٹھا کر خدا کی درگاہ میں عرض کرنے لگا۔ خداوندا میں توبہ کرتا ہوں اور ان لوگوں سے سخت بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ جنہوں نے تیری نبیؐ کی آل کو قتل کیا۔ خدا تو جلد ان پر اپنا عذاب نازل کر۔

سہل ساعدی حضرت رسولخدؐ کے مقدس صحابی بیت المقدس کی زیارت کو تشریف لے گئے تھے وہاں سے دمشق آئے۔ شہر کو غیر معمولی طور پر سجا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لوگوں سے پوچھا آج یہاں کونسی عید ہے۔ ایک شامی نے کہا عید کیسی یہ اس واقعہ کی خوشی ہے کہ اس کی وجہ سے اگر آسمان خون برسائے اور زمین شق ہو جائے تو بھی کم ہے۔ آج حسینؑ کا سر دربار یزید میں آرہا ہے۔ یہ سنتے ہی سہل کے ہوش جاتے رہے کہنے لگے ہائے ہائے کیا ظالموں نے فرزند رسولؐ کو قتل کر ڈالا۔ اے کیا قیامت آگئی نبیؐ کے نواسے کا قتل اور یہ خوشیاں۔ اولادِ رسولؐ کی اسیری اور شہر میں یہ عید۔ پھر پوچھا سر حسینؑ کس دروازے سے لایا جائے گا۔ اس نے باب الساعات کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شور سنائی دیا۔ اور بہت سے جھنڈے نمودار ہوئے پھر بے کجاوہ اونٹوں پر کچھ بیکس بی بیاں کھلے سر دکھائی دیں۔ ایک اونٹ پر ایک کمسن لڑکی بیٹھی تھی جس کی کمسنی، بھولاپن، اور قید کا تصور کر کے سہل زار زار رونے لگے آگے بڑھ کر پوچھا آپ کون ہیں؟ اس بچی نے جواب دیا سکینہؑ بنت الحسینؑ ہوں۔ سہل نے یہ سنکر منہ پیٹ لیا۔ ڈاڑھیں مار کر رونے لگے اور کہا اے شہزادی میں آپ کے جد کا صحابی سہل ساعدی ہوں۔ کاش میری آنکھیں اندھی ہو جاتیں کہ اولادِ رسولؐ کو اس حالت میں نہ دیکھتا۔ اچھا مجھے بتاؤ کہ میں اس وقت تمہاری کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ جناب سکینہؑ نے کہا۔ اگر ہو سکے تو ان سروں کو ہمارے اونٹوں کے پاس سے علیحدہ کرا دو تاکہ تماشائی ان کے ان کے دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ہم پر نامحرموں کی نظر نہ پڑے۔ سہلؓ نے یزیدی گروہ کو کچھ دے کر سروں کو وہاں سے آگے بڑھوا دیا۔ سہلؓ کہتے ہیں اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ ایک شامی عورت نے سر امام حسین علیہ السّلام پر ایک پتھر مارا۔ میں نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر لیں اور خدا سے دعا کی کہ اس ملعونہ کو اور اس کے ساتھ کی اُن چار عورتوں کو جو ہاتھوں میں پتھر لئے کھڑی تھیں ہلاک کر۔ ابھی میرا کلام تمام نہ ہوا تھا کہ وہ پانچوں کوٹھے پر سے گر کر مر گئیں۔ (مقتل اسفرائنی۔ ناسخ التواریخ)

مومنین اب تھوڑا سا حال اہلحرم کے دربار یزید میں جانے کا بھی سُن لیجئے۔ لکھا ہے جس وقت اہلبیت کو دربار یزید میں لائے وہ شقی شراب پی رہا تھا اور شطرنج سامنے بچھی ہوئی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ امام حسین علیہ السلام کا سر تخت کے نیچے رکھدیں۔ وہ جام پر جام پئے چلا جا رہا تھا اور جو تھوڑی سی شراب پیالہ میں رہ جاتی تھی وہ اسی طشت میں ڈال دیتا تھا وہ ملعون اس بیہودگی میں مشغول تھا اور اہلحرم مجرموں کی طرح اس کے سامنے بندھے کھڑے تھے اس کے بعد وہ ایک بید سے دندانِ مبارک امام مظلوم کے ساتھ بے ادبی کرنے لگا۔ ابو برزہ اسلمی صحابی رسولؐ سے یہ گستاخی نہ دیکھی گئی۔ بگڑ کر کہنے لگے۔ اے یزید حسینؑ کے دانتوں پر سے اپنی چھڑی ہٹالے بخدا میں نے حضرت رسولِ خداؐ کو دیکھا ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسین علیہما السلام کے دانتوں اور ہونٹوں کے بوسے لیتے تھے اور فرماتے تھے۔ تم دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہو۔ خدا تمہارے قاتلوں کو ہلاک کرے ان پر لعنت ہو اور دوزخ میں ان کو جگہ ملے۔ یہ بات سنکر یزید کو غصہ آگیا اور ابو برزہ کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔

منقول ہے کہ جب یزید کی نظر اہلحرم پر پڑی تو دیکھا کہ ایک کمسن بچی بار بار اپنے پیر زمین سے اٹھاتی ہے اور رکھدیتی ہے۔ یزید نے پوچھا یہ کون لڑکی ہے۔ کسی نے کہا یہ سکینہ بنت الحسینؑ ہے۔ اب یزید جناب سکینہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ اے لڑکی تو بار بار اپنے پیر زمین سے کیوں اٹھاتی ہے۔ جناب سکینہ نے فرمایا اے یزید تیری فوج نے ہم بارہ اسیروں کے گلے ایک رسّی میں باندھ رکھے ہیں چونکہ ادھر اُدھر کی بی بیاں مجھ سے قد میں لمبی ہیں اس لئے ان کے کھڑے ہونے کی حالت میں جب رسّی کھنچتی ہے تو میں اپنے پیر بار بار اٹھاتی ہوں۔ یہ سنکر یزید نے حکم دیا کہ سکینہ کی گردن کی رسّی ڈھیلی کر دی جائے۔

منتخب ابن رشید میں ہے کہ یزید نے شمر سے کہا کہ میں زینبؑ بنت علیؑ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں کنیزوں کو اس کے سامنے سے ہٹا دے یہ حکم سنتے ہی شمر تازیانہ لے کر بڑھا اور کنیزوں کو جناب زینبؑ کے سامنے سے ہٹانے لگا اور سب تو ہٹ گئیں لیکن ایک زنِ حبشیہ (فضہ رض) کسی طرح ہٹنے پر آمادہ بھی نہ تھی۔ شمر نے چاہا کہ تازیانہ سے جناب فضہ کو اذیت پہنچائے۔ اس وقت یزید کے پس پشت حبشی غلاموں کی ایک جماعت برہنہ تلواریں لئے کھڑی تھی جناب فضہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا اوے تمہاری غیرت و حمیت کو کیا ہو گیا کہ تمہاری قوم اور قبیلہ کی ایک عورت کو شمر تازیانہ سے مارنا چاہتا ہے اور تم چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہو۔ یہ سننا تھا کہ وہ سب حبشی تلواریں سونت سونت کر یزید کے سامنے آگئے اور کہنے لگے۔ اے یزید شمر سے منع کر دے کہ اس زنِ حبشیہ پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ ورنہ ابھی بھرے دربار میں تلوار چل جائے گی یزید یہ حال دیکھ کر خائف ہو گیا۔ اور شمر کو منع کر دیا۔

مومنین اس وقت جناب زینبؑ کا دل بھر آیا۔ سر حسینؑ کی طرف منہ کر کے کہنے لگیں۔ اے غیرت دار بھیّا ایک زنِ حبشیہ کے بچانے والے تو اس دربار میں اتنے موجود ہیں مگر آہ تمہاری دکھیا بہن کا بچانے والا یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۵

اٹھائیسویں مجلس

تفسیر آیۂ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ اور حالِ اہلِ حرم در زندانِ شام

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ تَعَالٰی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اے رسول اپنے قریب تر عزیزوں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ) منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت رسولِ خدا نے تمام اولادِ عبدالمطلبؓ کو دعوت کے سلسلہ میں جمع کیا۔ جب کھانے سے فراغت ہو گئی تو فرمایا اے قوم میں خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایسی چیز لیکر آیا ہوں کہ اگر تم نے اس کو قبول کر لیا تو تمہارا دین اور دُنیا دونوں جگہ بھلا ہو گا میں اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے تم میں سے اپنا ایک وصی و وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ تم میں کوئی ایسا ہے کہ میرا یہ بوجھ بٹالے۔ یہ سنکر سب پر موت کی سی خاموشی چھا گئی اور کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یہ دیکھ کر حضرت علی مرتضیٰ کھڑے ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ میں اس خدمت کو انجام دوں گا۔ حضرت نے فرمایا اے علی بیٹھ جاؤ۔ دوسری بار آپ نے پھر وہی کلمات فرمائے۔ پھر حضرت علیؑ نے کھڑے ہو کر وہی عرض کیا۔ آپ نے پھر ان کو بٹھا دیا اور تیسری بار پھر اپنے الفاظ کا اعادہ کیا۔ اس مرتبہ بھی حضرت علیؑ ہی نے جواب دیا اور وہ سب لوگ ہنسی مذاق کرتے اٹھ کر چل دیئے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ بغیر اپنا وصی اور خلیفہ بنائے دنیا سے چلے گئے وہ بھولتے ہیں۔ حضرتؐ نے تو بعثت کے پہلے ہی روز اپنی خلافت کے مسئلہ کو پیش کر دیا تھا۔ اور بھرے مجمع میں حضرت علیؑ کو یہ کہکر زبان دیدی تھی۔ یَا عَلِیُّ اَنْتَ وَصِیِّیْ وَوَزِیْرِیْ وَخَلِیْفَتِیْ۔ ایسے ضروری امر کو حضرتؐ بغیر انجام دیئے چھوڑ کیسے سکتے تھے۔ رسول تو رسولؐ ہی ہے دنیا کی سلطنتوں کا یہ قاعدہ ہے کہ بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ ولیعہدی کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔

جو وعدہ اپنی وصایت و خلافت کا آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے دعوت ذوالعشیرہ میں کیا تھا ارباب عقل و انصاف فرمائیں کہ اس کا پورا کرنا لازم تھا یا نہیں اور در صورت پورا نہ کرنے کے آپ کی رسالت باقی رہ سکتی تھی یا نہیں۔ جبکہ پہلا ہی وعدہ غلط ثابت ہوتا تو اور وعدوں پر کیونکر اعتبار ہوتا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے جتنے وعدے امور دین کے متعلق تھے ان سب کا تعلق آخرت سے تھا نہ کہ اس دنیا سے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ جتنے اعمال ہیں ان کے تمام ثواب جنت، حور، قصور، کوثر و سلسبیل وغیرہ سب کے سب بصورت وعدہ تھے اور یہ سب وعدے آخرت میں پورے ہونے والے تھے نہ کہ اس دنیا میں۔ یہاں اگر پورا ہونے کے قابل تھا تو وہی ایک وعدہ جو دعوت ذوالعشیرہ میں حضرت علی سے کیا تھا۔ پس اگر یہ وعدہ پورا نہ ہوتا یعنی آپ حضرت علیؑ کو خلیفہ بنا کر دنیا سے نہ جاتے تو لوگوں کو اس بدگمانی کا موقع مل جاتا کہ جب وہ وعدہ پورا نہ ہوا جو اس دنیا میں پورا ہو سکتا تھا تو اور وعدوں پر کیا بھروسہ کیا جائے پس اس صورت میں آپ کی رسالت میں لوگوں کو بہت سے شبہات پیدا ہو جاتے آیت نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ اگر تم نے یہ کام کر کے نہ دکھایا تو ایسا ہو جائیگا گویا رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہ دیا۔

یہ امر ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کتاب و حکمت کی تعلیم دینے آئے تھے اور حکمت نام ہے فکر و عمل کا یعنی کسی چیز کو بذریعہ فکر پیدا کرنا اور پھر اس کو بذریعہ عمل کے جاری رکھنا۔ پس اسلام جو در اصل اصلاح روحانی اور انتظام جسمانی کا نام ہے فکر و عمل کے دو مضبوط ستونوں پر قائم ہے۔ جب آنحضرت مبعوث

ہوئے اور آیۂ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی اور آپ نے سب کنبہ کو جمع کرکے دعوتِ طعام و اسلام دی تو صرف حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت کا علانیہ اقرار کیا اور پیغمبرؐ نے اس وقت ان کو اپنا وصی و وزیر و خلیفہ بنایا تو اس کا منشا یہ تھا کہ امرِ فکر جس کے اظہار کو اصطلاحِ شریعت میں تبلیغ رسالت کہتے ہیں، پیغمبرؐ نے اپنی ذات خاص سے متعلق رکھا اور امر تبلیغ رسالت کو بذریعہ عمل جاری کرنا اور اس کو قائم رکھنا علیؑ کے سپرد کیا جس کو اصطلاح شرع میں منصب امامت کہتے ہیں۔

علیؑ اور نبیؐ کے تمام واقعاتِ زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور جس طرح انسانیت کے دائرہ میں عملِ فکر سے اور فکر عمل سے جدا نہیں اسی طرح اُن کے سوانح عمر بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

ظاہر ہے کہ عین ابتدائے دعوتِ اسلام کے وقت پیغمبرؐ نے علیؑ مرتضیٰ کو جو امر سپرد کیا یا جس امر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آنحضرتؐ نے علیؑ کو مقرر کیا آپ اس پر آخر عمر تک برابر قائم رہے۔ مثلاً امر رسالت میں پہلے مسئلہ توحید تھا جو فکر سے متعلق ہے اور جس کو پیغمبرؐ نے سب سے پہلے ظاہر کیا۔ اسی مسئلہ توحید کو بذریعہ عمل جاری کرنا شرک کو مٹانا تھا اور شرک کو مٹانا ممکن نہ تھا جب تک وہ لوگ قتل نہ کئے جاتے جو خدا کا شریک دوسروں کو قرار دیتے تھے

جیسے یہ امر یقینی ہے کہ آنحضرتؐ نے مسئلہ توحید کو ظاہر کیا ویسے ہی یہ امر بھی یقینی ہے کہ پیغمبرؐ نے بذاتِ خود اور اپنے ہاتھ سے نہ کسی کافر و مشرک و بُت پرست کو قتل کیا۔ اور نہ کسی بُت کو توڑا۔ البتہ یہ سب کام حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھوں انجام پائے۔ خانۂ کعبہ میں جو بُت سب سے اونچے تھے اُن کو گروانے کے لئے پیغمبرؐ نے یہاں تک کیا کہ علیؑ کو اپنے دوش پر سوار کیا: تاکہ اس امر میں کوئی شبہ نہ رہے کہ احکامِ اسلام کی تعمیل کرنے والا اور ان کا جاری اور قائم رکھنے والا علیؑ کے سوا اور کوئی نہیں اور کارِ امامت ان کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ پیغمبرؐ کی قوتِ فکری اور علیؑ کی قوتِ عملی سے خانۂ کعبہ بتوں سے پاک ہوا۔ اور ان کے پوجنے والے اور امر توحید میں مزاحمت کرنے والے نیست و نابود ہو گئے۔ یہ ہے مراد جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ سے نبیؐ اور علیؑ اس آیت کے مصداق ہیں۔ ایسا شدید اتصال رکھتے ہیں کہ جدائی ممکن ہی نہیں۔ نبیؐ حق کو لائے اور علیؑ نے باطل کو بھگایا۔

جب خانۂ کعبہ بتوں سے اور مکہ ان کے پرستش کرنے والوں سے پاک ہوا تو پیغمبرؐ نے طائف کے بُت توڑنے کے لئے علیؑ مرتضیٰ کو بھیجا اور آپ نے وہاں کے تمام بُت توڑ کر گرا دیئے اور یوں بُت شکنی کا اتمام آپ کے ہاتھوں سے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی دونوں بزرگوار اپنے جد حضرت ابراہیمؑ کا نمونہ بُت شکنی میں ہوئے۔ ان میں سے ایک نے حکم کیا دوسرے نے عمل۔

علیؑ کے سوا جتنے مسلمان پیغمبرؐ کے ساتھ تھے سب بتوں کی پرستش کئے ہوئے تھے۔ بعض صحابہ کی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی شغل میں گزر چکا تھا۔ اگر علیؑ کے سوا دوسرا بُت شکنی پر مامور ہوتا تو اس کی طبیعت میں بتوں کی پہلی وقعت کی وجہ سے ضرور جھجک ہوتی اور بے دھڑک یہ خدمت انجام نہ دے سکتا۔ اس طبعی معاملہ کا اس زمانہ میں بھی تجربہ ہے۔ اگرچہ ہر مولود فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ماں باپ یہودی اور مجوسی و عیسائی بنا دیتے ہیں اور جب ان کا ایک حصۂ زندگی اس حالت میں گزر جاتا ہے اور کفر ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے اور پھر وہ مذہب اسلام قبول کرتے ہیں تو وہ دینِ سابق کے احکام کو باطل تو سمجھنے لگتے ہیں لیکن عمل کے وقت ایسے امور کی بابت جو اسلام میں جائز ہیں اور دیگر ادیان میں ممنوع۔ ان کو ایسی کراہت آتی ہے کہ اس کے ارادہ سے قے ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی ہندو مسلمان ہونے کے بعد اگر گائے کا گوشت کھلانے کو کہو گے تو وہ یقیناً گھبرا جائیگا اور اگر کھائے گا تو ضرور قے کر دے گا۔ اور یہ حالت اس کی مدت دراز تک رہے گی۔ اس کے برخلاف حالت اُس مولود کی ہے جو فطرتِ اسلام پر پیدا

ہوا ہو اور دائرۂ اسلام ہی میں نشو ونما پا کر جوان ہوا ہو اور اُسی میں بوڑھا ہو کر مرا ہو۔ بچپن سے لے کر آخر عمر تک معصوم رہا ہو۔ ان دونوں حالتوں میں علیؑ اور غیر علیؑ کی صورت ایسی نظر آجاتی ہے جیسے آئینہ میں کوئی صورت دیکھے۔

پیغمبرؐ نے جب ابتدائی دعوتِ اسلام دی تھی تو یہ جان لیا تھا کہ مسئلہ توحید کے قائم کرنے کا عمل سوائے علیؑ کے کوئی نہ کر سکے گا۔ اور جان لیا تھا کہ جیسے بت پرستی میں نے نہیں کی علیؑ نے بھی نہیں کی۔ علیؑ اس کو بے دھڑک عمل میں لائے گا۔ اور جو میں کرنا چاہوں گا وہ کرے گا۔

وقتِ ہجرت پیغمبرؐ نے دیگر مسلمانوں کو پہلے سے مدینہ روانہ کر دیا۔ ابوبکر و علیؑ باقی رہ گئے۔ وقتِ ہجرت علیؑ کو بستر پر سلایا اور اپنی ردائے خاص جو شہر حضر موت سے پیغمبرؐ کے لئے ہدیہ آئی تھی اور جس کو لوگ پہچانتے تھے کہ حضرت کی ہے اُڑھا دی تاکہ کفار یقین رکھیں کہ پیغمبرؐ خود سوتے ہیں۔ کوئی پیغمبرؐ ایسا نہیں کرتا کہ اپنا لباس پہنا کر دوسرے کو اپنے ہونے کا یقین دلائے۔ بلکہ اگر کوئی شخص پیغمبرؐ کے ساتھ التباس کرے اور اپنے کو پیغمبر بنا کر دکھائے تو واجب القتل ہو جائے گا۔ البتہ پیغمبرؐ اسی کے لئے ایسا کر سکتا ہے۔ جس کو مثل اپنی ذات کے سمجھتا ہو۔

رسولؐ کا مکہ سے ہجرت کر جانا اور علیؑ کا تین روز تک تن تنہا رہنا ایسا ہی تھا جیسے پیغمبرؐ اس زمانہ میں جبکہ کوئی مسلمان نہ تھا۔ تن تنہا خدا کا نام لینے والے تھے۔

غور کی بات یہ ہے کہ پیغمبرؐ شبِ ہجرت ایسے خورد سال نوجوان کو جس کی پرورش اور تعلیم پیغمبرؐ نے بطور اپنے فرزند کے کی ہو اور جس نے دنیا میں کسی قسم کا لطف نہ اٹھایا ہو ایسے خطرناک مقام پر کیوں چھوڑ گئے؟ جبکہ قتل ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ نیز کفار کی اس طعن کا بھی خیال تھا کہ خود تو جان بچا کر چلے گئے اور ایک نوجوان کو اپنا فدیہ بنا دیا۔ ابوبکر جو سن رسیدہ اور زیست کا مزہ چکھے ہوئے تھے۔ ان کو علیؑ کے بجائے بستر پر نہ لٹایا۔ حالانکہ بظاہر ان کو زیادہ زندہ رہنے کی ضرورت نہ تھی اور خود ان کا بجائے علیؑ بستر پر لیٹ رہنے کی خواہش نہ کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ پیغمبرؐ کے نزدیک وہ اس کام کے اہل نہ تھے اور ابوبکر خود بھی جانتے تھے کہ جانشینِ نبی میرا حق نہیں کیونکہ شروع دعوتِ اسلام کے وقت پیغمبرؐ علیؑ کو اپنا نذیر بنا چکے تھے پس ممکن ہے کہ یہ خواہش دل میں ہو کہ علیؑ قتل ہو جائیں تو مقصود بر آئے۔

رسولؐ کا علیؑ کو اپنی جگہ لٹانا اور ابوبکر کا وہاں چھوڑنا صداقتِ پیغمبرؐ اور ان کے دین کی دلیل ہے۔ ہر پیغمبرؐ کو لازم ہے کہ امر تبلیغ میں اپنی جان تک صرف کرنے سے دریغ نہ کرے۔ مگر یہ وقت ابتدائے تبلیغ رسالت کا تھا اور امر تبلیغ رسالت بہت کچھ باقی تھا۔ اس موقع پر پیغمبرؐ کو اپنی جان کی حفاظت ویسی ہی لازم تھی جیسے کہ امر تبلیغ رسالت میں قتل ہو جانا۔ پس ضرور تھا کہ پیغمبرؐ اپنی جان کی حفاظت کریں اور بجائے اپنے کسی ایسے شخص کا قتل ہو جانا گوارا کریں جو بمنزلہ نفسِ رسولؐ ہو۔ اسی قسم کے واقعات نے تو زبانِ پیغمبرؐ سے علیؑ کو نفس کہلوایا ہے۔ جس کی خبر خدا نے دی ہے اور ایسی ہی عدیم المثال جاں نثاریوں کی وجہ سے پیغمبرؐ نے علیؑ کی نسبت کہا ہے لحمک لحمی و دمک دمی۔ کیا جعفرؓ و عقیلؓ جو حقیقی بھائی حضرت علیؑ کے تھے بنظر مساوات فی القرابت اس قول کے مصداق ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں پیغمبرؐ نے ان کو کب اس طرح پالا تھا جس طرح علیؑ کو۔ جب علیؑ پیدا ہوئے پیغمبرؐ نے اپنی گود میں لیا اور ہمیشہ ان کی نگہداشت کرتے رہے۔ زمانۂ قحط میں حضرت ابو طالبؑ سے لے کر ان کی پرورش کی۔ بیشک یہی بدلہ اس پرورش کا تھا جو حضرت ابو طالبؑ نے پیغمبرؐ کو حضرت عبد المطلبؑ سے لے کر کی تھی۔ پیغمبرؐ نے جب سے علیؑ کو لیا پھر جدا نہیں کیا اور اپنی ذاتی کمائی جس طرح اپنے اوپر صرف کرتے رہے ویسے ہی علیؑ پر صرف کی۔ پس جس طرح پیغمبرؐ کا گوشت پوست پیدا ہوا اسی طرح علیؑ کا ہوا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ امر قبیح و حسن افعال جسمانی سے پیدا ہوتے ہیں

اور یہ امر مسلم ہے کہ پیغمبرؐ سے کوئی امر قبیح سرزد نہیں ہوا۔ پس اس ارشاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح میرے گوشت و پوست سے کوئی امر قبیح سرزد نہ ہوگا اسی طرح اے علیؑ تیرے گوشت و پوست سے بھی نہ ہوگا۔

پیغمبرؐ انتہائی عدل کے ساتھ ہر کام کرتے تھے۔ جب شروعِ دعوتِ اسلام کے وقت پیغمبرؐ علیؑ کو اپنا وزیر مقرر کر چکے تھے تو سوائے علیؑ کے کوئی اس کا مستحق نہ تھا کہ جس خطرہ میں پیغمبرؐ خود وقتِ ہجرت تھے بجائے ان کے سو رہے مگر وہی جو ان کا وزیر ہو۔ اگر پیغمبرؐ کسی کو بجائے علیؑ کے بستر پر لٹاتے اور ایسے موقع پر دوسرے کو خطرہ میں ڈالتے تو یہ امر منافی عدالت ہوتا۔ اگر اس جگہ ابوبکر کو لٹا دیتے تو دین کی سچائی کی دلیل پیدا نہ ہوتی۔ کیونکہ بستر پر غیر کو دیکھ کر لوگ کہنے لگتے کہ پیغمبرؐ اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کو تو بچاتا ہے اور دوسروں کو معرضِ ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ یہی خیال اس غیر کے دل میں بھی پیدا ہوتا۔ البتہ ایسے شخص کے دل میں نہیں پیدا ہو سکتا جو علیؑ سا کامل الایمان ہو اور جو حفاظتِ پیغمبرؐ کے مقابل کسی خطرہ کی پرواہ نہ کرتا ہو باوجودیکہ ردائے حضرمَوت یہ اشارہ کر رہی تھی کہ موت حاضر ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی جان بیچے اور خدا کی حفاظت پر بھروسہ کئے انتہائی اطمینان سے سو رہا تھا۔

پیغمبرؐ کو علیؑ کی سچی جاں نثاری اور عدیم المثال شجاعت پر پورا بھروسہ تھا۔ آپ جانتے تھے کہ دوسرا دہشت کے مارے اس مقام پر لیٹ نہ سکے گا۔ اور فوراً بھاگ کھڑا ہوگا جس سے راز فاش ہو کر باعثِ گرفتاری پیغمبرؐ ہوگا۔ اسی وجہ سے علیؑ کو تجویز کیا۔ اور اپنی جان کی کنجی ان کے سپرد کر کے تشریف لے گئے۔ پیغمبرؐ نے جو فکر کی تھی اور اپنی حفاظت کی جو تدبیر سوچی تھی۔ اس کو علیؑ نے اپنے عمل سے ویسا ہی انجام دیا جیسی اُن کی ذات سے توقع تھی۔ اگر علیؑ اس وقت تعمیل میں ذرا بھی قصور کرتے تو بے شک پیغمبرؐ کفار کے ہاتھوں سے قتل ہو جاتے اور ان کے ساتھ ہی دینِ اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ حضرت عمر نے اپنی فقہی کمزوریوں پر نظر رکھ کے بارہا کہا لولا علی لھلک عمر۔ لیکن تمام امت کو علیؑ کے اس عمل پر نظر کر کے اس کا قائل ہونا چاہیئے۔ لولا علی لھلک الرسول۔ پس جس نے اسلام اور رسولؐ دونوں کی حفاظت اپنے عمل سے کی کیا وہ بعد رسولؐ امتِ رسولؐ کا امام بننے کے قابل نہ تھا۔ علیؑ نے جو عمل اس وقت کیا دراصل وہی حقیقتِ امامت ہے۔ کیونکہ امام اسی کو کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے جو کچھ تبلیغ کی ہو اس کو قائم رکھے

درحقیقت شروعِ دعوتِ اسلام کے وقت پیغمبرؐ نے جو علیؑ کو وزیر مقرر کیا تھا وہ اقرار فکری تھا اور شبِ ہجرت اپنی جگہ پر چھوڑنا خلیفہ بنانے کا عمل تھا۔ جانِ پیغمبرؐ کی حفاظت کا واقعہ ایک عجیب واقعہ ہے جس کی ضمن میں حفاظتِ جانِ ابوبکر بھی ہو گئی۔ اگر علیؑ اس وقت ذرا بھی بے احتیاطی کرتے تو پیغمبرؐ کے ساتھ ابوبکر بھی ضرور قتل ہو جاتے۔ کیا اس کا شکریہ ابوبکر پر لازم نہ تھا! کیا علیؑ کا یہ احسان قابلِ فراموشی تھا۔ علیؑ کے ساتھ پیغمبرؐ کا بھی احسان مند ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اگر وہ ایسے شخص کو مقرر نہ کرتے تو ابوبکر بچ نہ سکتے تھے اور جب نہ بچتے تو پھر سقیفہ میں خلافت کیسے پاتے؟ حضرت علی علیہ السلام نے صرف ابوبکر ہی کی جان نہیں بچائی بلکہ غزوات میں اپنی جان پر کھیل کر بہت سے صحابہ کی جان بچائی۔ واللہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو کفار ان کو چن چن کر قتل کر ڈالتے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جیسے کلامِ عرب میں بہ لحاظ فصاحت و بلاغت قرآن کا مرتبہ سب سے اعلیٰ ہے اسی طرح حضرت علیؑ کو بھی افصح و ابلغ مانا گیا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی فصیح و بلیغ کتاب کو سوائے افصح و ابلغ کے دوسرا بھی کما حقہ سمجھ سکتا ہے۔ علیؑ میں یہ فصاحت و بلاغت کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سچ ہے کہ علیؑ کی دماغی ساخت قدرتاً ایسی تھی لیکن اس پر جلا اُس تعلیم کی بدولت ہوئی جو پیغمبرؐ نے

ان کو دی تھی۔ جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا۔ پیغمبرؐ اس کے متعلق ہر ایک بات ان کو بتاتے اور سمجھاتے گئے۔ ایسے شخص کے متعلق کون گمان کر سکتا ہے کہ قرآن کے معنی سمجھنے میں اس سے غلطی ہو سکتی ہے یا اس سے بہتر کوئی آیاتِ قرآنی کی تاویل کر سکتا ہے۔ لوگوں تک قرآن کو پہنچانا رسولؐ کا کام تھا اور مفہوم و مقصود بتانا امام کا کام تھا۔ اسی اعتبار سے رسولؐ نے فرمایا اے علیؑ میں نے جس طرح تنزیلِ قرآن پر جنگ کی ہے ویسے ہی تم تاویلِ قرآن پر کرو گے۔

سورۂ برأت کی تبلیغ کو پہلے آنحضرتؐ نے ابوبکر کو بھیجا پھر موافقِ وحی درمیانِ راہ سے لوٹا کر علیؑ کو بھیجا اس کی حقیقت یہ تھی کہ آیاتِ قرآنی کے معنی جیسے علیؑ سمجھتے تھے ابوبکر نہیں سمجھتے تھے۔ مزید یہ اندیشہ تھا کہ اگر کسی نے ان آیات کا مفہوم و مصداق پوچھ لیا تو جواب نہ دے سکیں گے علیؑ کے متعلق یہ خدشہ نہ تھا وہ مثلِ پیغمبرؐ کے صحیح مراد جانتے تھے۔ سلاطین ہمیشہ ایسے ہی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں جس کی قوتِ فکر و عمل دونوں پر ان کو اعتماد ہوتا ہے اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ وہ شاہی نوشتہ کا صحیح مطلب سمجھا دے۔

پہلے ابوبکر کو کیوں بھیجا تھا؟ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اگر پیغمبرؐ کسی کو امرِ تبلیغ کے لئے معین کر بھی دے اور خدا اس کو نہ چاہے تو اس معاملہ میں پیغمبرؐ کی چل نہیں سکتی۔ اس سے بڑا عقدہ یہ حل ہوا کہ جو لوگ رسولؐ پر اتہام لگاتے ہیں کہ وہ علیؑ کی محبت میں ایسے چور تھے کہ ہر بات انہی کیلئے چاہتے تھے ان کی بات کا جواب ہو جائے۔ بھلا بغیر مرضیٔ خدا پیغمبرؐ کیسے چاہ سکتا ہے نیز یہ کہ جب ایک سورت کی تبلیغ بغیر حکمِ خدا ابوبکر نہ کر سکے تو بھلا ان کو بعدِ حکمِ خدا خلیفۂ رسولؐ بننا کیونکر جائز تھا۔ ان کی قابلیت تو اسی سے ظاہر ہے۔ پس جب رسولؐ کو یہ اختیار نہ دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے جسے چاہیں امرِ خلافت سپرد کر دیں تو بھلا مسلمانوں کے اجماع پر اسے کیونکر موقوف رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اطمینان بخش وہ واقعہ ہے جب جب رسولؐ نے علیؑ کو ہدایت کے لئے یمن بھیجا تھا اور بغیر جنگ وہاں کے لوگ ایمان لائے تھے اور جب نصاریٔ نجران سے جزیہ وصول کرتے ہوئے حجۃ الوداع میں آ شریک ہوئے تھے کیا یہ واقعات ظاہر نہیں کرتے کہ پیغمبرؐ نے اپنی طرف سے کارِ تبلیغِ رسالت اور اس کا قائم و جاری رکھنا علیؑ مرتضیٰ کے سپرد کیا تھا اور آپ کی قوتِ عمل رسولؐ کی قوتِ فکر کے ساتھ ساتھ کام کر رہی تھی۔

دینِ اسلام مسلمانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ خدا اور رسولؐ کا بنایا ہوا ہے۔ پس حقیقی خلیفۂ رسولؐ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا اور رسولؐ بنائیں نہ کہ وہ جس کو مسلمان اجماع کر کے بنالیں۔ ایسا شخص خلیفۂ رسولؐ نہ ہوگا۔ بلکہ خلیفۃ الناس کہلائے گا۔ اسلام کا بادشاہ اور رسولؐ کا خلیفہ تو وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں وہ تمام خصوصیات ہوں جو رسولؐ میں پائی جاتی ہیں اور جس نے امرِ فکری رسولؐ کو اپنی قوتِ عمل سے کامل اور تمام کیا ہو ایسا ہی شخص صحیح مرکز پر اسلام کو قائم رکھ سکتا ہے۔

شرافتِ نسبی جس کو عرب خلافت و سلطنت کے لئے بہت مانتے تھے۔ جو رسول اللہؐ کی تھی وہی علیؑ کی تھی وہ بھی عبدالمطلبؓ کے پوتے تھے۔ وہ بھی بنی ہاشم تھے یہ بھی۔ رسولِ خداؐ بعد پیدائش فوراً خانۂ کعبہ میں لائے گئے تھے علیؑ وہاں پیدا ہوئے۔ بچپن میں جبلی باپ کے یہاں دونوں نے پرورش نہیں پائی جس کمائی سے رسولؐ کا گوشت و پوست پیدا ہوا اسی سے علیؑ نے نشو و نما پائی۔ جس جگہ پیغمبرؐ پلے وہیں علیؑ پلے جس مکان میں وہ رہے وہیں یہ رہے دونوں نے کسی وقت شرک نہیں کیا۔ ایک زمانہ ایسا تھا جب رسولؐ جوان تھے اور علیؑ کم سِن تھے اور کوئی اور مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں سوائے رسولؐ اور کوئی حامیٔ توحید مکہ میں نہ تھا۔ ایک زمانہ ہجرت کا وہ تھا جبکہ سب مسلمان

اور پیغمبرؐ خود مکہ سے ہجرت کر گئے تھے۔ اور علیؑ کے سوا توحید پرست اور حامیٔ اسلام کوئی دوسرا مکہ کے اندر نہ تھا۔

جس طرح پیغمبرؐ آخری پیغمبرؐ ہیں اسی طرح علیؑ آخری مہاجر ہیں۔ اشاعت میں جیسے پیغمبرؐ کی جان ہلاکت میں پڑی ویسے ہی علیؑ کی۔ اگر اپنی زوجہ کی وجاہت سے پیغمبرؐ نے فائدہ حاصل کیا تو علیؑ نے بھی اپنی زوجہ کی روحانی وجاہت سے فائدہ حاصل کیا۔ جس چادر کو رسولؐ نے اوڑھا اسی کو علیؑ نے اوڑھا اور جس پر رسولؐ سوار ہوئے یعنی دلدل اسی پر علیؑ سوار ہوئے۔ ناقۂ غضبا جس طرح رسولؐ کی سواری میں رہا علیؑ کی سواری میں بھی رہا۔ ذوالفقار جو پیغمبرؐ کو ہدیہ ملی تھی وہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو عطا فرمادی۔ اسی طرح جو عمامہ رسولؐ سر پر رکھتے تھے اور بمنزلۂ تاج تھا وہی علیؑ نے استعمال کیا۔ جو اسلحہ رسولؐ کے تھے وہی علیؑ کے تھے جس طرح پیغمبرؐ کو کسی جنگ میں ہراس و گھبراہٹ نے نہیں گھیرا اسی طرح علیؑ بھی اس سے دوچار نہ ہوئے جس طرح رسولؐ بحالت جنابت مسجد میں جاسکتے تھے اسی طرح علیؑ بھی جاسکتے تھے۔ چونکہ علیؑ نفس رسولؐ تھے لہٰذا سوائے منصب رسالت اور صفات مختصۂ نبوت اور تمام فضائل و مناقب میں حضرت علی علیہ السلام آپ کے شریک تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے بیٹے بھی رسولؐ کے بیٹے قرار پائے نبیؐ نے اپنی پیاری بیٹی علیؑ کے سپرد کی تھی۔ علیؑ نے اپنی اولاد پیغمبرؐ کے سپرد کردی۔

افسوس صد افسوس جس قدر پیغمبرؐ سے علیؑ کو زیادہ قربت تھی اسی قدر لوگوں نے ان کے احترام کے مٹانے میں زیادہ کوشش کی۔ رفتہ رفتہ معاویہ وغیرہ کی کوششوں سے ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ جناب فاطمہ حضرت رسولِ خداؐ کی کون تھیں اور حسنین علیہما السلام کو آنحضرت سے کیا رشتہ تھا چنانچہ صاحب کنز المصائب لکھتے ہیں کہ جب اہلِ حرم زندانِ شام میں تھے تو ایک روز امام زین العابدین علیہ السلام نے زندان بان سے فرمایا اے شخص تو کس دین کا پیرو ہے۔ اس نے کہا میں مسلمان ہوں فرمایا تو یہ بھی جانتا ہے کہ تیرے رسولؐ کی اولاد میں کون کون ہے۔ اس نے کہا ہمارے رسولؐ کے اولاد ہی نہ تھی۔ فرمایا تو نے فاطمہ زہراؑ کا نام نہیں سنا۔ اس نے کہا میں نہیں جانتا یہ کون ہیں فرمایا حسنؑ و حسینؑ کو بھی جانتا ہے اس نے کہا ہاں صرف حسینؑ کے متعلق اتنا جانتا ہوں کہ وہ مکہ کا ایک باغی تھا جس نے یزید بن معاویہ پر خروج کیا تھا۔ یزید کی فوج نے اس کو قتل کردیا۔ یہ سنکر آپ رونے لگے اور دیر تک اسے تمام واقعات اور تعلقات سمجھاتے رہے جب اس کو حقیقتِ حال سے آگاہی ہوئی تو رونے اور منہ پر طمانچے مارنے لگا پھر ہاتھ باندھ کر عرض کی یا ابن رسول اللہ جو سختیاں میں نے نادانستہ آپ پر کی ہیں ان کو معاف فرمایئے۔ آہ مجھے علم نہ تھا کہ اس قید خانہ میں اولادِ رسولؐ بند ہے۔ خدا یزید بن معاویہ کو غارت کرے اے فرزند رسولؐ آج ہی سے میں اپنی اس ملازمت سے سبکدوش ہوتا ہوں۔

منقول ہے کہ ظالموں نے اہلِ حرم کو ایک ایسے تنگ و تاریک قید خانہ میں مقید کیا تھا جہاں نہ ہوا کا گزر تھا نہ روشنی کا۔ آہ ایسے مقام پر بیکس بی بیوں اور یتیم بچوں نے جس طرح تڑپ تڑپ کر اپنے دن اور راتیں گزاری ہیں اس کا بیان ہونا ناممکن ہے ایک روز جب امام زین العابدینؑ علیہ السلام کا دل زیادہ گھبرایا تو آپ طوق و زنجیر سنبھالے قریب در زندان کے تشریف لائے اور زندان بان سے فرمانے لگے اے شخص اس تاریکی میں پڑے پڑے میرا دم گھبرا گیا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے زندان سے باہر نکل کر تازہ ہوا کھالوں۔ وہ شخص اہلِ دل تھا رحم آگیا اور زندان کا دروازہ کھول دیا۔ حضرت دوہری بیڑیاں اور خاردار طوق اٹھائے۔ قریب درِ زندان کے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے بیٹھ گئے۔ اتفاقاً محبانِ اہلبیتؑ میں سے ایک شخص ادھر سے گزرا۔ وہ مدینہ میں آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہو چکا تھا۔ آپ نے اس کو پہچان کر اپنی گردن

مجھ کالی۔ آہ دنیا میں کوئی عزیز ذلیل نہ ہو۔ جب کوئی شناسا ایسی حالت میں مل جاتا ہے تو سخت ندامت ہوتی ہے۔ وہ شخص دیر تک آپ کو بغور دیکھتا رہا۔ دل میں کہتا تھا یہ صورت تو خاندانِ رسالت سے ملتی جلتی ہے۔ مگر ان سے اور زندان سے کیا تعلق۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو پاس آ کر کہنے لگا اے اسیرِ بلا تم کس خاندان سے ہو اور کس جرم میں قید ہوئے ہو۔ حضرت نے ایک آہ سرد بھر کر فرمایا اے شخص تجھے کیا بتائیں کہ ہم کون ہیں۔ بس اب تو اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یزید بن معاویہ کے اسیر ہیں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا۔ ہم مدینۂ رسولؐ کے رہنے والے ہیں اور خاندانِ رسولؐ سے ہیں یہ سنتے ہی اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اور بہت غور سے حضرت کے چہرے پر نظر کر کے کہنے لگا واقعی علیؑ بن الحسینؑ۔ آپ علیؑ بن الحسینؑ تو نہیں۔ فرمایا ہاں میں وہی ہوں۔ اب تو اس کو تابِ ضبط نہ رہی پیروں پر سر رکھ کر کہنے لگا۔ اے میرے سید و آقا یہ غلام آپ پر سے فدا ہو آپ کو کس جرم میں ظالموں نے قید کیا ہے۔ مولا کاش یہ بیڑی میرے پیروں میں پڑی ہوتی۔ یہ خاردار طوق میں پہنے ہوئے ہوتا۔ آہ مولا تیری عزت و بیکسی کے نثار یہ کیا انقلاب ہو گیا میرے سید و مولا حضرت ابو عبداللہ الحسین کہاں ہیں۔ یہ سنکر بیمار کربلا اس سے گلے مل کر زار زار رونے لگے اور تمام واقعات بیان کرنے شروع کئے۔ ابھی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک نہایت نحیف و زار آواز زندان کے اندر سے آئی۔ بیٹا سید سجادؑ بڑی دیر لگائی جلد آؤ کہ مجھے اتنی دیر جدائی کی تاب نہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سے فرمایا اے شخص اب میں رخصت ہوتا ہوں کیونکہ میری پھوپی زینبؑ مجھے قید خانہ میں یاد فرما رہی ہیں۔

جب آپ اندر پہنچے تو جناب زینبؑ نے بے اختیار گلے میں باہیں ڈال دیں اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ بیٹا باہر کس سے گفتگو کر رہے تھے۔ عرض کی ہمارا ایک دوست اتفاقاً ادھر آ نکلا تھا میں اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ آہ ذریتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دوستوں کو کیسی ترس گئی تھی۔ دوست کا نام سنتے ہی جناب زینبؑ کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں ہوئے۔ فرمانے لگیں بیٹا سید سجادؑ وہ بندۂ مومن چلا گیا یا ابھی ہے۔ اگر ہو تو ذرا بلا لو۔ زینبؑ کو بھی کچھ کہنا ہے۔ امام علیہ السلام نے آواز دے کر فرمایا اے شخص ذرا درِ زندان کے قریب آؤ کہ میری پھوپی تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ جب وہ بندۂ مومن قریب آیا تو جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹا سید سجادؑ پہلے تو ہمارے اس دوست سے میرا سلام کہو۔ یہ سننا تھا کہ وہ شخص رونے لگا اور منہ پر طمانچے مار کر کہنے لگا۔ اللہ اللہ غلاموں کا یہ مرتبہ ہو گیا کہ شہزادیاں ان پر سلام بھیجتی ہیں۔ مولا ثانی زہراؑ کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچایئے اور میری طرف سے اٹھارہ بنی ہاشم کا پرسا دیجئے۔ اور یہ فرما دیجئے کہ اگر کوئی خدمت اس غلام کے لائق ہو تو بیان فرمایئے تاکہ بجا لائے جناب زینبؑ نے فرمایا اے بھائی دخترِ زہراؑ دو باتیں تم سے کہنا چاہتی ہے اول یہ کہ جب ٹھنڈا پانی پیو تو اپنے مظلوم آقا کی پیاس یاد کر لینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اپنے شہیدوں کو جی بھر کر نہیں رو سکے۔ لہذا مقتضائے محبت یہ ہے کہ ہمارے دوست صفِ ماتم بچھا کر اپنے مظلوم امام علیہ السلام کے مصائب یاد کر کے گریہ و بکا کریں۔ یہ سنکر وہ بندۂ مومن دھاڑیں مار مار کر رویا اور پھر سلام رخصتی کر کے روانہ ہوا۔

منقول ہے کہ ایک روز جناب زین العابدین علیہ السلام نے دیکھا کہ جناب زینبؑ بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہیں۔ آپ بے چین ہو گئے اور جناب زینبؑ کے قریب آ کر فرمایا اے پھوپی اماں مجھے زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ آپ جیسی عاشقِ خدا بی بی کو میں بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے سخت سے سخت حالات میں بھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی فرمایئے اس کا کیا سبب ہے۔ ارشاد فرمایا بیٹا اس کا سبب

نہ پوچھو تم سے نہ سُنا جائے گا۔ فرمایا نہیں میں سُننا چاہتا ہوں۔ جب جناب زینبؑ مجبور ہوئیں تو جناب اُمِ کلثوم سے فرمایا بہن تم ذرا بیمار بھتیجے کا بازو پکڑو ایسا نہ ہو کہ یہ غش کھا کر گر پڑیں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا سنو بیٹا جو کھانا یزید کے یہاں سے ہم اسیروں کے لئے آتا ہے وہ مقدار میں اتنا کم ہوتا ہے کہ کسی طرح ہم سب کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ میں آج تک اپنے حصہ کا کھانا بچوں کو کھلاتی رہی ہوں۔ بیٹا جب تک بدن میں جان رہی کھڑے ہو کر نماز ادا کی لیکن اب اس پر قادر نہیں۔ یہ سننا تھا کہ بیمار کربلا آہ کا نعرہ مار کر بیہوش ہو گئے۔ ہائے اولادِ رسولؐ کے ستانے میں ان ظالموں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔

چونکہ یہ زندان محلِ یزید کے قریب تھا اس لئے دکھیا عورتوں اور بچوں کو بآوازِ بلند رونے کی بھی اجازت نہ تھی۔ آہ نازوں کے پالے بچے اس زندان کی تاریکی میں کیسے گھبراتے تھے۔ ٹھنڈا پانی پینے اور تازہ ہوا کھانے کو ترس گئے تھے۔ ان بچوں میں سب سے زیادہ تباہ حالت جناب سکینہ بنت الحسینؑ کی تھی۔ آہ باپ کی چھاتی پر سونے والی بچی جب رات کو خاک پر سوتی تھی اور اپنے باپ کی یاد میں بلبلا کر روتی تھی تو سیدانیاں تڑپ جاتی تھیں۔ جناب زینبؑ بچی کا دل بہلانے کے لئے کربلا کی کہانی سناتی تھیں۔

ایک روز جناب سکینہ یادِ پدر میں بہت بے چین تھیں اور بار بار جناب زینبؑ سے کہتی تھیں مجھے میرے بابا جان سے ملا دو ہائے وہ اس زندان میں چھوڑ کر کہاں چلے گئے میں ان سے ظالموں کے ظلم کی شکایت کروں گی۔ اسی حالت میں نیند آگئی۔ خواب میں امام حسین علیہ السلام کو دیکھا۔ آنکھ کھلی گھبرا کر ہر طرف دیکھنے لگیں۔ جناب زینبؑ نے پوچھا سکینہؑ بیٹی کیا دیکھتی ہو۔ رو رو کر کہنے لگیں ہائے میرے بابا جان کہاں چلے گئے۔ ابھی تو یہاں تھے مجھے اپنی چھاتی سے لگائے کہہ رہے تھے سکینہؑ گھبراؤ مت تمہاری مصیبت کا زمانہ ختم ہوا کل رات تم ہمارے پاس ہوگی۔ یہ سنکر سیدانیوں میں ایک کہرام بپا ہو گیا اور سب نے سمجھ لیا کہ اب سکینہؑ سے دائمی جدائی ہے چنانچہ اسی رات کو اس یتیم حسین علیہ السلام نے انتہائی مصائب و آلام برداشت کر کے زندانِ شام میں انتقال کیا۔ اس وقت بیکس سیدانیوں پر کیا گزر رہی تھی۔ ذاکر کی زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ بالخصوص جناب ربابؑ مادرِ جناب سکینہ کا بہت غیر حال تھا۔ ایک یہی بچی ان کی تسکین قلب کا باعث تھی۔ جناب علی اصغر کو کربلا میں کھو چکی تھیں۔ جناب سکینہؑ سے یہاں جدا ہوئیں۔ بار بار رو رو کر بزبانِ حال کہتی تھیں ؎

زندان کی جنانہ اٹھی نیم جان سے　　　آخر کو چل بسی مری بچی جہاں سے

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ٥

انیتسویں مجلس

تفسیر آیہ قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللَّهِ نُورٌ الخ اور حال رہائی اہل حرم اور زندانِ شام

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۔ (اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب مبین آئی ہے) اس آیت میں کتاب کے ساتھ ایک نور کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مراد حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ایک اور آیت میں قرآن کو نور کہا گیا ہے اور جناب رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برہان چنانچہ فرماتا ہے قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برہان آئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک نور مبین کو نازل کیا ہے) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ رسول بھی نور ہیں اور قرآن بھی نور ہے اور نور کا ساتھ نور سے ہے۔

آسمانی کتابیں اور بھی ہیں مگر وہ کل نور نہیں بلکہ جزو نور ہیں اور قرآن کل نور اور مجسّم نور ہے۔ چنانچہ توریت کے متعلق ہے۔ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ (ہم نے توریت کو نازل کیا اس میں ہدایت و نور ہے) اور انجیل کے متعلق فرماتا ہے وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ (ہم نے اس کو انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے) قرآن تمام عالموں کے لئے ہدایت ہے اور توریت صرف بنی اسرائیل کیلئے وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ۔

جو تعلق روح کو بدن سے، دل کو ایمان سے، آنکھوں کو بصارت سے، سقی کو آب سے ہے۔ وہی کتاب کو نور سے ہے۔ ہدایت عالم انہی دونوں کے دامن سے وابستہ ہے۔ ہر زمانہ میں ان دونوں کا وجود ضروری ہے۔ نور و کتاب مبین کے چارہ حرف ہیں پس دنیا کی ہدایت ان ہی چاروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کو جدا کر دیا جائے تو ہدایت ناقص ہو گی۔ حدیث ثقلین اسی بات پر روشنی ڈال رہی ہے یہی ہدایت کے دو ہاتھ ہیں۔

نور کی حقیقت ہماری سمجھ میں کیا آئے جب نار کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ نار اور چیز ہے۔ نور اور چیز ہے۔ عددی فرق بھی دیکھا جائے تو پلٹ کہے نار میں پانچ ملا دیئے تو نور ہو گیا۔ بیشک پنجتن سے تمسک ناری کو نوری بنا دیتا ہے۔ نور جلانے والی چیز ہے اور نار جلانے والی۔ نار سے خلقتِ شیطان ہے اور نور سے خلقت سید الانس والجان۔ نور ہمیشہ نار پر غالب رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نار میں ڈالا گلزار بن گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنور کی آگ ضرر نہ پہنچا سکی۔ ان لوگوں کا تو ذکر ہی کیا جو شریک نور رسالت تھے۔ جو لوگ ان سے تمسک رکھتے تھے اور کامل الایمان تھے آگ ان کو بھی نہ جلا سکتی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرد خراسانی امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ آپ اپنے دشمنوں سے اپنا حق کیوں نہیں لیتے۔ فرمایا کامل الایمان ناصر و مددگار میرے پاس نہیں۔ اس نے کہا آپ کیا فرماتے ہیں۔ خراسان میں آپ کے ہزارہا شیعہ موجود ہیں جو آپ کے ایک اشارہ پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔ منجملہ ان کے ایک

آپ کا یہ غلام بھی ہے۔ حضرت یہ سنکر خاموش ہو رہے اور گھر میں جا کر کنیز کو حکم دیا کہ تنور روشن کر دے۔ جب آگ کے شعلے بلند ہونے لگے تو آپ نے اس مرد خراسانی کو بلا کر فرمایا ذرا اس میں کود تو پڑو۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا مولا آپ مجھے بے قصور کیوں جلاتے ہیں رہنے دیجئے۔ تاکہ میں آپ کے دشمنوں سے وقتِ ضرورت جنگ کروں۔ حضرت یہ سنکر مسکرائے۔ اتفاقاً اس طرف سے ہارون مکی کا گزر ہوا آپ نے اشارہ سے اُن کو بلا کر فرمایا اے ہارون ذرا اس میں کود تو پڑو۔ یہ حکم سنتے ہی ہارون بے تامل اس میں کود پڑے۔ آپ نے تنور کو بند کر دیا اور اس مرد خراسانی سے بات چیت کرنے لگے۔ وہ بے چین ہو کر عرض کرنے لگا۔ مولا ذرا اس شخص کی تو خبر لیجئے۔ اب تو جل کر خاک ہو گیا ہوگا۔ آپ سنکر تنور پر تشریف لائے۔ اب جو اس کو کھول کر دیکھا تو ہارون مکی کو تلاوتِ قرآن شریف کرتے ہوئے پایا۔

آگ ہی کیا نورِ الہیٰ پر کوئی شے دنیا کی غالب نہیں آسکتی۔ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی اپنے شکم کی آگ سے نہ جلا سکی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں کا پانی ڈبو نہ سکا۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کو درندے ضرر نہ پہنچا سکے۔

آگ چار طرح کی ہوتی ہے (۱) کھاتی ہے پیتی نہیں جیسے نارِ دنیا (۲) پیتی ہے کھاتی نہیں جیسے نارِ اشجار جعل لکم من الشجر الاخضر نارا (۳) کھاتی بھی ہے پیتی بھی ہے جیسے نارِ معدہ (۴) نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ جیسے وہ نار جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر دیکھی تھی۔ دوسری تقسیم اس کی یہ ہے (۱) وہ آگ جو روشنی رکھتی ہے گرمی نہیں رکھتی جیسے نارِ موسیٰ علیہ السلام (۲) گرمی رکھتی مگر نور نہیں رکھتی جیسے نارِ جہنم (۳) گرمی اور نور دونوں رکھتی ہے جیسے نارِ دنیا (۴) نہ گرمی رکھتی ہے نہ نور جیسے نارِ اشجار۔

اس آیت میں عہدِ رسالت کے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب مبین آئی ہے۔ پس جب عہدِ رسالت میں یہ دونوں چیزیں ساتھ تھیں تو بھلا اب کیوں نہ ہوں گی ہم کو اس برکت سے کیوں محروم رکھا جائے گا۔ یہ بات سراسر عدلِ الہیٰ کے خلاف ہے کہ ایک زمانہ کے مسلمانوں کے لئے تو دو ہادی ہوں اور ایک زمانہ والوں کے لئے صرف ایک۔ اگر صرف کتاب خدا کافی ہوتی تو اس کے ساتھ نور کو کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر یہ نور کتاب کے ساتھ نہ ہو تو کتاب پر تاریکی ہے۔ صرف الفاظ نظر آنے سے کام نہیں چلتا تا وقتیکہ مفہوم پر روشنی نہ پڑے اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک نور خدا اس کے ساتھ نہ ہو۔ عدلِ الہیٰ اور ضرورتِ دین کا اقتضا یہی ہے کہ ہر زمانہ میں کتاب کے ساتھ ایک نور رہے۔ کیا قرآن اس کے متعلق کچھ رہنمائی کرتا ہے! ضرور۔ ایک آیت صاف اس مقصد پر روشنی ڈال رہی ہے۔ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِی اُنْزِلَ مَعَہٗ یعنی اس نور کے اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ اتباع کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد اس سے عمل ہے۔ یعنی کتاب علم ہے اور نور عمل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معیت صادق آتی ہے حدیث اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُورٍ وَّاحِدٍ سے واضح ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نورِ محمدیؐ کا جز ہیں۔ پس جب یہ نور صلبِ آدم علیہ السلام میں آتا تو نورِ علی علیہ السلام ساتھ ساتھ تھا اور اس کے بعد جن جن اصلابِ طاہرہ اور ارحامِ طاہرہ میں یہ نور منتقل ہوتا رہا۔ نورِ حضرت علی علیہ السلام اس کے ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ صلبِ عبد المطلبؓ تک یہ شرکت رہی۔ صرف ایک پشت کی جدائی کے بعد جب اس نور کے دونوں حصوں نے بشری جامہ پہنا تو حضرت علی علیہ السلام کو پھر نبیؐ سے معیتِ تامہ حاصل ہو گئی۔ یعنی خدا نے ان تمام صفات کو

حضرت علی علیہ السلام کی ذات میں جمع کر دیا جو معیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے لازم تھیں۔ زبانِ قدرت سے اب اُن کا بیان سُن لیجئے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں رحم کا برتاؤ کرنے والے ہیں۔ تم ان کو رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھو گے۔ اور وہ فضل اور رضوانِ الٰہی کے چاہنے والے ہوں گے اور ان کی پیشانیوں میں سجدہ کا نشان ہوگا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ فضل اور رضوان خدا کا چاہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنے والوں کی خاص صفت ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی سند کس کے ہاتھ آئی۔ اول مرضیٔ الٰہی کو لیجئے اور آیۂ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ پر غور کیجئے۔ صاف بات ہے کہ شبِ ہجرت علیؑ نے فرشِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سو کر مرضیٔ الٰہی کو حاصل کیا۔ اب رہا فضلِ خدا کا حاصل کرنا اس کے متعلق بھی سُن لیجئے يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (اے ایمان والو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا (تو ہم کو اس کی پرواہ نہیں پھر جائے) اللہ عنقریب ایسی قوم کو لے آئے گا کہ خدا ان سے محبت کرتا ہوگا اور وہ خدا سے۔ مومنین کے مقابل وہ فروتن ہوں گے اور کافروں کے مقابل عزیز ہوں گے۔ وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کریں گے۔ یہ ہے اللہ کا فضل جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے) اس آیت میں صاحبانِ فضل کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے سوا اور کسی میں من حیث المجموع نہیں پائی جاتیں۔ پہلی صفت محبت ہے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خیبر میں فرمایا تھا۔ لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ رَجُلًا كَرَّارًا غَيْرَ فَرَّارٍ يُحِبُّ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ پس جب یہ علم جناب امیر السلام نے پایا تو اس حدیث کے مصداق وہی قرار پائے۔ اور جب اس کے مصداق ہوئے تو اوپر والی آیت کے بھی مصداق ہوئے۔ اب رہی مومنین کے ساتھ فروتنی تو وہ جناب امیر المومنین علیہ السلام سے زیادہ کسی نے دکھائی ہی نہیں۔ آپ اپنی عبا کا دامن بچھا کر فقرائے مومنین کو بٹھاتے تھے۔ ان کے گھر کا کام کاج کر دیتے تھے۔ اب رہی کفار کی نظر میں عزت تو اس کا حال عمرو بن عبدود کی بہن سے پوچھو جس نے باوجود اپنے بھائی کا قاتل ہونے کے حضرت کی تعریف میں مدحیہ اشعار کہے۔ جہاد فی سبیل اللہ علی علیہ السلام سے زیادہ کسی نے کیا ہی نہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ فضل اور رضوانِ الٰہی کے مالک جناب امیر علیہ السلام ہیں اور جب ایسا ہے تو آپ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں میں ہیں۔ پس جب عالمِ نورانی اور عالمِ جسمانی دونوں جگہ معیت ثابت ہو گئی تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ آپ کا نور نورِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اور جب ایسا ہے تو بحوائے آیۂ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ آپ کا اتباع تمام اُمت پر واجب ہو گیا۔ پس یہی وہ نور تھا جو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کتاب اللہ کے ساتھ رہا اور اسی نور کی ایک شعاع ہر زمانہ میں کتاب اللہ کے ساتھ رہی اور رہے گی۔ اسی کا اظہار ہمارے چوتھے امام نے اس وقت کیا تھا جب یزید نے رہائی کے لئے اپنے دربار

میں بلایا تھا۔ آپ نے دوران تقریر میں فرمایا اے یزید! کیا تو نہیں جانتا کہ ہم وہ اہلبیت ہیں جن کا ہر لمحہ میں قرآن کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

منقول ہے کہ جب ایک مدت کے بعد یزید بے حیا کو اپنی غلط کاری پر انتباہ ہوا تو اس نے اپنے ایک غلام کو زندان میں بھیجکر جناب امام زین العابدین علیہ السلام کو بلایا۔ مومنین جس وقت جناب زینبؑ کو یہ معلوم ہوا کہ یزید سید سجادؑ کو دربار میں بلا رہا ہے تو ثانیٔ زہراؑ کا دل خوف سے ہل گیا۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے فرمانے لگیں۔ بیٹا! میں تم کو تنہا نہ جانے دوں گی مجھے یزید کی غداری سے خوف معلوم ہوتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شقی تم کو قتل کر دے۔ بیٹا! زینبؑ تمہارے ساتھ چلے گی حضرت زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا اے پھوپھی اماں ابھی آپ کا جانا قرین مصلحت نہیں۔ نہ معلوم اس شقی نے کس غرض سے بلایا ہے۔

الغرض آپ اس غلام کے ساتھ یزید کے محل میں تشریف لائے۔ اس بے حیا کی مکاری دیکھو جوں ہی امام علیہ السلام کو آتا دیکھا استقبال کو آگے بڑھا اور حضرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چاہا کہ تخت پر آپ کو بٹھائے۔ حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ اے یزید بس میرے زخمی دل پر نمک نہ چھڑک۔ یہ وہی تخت تو ہے کل جس کے نیچے میرے پدر مظلوم کا سر رکھا ہوا تھا۔ کیونکر ممکن ہے کہ آج اسی تخت پر میں بیٹھ جاؤں۔ یہ سنکر یزید شرمندہ ہوا اور کہنے لگا اچھا جہاں آپ کا دل چاہے بیٹھ جائیے۔ میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آج آپ کو رہائی کا حکم سنا دوں۔ اے علی ابن الحسینؑ تمہارے باپ کا اصلی قاتل پسر زیاد ہے میں نہیں چاہتا تھا کہ حسینؑ بن علیؑ قتل کئے جائیں۔ بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا خوں بہا آپ کو ادا کر دوں۔ میرے خزانے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں جتنا مال آپ کو درکار ہو لے لیجئے۔ آہ یہ سنتے ہی امام علیہ السلام زار زار رونے لگے اور فرمایا اے یزید حسینؑ کا خوں بہا لینے والا میں کون۔ یہ خوں بہا معدن حشر رسولخداؐ کو دینا جنہوں نے اپنی زبان چسا چسا کر حسینؑ کو پالا تھا۔ یہ خوں بہا علی مرتضیٰؑ کو دینا جنہوں نے اپنی چھاتی پر رکھ کر پالا تھا۔ یہ خوں بہا حضرت فاطمہ زہراؑ کو دینا جنہوں نے چکیاں پیس پیس کر پالا تھا۔ اے یزید اس قسم کی باتیں کر کے کیوں ہمارا کلیجہ پھاڑتا ہے۔

یہ سنکر یزید بد انجام نے اپنا سر جھکا لیا اور کہنے لگا اے علی ابن الحسینؑ اب میں آپ کو رہا کر چکا۔ آپ کو اختیار ہے چاہے یہاں رہئے چاہے مدینہ جائیے۔ حضرت نے فرمایا اس بارہ میں بغیر اپنی پھوپھی سے مشورہ کئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

چنانچہ آپ وہاں سے زندان میں تشریف لائے اور جناب زینبؑ کو اپنی رہائی کی خبر سنائی اور یہ بھی فرمایا کہ یزید نے پوچھا ہے آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں یا مدینہ جانا پسند کرتے ہیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹا! ابھی تو زینبؑ اپنے مظلوم بھائی کی صف ماتم بچھا کر رونے بھی نہیں پائی۔ بیٹا! تم یزید سے کہو کہ دمشق میں ایک مکان ہمیں خالی کرا دے اور جو لوگ ہمارے پاس پرسے کو آنا چاہیں ان کو آنے کی اجازت دے۔ نیز ہمارے شہیدوں کے سر اور لوٹے ہوئے تبرکات ہمارے پاس بھجوا دے تاکہ ہم اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے مل لیں اور جی کھول کر نوحہ و ماتم کریں۔

الغرض ایک مدت تک اسیری کے مصائب اٹھانے کے بعد اہل حرم زندان شام سے نکل کر دمشق کے ایک مکان میں فروکش ہوئے حسینؑ مظلوم اور شہدائے کربلا کی صف ماتم بچھی۔ سیدانیوں نے سیاہ لباس پہنے۔ نوحہ و ماتم کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جوق جوق زن و مرد پرسے کو آنے لگے۔

منقول ہے کہ جب یزید نے سرہائے شہدا کو واپس کیا ہے تو اس وقت اہلِ حرم میں ایک عجیب کہرام برپا تھا۔ جب کوئی سر آتا تھا تو سیدانیاں اپنا سر کھول کر نوحہ و ماتم کرتی تھیں اور جس بی بی سے وہ سر متعلق ہوتا تھا وہ آگے بڑھ کر اس کو اپنی گود میں لے لیتی تھی۔ پہلے بالترتیب انصارِ حسینؑ کے سر آئے سیدانیوں نے ان پر اسی طرح ماتم کیا جیسے اپنے خاص عزیزوں پر کیا جاتا ہے اس کے بعد بنی ہاشمؑ کے سر آنے شروع ہوئے جب عونؑ و محمدؑ کے سر آئے تو جناب زینبؑ نے بڑھ کر چھاتی سے لگا لیا۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے چہروں پر بوسے دیئے اور فرمایا اے فرزندو! دکھیا ماں تمہاری شکرگزار ہے کہ تم نے کربلا میں میری آبرو رکھ لی۔ اس کے بعد یتیم حسنؑ جناب قاسمؑ کا سر آیا۔ جناب اُمِّ فروہ نے دوڑ کر چھاتی سے لگا اور رو رو کر بین کرنے لگیں۔ اے میرے ناشاد و نامراد فرزند آہ تیری جوانی کیسی خاک میں مل گئی آہ اب یہ کوکھ جلی ماں کس کے سہارے جئے گی۔ اس کے بعد مومنین حسینؑ کے کڑیل جوان اُمِّ لیلیٰ کی اٹھارہ برس کی کمائی شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ کا سر آیا سیدانیاں واعلی اکبراہ واقرۃ عیناہ کے نعرے مارتی سر و سینہ پیٹتی استقبال کو بڑھیں۔ جناب زینبؑ نے بڑھ کر گود میں لے لیا اور رو رو کر فرمانے لگیں۔ آہ بیٹا! ظالموں نے تیری یہ چاند سی صورت خاک میں ملا دی۔ آہ میرے کڑیل جوان تجھے کس کی نظر کھا گئی۔ آہ میں نے اس لئے اٹھارہ برس محنت نہ کی تھی کہ ظالموں کے تیغ و تیر کا نشانہ بناؤں۔ بیٹا میرے ارمان خاک میں مل گئے۔ آہ مومنین جب قمرِ بنی ہاشم جناب عباسؑ کا سر آیا تو زوجہ حضرت عباسؑ کو شرم آئی کہ جناب زینبؑ اور اُمِّ کلثومؑ کی موجودگی میں اپنے شوہر کا سر گود میں لیں پس جناب اُمِّ کلثومؑ ہاتھ پھیلا کر بڑھیں اور فرمانے لگیں بھیا عباس آپ کربلا میں میری طرف سے میرے ماں جائے کا فدیہ بنے تھے دکھیا بہن آپ کے سر کے قربان۔ آیئے آپ میری گود میں آیئے دیر تک سیدانیاں سقائے سکینہؑ کے سر پر نوحہ و ماتم کرتی رہیں۔ مومنین اس کے بعد ایک چھوٹا سا سر جھنڈولے بالوں والا آیا۔ آہ جناب ربابؑ بڑھیں اور سر کو چھاتی سے لگا کر فرمانے لگیں۔ بیٹا علی اصغرؑ تمہیں دکھیا ماں کے بغیر کیسے چین آیا۔ آہ ظالموں نے میری گود خالی کر دی۔ آہ یہ ننھی سی جان اس قابل نہ تھی کہ تیرِ ظلم کا نشانہ بنائی جائے۔ آہ آہ بی بی بار بار اصغرِ معصوم کا سر ہاتھوں میں لیکر پیار کرتی اور زار زار روتی تھی۔

مومنین اب مجھے صرف ایک سر کا حال اور بیان کرنا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنے اپنے سر برہنہ کر کے اس سر کا حال سنئے۔ یہ سر کس کا ہے؟ غریبِ نینوا، شہیدِ خنجرِ جفا، سبطِ رسول الثقلین حضرت ابوعبداللہ الحسین علیہ السلام کا ہے۔ جب یہ سر نمودار ہوا تو سیدانیاں اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ کہتی ہوئی بے تابی سے استقبال کو بڑھیں اور وَا حُسَیْنَاہ وَا حُسَیْنَاہ کا شور برپا ہوا۔ جناب زینبؑ نے آگے بڑھ کر اپنے ماں جائے کے سر کو گود میں لے لیا۔ آہ مصیبت زدہ بہن نے، کبنہ موئی بہن نے، فراق رسیدہ بہن نے جب بھائی کا سر پایا ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور فرمانے لگیں۔

اخی یا اخی ایّ المصائب اشتکی
فراقک او ذلّی و ہتکی و غربتی

اے میرے ماں جائے اے میرے شہید برادر دکھیا بہن آپ سے کس کس مصیبت کی شکایت کرے۔ آپ کی جدائی کا بیان کروں یا اپنی ذلت اور بازارِ کوفہ و شام کی تشہیر و ذلت کا حال سناؤں۔ یا دربارِ پسرِ زیاد اور ابنِ معاویہ میں جو ہتک ہوئی ہے اس کا ذکر کروں یا پردیس کی تکلیفوں کا قصہ بیان کروں۔ آہ! مومنین اس وقت اہلِ حرم کے بین سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۵

تیسویں مجلس

تفسیر آیۂ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول الخ اور حال روانگی اہلِ حرم بمدینہ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے اُولی الامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم کسی امر میں جھگڑا کرو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف رد کرو)۔ آیت اتری یوں تھی کہ پہلے اللہ کی اطاعت تھی پھر رسول کی اس کے بعد اولی الامر۔ لیکن تعمیل ہو کر یوں ہو گئی پہلے اولی الامر کی اطاعت پھر رسولؐ کی پھر خدا کی۔ یعنی اطاعتِ اولی الامر اطاعت رسول ہے اور اطاعتِ رسول اطاعتِ خدا ہے۔

اس آیت میں خداوند عالم نے رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے۔ یعنی ایک ہی اطیعوا کے تحت میں دونوں کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اور اولی الامر کا حکم جزمی اور قطعی قرار دیا ہے۔ پس اولی الامر کا معصوم ہونا ضروری ہے پھر کہتے ہیں قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ معصوم کل امت مانی جائے یا بعض امت۔ اگر کسی خاص گروہ یا خاص ذات کو مراد لیا جائے تو یہ دقت ہے کہ ہم معرفت امامِ معصوم اور اس سے استفادہ کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا اولی الامر سے مراد اہل حل و عقد (علماء) ہونی چاہیے جو امت سے ہوں اور اس سے لازم آتا ہے کہ اجماعِ امت حجت ہے اس کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ جب وہ بعض امت یعنی امام معصوم کی معرفت کو متعذر سمجھتے ہیں تو یہ دشواری اہلِ حل و عقد کی معرفت کے متعلق کیوں نہیں یا ان کا شمار بعض امت میں نہیں۔ ان کو لازم تھا کہ کوئی طریقہ ارباب حل و عقد کی شناخت کا ایسا بتاتے جس سے کل امت کو ان کی معرفت کا یقین ہو جاتا۔ جب رازی بعض افراد امت کو اولی الامر جانتے ہیں اور ان کے اجماع کو بمنزلہ عصمت سمجھتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بعض افراد کا انتخاب کس معیار پر ہوگا۔ غالباً علم ہی کو قرار دیا جائے گا لیکن علم کے مدارج و مراتب مختلف ہیں۔ کسی کو کم ہے کسی کو زیادہ۔ پس اس صورت میں ارباب حل و عقد کا انتخاب کرتے وقت کیا طریقہ ہوگا۔ جس سے اعلم ہی چناؤ میں آجائیں اور انقص یا اوسط چھوٹ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن کو ہم نے اعلم سمجھا ہے ان سے زیادہ عالم کچھ لوگ موجود ہوں۔

پھر شیعوں پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شیعہ اپنے امام تک پہنچ ہی نہیں سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترویج و تبلیغ اسلام کا سلسلہ بند ہو جانا چاہیے کیونکہ بعد وفات نہ کوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا سکتا ہے نہ کوئی ان کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ آیت اولی الامر کی اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ہے پس اگر معرفت اولی الامر اور ان سے استفادہ کرنا دشوار اور تکلیف مالایطاق ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ بات کیوں نہیں؟ کیا اس صورت میں اطاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساقط ہو جاتی ہے۔ یہی حال خدا کی اطاعت کا ہے۔ وہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ اور نہ کوئی

اس تک پہنچ سکتا ہے۔

رازی کا یہ حملہ شیعوں پر بارہویں امام علیہ السّلام کے غائب ہونے کی وجہ سے ہے افسوس ہے کہ رازی صاحب شیعوں کے اس عقیدہ پر تو راضی نہیں۔ لیکن یہ مانتے ہیں کہ جب کوئی صاحب کتاب و شریعت رسول صلی علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور نظر سے غائب ہو جاتا ہے تو جب تک دوسرا صاحب شریعت نہیں آتا۔ اسی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی کو صاحب العصر اور صاحب الزماں مانا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا سے رخصت ہوئے تیرہ سو برس سے زیادہ ہو گئے لیکن اب تک ہر مسلمان ان کو حیّ القائم مانتا ہے اور ان کی شریعت کا زمانہ قیامت تک جاتا ہے۔ قرآن ہمارے لئے کتاب ہدایت ہے لیکن اس میں بے شمار آیات متشابہات بھی ہیں۔ اس کا ظاہر و باطن بھی ہے۔ آیات کو شریعت کے قواعد کلیہ سے مطابق کرنا بھی ہے۔ احکام کا استنباط کرنا بھی ہے۔ قواعد کلیہ کو قواعد جزیہ سے منطبق کر کے خطاء سے بچنا بھی ہے۔ پس کیا یہ کوئی معمولی کام ہے۔ کیا اس کے لئے کسی ایسے جانشین نبی کی ضرورت نہیں جو مثل نبی اور نفس نبی ہو تا کہ وہ قرآن سے وقتِ ضرورت استنباط کر سکے۔ ایسے شخص کی اطاعت بھی رسولؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہوگی اور پھر اس کا رسولؐ کی طرح معصوم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ضلالت کا خطرہ نہ رہے۔ رازی صاحب عصمت کی ضرورت تو محسوس کرتے ہیں لیکن اجماع سے عصمت پیدا کرنی چاہتے ہیں اور اس حدیث سے تمسک کرتے ہیں لا تجتمع اُمّتی علی الضّلالۃ میری امت گمراہی پر کبھی جمع ہونے والی نہ ہوگی۔ ان کی یہ نرالی منطق ہماری سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ عقل کیونکر اس بات کو مان لے کہ دس اندھے مل سیانکھے ہو جائیں گے۔ یا سو جاہل مل کر عالم بن جائیں گے۔ یا ہزار خاطی و گنہگار مل کر معصوم ہو جائیں گے۔ ناقص کا مجموعہ ہر حالت میں ناقص ہی رہے گا۔ کامل ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر رازی صاحب فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اگر تم جھگڑا کرو تو خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو پس اگر اولی الامر سے مراد امام معصوم ہوتی تو اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کا بھی حکم ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اور سنّت ہے۔ یعنی ہر مسلمان کے لئے اطاعت کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لازم ہے۔ اور جب کسی امر شرعی میں نزاع ہو تو اولی الامر کے قول کی اطاعت بھی ویسی ہی سمجھنی چاہیے جیسی کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ کتاب و سنت کے معاملہ میں آخری فیصلہ اولی الامر کا ہے جیسا کہ فرماتا ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (کیا وہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوا ہوتا تو وہ اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔ اور اگر وہ اپنے معاملہ کو رسول اور اولی الامر کی طرف رد کریں تو وہ لوگ اصلی بات ان کو بتلا دیں گے۔ جو قرآن سے استنباط کرتے ہیں)

اس آیت میں اللہ نے صرف اولی الامر کی طرف رجوع کرنے ہی کو نہیں بتایا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اولی الامر کی اطاعت کس چیز میں کی جائے۔ یعنی اطاعت ان کے استنباط کی اور اولی الامر کو بھی بتا دیا کہ وہ کون ہیں استنباط کرنے والے۔ یہ اولی الامر مثلِ رسولؐ معصوم ہونے چاہئیں ورنہ ان کے استنباط پر کیونکر مثل قولِ رسولؐ بھروسہ ہو سکتا ہے چونکہ ان کی اطاعت مثل اطاعتِ رسولؐ ہے۔ لہٰذا

پہلی آیت میں صرف رسول کی طرف رجوع کرنے کو کہا اور اولی الامر کا ذکر کیا۔ کیونکہ جب اطاعت ایک قسم کی ہے تو پھر رجوع کرنا بھی ایک ہی قسم کا ہے۔

اس آیت میں جو نزاع کا ذکر ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اگر مومنین اور اولی الامر میں نزاع ہو تو وہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ اگر اولی الامر کے کسی حکم کو اس کے ماتحت خلاف حق سمجھیں تو دو حال سے خالی نہیں یا تو اولی الامر کا وہ حکم درحقیقت خلاف حق ہے اس صورت میں تو وہ اولی الامر نہیں یا اس کے ماتحتوں نے غلطی سے خلافِ حق سمجھا اس صورت میں انہوں نے خلاف نص عمل کیا۔ کیونکہ اولی الامر کی اطاعت واجب تھی اس کو ترک کیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے رسول کو رسول سمجھا ہو اور پھر اس کے حکم کو خلاف حق جانتا ہو۔ پس یہ کہنا بالکل ہے کہ کسی نزاعی معاملہ میں اولی الامر اور اس کے ماتحتوں پر واجب ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے قول کی طرف رجوع کریں۔ اور کسی قول کا حکم خدا اور رسولؐ کے خلاف ثابت ہو تو اس کو غلط سمجھ لیں۔ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت جو مثل اطاعتِ رسولؐ واجب کی گئی ہے بے فائدہ ہے۔ اس صورت میں اللہ اور رسولؐ کے قول کے سوا اولی الامر کوئی چیز نہیں رہتا بلکہ اس کے مخالف جو حق پر ہوں گے وہ اولی الامر بن جائیں گے اور وہ اپنے قول کی اطاعت کرنے والے ہوں گے نہ کہ اولی الامر کی۔

اگر اولی الامر مفترض الطاعۃ نہ ہوتے تو صرف اتنا کہنا کافی تھا کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اولی الامر کے وجوب کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ پھر ایمان والوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو تو خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ قرآن زبان اور محاورہ انسانی پر نازل ہوا ہے۔ خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے یہ مراد ہے کہ جیسے کسی بے علم یا کم علم والے سے کہیں کہ قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرو تو پتہ چلے۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جاہل بطور خود قرآن و احادیث کو دیکھ کر یا خود ان سے استنباط کر کے تنازع کا فیصلہ کرے۔ نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بے علم خود رجوع کرے بلکہ کسی عالم کی طرف جو اعلیٰ درجہ کا علمِ قرآن و حدیث رکھتا ہو رجوع کرے۔ باعتبار اسی محاورہ کے خدا نے خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کا حکم دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب رسولؐ وفات پا جائے اور نزول وحی منقطع ہو جائے تو اولی الامر کی طرف رجوع کرو وہ تمہارے درمیان عدل سے حکم کریں گے۔ اسی لئے خدا نے دوسری آیت میں اولی الامر کی طرف رجوع کو بیان کر دیا۔ اس آیت میں جو تنازع کا ذکر ہے وہ مومنین کا مومنین کے ساتھ ہے نہ کہ مومنین کا اولی الامر کے ساتھ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مومنین میں اولی الامر و غیر اولی الامر اہلبیت و غیر اہلبیت سب شامل ہیں اولی الامر منکم (اولی الامر جو تم میں سے ہے) نے اولی الامر کو ان عام مومنین سے جن پر اطاعت فرض ہے جدا کر دیا۔ اور اولی الامر کو مثل خدا اور رسول مُطاع بنا دیا گیا۔ اور دیگر مومنین خدا و رسولؐ اور اولی الامر کے مطیع ہو گئے۔ اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے مراد قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا ہے کیونکہ یہی دونوں مل کر قانونِ شریعت ہیں۔ پس مقصود یہ ہوا کہ شریعت کی طرف رجوع کرو لیکن احکامِ شریعت کا واضع جب موجود نہ ہو۔ یعنی سلسلۂ نبوت قطع ہو جائے تو ان احکام کا بتلانے والا اور ان سے استنباط کرنے والا کوئی ضرور ہونا چاہیئے کہ جو صاحب شریعت تو نہ ہو مگر مثل صاحبِ شریعت کے حکم کرنے والا ہو۔ پس وہی اولی الامر ہے۔ اگر نزاع میں اولی الامر کو شامل کر لیا جائے اس بناء پر کہ اس

آیت کے شروع میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کہہ کر مومنین سے مخاطبہ کیا گیا ہے اور اولی الامر داخلِ مومنین ہیں لہٰذا فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ کا تعلق ان سے بھی ہے تو پھر رسول کو کیونکر جدا کیا جا سکتا ہے کیونکہ رسولؐ کے مومن ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ پس اس صورت میں آیت کا مضمون بالکل بدل جائے گا۔ یعنی خود ہی رسول جھگڑا کرنے والا اور خود ہی فیصلہ کرنے والا بن جائے گا۔

اگرچہ حکمِ خدا کی حقیقت اور ہے اور حکمِ رسولؐ کی نوعیت اور ہے اور حکمِ اولی الامر کی حالت اور ہے۔ لیکن واجب العمل ہونے کی حیثیت سے سب کے حکم مساوی منزلت رکھتے ہیں۔ اللہ وحی بھیجنے والا۔ رسولؐ وحی لینے والا۔ اور اولی الامر وحی سے استنباط کرنے والا ہے۔ اولی الامر صاحبِ شریعت نہیں بلکہ محافظ شریعت ہے اور قرآن و حدیث سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے والا ہے وہ سرِمو اصولِ شریعت سے تجاوز نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ امورِ شریعت کے موافق حکم دیتا ہے۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ لفظ اولی الامر سے وہ حاکم مراد ہے جس کو رسولؐ کی طرف سے کسی لشکر یا شہر کی حکومت ملی ہو۔ اور اس کی اطاعت اس وقت تک واجب ہو جب تک اس کا حکم خدا و رسولؐ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ نیز یہ کہ اولی کا لفظ ان حکام پر بھی شامل ہے جن کو بعد رسولؐ حکومت ملی۔ غور کے قابل بات یہ ہے کہ اگر اولی الامر سے مراد وہ لوگ ہوں جن رسولؐ کی طرف سے حکومت ملی ہو تو بعد رسولؐ حکومت پانے والے اولی الامر کیسے قرار پائیں گے اور اگر یہ دائرہ وسیع کر دیا جائے تو تمام بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہ اولی الامر بن جائیں گے اور ان سب کی اطاعت رسولؐ جیسی اطاعت ہو جائے گی۔

عام سلاطین کی طرح اولی الامر سے مراد وہ لوگ بھی نہیں ہو سکتے جن کو رسولؐ نے سردار بنا کر کسی لشکر کے ساتھ بھیجا تھا کیونکہ یہ لوگ کبھی مطاع بنتے تھے اور کبھی دوسرے کے مطیع ہو کر جاتے ہیں۔ پس ایسی صورت میں ان کی اطاعت رسولؐ کی سی اطاعت کہاں رہی کیا رسولؐ بھی کبھی مطاع تھے اور کبھی مطیع۔ عہدِ رسالت میں جناب امیر علیہ السّلام کے اور کوئی سردار لشکر ایسا نظر نہیں آتا جو ہمیشہ امیر ہی بن کر نکلا ہو اور ماموور نہ بنا ہو۔ رسولؐ کی یہ امتیاز بخشی علیؑ کے اولی الامر ہونے کی قوی دلیل ہے۔

امام رازی اور ان کے ہم مشرب علماء بادشاہانِ دنیا ہی کو اولی الامر سمجھے بیٹھے ہیں اور باوجود ان کے کھلے ہوئے فسق و فجور کے رسولؐ کی طرح واجب الاطاعت مان رہے ہیں استغفر اللہ۔ بادشاہانِ دنیا کو اولی الامر سے کیا نسبت ہے

طینت جامِ جم از طینت کانِ دگر است
تو توقع ز گلِ کوزہ گراں مے داری

ہم ذیل میں ایک واقعۂ تاریخی درج کرتے ہیں جس سے بادشاہ اور اولی الامر کا فرق بخوبی سمجھ میں آ جائے گا۔ ایک بار ہشام بن عبد الملک حج کے ارادہ سے خانۂ کعبہ میں آیا۔ اتفاقاً اس سال حاجیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ بوسہ دینے کے لئے حجرِ اسود تک نہ پہنچ سکا۔ آخر مجبور ہو کر ایک بلند مقام پر جا کھڑا ہوا کہ خلائق کا ہجوم کم ہو تو جا کر بوسہ دے۔ ناگاہ اس نے دیکھا کہ ایک بزرگ نورانی صورت، پیشانی پر سجدہ کا نشان، سر سے پیر تک سیاہ لباس پہنے ہوئے عصا کے سہارے دروازہ کی طرف سے خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔ لوگ آپ کو دیکھتے ہی کائی کی طرح پھٹ گئے اور دروازے سے حجرِ اسود تک ایک راستہ بنا دیا لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ہاتھوں اور پیروں پر بوسہ دینے کے لئے گرے پڑتے تھے۔ آپ کے ساتھی کہہ رہے تھے۔ ایہا الناس

زیادہ ہجوم نہ کرو تمہارے امام نہایت نحیف و نزار ہیں۔ لیکن لوگ کسی طرح نہ مانتے تھے۔ غرض کہ آپ اسی طرح حجرِ اسود تک پہنچے اور بوسہ دے کر واپس ہوئے۔ ہشام بہ نگاہِ حیرت یہ تمام واقعہ دیکھتا رہا باوجودیکہ وہ بخوبی واقف تھا کہ آپ سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام ہیں۔ مگر بطور تجاہلِ عارفانہ پوچھنے لگا یہ کون شخص تھا جس کی لوگوں نے ایسی غیر معمولی تعظیم کی۔ اس کے ارکانِ سلطنت جو دسترخوانِ نعمت کی مکھیاں تھے یہ سنکر خاموش ہو رہے مگر فرزدق شاعر سے جو پہلو میں کھڑے ہوئے تھے ضبط نہ کر سکا۔ فی البدیہہ امام علیہ السلام کی شان میں ایک قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ قصیدہ بہت طولانی ہے اس لئے چند اشعار کی نقل پر اکتفا کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

هٰذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ ۔۔۔ وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

یہ وہ بزرگ ہیں جن کے نشانِ قدم بطحا جانتا ہے۔ خانہ کعبہ اور مقام حل و حرم پہچانتے ہیں۔

هٰذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمُ ۔۔۔ هٰذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

یہ اس شخص کے بیٹے ہیں جو خدا کے سب بندوں سے بہتر تھا۔ یہ متقی و پرہیزگار صاحب باطن گناہوں سے پاک اور مشہور و معروف ہستی ہیں

مَا قَالَ لَا قَطُّ إِلَّا فِي تَشَهُّدِهِ ۔۔۔ لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاءُهُ نَعَمُ

یہ ایسے سخی ہیں کہ انہوں نے اپنی زبان سے کسی سائل کے لئے "لا" (نا) کہا ہی نہیں۔ اگر تشہد میں لفظ لا نہ ہوتا تو یہ کلمہ مدت العمر ان کی زبان پر آتا ہی نہیں۔

الغرض جب فرزدق قصیدہ پڑھ چکے تو ہشام نے غضبناک ہو کر کہا کیوں اے فرزدق تو ایک مدت سے ہماری سرکار کا وظیفہ خوار ہے۔ لیکن آج تک تو نے میری تعریف میں ایسا پُر زور قصیدہ نہ کہا۔ فرزدق نے فرمایا اے ہشام خاموش ہو تو بھی اپنی ذات میں یہی خوبیاں پیدا کر لے۔ تو بھی اپنے باپ دادا ایسے ہی بنالے میں تیری شان میں بھی ایسا ہی قصیدہ لکھ دوں گا۔ ہشام یہ سنکر غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ حکم دیا کہ فرزدق کو ابھی طوق و زنجیر میں جکڑ کر قید خانے لے جاؤ۔

مومنین آپ نے اولی الامر کے روحانی اثرات کو دیکھا۔ بھلا دنیوی بادشاہوں کے اقتدار کو اس سے کیا نسبت۔ جسموں پر حکومت کرنا اور بات ہے اور روحوں پر حکومت کرنا اور بات ہے۔

الغرض جب امام زین العابدین علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا کہ فرزدق شاعر ہماری محبت میں قید ہو گیا تو آپ کو بیحد صدمہ ہوا۔ چونکہ آپ زندان کی تکلیفیں جھیل چکے تھے۔ اس لئے فرزدق کے مصائب کے تصور سے اور زیادہ دل کڑھا۔ آپ نے ایک رومال میں چند درہم و دینار باندھے اور اپنے غلام سے فرمایا۔ اس کو زندان میں فرزدق کے پاس لے جا اور ہماری طرف سے کہہ بھائی ہمارے پاس مالِ دنیا سے کچھ باقی نہیں ہے۔ یہ حقیر ہدیہ جو بھیجا جاتا ہے۔ اس کو منظور کر لینا۔ غلام وہ عطیہ امام علیہ السلام لے کر فرزدق کے پاس گیا۔ وہ اس وقت در زندان کے قریب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ غلام نے جا کر سلام

کیا۔ فرزدق نے سر اٹھا کر کہا اے شخص تو کون ہے۔ اس نے کہا میں امام زین العابدین علیہ السلام کا غلام ہوں۔ فرزدق نے خوش ہو کر کہا اے شخص ذرا اپنے قدم آگے بڑھا تاکہ میں ان پر بوسہ دوں۔ کیونکہ تو میرے امام علیہ السلام کا غلام ہے۔ زہے نصیب کہ مولا کا قاصد مجھ تک آیا۔ الغرض غلام نے وہ رومال فرزدق کے سامنے پیش کیا۔ اور امام علیہ السلام کا پیغام پہنچایا۔ فرزدق نے پہلے تو اس رومال کو آنکھوں سے لگایا پھر رو کر کہنے لگے۔ اے غلام میرے سید و آقا سے کہہ دینا کہ میں نے آپ کی شان میں یہ قصیدہ کسی طمع دنیوی سے نہیں کہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ روز قیامت جب یہ گنہگار میدان حشر میں آئے تو اپنے دامن کا سایہ میرے سر پر کر لینا۔

مومنین اس وقت مجھے امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک تحفہ اور یاد آگیا۔ جو آپ نے بشیر بن خذلم کو مدینۂ منورہ میں قید یزید سے رہا ہونے کے بعد عطا فرمایا تھا۔

منقول ہے کہ جب اہلبیت دمشق میں شہدائے کربلا کا ماتم ایک ہفتہ کر چکے تو مدینۂ منورہ کو واپس آنے کا قصد کیا۔ یزید نے اپنے ایک سپہ سالار کو جس کا نام بشیر بن خذلم تھا۔ کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس غرض سے متعین کیا کہ وہ اہلِ حرم کے قافلہ کو بحفاظت تمام مدینۂ منورہ پہنچا دے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام دمشق سے روانہ ہوئے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹا سید سجادؑ بشیر سے کہو کہ ہمیں کربلائے حسینؑ کی طرف سے نکال کر لے چلے۔ تاکہ زینبؑ اپنے ماں جائے کی قبر سے رخصت ہولے۔

لکھا ہے کہ جناب جابر بن عبداللہ انصاری جو حضرت رسولِ خداؐ کے خاص صحابی تھے۔ امام حسین علیہ السلام کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے مدینہ سے تشریف لے گئے تھے۔ چونکہ نابینا تھے اس لئے غلام سے کہہ دیا تھا کہ جب کربلائے حسین علیہ السلام نمودار ہو تو مجھ سے کہہ دینا۔ چنانچہ جب سرزمین کربلا پر پہنچے تو غلام نے جناب جابرؓ کو آگاہ کیا۔ آپ فوراً اونٹ سے اتر پڑے۔ عمامہ سر سے پھینک دیا۔ نعلین پیروں سے نکال دیں اور روتے پیٹتے آگے بڑھے۔ غلام سے کہا کہ مجھے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر پر لے چل۔ اس نے کہا اے صحابیٔ رسولؐ یہاں تو بہت سی قبریں ہیں یہ پتہ کیونکر چلے کہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے قبروں کے بیچ میں کھڑا کر دے۔ چنانچہ غلام نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے فرمایا السلام علیک یا ابا عبداللہ پس ایک طرف سے آواز آئی وعلیک السلام یا جابرؓ۔ جابرؓ سمجھ گئے کہ یہی قبر امام مظلوم ہے۔ پس آپ قبر سے لپٹ کر زار زار رونے لگے۔ ابھی قبر سے جدا نہ ہوئے تھے کہ غلام نے کہا اے صحابیٔ رسولؐ مجھے کوئی فوج ادھر آتی نظر آتی ہے۔ آپ نے فرمایا ذرا آگے جا کر دیکھ کہ یہ کون لوگ ہیں۔ غلام تھوڑی دور کھڑا دیکھتا رہا۔ جب دامن گرد چھٹا تو کچھ کالے جھنڈے اور اونٹوں کی ہودجوں پر پردے پڑے نظر آئے۔ غلام نے یہ حال بیان کیا۔ جناب جابرؓ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد واحسیناہ واحسیناہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اونٹ بٹھائے گئے۔ کچھ بی بیاں سیاہ لباس پہنے اونٹوں سے اتریں اور شہداء پر نوحہ و ماتم شروع کیا۔ مومنین جونہی

امام زین العابدین علیہ السّلام کی نظر جناب جابر رضی اللہ عنہ پر پڑی بے اختیار لپٹ گئے اور فرمانے لگے۔ اے جابرؓ میں بستر کا سوگوار علیؑ بن الحسینؑ ہوں۔ قید یزید سے رہا ہو کر آرہا ہوں۔ آہ جابرؓ ہمارا گھر تباہ ہو گیا ہے۔ حضرت ابو عبد اللہ الحسینؑ شہید کردیئے گئے۔ آہ! ہمارے سب عزیز چن چن کر مارے گئے۔ آہ جابرؓ دشمنوں نے ہم کو اسیر کر کے کوفہ و شام میں تشہیر کیا۔ رسن بستہ دربار ابن زیاد اور دربار یزید میں لے گئے ؎

أُقَادُ ذَلِیلاً فِی دِمَشْقَ کَاَنَّنِی مِنَ الزِّنْجِ عَبْدٌ غَابَ عَنْهُ نَصِیْر

میں دمشق میں اس طرح کھینچا کھینچا پھرا جیسے وہ حبشی غلام جس کا کوئی مددگار نہ ہو۔ یہ سننا تھا کہ جناب جابرؓ غش کھا کر گر پڑے اور جب ہوش آیا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

لکھا ہے کہ دو روز اہل حرم کربلا میں رہے قریب تھا کہ روتے روتے ہلاک ہو جائیں۔ جب یہ حال دیکھا تو بشیر نے امام زین العابدین علیہ السّلام سے عرض کی۔ مولا اب مدینہ چلنے کا اہتمام کیجئے۔ کیونکہ ابھی بہت بڑی منزل طے کرنے کو باقی ہے غرضکہ یا حالِ تباہ اہلِ حرم نے کربلائے حسینؑ کو رخصت کیا اور وہاں سے مدینہ کو روانہ ہوئے۔

مومنین۔ جب یہ ستم رسیدہ اور آفت دیدہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا اور شہر کے در و دیوار نظر آنے شروع ہوئے تو سب کے دل بھر آئے۔ جناب امّ کلثوم نے بے اختیار ہو کر چند دردناک اشعار پڑھے۔ جن میں سے دو شعر یہ ہیں۔

مَدِیْنَةُ جَدِّنَا لَا تَقْبَلِیْنَا فَبِالْحَسَرَاتِ وَالْاَحْزَانِ جِئْنَا
خَرَجْنَا مِنْکِ بِالْاَهْلِیْنَ جَمْعاً رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَلَا بَنِیْنَا

اے نانا کے مدینے اب ہم تجھ میں آنے کے قابل نہیں رہے کیونکہ ہم حسرت و غم کی تصویر بنے ہوئے آرہے ہیں۔ جب تجھ سے نکلے تھے تو بھرا کنبہ ساتھ تھا۔ اور اب اس حال میں لوٹے ہیں کہ ہمارے ساتھ مرد ہیں نہ بچے۔

امام زین العابدین علیہ السّلام نے بشیر کو بلا کر فرمایا اے بشیر تیرا باپ مرد شاعر تھا۔ کچھ تجھے بھی فنِ شعر میں دخل ہے۔ اس نے کہا ہاں میں بھی کچھ کہہ لیتا ہوں۔ فرمایا پھر ہمارے مصائب کے متعلق کچھ کہہ اور مدینۂ رسولؐ میں جا کر ہمارے ہم وطنوں کو ہمارے آنے کی خبر کر دے۔ اے بشیر مدینہ کے گلی کوچوں میں جا کر یہ صدا کر الا قُتِلَ الحسین مکو بلا الا ذُبِحَ الحسینؑ مکو بلا۔ اے بشیر جب محلہ بنی ہاشم میں پہنچنا تو کئی بار اس آواز کو بلند کرنا۔

الغرض اہل حرم نے بیرونِ شہر قیام کیا اور بشیر وہاں سے روانہ ہو کر مدینہ میں آیا اور یہ شعر باواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

یَا اَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ بِهَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ فَاَدْمُعِی مِدْرَارٌ

مدینہ والو اب مدینہ تمہارے رہنے کی جگہ نہیں رہا حسینؑ قتل کر دیئے گئے۔ پس میرے آنسو ان کے غم میں جاری ہیں۔

مومنین جونہی یہ آواز مدینہ میں گونجی ہر طرف سے زن و مرد پریشان حال نکل پڑے اور کہنے لگے اے شخص تو یہ کیسی سناؤنی لایا ہے کیا حسینؑ فرزند رسول الثقلین قتل کر دیئے گئے۔ آہ! کیا مدینہ نواسۂ رسولؐ سے خالی ہو گیا۔ بشیر کہتا ہے میرے آس پاس خلائق کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ قدم اٹھانا دشوار ہو گیا۔ ہر شخص اس خبر کو سنکر زار زار رو رہا تھا۔ جب میں بمشکل تمام محلہ بنی ہاشم میں پہنچا تو میں نے رو رو کر کئی بار یہ آواز بلند کی اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اس آواز کے بلند ہوتے ہی میں نے سنا کہ بنی ہاشم کے گھروں سے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ ایک لڑکی برقع پوش عصا کے سہارے نہایت بے تابانہ انداز میں ایک گھر سے نکلی اور گھبرا کر پوچھنے لگی۔ اے شخص تو یہ کیا صدا بلند کر رہا ہے۔ کیا میرے بابا حسینؑ کربلا میں قتل کر دیئے گئے۔ آہ کیا میں یتیم ہو گئی۔ اے شخص کچھ تجھ کو ہمارے کنبہ کی بھی خبر ہے۔ میں نے کہا بی بی کربلا کا لٹا ہوا قافلہ بیرون شہر مقیم ہے۔

مومنین یہ خبر سنتے ہی جناب فاطمہ صغرا بے تابانہ دوڑی ہوئی حضرت محمد حنفیہ کی خدمت میں آئیں اور ان سے لپٹ کر کہنے لگیں۔ اے چچا آپ کیا اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ آپ کا گھر تباہ ہو گیا۔ بابا حسینؑ مارے گئے۔ آہ میں یتیم ہو گئی۔ لٹا ہوا کنبہ واپس آیا ہے۔ جلد مجھے لے کر وہاں چلئے۔ یہ خبر سنتے ہی محمد حنفیہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور فاطمہ صغرا کو ساتھ لیکر وہاں سے کنبہ سے ملنے کو روانہ ہوئے۔ جب قریب پہنچے وَرَاٰی اَعْلَامَ السُّوْدِ فَخَرَّ مَغْشِیًّا عَلَیْہِ جونہی سیاہ نشان نظر آئے غش کھا کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا اور وہاں پہنچے تو بیمار کربلا پر نظر پڑی بیتابی سے دوڑے اور یتیم بھتیجے کو چھاتی سے لپٹا کر رونے لگے۔ حضرت نے فرمایا اے چچا مجھے زیادہ نہ دبائیے میرا سینہ درد کرتا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے عبا کا تکمہ کھول دیا اب جو محمد حنفیہ کی نظر پڑی تو سینہ پر ایک زخم دکھائی دیا۔ پوچھا اے فرزند یہ زخم کیسا ہے۔ فرمایا اے چچا یہ اس طوق خاردار کا زخم ہے جو ظالموں نے میری گردن میں ڈالا تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اے چچا ذرا میری پنڈلیوں کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ سیاہ نشان ان بیڑیوں کے ہیں جو اشقیائے امت نے مجھے پہنائی تھیں۔ یہ سنکر جناب محمد حنفیہ کا فرطِ غم سے عجیب حال ہوا۔ رو رو کر کہنے لگے اَیْنَ اَیْنَ سَیِّدِیْ وَمَوْلَایَ اَبُوْعَبْدِاللّٰہِ الْحُسَیْنُ اے فرزند میرے سید و مولا حضرت ابو عبداللہ الحسینؑ کہاں ہیں۔ فرمایا قُتِلَ مَظْلُوْمًا مَهْمُوْمًا عَطْشَانًا۔ اے چچا حضرت ابو عبداللہ الحسینؑ مظلوم قتل کر دیئے گئے۔ آہ! تین دن کے پیاسے شہید ہوئے۔ کئی روز لاش بے غسل و کفن پڑی رہی۔ دشمنوں نے ان کا سر انور کاٹ کے نیزہ پر چڑھایا۔ پوچھا اور میرے بھائی قمر بنی ہاشم ابو الفضل العباس کہاں ہیں۔ فرمایا نہر فرات کے کنارے ان کے شانے قلم کر کے شہید کر دیا۔ پوچھا اور شبیہ پیغمبرؐ علی اکبرؑ کہاں ہیں۔ فرمایا وہ بھی سینہ پر برچھی کھا کر شہید ہوئے۔ اے چچا روز عاشورہ محرم بھرے گھر کی صفائی ہو گئی۔ مختصر یہ ہے کہ مردوں میں میرے سوا کوئی باقی نہیں۔ یہاں تک کہ میرا شیر خوار بھائی علی اصغرؑ بھی تیر ستم کا نشانہ بن گیا۔

آہ مومنین جب بھائیوں کی ترسی بہن زینبؑ کو معلوم ہوا کہ محمد حنفیہ آئے ہیں تو زار زار روتی ہوئی ان کے پاس

آئیں اور گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگیں۔ بھیا محمد کبھی بہن کو بھائی حسینؑ کا پرسا نہیں دیتے۔ آہ! میں سب لٹا کر گھر کو آئی ہوں۔ بھیا محمد ایک گھر سے اٹھارہ جنازے چند گھنٹے کے اندر نکل گئے۔ آہ ظالموں نے ہمارے خیموں میں آگ لگا دی ہمیں ایسا لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر نہ رہی۔ آہ بھیا محمد تمہاری بہنیں اور بھاوجیں بازار کوفہ و شام میں تشہیر کی گئیں، دربار میں بلائی گئیں۔ آہ بھیا ہمارے شانوں میں رسیاں باندھی گئیں۔ دیکھو میرے بازوں پر اُسی کے نیل ہیں۔ الغرض دیر تک بہن بھائی گلے مل کر روتے رہے۔ اس کے بعد محمد اور بی بیوں سے ملے۔ اس وقت ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ ایک طرف جو چھوٹے بچھڑے ملنے سے بل بل کر رو رہے تھے۔ دوسری طرف جناب فاطمہ صغریٰ پچھاڑیں کھا رہی تھیں ایک ایک بی بی کو گلے سے لگاتی تھی اور روتی تھی۔

منقول ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ ہر بی بی کی گود کو بڑے غور سے دیکھتی تھیں۔ جناب رباب نے پوچھا اے بیٹی کیا ڈھونڈ رہی ہو۔ کہنے لگیں میں اپنے ننھے بھیا علی اصغرؑ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ جناب رباب نے رو کر فرمایا۔ بیٹی اب علی اصغر کہاں ہیں کہ تم ان سے ملو گی۔ وہ تو کربلا میں ظالم حرملہ کے تیر کا نشانہ بن گئے۔

الغرض اس کے بعد یہ قافلہ مدینہ کے اندر داخل ہوا۔ پہلے روضۂ رسولؐ میں پہنچے آہ! یہ بھی ایک عجیب دردناک منظر تھا۔ نہ معلوم کیا حال تھا کہ ایک ایک بی بی نے اپنے کو قبر رسولؐ پر گرا دیا اور اس قدر روئیں کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ خاص کر جناب زینبؑ کے بین اور بھی قیامت کے تھے۔ کہہ رہی تھیں نانا میں آپ کے حسینؑ کو کربلا میں چھوڑ آئی۔ نانا آپ کی امت نے ہمارے بھرے گھر کی صفائی کر دی۔ ہم بے والی و وارث ہو گئے ہماری گودیں بچوں سے اور جوانوں سے اور بوڑھوں سے خالی ہو گئے۔

الغرض قبر رسولؐ سے رخصت ہو کر روضۂ جناب سیدہ میں آئے۔ یہاں بھی دیر تک نوحہ خوانی اور سینہ زنی ہوتی رہی پھر وہاں سے قبر امام حسن علیہ السلام پر پہنچے۔ اس کے بعد اجڑے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ آہ! یہ وہی گھر ہے جو ایک سال پہلے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج وہ بالکل سنسان ہے سوائے چند مصیبت زدہ عورتوں کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس وقت اس ویران گھر میں ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ تمام زنان بنی ہاشم اور محلہ کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ سب گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ ایک ماتم کا عالم تھا۔ گھر میں گویا صف ماتم بچھی تھی۔ اور نوحہ خوانی ہوتی رہی کہتی ہیں جناب ام کلثومؑ کی حالت اور زیادہ خراب تھی۔ فرش پر غش پڑی رہتی تھیں۔

گھر میں تو یہ کہرام بپا تھا اور باہر بازار کربلا ... کہ یا حسین یا امام ... بشیر نے عرض کی مولا اب مجھے واپسی کی اجازت دیجئے۔ حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا اے بشیر تو نے ہماری خدمت کی ہے مال دنیا کوئی چیز عطیہ تحفہ میں نہیں کر سکتا۔ بھائی ہم کربلا میں لٹ چکے ہمارے پاس اب کچھ نہیں۔ بشیر نے رو کر کہا مولا مجھے مال دنیا کی حاجت نہیں چاہتا ہوں کہ تبرکات میں سے کوئی شے ایسی عطا فرما دیجئے جو کفن میں میرے ساتھ جائے۔ یہ سن کر حضرت نے ایک چھوٹا سا رومال

آئیں اور گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگیں۔ بھیا محمد کتنی بری بہن کو بھائی حسینؑ کا پرسا نہیں دیتے۔ آہ! میں سب کنبہ کو کھو کر آئی ہوں۔ بھیا محمد ایک گھر سے اٹھارہ جنازے چند گھنٹے کے اندر نکل گئے۔ آہ ظالموں نے ہمارے خیموں میں آگ لگائی ہمیں ایسا لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر نہ رہی۔ آہ بھیا محمد تمہاری بہنیں اور بھاوجیں بازار کوفہ و شام میں تشہیر کی گئیں۔ دربار دربار میں بلائی گئیں۔ آہ بھیا ہمارے شانوں میں رسیاں باندھی گئیں۔ دیکھو یہ میرے بازوؤں پر انہی کے نیل ہیں۔ الغرض دیر تک بہن بھائی گلے مل کر روتے رہے۔ اس کے بعد محمد اور بی بیوں سے ملے۔ اس وقت ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ ایک طرف محمد حنفیہ بچھڑے کنبے سے مل مل کر رو رہے تھے۔ دوسری طرف جناب فاطمہ صغراؑ پچھاڑیں کھا رہی تھیں ایک ایک بی بی ان کو چھاتی سے لگاتی تھی اور روتی تھی۔

منقول ہے کہ جناب فاطمہ صغراؑ ہر بی بی کی گود کو بڑے غور سے دیکھتی تھیں۔ جناب رباب نے پوچھا اے پارۂ جگر کیا ڈھونڈ رہی ہو۔ کہنے لگیں میں اپنے ننھے بھیا علی اصغرؑ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ جناب رباب نے رو کر فرمایا۔ بیٹی اب علی اصغر کہاں ہیں کہ تم ان سے ملو گی۔ وہ تو کربلا میں ظالم حرملہ کے تیر کا نشانہ بن گئے۔

الغرض اس کے بعد یہ قافلہ مدینہ کے اندر داخل ہوا۔ پہلے روضۂ رسول میں پہنچے۔ آہ! یہ بھی ایک عجیب دردناک منظر تھا۔ السلام علیک یا جداہ کہہ کر ایک ایک بی بی نے اپنے کو قبر رسولؐ پر گرا دیا اور وہ دردناک بین کئے کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ خاص کر جناب زینبؑ کے بین اور بھی قیامت کے تھے۔ کہہ رہی تھیں نانا میں آپ کے حسینؑ کو کربلا میں کھو آئی۔ نانا آپ کی امت نے ہمارے بھرے گھر کی صفائی کر دی۔ ہم بے والی و وارث ہو گئے۔ ہماری گودیں بچوں سے اور ہمارے گھر جوانوں اور بوڑھوں سے خالی ہو گئے۔

الغرض قبر رسولؐ سے رخصت ہو کر روضۂ جناب سیدہ میں آئے۔ یہاں بھی دیر تک نوحہ خوانی اور سینہ زنی ہوتی رہی۔ پھر وہاں سے قبر امام حسن علیہ السلام پر پہنچے۔ اس کے بعد اجڑے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ آہ! آہ! یہ وہی گھر ہے جو ایک سال پہلے بچوں۔ جوانوں اور بوڑھوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج وہ بالکل سنسان ہے۔ سوائے چند مصیبت زدہ عورتوں کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ آہ اس وقت اس ویران گھر میں ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ تمام زنانِ بنی ہاشم اور محلہ کی عورتیں پرسے کے لئے جمع تھیں اور گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ ایک کا ماتم کسی گھر میں کیسا سخت ہوتا ہے اور یہاں تو بہتر کا ماتم تھا جتنی سینہ زنی اور نوحہ خوانی ہوتی کم تھی۔ جناب ام سلمہؓ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ غش پر غش آ رہے تھے۔

گھر میں تو یہ کہرام بپا تھا اور باہر بیمار کربلا کے پاس برابر لوگ پرسے چلے آ رہے تھے۔ بشیر نے عرض کی مولا اب مجھے واپسی اجازت دیجئے۔ حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا اے بشیر مجھے سخت ندامت ہے کہ از قسم مالِ دنیا کوئی چیز بطور تحفہ پیش نہیں کر سکتا۔ بھائی ہم کربلا میں لٹ چکے ہمارے پاس اب کچھ نہیں۔ بشیر نے رو کر کہا۔ مولا مجھے مالِ دنیا کی حاجت نہیں چاہتا ہوں کہ تبرکات میں سے کوئی شے ایسی عطا فرما دیجئے جو کفن میں میرے ساتھ جا سکے۔ یہ سن کر حضرت نے ایک چھوٹا سا رومال

عطا فرما کے کہا۔ اے بشیر یہ میری جدہ ماجدہ جناب فاطمہ زہراؑ کے دستِ مبارک سے کاتے ہوئے سوت سے بنا گیا ہے۔ بشیر نے اس کو بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ پھر کھول کر دیکھا تو اس میں ایک سوراخ تھا۔ بشیر نے پوچھا مولا یہ سوراخ اس میں کیسا ہے۔ سہ کر فرمایا یہ رومال روزِ عاشور حضرت علی اصغرؑ شیر خوار کی گردن پر بندھا تھا۔ یہ سوراخ حرملہ کے تیر کا نشان ہے۔

اَلَا لَعنۃُ اللّٰہِ علی القومِ الظّالمین وسَیَعْلَمُ الذین ظلمُوا اَیَّ مُنقَلَبٍ یَّنقَلِبُون ۵

تمّت بالخیر